شیریں کتھا

ممتاز شیریں کی آپ بیتی، افسانے، مترجم افسانے، خطوط

ترتیب و مقدمہ

ضیاء اللہ انور

''جب کسی افسانہ نگار کے تمام
افسانے ایک ساتھ پڑھنے کو ملتے
ہیں تو ہم پر اس انوکھی دنیا کی
دریافت اور سیاحت کا در وا ہو جاتا
ہے جسے اس افسانہ نگار نے تخلیق کیا
اور ایک سبھا کی طرح سجایا۔ پھر یہ عمل
پڑھنے والے کے بس میں ہوتا ہے کہ
انکشاف کی حد سے گزر کر اجنبی،
مانوس رہگزاروں پر آوارہ خرامی کو
بصیرت کا پیش خیمہ بنالے۔ ممتاز
شیریں کے تمام افسانے یک جا ہو کر
اس بات کے متقاضی ہیں کہ ان کی
دید و دریافت کے مراحل سے گذرا
جائے۔ ممتاز شیریں کے افسانوں کا
محاکمہ، محمد حسن عسکری، مظفر علی سید،
نذیر احمد اور خالدہ حسین سے لے کر
انور سدید و شہزاد منظر تک کئے نقاد

شیریں کتھا

ممتاز شیریں کی آپ بیتی، افسانے، مترجم افسانے، خطوط

ترتیب و مقدمہ

ضیاء اللہ انور

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

Shireen Katha
(Mumtaz Shireen ki Aapbeeti, Afsane, Mutarjam Afsane, Khutoot)

Compiled by
Zeyaullah Anwer

Year of First Edition 2016
ISBN 978-93-5073-892-4

₹ 600/-

نام کتاب	:	شیریں کتھا (ممتاز شیریں کی آپ بیتی، افسانے، مترجم افسانے، خطوط)
مرتب	:	ضیاء اللہ انور
ای-میل	:	zeyaullahanwer@gmail.com
اشاعت اول	:	۲۰۱۶ء
قیمت	:	۶۰۰ روپے
تعداد اشاعت	:	۵۰۰
ضخامت	:	۵۷۶
کمپوزنگ و سرورق	:	تنویر احمد
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی-۶

کتاب حاصل کرنے کے لیے رابطہ نمبر

+91-8447416234, +91-9852891511

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

آدم اور حوا کے 'بنیادی گناہ' کے نام

جو نسل انسانی کی افزائش کا سبب بنا

•

حوا کی بیٹیوں کے نام

جو آج بھی اپنی بے گناہی کا کفارہ ادا کر رہی ہیں

''لوگ کتابوں کو نہیں سمجھتے جب تک کہ ان کو تھوڑا بہت زندگی کا تجربہ حاصل نہ ہو۔ بہر حال کوئی کسی گہری کتاب کو اس وقت تک سمجھ نہیں پاتا جب تک کہ اس کے مشمولات کا کم سے کم ایک حصہ اس کے سامنے خود اس پر گزر نہ جائے۔ کتابوں کے خلاف تعصب ان لوگوں کی حماقت کو دیکھ کر پھیلا ہے جنھوں نے محض کتابیں پڑھی ہیں۔''

— ایذرا پاؤنڈ

"Mans love is mans life a thing apart. It's women's whole existance."

— Lord Byron

فہرس

نامکمل افسانے

مترجم افسانے

خطوط

مقدمہ

ممتاز شیریں اردو ادب کی ایک معتبر آواز ہیں۔ ان کی ادبی شخصیت کئی جہتوں کی حامل ہے۔ وہ بیک وقت افسانہ نویس، تنقید نگار، مترجم، مرتب اور مدیر کی حیثیت سے ادب میں خود کو قائم کر چکی ہیں۔ 'معیار' (1963) اور 'منٹو: نوری نہ ناری' (1985) ادبی دنیا میں بطور ناقد ان کے شناخت نامے ہیں۔ شیریں فطرتاً زود حس واقع ہوئی تھیں۔ تخلیق کاری کے لیے ان کی طبیعت انتہائی موزوں تھی۔ 'اپنی نگریا' (1947) اور 'میگھ ملہار' (1962) ان کے تخلیقی جواہر ہیں۔ 'تخلیق کی فطری بے ساختگی' اور 'انٹلکچوئل ازم' ان کی تخلیقیت کے مظہر ہیں۔ شیریں کے افسانوں کی ایک اہم بات یہ ہے کہ ان کے یہاں تخلیقی بہاؤ میں کمی نہیں آتی اور خیال کا سایہ کم کم دکھائی دیتا ہے۔ وہ افسانے گڑھتی نہیں خلق کرتی ہیں۔ ان کی تنقید بے لاگ ہے۔ وہ کسی نظریہ یا ازم کی پابند نہیں بلکہ ادب کی وسعت کی خواہاں ہیں۔ ان کی تخلیق و تنقید دونوں فی الواقع ایک دوسرے کے لئے 'complimentary' حیثیت رکھتے ہیں۔ 'شیریں کتھا' ان کے افسانوں کو یکجا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اس کتاب میں شیریں کے دونوں افسانوی مجموعے (اپنی نگریا اور میگھ ملہار)، نامکمل افسانے (مجرم کون اور ایک زلیخائے خود آگاہ کا دامن بھی چلا) اور نامکمل آپ بیتی (ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے) شامل ہیں۔ ان تخلیقی گہر پاروں کے علاوہ ان کے مترجم افسانے جو مختلف زبانوں سے ترجمے کئے گئے ہیں، اپنے ترجمے کی خوبی کی وجہ

سے تخلیقی درجہ رکھتے ہیں۔ شیریں کے ادبی اور ذاتی خطوط جو ان کی ذہنی اور فکری ساخت کی گرہ کشائی کرتی ہیں، اس کتاب کے مشمولات ہیں۔

جنوبی ہند کی ریاست آندھرا سے تعلق رکھنے والی ممتاز شیریں کا مولد ہندو پور اور میسور مسکن تھا۔ شادی کے بعد بنگلور اور تقسیم کے بعد پاکستان کا سفر ان کی زندگی کے اہم موڑ ہیں۔ زندگی سفر مسلسل سے عبارت ہے۔ شیریں کا یہ سفر پاکستان منتقل ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔ مشرقی پاکستان، برطانیہ، ترکی، بینکاک اور بالآخر اسلام آباد نے انہیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ شیریں (1924-1973) اسلام آباد میں ہی ازلی و ابدی نیند سو گئیں۔ اپنی نامکمل آپ بیتی میں اپنے وطن کے متعلق اپنی ذہنی کشمکش کا اظہار یوں کرتی ہیں:

> میرا وطن کون سا ہے؟ ہندو پور جہاں میرے بزرگ رہتے آئے ہیں اور جہاں میں پیدا ہوئی یا میسور جہاں میں پلی بڑھی، تعلیم حاصل کی، شادی کی بچپن اور نوجوانی کا زمانہ گزارا اور جہاں اب بھی میرے نانا جان، امّی، بہنیں، بھائی سبھی رہتے ہیں یا پاکستان جس کی تقدیر سے میں نے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا ہے اور جو میرا روحانی وطن ہے۔

(ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے، رسالہ 'قند'، مردان، ممتاز شیریں نمبر، 1974، ص 104)

شیریں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز بنگلور سے کیا۔ سترہ برس کی عمر میں صمد شاہین سے شادی کے بعد انھوں نے ادب کو سنجیدگی سے برتنا شروع کیا۔ مطالعہ کا شوق صغر سنی سے ہی تھا۔ ابا جان (قاضی عبدالغفور) نے ان کی ادب نوازی کو خوب پروان چڑھایا، رسالہ اور کتابیں وہ خود مہیا کراتے تھے۔ شیریں کو مطالعہ کی بنیاد پر بچپن میں ہی لکھنے، پڑھنے کی لگن ہو گئی تھی۔ لیکن باضابطہ طور پر 1943ء میں ان کی پہلی کہانی 'انگڑائی' شاہد احمد دہلوی کے رسالہ 'ساقی' میں شائع ہوئی۔ شیریں ان معدودے چند فنکاروں میں سے ہیں جنھیں قلم اٹھاتے ہی شہرت دامن گیر ہوئی۔ ان کے اس پہلے افسانے نے اردو کے معروف

فنکاروں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ صمد شاہین نے اسے 1943 کے بہترین افسانوں میں شمار کیا ہے۔ ادبی دنیا میں قدم رکھتے ہی 1944 میں شوہر صمد شاہین کے ساتھ مل کر رسالہ 'نیا دور' کی شروعات کی۔ رسالہ کے پہلے شمارے میں '1943 کے افسانے' کے عنوان سے اپنا ایک تنقیدی مضمون بھی شائع کیا۔ مضمون کا چرچا ادبی حلقوں میں زور و شور سے ہوا۔ کرشن چندر، احتشام حسین، آل احمد سرور وغیرہ نے اس کی کافی ستائش کی۔ شیریں کی تخلیقی صلاحیت کے ساتھ ساتھ تنقیدی بصیرت کی بھی خوب تعریف کی گئی۔ حسن عسکری لکھتے ہیں:

> ممتاز شیریں اردو کے ان چند لکھنے والیوں میں سے ایک ہیں جن کی تعریف ہی ان کی شہرت سے شروع ہوتی ہے۔ انھیں مشہور ہونے کے لیے انتظار نہیں کرنا پڑا بلکہ پہلے ہی افسانے کے بعد ادب کے شائقین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی۔

(دیباچہ 'اپنی نگریا'، صفحہ 9)

احتشام حسین رقم کرتے ہیں:

> ممتاز شیریں صاحبہ کا طویل مضمون میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ مجھے موصوفہ کی وسیع النظری اور مطالعہ کی کثرت پر حیرت ہوتی ہے۔ پھر افسانہ نگاروں کا تجزیہ، ان کے افسانوں کے متعلق پرخلوص اور ناقدانہ رائیں یہ باتیں بہت دنوں میں آتی ہیں، مگر افسانوں کے متعلق اس مضمون کو پڑھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کی جگہ برسوں لکھنے والوں میں نہیں ہے۔

('جدید اردو افسانہ'، شہزاد منظر، صفحہ 232)

افسانہ 'انگڑائی' (1943) سے اپنا تخلیقی سفر شروع کرنے والی شیریں 'کفارہ' (1961) پر افسانوی دنیا کو خیر آباد کہہ دیتی ہیں۔ اپنے اس اٹھارہ سالہ تخلیقی سفر میں انھوں نے محض دو افسانوی مجموعہ اور دو نامکمل افسانے ('مجرم کون' اور 'ایک زلیخائے خود آگاہ کا دامن بھی جلا') اردو ادب کو دیے ہیں۔ پھر سکوت کا ایک لمبا سلسلہ ہے جو ان کے سفر آخرت تک دراز ہے۔ اپنے آخری افسانہ کفارہ سے انتقال کے درمیانی بارہ سالہ دورانیہ میں

انہوں نے لکھنے کی کئی بار کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکیں۔ شائد انہوں نے اپنے تخلیقی سفر کا کفارہ ادا کردیا تھا، اور اب مزید کفارہ کی ضرورت نہ تھی۔ 'مجرم کون' اور 'ایک زلیخائے خود آگاہ کا دامن بھی جلا' انہیں دنوں کی یادگار ہیں۔ 'اپنی نگریا' (1947) اور 'میگھ ملہار' (1962) شیریں کی کل تخلیقی جمع پونجی ہے۔ ان دونوں مجموعے میں کل بارہ افسانے ہیں۔ اپنی نگریا میں: آئینہ، انگڑائی، گھنیری بدلیوں میں، اپنی نگریا، رانی اور شکست۔ میگھ ملہار میں: کفارہ، آندھی میں چراغ، بھارت ناٹیہ (آزادی کی صبح)، آزاد نگارستان، دیپک راگ اور میگھ ملہار — میں اپنی تمام کی کوتاہیوں کے باوجود ان موادوں کی یکجائی میں جٹ گیا۔ اور ایک طفل مکتب کی طرح اس راہ کی دشواریوں اور پریشانیوں سے انجان اپنی دھن میں بڑھتا چلا گیا.... اس سلسلے میں مَیں نے سب سے پہلے پروفیسر ابوبکر عباد سے ملاقات کی۔ چونکہ انہوں نے اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ 'ممتاز شیریں: ناقد اور کہانی کار' کے عنوان سے تیار کیا تھا، بایں ہمہ ہندوستان میں شیریں سے متعلق انہیں ہی مرجع کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن ان سے موبائل پر کی جانے والی بارہا گفتگو اور بالمشافہ ملاقات سے بھی کسی قسم کی کوئی امید بر نہیں آئی۔ ان کی حوصلہ شکن باتوں سے میری ساری امیدیں ملیامیٹ ہوتی نظر آنے لگیں۔ لیکن انسان کو اتنی جلدی ہار نہیں ماننا چاہئے۔ اس کا حوصلہ ہی اس کی سب سے بڑی طاقت ہے، جو اسے کامیابی سے ہم کنار کرتی ہے۔ زندگی کا یہ سبق یاد ہے مجھے بایں ہمہ میں نے اپنی کوشش جاری رکھی اور آج یہ کتاب آپ قارئین کے سامنے ہے، میری کوششوں کا ثمرہ جو آپ قارئین کی نظر عنایت کا منتظر ہے۔

شیریں سے میری پہلی ملاقات ایم۔ اے کے زمانہ میں منٹو کے حوالے سے ہوئی۔ منٹو، جس کی ذات اردو ادب میں افسانہ کا استعارہ ہے، اس پر شیریں کی تحریروں نے سوچنے کا ایک نیا زاویہ دیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ شیریں سے میری قربت بڑھتی گئی۔ معیار، اپنی نگریا اور پھر میگھ ملہار۔ میگھ ملہار کی تلاش مجھے اور میرے ساتھیوں کو برسوں سے تھی۔ اس افسانہ کے بارے میں کافی کچھ سنا تھا۔ اس لئے اس کی جستجو بڑھتی گئی۔ لیکن تلاش بسیار کے

باوجود افسوس حاصل کا.... پھر یہ ترکیب سوجھی کہ کیوں نہ شیریں کے افسانوں کو کتابی صورت میں یکجا کیا جائے۔ابتدا میں میں نے محض ان کے افسانے جمع کرنے کا عزم کیا۔ لیکن دھیرے دھیرے یہ دائرہ بڑھتا گیا۔'جہاں چاہ وہیں راہ'۔شیریں کے افسانوں کی تلاش کے دوران مجھے ان کے نامکمل افسانے، مترجم افسانے، خطوط اور آپ بیتی کا پتا چلا۔ میں ان تمام موادوں کی حصولیابی میں جٹ گیا۔اور انہیں بھی اپنی کتاب میں شامل کرنے کا ارادہ باندھ لیا، لیکن ان کی حصول یابی نے میرے پسینے چھڑا دیے، میں پس وپیش کے عالم میں— ارادے باندھتا ہوں سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں— کی کیفیت سے گزرتا رہا۔ بہ ظاہر اس معمولی سی کوشش میں، قابل ذکر بات یہ ہے کہ فی زمانہ شیریں کی تحریریں کمیاب ہیں، بلکہ بعض چیزیں تو نایاب ہوگئی ہیں۔

'اپنی نگریا' کی پہلی اشاعت 1947 میں مکتبہ جدید لاہور کی جانب سے ہوئی اور دوسری 1955-1969 میں۔(یہاں یہ بات جملہ معترضہ کے طور پر عرض کردوں کہ اپنی نگریا کے پہلے ایڈیشن کا دیباچہ محمد حسن عسکری نے لکھا تھا، دوسرے ایڈیشن میں شیریں نے اس کی جگہ خود سے رقم کیا ہوا دیباچہ ٹانک دیا ہے۔) اس کا پہلا ایڈیشن دہلی یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں موجود ہے، جسے میں نے اپنا مرجع بنایا ہے، لیکن کتاب کی حالت بالکل غیر ہے۔کئی صفحات کتاب سے الگ ہیں۔اس کے علاوہ بوسیدگی کا یہ عالم ہے کہ کئی صفحے آدھے ادھورے ہیں۔ کتاب کھولتے ہوئے ایک ایک صفحہ دھیان سے کھولنا پڑتا ہے تاکہ کوئی حصہ ہاتھ میں نہ آجائے۔کئی جگہ عبارت کی قرأت میں دشواری پیش آئی۔ میری اس پریشانی کا مداوا خدا بخش خاں لائبریری، پٹنہ نے کیا۔خدا بخش لائبریری میں اپنی نگریا کا تیسرا ایڈیشن (1969) اپنی صحیح سالم حالت میں دریافت ہوا۔اپنی نگریا کے مکمل ہونے میں ان دونوں نسخوں نے میری مدد کی۔یوں حاتم طائی کی طرح میں نے بھی اپنا پہلا مرحلہ بہ آسانی مکمل کرلیا۔اور دوسرے سوال کی طرف چل نکلا۔یہ دوسرا سوال میگھ ملہار کی صورت میں میرے سامنے آیا۔'میگھ ملہار' لارک پبلشرز کراچی کے زیر اہتمام 1962 میں پہلی

دفعہ شائع ہوا (اس کا دوسرا ایڈیشن تلاش بسیار کے باوجود میری نظر میں نہ آسکا)۔ میگھ ملہار کی دستیابی میرے لئے دشوار گذار ثابت ہوئی۔ یہ مجموعہ لائبریریوں کی خاک چھاننے کے باوجود بھی حاصل نہ ہوسکا۔ لہذا میں نے ابوبکر عباد کی کتاب (ممتاز شیریں: ناقد اور کہانی کار) سے ان افسانوں کے حوالے نکالے جو میگھ ملہار میں شامل تھے۔ اور اپنی تلاش ان رسالوں میں شروع کی جن میں شیریں عموماً چھپتی تھیں۔ اس سلسلے میں مجھے پہلا افسانہ 'کفارہ' رسالہ سوغات (1962) کے افسانہ نمبر میں ملا۔ جو میرے لئے اپنی تلاش جاری رکھنے میں امید کی کرن ثابت ہوا۔ اس سلسلہ کی دوسری کڑی افسانہ 'آندھی میں چراغ' ہے۔ یہ افسانہ رسالہ نقوش کے افسانہ نمبر سے حاصل ہوا۔ ان کے علاوہ افسانہ آزادی کی صبح یا بھارت ناٹیہ رسالہ ماہ نو، اگست، 1948 سے، دیپک راگ رسالہ ساقی، جولائی-اگست، 1949 سے، میگھ ملہار رسالہ سویرا، شمارہ 20-19 سے— کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے— یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ افسانے میں نے xerox کی صورت میں حاصل نہیں کئے بلکہ تصویروں کی صورت میں پائے ہیں۔ کیوں کہ ان رسالوں کی حالت اس قدر غیر تھی کہ ان کا xerox ملنا دشوار کن تھا، پھر لائبریریوں کی formalities اپنی جگہ، بنابریں ٹکنالوجی کی دین موبائل فون نے میرا کام آسان کر دیا۔ یوں میں نے مجموعہ میگھ ملہار کے یہ پانچوں افسانے ان مختلف رسالوں سے حاصل کر لئے، لیکن ہنوز سوال ادھورا تھا کیوں کہ اس سلسلہ کی آخری کڑی افسانہ 'آزاد نگارستان' وصول نہ ہوسکا تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ افسانہ کب اور کس رسالہ میں شائع ہوا اس کا حوالہ کہیں نہیں مل سکا۔ بایں ہمہ اس سلسلہ میں میں اپنے مشفق استاد پروفیسر مظہر مہدی کا مشکور ہوں جن کی رعایت سے پروفیسر علی احمد فاطمی کے ذریعہ افسانوی مجموعہ میگھ ملہار کی دستیابی ممکن ہوسکی۔ یوں میرا یہ آدھا ادھورا کام پایہ تکمیل کو پہنچ سکا، اور مہینوں کی صعوبتیں اٹھانے کے بعد میرا یہ دوسرا مرحلہ اپنے انجام کو پہنچا۔ میگھ ملہار (مجموعہ) کے مطالعہ کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ مجموعہ میں شامل افسانوں میں بجز 'کفارہ' اور 'آزاد نگارستان' کے بقیہ تمام

افسانوں میں شیریں نے حذف واضافے کیے ہیں۔ بنا بریں میں نے اس کتاب میں رسالوں سے حاصل شدہ افسانوں کے بجائے مجموعہ میگھ ملہار کے متون کو ہی اپنا مرجع بنایا ہے۔

اس کہانی کو یہیں ختم کر کے میں اپنے اگلے سفر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان دونوں کتابوں کی حصول یابی نے مجھ میں وہ حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ کسی صورت اب میں اپنے سفر کو مکمل کر کے ہی دم لینا چاہتا تھا۔۔۔ مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کے آساں ہو گئیں۔۔۔ رسالہ قند، مردان، جنوری - فروری 1974 کا ممتاز شیریں نمبر، اس رسالہ کی تلاش نے مجھے پھر سے وہیں لا کھڑا کر دیا جہاں سے میں نے اپنی تلاش شروع کی تھی۔ زمانہ ایک دائروی شکل میں گردش کر رہا ہے، رسالہ 'قند' (ممتاز شیریں نمبر) کی تلاش میں اس بات کا شدید احساس ہوا۔ اس رسالہ کی دستیابی کے لئے میں نے پھر سے ساری لائبریریوں کی خاک چھانی، دوست، یاروں سے معلوم کروایا، ہندوستان اور پاکستان کی چند معروف شخصیات سے بھی رابطہ کیا۔ گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، عتیق اللہ، علی احمد فاطمی، نند کشور وکرم، مرزا حامد بیگ، آصف فرخی، ناصر عباس نیر جن میں قابل ذکر ہیں لیکن پھر بھی معاملہ صفر کا صفر ہی رہا۔ امید و بیم کے اس سفر میں میرے لئے نا امیدی کفر تھی۔ بچپن سے سنتا آیا ہوں۔۔۔ ہمت مرداں مدد خدا۔۔۔ میرے لئے یہ مدد راشد اشرف صاحب کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ہندو فلسفہ میں یہ بات بتائی جاتی ہے کہ انسان کی تلاش سچی ہو تو خود بھگوان انسانی روپ میں اس کی مدد کے لئے چلے آتے ہیں۔ "داتا کے بھید وہی جانے"۔ خیر بھلا ہو راشد بھائی کا جن کی تگ و دو کی وجہ سے یہ رسالہ مجھے حاصل ہو سکا اور اس کتاب سے متعلق میری امید بر آئی۔ اس سلسلہ میں شکریہ کا مستحق میرا دوست اور چھوٹا بھائی کامران غنی بھی ہے۔ جو محض اپنی کنیت سے ہی غنی نہیں دل سے بھی غنی ہے۔ اس کی محبتوں کی وجہ سے ہی میری رسائی راشد بھائی تک ممکن ہو سکی۔ خدا تعالیٰ انہیں اس کا بہتر صلہ عنایت کرے۔ اس رسالہ کے مشمولات میں شیریں کی وہ نامکمل تحریریں ہیں جو کسی اور رسالہ میں شائع نہیں ہو سکی

تھیں، ان میں شیریں کے دو نامکمل افسانے جن کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا جا چکا ہے، کے علاوہ ان کی نامکمل آپ بیتی ''ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے''، چند ذاتی خطوط جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیے گئے اور ایک انٹرویو اہم ہیں۔ اس کتاب کی تکمیل کے لئے شیریں کے نامکمل افسانے، آپ بیتی اور خطوط کی حصولیابی میرے لئے انتہائی ضروری تھیں۔ شیریں کی ان تحریروں کی شمولیت کے بغیر یہ کام ادھورا تھا۔ میرے یہ تمام حاصل، لاحاصل تھے اگر رسالہ 'سوغات' (ستمبر 1992 اور مارچ 1994) رسالہ 'نقوش' خطوط نمبر (شمارہ۔ 109، اپریل، مئی، 1968) اور شب خون (جنوری، 1994)، دستیاب نہ ہوتے۔ ان مذکورہ رسالوں میں شیریں کے وہ تمام خطوط جو انہوں نے ادبی حوالہ سے مختلف لوگوں کو لکھے تھے، شامل ہیں۔ خدا بڑا کارساز ہے اس نے پھر ایک بار میرے سفر کو آسان کر دیا، اور میں حاتم کے مثل اپنے سفر سے کامیاب و با مراد لوٹ آیا۔ شیریں سے متعلق میری یہ کوشش جس کا نام ''شیریں کتھا'' طئے پایا ہے، میری اسی کامیابی کا ثمرہ ہے۔

اپنی نگریا اور میگھ ملہار، شیریں کی یہ دونوں کتابیں ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ کمیاب ہیں۔ ہندوستان میں تو یہ عنقاء ہیں۔ یہاں کی کئی معروف اور قدیم لائبریریوں میں بھی یہ کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ خدا بخش خاں لائبریری، انجمن ترقی اردو دہلی اور انجمن ترقی اردو بہار کی لائبریری، اردو اکادمی دہلی، مغربی بنگال اردو اکادمی اور ساہتیہ اکادمی لائبریری، علی گڑھ یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، میسور یونیورسٹی اور قدیم کلکتہ یونیورسٹی لائبریریوں میں بھی یہ مجموعے مفقود ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ خدا بخش خاں اور دہلی یونیورسٹی کی مرکزی لائبریریوں میں مجموعہ 'اپنی نگریا' 1969ء کے ایڈیشن کی ایک ایک کاپی موجود ہے، جیسا کہ ماقبل سطور میں اس کا ذکر کیا گیا۔ لیکن لائبریریوں میں موجود یہ نسخے بھی اپنی بدحالی پر ماتم کناں ہیں۔

میں، میرے کئی ساتھی اور مجھ جیسے ادب کے کئی طالب علم اردو کی اس باشعور، باصلاحیت خاتون کو، جنھیں حقیقی معنوں میں انٹلکچوئل یا دانشور کہا جائے تو کسی کو کوئی مذائقہ نہیں، کی تحریروں کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں۔ لیکن لائبریریوں کی خاک چھاننے کے باوجود مایوسیاں ہی ہاتھ آتی ہیں۔ شیریں کے افسانوں کا تو یہ معاملہ ہے کہ اردو افسانوں کے انتخابات کی کتابوں میں بھی شاذ ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ خواہ یہ انتخاب مرزا حامد بیگ کا (اردو افسانے کی روایت) ہو یا پھر گوپی چند نارنگ، ارتضیٰ کریم اور اسلم جمشید پوری کا (آزادی کے بعد اردو افسانہ)۔ ہر ایک جگہ ہمیں مایوسی ہی ہوتی ہے۔ شیریں کے افسانوں کو ادبی روایت کا حصہ نہ ماننے کا ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ شیریں کے افسانے اس معیار کے نہیں کہ انھیں ادبی روایت کا حصہ بنایا جا سکے (جو میری سمجھ سے ایک مشکل امر ہے) یا پھر وہ کسی تحریک یا ازم سے منسلک نہیں تھیں جس کا خمیازہ ہم نئے پڑھنے لکھنے والوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ کاش آج شیریں زندہ ہوتیں تو ہم ان سے کہہ پاتے کہ محترمہ ادبی دنیا میں زندہ رہنے کے لیے محض سچی تخلیقیت کارگر نہیں ہوتی، نا ہی دوٹوک تنقید آپ کو حیات جاوید بخش سکتی ہے۔ اگر اردو ادب میں آپ کو زندہ رہنا ہے تو کسی نظریہ، کسی ازم کے طابع ہو جائیں اور اسی کے گن گان کریں تبھی اردو دنیا آپ کو یاد رکھے گی۔ لیکن بھلا ہو ان کا کہ ادب کے متعلق انہوں نے کبھی مصالحت نہیں کی اور تخلیق کی فطری بے ساختگی کو ادب میں ترجیح دیتی رہیں۔ اپنے اسی موقف کے تحت انھوں نے تنقید لکھی اور افسانے خلق کئے ہیں۔ یہ شیریں کا خاصہ ہے کہ وہ ادب کو کسی مخصوص نظریہ یا ازم کے دائرہ میں نہیں بلکہ عالمی کینوس میں دیکھتی ہیں۔ ادب کے تئیں ان کا یہی رویہ میرے لئے ان کی دریافت کا سبب بنا ہے۔

شیریں نے ادب کے عالمی نظریہ کی بنیاد پر ہی 'شکست' اور 'رانی' جیسے ترقی پسند افسانے (ترقی پسند اس لیے کہ اس وقت انسانی ہمدردی یا غریبوں کی بات کرنے والا ترقی پسند ہی کہلانے لگتا تھا) بھی لکھے اور 'انگڑائی' اور 'کفارہ' جیسے نفسیاتی اور علامتی افسانے بھی اور 'میگھ ملہار' اور 'دیپک راگ' جیسے اساطیری اور تجرباتی افسانے بھی۔ گردش ایام کے ساتھ

شیریں کا تخلیقی سفر بھی جاری رہا۔ انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کو کسی تنقیدی نظریے کے ماتحت نہیں کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مطالعہ کی وسعت نے انھیں کہیں رکنے نہیں دیا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں میں ہمیں جدید عہد کی رمق دکھائی دیتی ہے۔ وہ مغرب کی اچھی چیزوں کو اپنے ادب میں شامل کرنے کی کوشش کرتی ہیں، لیکن ساتھ ہی اپنے دیسی رنگ کو بھی زائل نہیں ہونے دیتی ہیں۔ ہند اسلامی کلچر اور مشرقی سائیکی کو وہ کہیں مجروح نہیں کرتی ہیں۔ انھوں نے مارشل پروست اور جیمس جوئس سے اثرات ضرور قبول کیے ہیں، لیکن محض تکنیکی سطح پر۔ ان کے افسانوں کی روح خالص مشرقی ہے۔ ان کے شعور اور لاشعور میں مشرقیت اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ رچی بسی ہے۔ شیریں کے افسانوی موضوعات خالص دیسی قسم کے ہیں۔ 'انگڑائی' سے 'کفارہ' تک انھوں نے ہر ایک جا مشرقی محبت، سائکی اور اس کے مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے۔ شوہر، بیوی کے درمیان محبت کے مختلف شیڈس ہمیں ان کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ ان کے افسانوں کا سب سے بڑا وصف ہے جس کی وجہ سے ہم اردو افسانے کی روایت میں بآسانی ان کی شناخت کر لیتے ہیں۔ شیریں کا مطالعہ جتنا وسیع تھا، مشاہدہ اتنا ہی محدود تھا۔ انھوں نے زندگی کو ایک مخصوص زاویہ سے دیکھا تھا۔ شوہر، بیوی کی اس شدید محبت کو شیریں نے اپنی حقیقی زندگی میں برتا تھا۔ وہ صمد شاہین سے بے پناہ محبت کرتی تھیں اور صمد بھی ان پر جان چھڑکتے تھے۔ اپنی اس خانگی محبت کا ایک روپ انھوں نے افسانہ 'اپنی نگریا' میں پیش کیا ہے۔ اپنی نگریا ان کی خانگی زندگی کا ایک خاکہ ہے جو افسانہ بنتے بنتے رہ گیا ہے۔ وہ خود اس کے متعلق لکھتی ہیں:

> یہ اپنے 'نیا دور' کی کہانی ہے جو افسانوی جامہ پہنائے بغیر براہ راست واقعیت کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔

(دیباچہ نقش ثانی، مجموعہ 'اپنی نگریا' صفحہ 167)

عسکری اس افسانے کے متعلق یوں تبصرہ کرتے ہیں:

'اپنی نگریا' اس لحاظ سے ایک عجیب افسانہ ہے کہ اس میں انتہائی بے رنگ باتوں سے رومان پیدا کیا گیا ہے۔ معمولی باتوں میں معنویت ڈھونڈھنا ممتاز شیریں کے ادبی مزاج کا خاصہ ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہ تجزیہ دکھایا گیا ہے کہ بے رنگ مشغولیتوں سے میاں بیوی کی محبت میں کمی نہیں ہوتی اور نہ ایک دوسرے کی شخصیت سے انہماک کم ہوتا ہے بلکہ کام گویا محبت کا ایک عکس بن جاتا ہے۔

('اپنی نگریا'، دیباچہ نقش اول، صفحہ 8)

شیریں نے اپنے افسانے کے ایک ایک لفظ کو بھوگا ہے۔ ان کا مشاہدہ گرچہ محدود تھا لیکن اس محدود دائرے میں انھوں نے مختلف گل بوٹے کھلائے ہیں۔ ان کے افسانوں پر میر انیس کا یہ مصرع صادق آتا ہے:

ع   اک پھول کا مضمون ہو تو سو ڈھنگ سے باندھوں

شیریں کے افسانوں کا بنیادی موضوع یا محور ازدواجی زندگی ہے۔ وہ اپنے افسانوں کا تانا بانا شوہر و بیوی کی فطری محبت کے گرد بنتی ہیں۔ 'اپنی نگریا'، 'گھنیری بدلیوں میں'، 'رانی'، 'آندھی میں چراغ' ان کے ایسے ہی افسانے ہیں جن کی تفہیم میں ہمیں اس محبت کی رمق دکھائی دیتی ہے۔ 'اپنی نگریا' میں ایک غیر رومانی پس منظر میں شاہد اور ناز نسرین کے کردار کے درمیان رومان دکھانے کی سعی کی گئی ہے۔ روزمرہ کے معمولات زندگی میں کام کے پریشر کی وجہ سے محبت کا رنگ پھیکا پڑنے لگتا ہے۔ شیریں نے اس قضیہ کے برعکس یہ دکھایا ہے کہ محبت زندگی کا ایک روپ ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کا اظہار یہ کسی ایک وقت سے خاص نہیں۔ ہم روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن اگر ان کا خیال رکھا جائے تو اس سے میاں، بیوی کی محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ افسانہ میں اس قسم کی چھوٹی چھوٹی بظاہر روکھی، پھیکی باتوں سے رومان پیدا کیا گیا ہے اور اس قضیے کو توڑنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کام کے بوجھ تلے محبتیں دم توڑنے لگتی ہیں۔ شیریں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ میاں بیوی چاہیں تو کام محبت کو گہرا کرنے کا سبب بن سکتا ہے:

...وہ سر اٹھا کر دیکھتی، شاہد کے چہرے پر پسینے کی بوندیں آ جمی ہیں۔ اس کے بال پریشان ہو کر پیشانی پر آ پڑے ہیں۔ وہ تھکا ہوا ہے۔ وہ چپکے سے اٹھ کر اندر چلی جاتی اور چائے بنا کر لے آتی۔ اس کے بال ہٹا کر ایک مادرانہ شفقت سے اس کی پیشانی چوم کر کہتی "چائے پی لو بہت تھک گئے ہو۔" وہ چپکے سے اس کا ہاتھ اٹھا کر آنکھوں سے لگالیتا۔ (افسانہ'اپنی نگریا)

افسانہ 'گھنیری بدلیوں میں' ایک نئے شادی شدہ جوڑے کی کہانی ہے۔ شوہر کے تئیں بیوی کے احساسات و جذبات اور اس کے emotional complex کی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ بیس، پچیس صفحات کے اس افسانے میں بمشکل بیس، پچیس مکالمے ہوں گے۔ پورا افسانہ داخلی انتشار اور جذباتی خلفشار کا علامیہ ہے۔ بیانیہ اس قدر گٹھا ہوا ہے کہ ہم بیان کنندہ کے ساتھ چلتے چلے جاتے ہیں اور ایک پل کو بھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی ہے۔ Intensity of Love کی صورت میں شوہر بیوی کے درمیان پیدا ہونے والے خدشات اور مطالبات کی بہترین عکاسی ہے۔ افسانے میں نجمہ کا کردار شیریں جس انداز سے پیش کرتی ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنے کردار کی پرتیں کھول رہی ہیں۔ نجمہ کے احساسات و جذبات میں ہمیں مصنفہ کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ محبت خدشات کو جنم دیتی ہے۔ یہ خدشات عاشق کے لئے وبال جاں بن جاتے ہیں۔ گھنیری بدلیوں میں نجمہ کا کردار اسی الجھاؤ کا شکار ہے۔

افسانہ 'رانی' اور 'آندھی میں چراغ' کا موضوع بھی محبت کے خمیر سے ہی تیار ہوا ہے۔ 'رانی' کا اپنے بیمار شوہر کی تیمارداری کرنا، اس کے لیے محنت مزدوری کر کے روزی روٹی اور دوا دارو کا انتظام کرنا، محبت کے اسی جذبہ کی طرف اشارہ ہے جس کی پروردہ شیریں خود تھیں۔ 'رانی' میں گرچہ اشتراکیت کا موضوع زیر بحث ہے، اور اسی مدعا کے ارد گرد کہانی رچی گئی ہے۔ لیکن کہانی کے بطن سے شوہر بیوی کی محبت کی وہی کرن پھوٹتی ہے جو شیریں کی زندگی کا حاصل تھا۔ افسانہ 'آندھی میں چراغ' بھی ازدواجی زندگی میں شوہر اور بیوی کے

محبت بھرے تعلقات یا Intensity of Love کی کہانی ہے، جہاں شوہر اپنی بیوی کی جان بچانے کے لیے آخری حد تک کوشش کرتا ہے۔ اپنی نقاہت اور کمزوری کی پروا کیے بغیر اپنی رگوں کا خون بھی اس کی رگوں میں منتقل کر دیتا ہے۔ اس کی دوائیوں کے لیے اپنے روز مرہ کے اخراجات بند کر کے پائی پائی جوڑتا ہے اور اپنی زندگی کے عوض اس کی زندگی پانے کی کوشش کرتا ہے۔ محبت کا یہ جذبہ شیریں کا خاصہ ہے۔ من تن شدم تو جاں شدی کا فقرہ ان کے افسانوں کی جان ہے۔ ان کا یہ ذہنی رویہ ان کے دیگر افسانوں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ افسانہ 'میگھ ملہار' اور 'دیپک راگ' کے مختلف حصوں میں بھی محبت کی یہ کارفرمائی صاف جھلکتی ہے۔ اردو افسانہ کی روایت میں شیریں کا خاصہ ہے کہ اپنے محدود دائرے میں رہ کر انہوں نے ایسے افسانے لکھے ہیں جو بلا تامل اردو افسانے کی روایت کا اہم حصہ کہے جا سکتے ہیں ۔ اپنے محدود یا مخصوص موضوع کے متعلق شیریں اس خیال کی حامی تھیں:

> میرا خیال ہے کہ آرٹسٹ کا یہ اصول ہونا چاہیے کہ وہ اپنے Range میں لکھے چنانچہ جین اسٹین کی بڑائی اور ادبی دیانت داری اسی میں ہے کہ انھوں نے اپنے تجربے اور اپنے رینج سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ اب تو یہ دیکھا جا رہا ہے کہ یہاں بیٹھے چین اور کوریا کے افسانے لکھے جا رہے ہیں، ظاہر ہے ان کا معیار کیا ہوگا۔ مشاہدے کی وسعت کی جتنی اہمیت ہے Intensity of Feeling کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے۔

(شیریں سے انٹرویو از شفیع عقیل، 'جنگ' کراچی، مارچ 1973)

اسی Intensity of Feeling کی مثال شیریں کا افسانہ میگھ ملہار اور دیپک راگ بھی ہے۔ میگھ ملہار کی تخلیق کے متعلق وہ کہتی ہیں ''مجھ پر واقعتاً اس وقت ایک جنون سا سوار تھا اور میں ایک وجدانی کیفیت میں سرشار تھی۔ میں نے ان دنوں چاندنی میں وہی کیفیت پائی تھی اور موسیقی کے سحر کو روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا تھا۔'' (دیباچہ میگھ ملہار) میگھ ملہار کے پہلے دو حصے میں مصنفہ کی اس کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی

بنت میں جذبہ اور احساس کی شدت فن، فنکار اور محبت کی تثلیثی صورت میں ڈھل گئے ہیں۔ میگھ ملہار (افسانہ) فن کی وجودیاتی تشکیل کا علامیہ ہے۔ موسیقی فنون لطیفہ کی ایک اہم شاخ ہے۔ شیریں نے اپنے اس افسانے میں موسیقی کی سحر کاری اور فنکار کی ابدیت کو موضوع بحث بنایا ہے۔ فن نہیں مرتا اور نہ اس کی سچی پرستش کرنے والا فنکار، فن قربانی چاہتا ہے۔ اپنی عزیز اور قیمتی اشیاء کی قربانی۔ میگھ ملہار (افسانہ) چار مختلف کہانیوں کا آمیزہ ہے۔ یہ چاروں کہانی جدا ہونے کے باوجود اپنے مرکزی خیال یا تھیم سے جڑی ہیں۔ ان چاروں حصوں میں افسانے کا مرکزی کردار جو پہلے حصے میں ستار ساز کی صورت میں سامنے آتا ہے، اپنی ریاضت کے ذریعہ فن کی بلندیوں کو پالیتا ہے اور موسیقی کی دیوی کے دیدار سے سرشار ہوتا ہے۔ بالآخر دیوی کے چرنوں میں اپنی قیمتی چیز ستار کی نذر پیش کرتا ہے۔ دوسری کہانی میں شیام مرلی بجاتا ہے۔ اپنی مرلی کی تانوں سے امرت رس گھولتا ہے۔ کلا اور سنگیت کی دیوی سرسوتی اس کے مرلی کی تان پر بے خودی کے عالم میں اپنا درشن دیتی ہے۔ شیام دیوی کے درشن سے مبہوت ہو جاتا ہے۔ لیکن انجام کار فن کی بقا کی خاطر اپنی رادھے اور مرلی سے دست بردار ہو کر پتھر بن جاتا ہے۔ تیسرے حصے میں آرفیوس بربط ساز ہے۔ اپنے فن میں درجہ کمال رکھتا ہے۔ کائنات کو اپنی فنی سحر کاری سے مسحور کر لیتا ہے۔ اپنے فن کی جان یوریڈیس کو کھونے کے بعد دنیا سے لاتعلق ہو کر بربط سے دست بردار ہو جاتا ہے اور اس کے فراق میں اپنی جان دے دیتا ہے۔ چوتھے حصے میں یوسف شیرازی قانون (آلہ موسیقی) ساز ہے۔ اپنے فن کی پرستش کرتا ہے۔ شیریں جو دنیا میں اسے سب سے زیادہ عزیز تھی، اس کی موت کے بعد وہ دنیا اور کاروبار دنیا میں شامل ہو کر بھی خود کو ان سے علیحدہ کر لیتا ہے۔ دنیا و مافیہا سے بے زار وہ موسیقی میں یوں گم ہو جاتا ہے گویا فنون کی دیوی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔ میگھ ملہار میں فن، فنکار کی ابدیت کا موضوع زیر بحث ہے، جس پر محبت کی فضا غالب ہے۔ نذیر احمد صاحب میگھ ملہار کے پہلے حصے کے متعلق اپنے مضمون 'ممتاز شیریں کے افسانے' میں یہ سوالات قائم کرتے ہیں کہ اس میں کردار

اپنے ستار سے دستبردار کیوں ہو جاتا ہے، حالانکہ یہی دیوی کے دیدار کا ذریعہ ہے۔ اور دیوی کو ستار کی بھینٹ کیوں منظور ہے—دراصل فن قربانی چاہتا ہے—قربانی کے ذریعہ ہی ابدیت حاصل ہوتی ہے/کی جاتی ہے۔ میگھ ملہار کے ہر حصہ میں اسی قربانی کی داستان ہے۔ افسانے میں قربانی کی یہ صورت کہانی کو المیہ رنگ دے دیتی ہے۔ میگھ ملہار کی فضا میں جہاں رومانیت گھلی ملی ہے وہاں انجام کار المیاتی رنگ نے غلبہ پالیا ہے۔ رومان اور المیہ کا ایک دوسرے سے گہرا انسلاک ہے۔ لیجینڈ، رزمیہ، رومانس جیسے قصوں میں ہم ان کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہماری مشہور عشقیہ داستانیں بھی المیہ بن کر تہذیب کا حصہ بن گئی ہیں۔ لیلہ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال اور رومیو جولیٹ، ہر ایک جا رومان نے المیہ کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ عام طور سے رومان المیاتی رنگ کو گہرا کر دیتا ہے۔ جس کے گہرے نقوش قاری کے ذہن پر مرتسم ہوتے ہیں۔ رومان اور المیہ میں ابدیت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ میگھ ملہار فنکار اور اس کی محبت کا المیہ ہے۔ اس المیہ میں فن، فنکار اور محبت ایک تثلیث کی صورت میں ابھرتے ہیں۔ یہ تثلیث ابدی ہے، لازوال ہے۔ افسانہ میں ابدیت کا یہ پہلو بارہا ذہن پر دستک دیتا ہے لیکن کیا افسانہ کی حیثیت سے میگھ ملہار ادب میں ابدیت کا حامل بن سکا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر ناقدوں کی رائے سرے سے نفی میں ہے۔ بجز ایک دو کے جن کا ذکر شیریں اپنے انٹرویو اور خطوط میں کرتی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شیریں کا یہ افسانہ اردو کے افسانوی ادب میں معتبر نہ ہو سکا اور ایک ناکام افسانہ قرار پایا۔ بجز اپنی خامیوں اور ادھورے پن کے میگھ ملہار اردو افسانے کی سوچ کو ایک نیا زاویہ دیتا ہے۔ تکنیکی تنوع اور اساطیری زاویہ نگاہ سے افسانے میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ میگھ ملہار ایک تجربہ ہے بقول شہزاد منظر ایک ناکام تجربہ، لیکن یہ تجربہ اردو فکشن میں اساطیری ادب کے بنیاد گزاروں میں ہے۔ اردو افسانے میں اساطیری ادب کی جب بھی بات چھڑے گی میگھ ملہار کو اولین صورت میں یاد کیا جائے گا۔ یونانی، ہندوستانی اور ہند ایرانی اساطیر کا ایک بہترین نمونہ میگھ ملہار کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ اساطیر کو افسانے

میں نباہنا ایک فنکاری ہے۔ اور اس فنکاری میں انتظار حسین کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں اساطیر کو اس انداز سے برتا ہے کہ افسانے کی روح مجروح نہیں ہوتی ۔ وہ اس کٹھن ڈگر سے انتہائی ہنر مندی کے ساتھ گزرے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کہیں کہیں ان کے پیر بھی ڈگمگائے ہیں لیکن حقیقی معنوں میں اساطیر ان کے یہاں افسانے کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں، جب کہ شیریں یہیں مار کھا جاتی ہیں۔ ان کے یہاں اساطیر مکمل طور پر افسانے کا روپ نہیں دھار سکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میگھ ملہار کے ابتدائی دونوں حصوں میں اساطیر نے افسانوی رنگ اختیار کر لیا ہے، لیکن تیسرا اور چوتھا حصہ ایک نامکمل افسانے کی کہانی معلوم ہوتا ہے۔ اس میں بیانیہ بری طرح مجروح ہوا ہے۔ چوتھا حصہ (شیریں فرہاد) ''بے رنگ من است'' ہے جبکہ تیسرا حصہ (آرفیوس، یوریڈیس) یونانی اساطیر کا انسائیکلو پیڈیا بن گیا ہے۔ اس کا بیانیہ اس قدر منتشر ہے کہ کہانی اپنے بطن میں ہی دم توڑ دیتی ہے۔ آرفیوس، یوریڈیس کی کہانی کے اردگرد بہتیرے کردار جمع ہو گئے ہیں اور ہر کردار اپنی ایک اساطیری حیثیت رکھتے ہیں۔ مختلف اساطیری کہانیوں کے حامل یہ کردار افسانے کو گنجلک بنا دیتے ہیں، جس سے افسانے میں بوجھل پن کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ مزید افسانہ نگار کی گرفت کہانی کے بیانیہ پر ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔

شیریں نے اس افسانے میں بیک وقت دو تجربہ کیا ہے۔ پہلا تکنیکی اعتبار سے دوسرا موضوعاتی سطح پر۔ موضوعاتی سطح پر اردو فکشن جو ہنوز حقیقت کی راہ پر چل رہا تھا، شیریں نے اسے اساطیر اور دیو مالا کی ڈگر دکھائی اور تہذیب و کلچر کو اس زاویہ نگاہ سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ بلا شبہ اس سے موضوعاتی سطح پر اردو فکشن میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ تکنیکی اعتبار سے میگھ ملہار ایک نیا افسانہ ہے، افسانہ کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کرنا، چار مختلف کہانیوں کو ایک چھت کے نیچے جمع کرنا، وہ بھی اس انداز سے کہ ان کی گتھم گتھی نہ ہو، سب مل کر ایک اکائی بن جائیں، ایک مشکل امر ہے۔ شیریں نے اس مشکل کو آسان کرنے کی ایک چھوٹی سی کوشش کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کوشش میں

انہیں مکمل کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے، لیکن پھر بھی اس پر ''عظمت کی ایک چھوٹ پڑتی ہے''۔ سہ بعدی تکنیک اردو ادب میں ایک نیا تجربہ تھا۔ ایک واقعہ، حقیقت یا انسانی زندگی کو مختلف زاویوں سے ایک ہی افسانہ میں دیکھنا/دکھانا اور انہیں فنی مہارت کے ساتھ پیش کرنا سہ بعدی (three dimentional) تکنیک کہلاتی ہے۔ میگھ ملہار یا دیپک راگ سے قبل 'ان داتا' (کرشن چندر) اور 'وقت کی بات' (سہیل عظیم آبادی) افسانوں میں اس تکنیک کا چھوٹے پیمانے پر ایک کامیاب تجربہ کیا جا چکا تھا۔ کرشن چندر نے قحط بنگال کو اور سہیل نے چھوٹا ناگپور کے غریبوں کے چائے کے باغات میں کام کرنے کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے کی سعی کی تھی۔ ان کے برعکس شیریں نے میگھ ملہار اور دیپک راگ میں اسے کسی ایک واقعہ، حادثہ یا مسئلہ سے جوڑ کر نہیں دیکھا ہے، بلکہ انسانی جذبہ، احساس اور خواہش کو آفاقی پیمانے پر تولنے کی کوشش کی ہے۔ بالخصوص میگھ ملہار میں اساطیری اور تہذیبی نقطۂ نظر سے فن اور فنکار کی ابدیت کو بیان کی زد میں لایا گیا ہے۔ یہ ایک بڑا تجربہ تھا جس میں لازمی طور پر خامیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس تکنیک کو ایک وسیع زاویہ عطا کرنے کے لئے ہمیں شیریں کی سراہنا کرنی چاہئے۔ میگھ ملہار کا پہلا اور دوسرا حصہ تکنیکی اعتبار سے کامیاب ہے جبکہ تیسرے اور چوتھے حصہ میں خامیاں نمودار ہو گئی ہیں۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ پہلا اور دوسرا حصہ اپنے اسی عنوان کے ساتھ علیحدہ افسانے کی صورت میں پہلے شائع ہو چکا تھا۔ جو صد شاہین کے مطابق اپنے موضوع کے مناسب حال تھا۔ ان دونوں حصوں میں کافی ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہے اور ان کی تکنیکی ساخت بھی صحیح ہے۔ جبکہ تیسرا اور چوتھا حصہ بعد میں میگھ ملہار میں شامل کیا گیا ہے، ان دونوں حصوں میں کافی تکنیکی خامیاں در آئی ہیں۔

شیریں نے اس افسانے میں محض بیان سے کام نہیں لیا ہے۔ مکالمہ اور عمل دونوں کے دخل سے مختلف صیغوں میں کہانی بیان کی ہے۔ سہ بعدی تکنیک کے اس تنوع سے افسانہ کی خارجی ساخت الگ الگ حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس تکنیک کی یہ خوبی ہے جو

افسانے کے آخر میں ایک اکائی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن شیریں میگھ ملہار کے ان جدا حصوں کو ایک composite whole میں تبدیل نہیں کر سکی ہیں۔

میگھ ملہار کے پہلے حصہ کا راوی واحد متکلم ہے جو موسیقی کے تئیں محبت اور سچی شردھا سے اپنے فن کی کہانی اور اس کے لافانی ہونے کا فسانہ بیان کرتا ہے۔ وہ موسیقی کی دیوی کے دیدار اور فن کے لیے اپنی قربانی کی قبولیت پر نازاں ہوتا ہے۔ افسانہ اپنے ابتدا سے اختتام تک موضوع اور عنوان سے گتھا ہوا ہے اور ایک پراسراری کیفیت اخیر تک قائم رہتی ہے۔ شیریں نے اس حصہ کا عنوان 'نیل کمل' رکھا ہے۔ فن موسیقی اور نیل کنول کی ایک دوسرے سے گہری مناسبت ہے۔ انہوں نے ان دونوں کے باہمی تعلق کو بڑی فنکاری سے اس حصہ میں استعمال کیا ہے۔ نیل کنول اپنے آپ میں ایک اساطیری حیثیت کا حامل ہے۔ یہ محض ایک پھول نہیں۔ مختلف اساطیر و دیو مالا میں اس کی اپنی ایک شناخت ہے جو متعدد معنوں پر دلالت کرتا ہے۔ مصری اساطیر میں نیل کنول کو سورج دیوتا کی نمائندگی اور حیات نو کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ بودھ مذہب میں نیل کنول اپنے حواس پر فتح پانے کی علامت اور علم و دانش کا اشاریہ ہے۔ جب کہ ہندوازم میں یہ خالصیت کی علامت ہے۔ امنگ، خوبصورتی، حیات آفرینی، پاک دامنی اور برائی سے علیحدگی کی طرف دال ہے۔ فن موسیقی سرسوتی (فنون کی دیوی) کی عبادت ہے، اور عبادت بغیر خالصیت کے مقبول نہیں۔ یہی سبب ہے کہ 'نیل کنول' کے اس حصے میں مرکزی کردار 'میں' جب اپنے فن میں ڈوب کر ستار بجاتا ہے تو دیوی کا اصل روپ اسے دکھائی دیتا ہے اور اس کی خالص نیت، پاکدامنی اور برائی سے علیحدگی کے سبب دیوی اس کی بھینٹ قبول کر لیتی ہے اور موسیقی کی دنیا میں اسے ابدی حیات بخش دیتی ہے۔ افسانہ جوں جوں آگے بڑھتا ہے ہم راوی کے ساتھ چلتے چلے جاتے ہیں اور یہ حصہ ایک دائروی شکل میں اختتام کو پہنچتا ہے۔ 'میگھ ملہار' کا یہ حصہ ابتدا سے انجام تک ایک دوسرے سے مربوط ہے اور بیانیہ کی گرفت بھی مضبوط دکھائی دیتی ہے۔

افسانہ کا دوسرا حصہ 'سرسوتی' واحد غائب کے صیغے میں بیان کیا گیا ہے۔ تکنیکی

اعتبار سے افسانے کا یہ حصہ بھی مکمل ہے۔ بیان کنندہ کہانی کو بڑے محتاط انداز میں آگے لے جاتا ہے۔ شیام، رادھے، دیوی سرسوتی، بہروپیا گندیا کا کردار ہو یا رادھے کی سہیلیوں کا، ہر ایک کو بیان کنندہ نے دھیان سے دیکھا ہے اور ان کے حرکات وسکنات کو کہانی کے عین مطابق بیان کیا ہے۔ اگر اس حصے کو بھی مصنفہ واحد متکلم کے صیغے میں بیان کرتیں تو ممکن تھا کچھ کردار بے جان سے ہو جاتے۔ بایں وجہ افسانے کے چھوٹے چھوٹے حصوں میں بے رنگی در آتی۔ مثلاً رادھے اور اس کی سہیلیوں کے مکالمے، چھیڑ چھاڑ اور ان کے سہاونے گیت، واحد متکلم راوی کی صورت میں افسانے میں شامل نہ ہو پاتے اور ایسی صورت میں افسانے کا سب سے اہم حصہ اس کا اختتامیہ تبدیل ہو جاتا۔ مصنفہ نے اپنی سوجھ بوجھ سے کام لے کر افسانے کے اس حصے کو بے جان ہونے سے بچالیا ہے۔

میگھ ملہار کا تیسرا حصہ 'آرفیوس، یوریڈیس' بظاہر گذشتہ دونوں حصوں سے الگ نظر آتا ہے۔ لیکن متن کی قرأت اس کے انسلاکات کو واضح کرتی ہیں۔ یہ یونانی اساطیر سے متعلق ہے جسے افسانے کا روپ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ آرفیوس، موسیقی کے دیوتا اپولو اور شاعری کی دیوی کا بیٹا تھا۔ یوریڈیس ایک جل پری ہے۔ یہ حصہ ان کے پیار کی داستان ہے جسے موسیقی نے حیات جاوید بخشی ہے۔ یہاں بھی راوی واحد غائب ہے جس کی وجہ سے افسانہ میں کئی واقعے ایسے بیان ہوئے ہیں جو شاید واحد متکلم راوی کی صورت میں بیان نہ ہو پاتے۔ یوریڈیس کی سہیلیوں کا بیان، یوریڈیس کی موت کے بعد ان کا ماتم کناں ہونا جیسے واقعات سے افسانے میں یوریڈیس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ افسانے میں یہ منظر کشی واحد متکلم راوی کی صورت میں ایک مشکل امر تھا۔ آرفیوس اور یوریڈیس ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ وہ اپنے آس پاس کی دنیا سے بالکل بے خبر دکھائی دیتے ہیں، ایسی صورت میں واحد متکلم کے ذریعہ قصہ کے بیان میں حالات و ماحول کی تصویر کشی کا کمزور پڑ جانا لازمی تھا۔ لیکن جہاں یہ کمیاں در آتیں وہیں دوسری بڑی خامیاں جن کی وجہ سے افسانہ میں اکتاہٹ پیدا ہو گئی ہے دور ہو جاتیں۔ مثلاً مختلف ضمنی قصے اور

کردار جو اپنی طوالت کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں اور جس کی وجہ سے افسانہ کا یہ حصہ قدرے بوجھل ہو گیا ہے، افسانہ اس سے پاک ہو جاتا اور افسانہ کی قرأت میں اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ بیان کنندہ واحد غائب کی بجائے آرفیوس ہوتا تو اسے اپولو، پلوٹو، دیوی آرٹیمس، افروڈائٹ، پیرس، ہیلن اور ساوتری کا قصہ بیان کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ یوں افسانے کے اس حصہ میں جو (تقریباً) 32-30 اساطیری کردار جمع ہو گئے ہیں، نہیں ہو پاتے۔ ان بے جا تفصیلات سے افسانہ محفوظ ہو جاتا اور اپنے مرکزی خیال یا تھیم سے زیادہ وابستہ دکھائی دیتا۔ ایسی صورت میں آرفیوس کے کردار میں مزید جذباتیت در آتی جو قاری کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرنے میں معاون ثابت ہوتی اور قصہ میں بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا۔

'میگھ ملہار' کا آخری حصہ 'شیریں فرہاد' ہے جو رسالہ میں 'آرفیوس، نارسائس' کے عنوان سے شامل کیا گیا تھا۔ یہ حصہ پہلے اور دوسرے حصے کی طرح مربوط اور گتھا ہوا نہیں ہے۔ اس کی تکنیک میں سب سے زیادہ کجی پائی جاتی ہے۔ یہ یوسف شیرازی اور شیریں کی داستان محبت ہے، جسے موسیقی نے مزید گہرا کر دیا ہے۔ واحد متکلم کے صیغے میں شروع ہونے والی یہ کہانی تہران (ایران) سے شروع ہو کر کراچی (پاکستان) میں ختم ہوتی ہے۔ کہانی کئی سطح سے ٹوٹتی بکھرتی معلوم ہوتی ہے۔ تکنیک میں بڑا جھول ہے جو کہانی کی ساخت کو بگاڑ دیتا ہے۔ کہانی کی ابتدا واحد متکلم میں ہوتی ہے۔ راوی اپنی اس المیہ کہانی کو یوں بیان کرتا ہے جیسے وہ قاری سے مخاطب ہے لیکن درمیان میں دو، تین اقتباس واحد غائب کے صیغہ میں بیان ہوئے ہیں۔ جس سے یہ ابہام پیدا ہوتا ہے کہ راوی کا مخاطب قاری نہیں کوئی اور شخص ہے۔ یہ شخص کون ہے؟ اس کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ رسالہ سویرا میں جب یہ افسانہ شائع ہوا تھا تو اس میں شیریں نے اس شخص کی وضاحت شیرازی کے اس جملہ کے ذریعہ کی تھی:

ارے نہیں، تم ان دوسروں میں شامل نہیں ہو۔ وہ تم سے نہیں کترائے گی، کیوں کہ

تمھیں بھی موسیقی سے محبت ہے اور اس کے محبوب ساز ستار سے والہانہ انس۔ ہماری دوستی کا بھی تو یہی راز ہے، میرے دوست....

لیکن مجموعہ میں شامل کرنے سے قبل شیریں نے جہاں اس افسانہ کے تیسرے حصہ سے ایک انگریزی نظم کو حذف کر دیا (جسے میں نے اسی مقام پر جہاں پہلے شامل تھا حاشیہ میں درج کر دیا ہے۔) وہیں چوتھے حصہ کے متن میں خاصہ ردّ و بدل بھی کیا ہے۔ آلاء موسیقی جو پہلے ستار استعمال کیا گیا تھا اسے بدل کر ایرانی مزاج کے مطابق قانون کر دیا گیا۔ کئی ایک جگہ جملے کی ساخت درست کی گئی، بے جا طوالت محسوس کرتے ہوئے افسانہ کے آخری حصہ سے تقریباً ڈیڑھ، دو صفحہ حذف کر دیے گئے، اور ساتھ ہی کہانی میں ربط پیدا کرنے کے لئے چند جملے کا اضافہ بھی کیا گیا، لیکن ان حذف و اضافہ سے بھی تکنیکی خامیوں پر کچھ خاص اثر نہیں پڑا ہے۔ افسانے کی تکنیک پہلی دفعہ اس وقت بگڑتی نظر آتی ہے جب شیرازی، شیریں کی موت کے بعد کراچی چلا آتا ہے اور اس کی کوٹھی اور کمرے کا بیان واحد غائب راوی (جو اپنی مداخلت سے قبل تک غائب تھا) کے ذمہ سونپ دیا جاتا ہے:

شیرازی کی شاندار، خوبصورت کوٹھی میں، شیرازی کا یہ مخصوص کمرہ جسے خالصتاً مشرقی ایرانی طور پر سجایا گیا تھا۔ اس کمرے کی ہر ہر چیز ایک فنکارانہ مزاج کا پتہ دیتی تھی۔ یہ کمرہ گویا موسیقی کے لئے وقف معلوم ہوتا تھا.... شیرازی خاندان کے قدیم ایرانی ساز یہاں رکھے ہوئے تھے.... یہ سارا کمرہ مقدس خوشبوؤں میں بسا ہوا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا یہ کوئی قربان گاہ ہے یا کسی دیوی کا آلٹر۔

پھر دوسری مرتبہ جب اس کی بنت عم اس کے کمرے میں قدم رکھتی ہے۔ تو یہاں بھی اگلے اقتباس میں راوی واحد متکلم (یوسف شیرازی) کے بجائے واحد غائب ہو جاتا ہے:

اچانک کمرے میں کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ شیرازی بھنا اٹھا: ''تم کیوں چلی آئی میرے کمرے میں؟ کتنی دفعہ کہا ہے تمھیں اس کمرے میں نہ آیا کرو....

مزید الجھن اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب اس کے بعد کے اقتباس میں اس کی بنت عم اپنے جذبات کا اظہار اپنی زبانی کرنے لگتی ہے:

جانے کیوں بھائی جان مجھ سے اتنی نفرت کرتے ہیں۔ وہ کمرے میں میرا آنا تک گوارا نہیں کرتے۔ میں نے کیا قصور کیا تھا آخر۔ میں تو انھیں اتنا چاہتی ہوں۔ ان کا اتنا خیال رکھتی ہوں۔ ان کی پرستش کرتی ہوں۔

بات یہیں بس نہیں ہوتی بلکہ اگلے اقتباس میں تکنیک پھر بدل جاتی ہے۔ اب شیرازی کے کردار میں خود کلامی کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ اگلے تین چار اقتباس تک اسی تکنیک میں کہانی آگے چلتی ہے:

ایکو کا دل ٹوٹ گیا ہے، اس کا وجود تمھاری محبت کی آگ میں جل رہا ہے۔ تم کتنے بے رحم ہو نارسائس! تم اپنے آپ میں مگن ہو۔ دوسروں کے دکھ کی تمھیں کوئی پروا نہیں۔ تمھارے لئے کوئی جلے تو جلے۔ سن رہے ہو، نارسائس؟ ایکو کی یہ سسکیاں سن رہے ہو؟ نارسائس، نارسائس، نارسائس!....

اور بالآخر واحد متکلم کے صیغہ میں کہانی اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ تکنیکی خامی کے سبب افسانہ کا اختتام بھی کچھ بے ترتیب سا ہو گیا ہے۔ مصنفہ نے افسانے کے چاروں حصوں کو ایک ایک اقتباس میں جوڑنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ یہ افسانہ ایک اکائی نہیں بن سکا ہے۔ میگھ ملہار ایک تکنیکی تجربہ ہے۔ 'ایک ناکام تجربہ' لیکن کیا ناکامی کے سبب تجربہ کرنا ہی چھوڑ دیا جائے؟ ناقدوں نے اس افسانہ پر خوب خوب تنقید کی ہے اور اس کی ناکامی کا بارہا ذکر کیا ہے لیکن کسی نے اس تجربہ کی سراہنا نہیں کی ہے۔ حالانکہ اردو افسانہ کی روایت میں یہ ایک ایسا افسانہ ہے جس نے اساطیر اور تکنیکی تنوع (سہ بعدی تکنیک کا وسیع پیمانہ پر استعمال) کی راہ دکھائی ہے۔ اور اردو افسانے میں مغربی ادب سے استفادہ کی ایک صحت مند مثال پیش کی۔ میگھ ملہار اردو افسانے کو ایک نئی ڈگر پر ڈالنے کی کوشش تھی۔ انتظار حسین نے اپنے ایک انٹرویو میں ممتاز شیریں اور عسکری کو اردو افسانہ کا سنگ میل اور

افسانے کا ایک نیا اسکول کہا ہے:

...انھوں (عسکری و شیریں) نے ان سے ہی سارا فیض حاصل کیا تھا، [یعنی] جوائس سے اور پروست سے اور اس طرح کے لکھنے والوں سے۔ تو اس نئی تکنیک [ناول یولیسس کی تکنیک] سے ہمارا زمانہ زیادہ مانوس نہیں ہو سکا۔ اور عسکری صاحب اور ممتاز شیریں کی زیادہ تر کہانیاں اسی تکنیک میں لکھی گئی ہیں۔ وہ ایک نئے سنگ میل کے اعتبار سے تو اہم ہیں اور ایک نیا اسکول نظر آتے ہیں۔ اور اگر ہم کہیں کہ نیا فکشن کہاں ہے تو ہم عسکری کی کہانیوں کا حوالہ دیں گے، ممتاز شیریں کی کہانیوں کا اور قرۃ العین حیدر کی کہانیوں کا حوالہ دیں گے۔

(بی بی سی اردو ڈاٹ کام)

افسانہ میگھ ملہار محض تجربہ برائے تجربہ نہیں، تجربہ برائے تعمیر تھا۔ اردو افسانے کی جدید عمارت کی تعمیر۔ آج اسے تقریباً پچپن سال ہو گئے ہیں۔ ان پچپن سالوں کے بعد آج بھی اس کے متعلق ہماری رائے وہی ہونی چاہیے جسے قدماء نے ثبت کر دیا ہے؟ یا جدید تقاضہ کے مطابق قرأت ثانی کے ذریعہ اس کی بھی بازیافت ہونی چاہیے؟ فی زمانہ جہاں اساطیر، دیو مالا، ٹوٹم اور ٹیبو کی باتیں عام ہو چکی ہیں، اور ان کی تہذیبی جڑیں تلاش کرنے کی کوشش جاری ہے، ایسی صورت میں میگھ ملہار کا ذکر نہ ہو، بڑے حیرت کی بات ہے۔ میگھ ملہار اپنے تمام نقائص کے باوجود موضوع کی آفاقیت اور سہ بعدی تکنیک کے سبب اردو افسانے کی روایت میں وقیع درجہ رکھتا ہے۔ میگھ ملہار اور دیپک راگ کے متعلق آصف فرخی نے بجا لکھا ہے:

اگر یہ افسانے [میگھ ملہار اور دیپک راگ] اپنے اجزاء میں کامیاب اور مجموعی طور پر ناکام بھی ہیں، تب بھی ان کی ناکامی پر عظمت کی ایک چھوٹ پڑتی ہے، اور بڑے پیمانے کے تجربے کی حیثیت سے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ (منٹو نوری نہ ناری، ص ۱۸)

ممتاز شیریں بحیثیت ناقد ادب میں اعلیٰ مقام رکھتی ہیں لیکن بطور افسانہ نگار انہیں

وہ اعتبار حاصل نہ ہو سکا۔ ایک ناقد کے لئے کسی تخلیق پر تنقید کرتے وقت تخلیق کار کی انانیت ، اس کی خود پسندی کو زیر نظر رکھنا کہاں تک لازمی ہے؟ فنکار کی رائے اس کی اپنی تخلیق کے متعلق کہاں تک اہمیت رکھتی ہے؟ اس کی رائے کی بنیاد پر اس کے فن پارے کی تفہیم یا تنقید کہاں تک درست ثابت ہو سکتی ہے؟ اصولاً تنقید کو تخلیق کار کی اپنی رائے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔ ناقد کے لئے ضروری ہے کہ وہ تخلیق کار کی رائے کے برعکس فن پارے کے حسن و معائب کے بارے میں اپنی ذاتی رائے قائم کرے، لیکن ممتاز شیریں کے افسانوں پر تنقید کی صورت حال برعکس دکھائی دیتی ہے۔ عموماً میگھ ملہار کے افسانوں کو ناقدوں نے شیریں کی ذاتی رائے کے مطابق تولنے کی کوشش کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ افسانہ میگھ ملہار (جسے شیریں اپنی انتہائی عزیز تخلیق مانتی ہیں) پر سب سے زیادہ تنقید کی گئی ہے۔ ان تنقیدوں میں اکثر کا یہ عالم ہے کہ یہ تنقیص کے درجہ میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میگھ ملہار ایک ناقص افسانہ ہے لیکن اس کی تنقیص اسے اسفل السافلین میں شامل کر دیتی ہے۔ ہمیں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ تنقید اپنے مرتبہ سے گھٹ کر تنقیص کے درجہ میں شامل نہ ہونے پائے۔

میگھ ملہار کی طرح افسانہ دیپک راگ بھی اپنے موضوع و تکنیک کے سبب اہم ہے۔ بقول شیریں دیپک راگ کا مرکزی موضوع جنس، محبت اور ازدواجی زندگی ہے۔ شیریں نے اس میں مرد، عورت کے تعلقات اور لاگ لگاؤ کے مختلف رنگ بکھیرے ہیں اور زندگی کے اس روپ کو چھ مختلف زاویوں سے دکھایا ہے۔ محبت جو شیریں کی زندگی کا بھی حاصل ہے اور ان کے افسانوں کا بھی، اس کے تلخ و شیریں رنگ اس افسانے میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ”کلاسیکی محبت، ہوسناک محبت، پاکیزہ محبت، جذباتی محبت، منصوبہ بند محبت، رفاقت سے آزاد محبت، رقابت سے محروم محبت، تاجرانہ محبت، حاسدانہ محبت اور شہوانی محبت۔“ (ابوبکر عباد، ممتاز شیریں، ناقد و کہانیکار، ص 218) جنس و محبت کے یہ رویے متوازی بھی ہیں اور متضاد بھی۔ جنس و محبت اور ازدواجی زندگی کے تئیں شیریں کا جو

موقف ہمیں ان کے دوسرے افسانوں میں نظر آتا ہے دیپک راگ ان سے بالکل مختلف ہے۔ شیریں یہاں اپنے قضیہ کو توڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ مرد، عورت کی جنسی کشش کو وہ شوہر بیوی کے ازدواجی رشتے سے علیحدہ فطری انداز میں دیکھتی اور دکھاتی ہیں۔ افسانے میں جہاں کہانی کے مختلف shades ابھارے گئے ہیں، وہیں کرداروں کے ذریعہ محبت، جنس اور خانگی زندگی کے مختلف تصورات کو بھی develop کیا گیا ہے۔ جارج سینڈرس، عزیز، زبیری، فرید، ممتاز، پرکاش اور آرٹسٹ کے کردار زندگی کے تئیں اپنی ایک سوچ رکھتے ہیں۔ کوئی ازدواجی زندگی سے خوش ہے اور اپنی جنسی تسکین کے لئے سماجی اصول وضوابط کو مانتا ہے۔ کوئی ہوس پروری کو فروغ دیتا ہے۔ کوئی محبت کے متعلق dilemma کا شکار ہے۔ کہانی میں جنسی تسکین کی خاطر جہاں ایک طرف مردوں کے کردار اور ان کے افکار بیان کئے جا رہے ہیں، وہیں مردوں کے بالمقابل عورتوں کے اقدامات اور ان کے ذہنی رویوں کو بھی بیان کی زد میں لایا گیا ہے۔ کملا، امینہ، دلہن، گیارہ سالہ اینگلو انڈین لڑکی، چمپا، رنجنا اور کسم کے کرداروں کے ذریعہ مخصوص زاویہ فکر سے سماج میں نسائی سوچ کو اجاگر کیا گیا ہے۔ شیریں اس افسانے کے متعلق یوں راقم ہیں:

> دیپک راگ اپنے انداز کا ایک نیا تجربہ ہے۔ اس میں زندگی کا ایک خاص پہلو ہے۔ جس پر کئی زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک خاص تصور ہے جو مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے۔

(معیار، صفحہ 180)

جیسا کہ کہا گیا کہ یہ خاص تصور جنس، محبت اور ازدواجی زندگی سے متعلق ہے جو افسانے میں مختلف شکلیں اختیار کرتا گیا ہے۔ شیریں نے ان تصورات کو سماج سے منسلک کر کے دیکھا ہے۔ اور کرداروں کی ایسی فریمنگ کی ہے جو فی زمانہ بھی اہمیت کے حامل ہیں اور موجودہ ترقی یافتہ معاشرے میں مشاہدہ میں آتے ہیں۔ یہاں انتہائی رذیل، شریف اور دوہری شخصیت کے حامل کردار ہیں۔ حصہ 'نغمے کی موت' کا فنکار اپنی حقیقی اور فلمی زندگی میں

دوہری زندگی جیتا ہے۔ اپنی ہوس اور جنسی تکمیل کی خاطر فن اور فنکاری کو ڈھال بناتا ہے۔ فن کی سچی پرستش نہ ہونے کی صورت میں اس کے یہاں فن کی موت ہو جاتی ہے۔ 'جوار بھاٹا' کا پرکاش عجیب نفسیاتی کشمکش کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ وہ جس جگہ بھی، جس کسی کے ساتھ ہوتا ہے، اسے ہر چند دنوں میں محبت ہو جاتی ہے۔ اس کے تئیں وہ اپنے دل میں اس قدر شدید محبت پاتا ہے کہ اس کے بغیر زندگی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ کسم، چمپا، جمیلہ، نزہت، کنول رانی، پرمیلا، اسے ہر ایک سے محبت ہو جاتی ہے اور محض چند دنوں نظر سے دور ہونے کے سبب محبت ماند پڑ جاتی ہے۔ پرکاش ایک ایسا کردار ہے جو جنسی کشش اور محبت میں فرق نہیں کر پاتا ہے۔ وہ مرد، عورت کی جنسی کشش (Attraction) کو محبت سمجھنے لگتا ہے۔ ''وہ ایک مغلوب الجذبات نوجوان ہے جسے جہاں کہیں اس کے تصور یا لاشعور میں بسے حسن کے ناز و انداز یا اس کی کیفیت کی کوئی جھلک دکھائی پڑتی ہے اس کا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اور وہ اسے ہی اول و آخر سمجھنے لگتا ہے۔'' (شیریں ناقد اور کہانی کار، صفحہ 126) اوتھیلو کا موہن ایک ایسا کردار ہے جو اپنی طوفانی زندگی کے بعد سکون چاہتا ہے۔ ایک پرسکون زندگی۔ گھر، بیوی، بچے اور ان کی محبت کے ذریعہ اطمینان چاہتا ہے۔ لیکن برعکس اس کے موہن کی زندگی جہنم بنتی جاتی ہے اور وہ اس جہنم میں جلتا تپتا رہتا ہے۔ چاہ کر بھی خلاصی حاصل نہیں کر سکتا۔ طلاق کی صورت میں کورٹ کے چکّر، معاشرہ میں رسوائی، اپنے رتبہ اور مرتبہ کا نقصان اور ایک بڑا اسکینڈل۔ وہ سماج کے اس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے، جہاں مرد، عورتوں کا ایک دوسرے سے ملنا جلنا، گھومنا پھرنا معیوب نہیں مانا جاتا۔ وہ اپنی بیوی کو محض اس لیے اپنے دوستوں سے ملنے اور ان سے بات کرنے سے نہیں روک پاتا ہے کہ لوگ اسے دقیانوسی (conservative) کہیں گے۔ سوسائٹی میں اس کی سبکی ہوگی۔ فکری انتشار کے سبب وہ اپنی ازدواجی زندگی کو جہنم بنا لیتا ہے۔ اندرونی خلفشار اور frustration کے انخلاء کی غرض سے وہ روزانہ دوسری عورتوں کے پاس جاتا ہے۔ پرسکون زندگی کا خواب بالآخر چکنا چور ہو جاتا ہے۔ موہن کا کردار ایک

عجیب نفسیاتی الجھن کا شکار ہے جو نہ ڈوب پاتا ہے، نہ ابھر پاتا ہے۔ یہ کردار شیریں کی نفسیاتی مہارت کا اظہاریہ بن جاتا ہے۔

تکنیکی اعتبار سے 'دیپک راگ' افسانہ 'میگھ ملہار' سے زیادہ مکمل ہے۔ اس میں تکنیکی کمزوری کا احساس کم کم ہوتا ہے۔ افسانہ کا راوی واحد غائب ہے جو قاری کو مختلف کرداروں سے، ان کے افکار وافعال سے واقف کراتا ہے، ان کے ذہنی رویہ کو ایک سمت دیتا ہے اور کہانی کو اپنے موضوع سے بھٹکنے نہیں دیتا۔ اس کے برعکس اگر مصنفہ افسانے کو کسی اور صیغہ میں بیان کرتیں تو غالب گمان تھا کہ افسانہ میں کئی غیر ضروری وضاحتیں در آتیں، مثلاً ضمنی کرداروں کی تفصیلات جس میں انہماک کی وجہ سے افسانہ کا موضوع مجروح ہو سکتا تھا۔ سہ بعدی تکنیک کے تعاقب میں ایک کمی ضرور رہ گئی ہے جس کا اعتراف خود مصنفہ بھی کرتی ہیں:

> ...میرا خیال ہے کہ اس میں (دیپک راگ میں) ایک کمی رہ گئی ہے۔ کیوں کہ پورے افسانے کو Composite whole نہیں بنا سکی، یعنی اس میں ایک مکمل یکجائی پیدا نہیں ہو پائی۔

(جدید اردو افسانہ، شہزاد منظر، صفحہ 240)

'دیپک راگ' میں چھ مختلف کہانیوں کو ایک افسانے کے تحت یکجا کیا گیا ہے۔ یہ کہانیاں اپنے تھیم اور مرکزی موضوع میں کافی حد تک ایک دوسرے سے جڑی ہیں۔ افسانہ کی قرأت کے دوران ہمیں اس کا احساس ہوتا ہے۔ افسانے کی معنوی ساخت کافی گتھی ہوئی ہے جب کہ ظاہری طور پر افسانے کے کرداروں اور واقعات میں کوئی نمایاں ربط نظر نہیں آتا ہے۔ بایں وجہ افسانہ کوئی وقیع تاثر قائم کرنے سے قاصر ہے۔ 'دیپک راگ' سے متعلق یہ بات بھی خاصی دلچسپ ہے کہ ابتدا میں اس کے آٹھ حصے تھے۔ پھر سات ہوئے اور بالآخر چھ حصے 'میگھ ملہار' میں شامل کیے گئے۔ جیسا کہ شیریں نے معیار میں لکھا ہے:

> افسانے (دیپک راگ) میں آٹھ الگ الگ حصے ہیں جن میں پہلا حصہ جو ہمہ گیر

ہے۔ دوسرے ساتوں حصوں کی خصوصیتوں کو اپنے اندر جذب کیے ہوئے ہے۔
دوسرے سات حصے پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ ہیں۔ یہ شکلیں بعض حیثیتوں میں ایک
دوسرے کی ضد ہیں اور بعض دوسری حیثیتوں میں ایک دوسرے سے مشابہ اور
متوازی۔ (معیار، صفحہ 180)

اس کے برعکس مجموعہ میگھ ملہار کے دیباچہ میں دیپک راگ کے سات حصہ شمار کرتی ہیں۔
'دیپک راگ' سہ بعدی اور تکنیکی اعتبار سے قوس قزحی افسانہ ہے۔ اس میں ایک ہی
تقسیم سے سات مختلف رنگ پھوٹے ہیں، جیسے ایک ہی رنگ کی یعنی سفید روشنی سے
سات مختلف رنگ پھوٹتے ہیں... دیپک راگ کے سات مختلف حصے آپس میں
ملاپ اور تضاد کی اسی کیفیت کے مظہر ہیں۔" (دیباچہ میگھ ملہار)

واقعہ یوں ہے کہ 'دیپک راگ' پہلی دفعہ 1949 میں رسالہ 'ساقی' کے افسانہ نمبر میں شائع ہوا تو اس کے سات ہی حصے تھے۔ آٹھواں حصہ کون سا تھا یہ معلوم نہیں ہو پایا ہے۔ اور نہ شیریں نے اس حصے کا نام کہیں ذکر کیا ہے۔ 'میگھ ملہار' کے مقدمہ میں بھی انھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، اور نہ ان کے کسی افسانے کی تقسیم یا موضوع اس سے میل کھاتا ہے، جس کی بنیاد پر کہا جا سکے کہ یہ آٹھواں حصہ ہو سکتا ہے۔ ساقی میں شائع دیپک راگ سے ان سات حصوں کا پتا چلتا ہے — (1) فوکس ٹروٹ، (2) کیاس نووا، (3) جوار بھاٹا، (4) نغمے کی موت، (5) وجدان کی پرواز — بیاتریچے، (6) اوتھیلو اور (7) آل سس ٹس۔ میگھ ملہار میں دیپک راگ کے ساتویں حصے 'آل سس ٹس' کو 'آندھی میں چراغ' کے عنوان سے ایک الگ افسانے کی صورت دے دی گئی ہے۔ اور یہی اس افسانے کی تکنیکی خامی ہے۔ اس کا ہر حصہ اپنے آپ میں ایک الگ افسانہ ہے جس کا اپنے گزشتہ اور آئندہ کے کسی حصے سے کوئی ربط ظاہری نہیں۔ یہ غزل کے شعر کی مانند ایک اکائی ہے۔ اس کا ہر حصہ اپنے آپ میں مکمل ہے اور ایک مکمل معنی کی ترسیل کر رہا ہے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ غزل میں یہ بے ترتیبی حسن قرار دی جاتی ہے اور افسانے میں ایک نقص ہے جو

افسانے کے وحدت تاثر کو منتشر کر دیتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ 1949 جولائی۔اگست میں رسالہ 'ساقی' میں 'دیپک راگ' کے شائع ہونے سے ایک سال قبل اس کا چھٹا حصہ 'اوتھیلو' رسالہ 'ماہ نو' جلد 1، شمارہ 3، جون 1948 میں 'ناؤ میں دو آبے تک' کے عنوان سے شائع ہو چکا تھا۔ اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ شیریں نے اسے اولاً الگ افسانے کی حیثیت سے رقم کیا تھا یا 'دیپک راگ' کے جزء کے طور پر اس کی تخلیق عمل میں آئی تھی۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ شیریں نے ابتدا میں اسے ایک الگ افسانے کے طور پر ہی رقم کیا ہوگا۔ بعد ازیں سہ بعدی تکنیک کی دھن میں اسے 'دیپک راگ' میں 'اوتھیلو' کے عنوان سے شامل کر لیا ہوگا۔ خیر قیاس کی دنیا بہت وسیع ہوتی ہے—یوں ہوتا تو کیا ہوتا—سے در کنار، 'اوتھیلو' کے علاوہ 'دیپک راگ' کا پانچواں حصہ 'وجدان کی پرواز—بیاترچے' بھی 'ادب لطیف' لاہور کے سالنامہ 1949ء کے شمارے میں 'بیاتراچے' کے عنوان سے شائع ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی اشاعت 'دیپک راگ' کی اشاعت کے بعد ہوئی تھی، اور ساتواں حصہ 'آل سس لس' کو 'آندھی میں چراغ' کا نام دے کر علیحدہ افسانے کی صورت میں میگھ ملہار (مجموعہ) میں شامل کیا گیا۔ شیریں کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ 'دیپک راگ' کو ایک Composite whole نہیں بنا سکی ہیں۔ بایں وجہ اس کے کئی ایک حصے کو انہوں نے خود ہی علیحدہ افسانہ کا روپ دے دیا تھا۔ نذیر احمد کو اسی لئے دھوکا ہوا ہے کہ دیپک راگ کے محض چھ حصہ ہیں، اور اس بنیاد پر انہوں نے مصنفہ کو لعن طعن بھی کر دیا کہ انہیں (شیریں) شوق تشبیہ میں اس بات کا بھی خیال نہیں رہا کہ دیپک راگ کے سات نہیں چھ حصہ ہیں۔ انوار احمد بھی اپنی کتاب 'تحقیق و تنقید' میں اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ شیریں نے چھ واضح حصوں کو سات کیسے لکھ دیا ہے۔ فی الواقع یہ قابل گرفت بات ہے کہ جب انہوں نے ساتویں حصے کو دیپک راگ سے جدا ایک مکمل افسانے کی صورت دے دی، تو مقدمہ میں اس کا ذکر کرنا لازمی تھا۔ میں نے کتاب ھذا میں میگھ ملہار مجموعہ کا اعتبار کرتے ہوئے دیپک راگ کے محض چھ حصے ہی درج کئے ہیں اور ساتویں کو آندھی میں

چراغ کے عنوان سے ہی علیحدہ افسانہ شمار کیا ہے۔

'میگھ ملہار' اور 'دیپک راگ' کے علاوہ 'کفارہ' اور 'آئینہ' شیریں کے اہم افسانے ہیں۔ آئینہ ان کے پہلے مجموعہ 'اپنی نگریا' میں شامل ہے جسے محمد حسن عسکری نے اس مجموعہ کا سب سے اچھا افسانہ قرار دیا ہے۔ شیریں اسے 'میگھ ملہار' اور 'دیپک راگ' سے زیادہ مکمل مانتی ہیں:

> ایک نقاد کی معروضیت سے جانچتے ہوئے میرے افسانوں میں 'آئینہ'، 'دیپک راگ' اور 'میگھ ملہار' سے کہیں زیادہ مکمل طویل مختصر افسانہ ہے۔ حالانکہ صفحات کے لحاظ سے ان کے مقابلے میں 'آئینہ' کی طوالت نصف سے بھی کم ہوگی۔... ('معیار'، صفحہ 84)

'آئینہ' موضوع و مواد کے اعتبار سے ایک مکمل کہانی ہے۔ فنی اور تکنیکی اعتبار سے بھی اس کی ساخت درست ہے۔ واحد متکلم کے صیغہ میں پروین کی زبانی کہانی کا آغاز و انجام ہوتا ہے۔ کہانی اپنے شروعاتی دور میں ہی ایک دلچسپ موڑ لیتی ہے۔ مرکزی کردار پروین کو گھر کی خادمہ یہ اطلاع دیتی ہے کہ نانی بی گزر گئی ہیں، اس خبریہ جملہ سے کہانی کا ایک نیا در کھلتا ہے۔ کہانی میں قاری کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے، اور نانی بی کو جاننے کی تجسس ہوتی ہے۔ یہ نانی بی کون ہیں؟ ان کا پروین سے کیا تعلق ہے؟ پروین ان کی موت کی خبر سن کر کیوں رنجیدہ ہو جاتی ہے؟ یہ تمام سوالات قاری کے ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں۔ ان کے جواب کی خاطر ہم راوی کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ راوی نانی بی کے ذریعہ قصہ کو بنتی چلی جاتی ہے۔ کہانی جو خود کلامی کی تکنیک میں شروع ہوتی ہے، اب بیانیہ (واضح ہو کہ میں نے یہاں بیانیہ کو تکنیک کی ایک قسم کے طور پر لیا ہے) کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یوں ہم نانی بی کی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ لیکن نانی بی کا کردار بھی بڑا عجیب ہے۔ یہ اپنی شناخت خود کرانا چاہتی ہے۔ اپنی کہانی لوگوں تک خود پہنچانا چاہتی ہے۔ اس لیے درمیان افسانہ میں بیانیہ کا سرا اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے۔ اور یہاں سے کہانی کی تکنیک میں ایک بار پھر تبدیلی آجاتی ہے۔ اب راوی واحد حاضر ہے۔ یعنی نانی بی اب افسانے کو آگے

لے جاتی ہیں اور اپنی درد بھری کہانی کے ذریعہ قاری سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ قاری کے جذبات و احساسات پر نانی بی اس قدر حاوی ہو جاتی ہیں کہ افسانے کی حقیقی راوی پروین منظر نامہ سے غائب ہونے لگتی ہے۔ لیکن مصنفہ اپنی فنکاری کا عمدہ ثبوت دیتے ہوئے کہانی کا سرا آخر میں پھر سے پروین کے ہاتھوں میں تھما دیتی ہیں۔ recycling کے اس عمل کے ذریعہ کہانی صیغہ واحد متکلم کے بیانیہ میں اختتام کو پہنچتی ہے۔ تکنیکی تنوع نے 'آئینہ' کو اہم بنا دیا ہے، لیکن کوئی بھی تخلیق محض اپنے تکنیکی تنوع یا اسلوب کی بنیاد پر لافانی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا موضوع و مواد بھی اہم نہ ہو۔ موضوع، اسلوب، خلوص نیت اور تخلیق کار کے خون جگر کی آمیزش سے ہی ایک لازوال فن پارہ خلق ہوتا ہے۔ 'آئینہ' شیریں کا ایک ایسا ہی لازوال افسانہ ہے، جس میں جذبے کی صداقت، خلوص نیت، موضوع کی اہمیت اور تکنیکی تنوع گھل مل گئے ہیں۔ 'آئینہ' کی وجودیاتی تشکیل میں یہ تمام عوامل یکساں کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔ پروین کو مرکز میں رکھ کر جو کہانی بنی گئی ہے اس میں نانی بی کے کردار کے ظاہری و داخلی خدوخال کو بڑے خوبصورت انداز میں واضح کیا گیا ہے۔ نانی بی جیسے کردار ہمارے روز مرّہ کے مشاہدہ میں ضرور آتے ہوں گے، لیکن ہم انہیں دیکھ کر یوں گزر جاتے ہیں، جیسے ان کا وجود ہمارے لئے ایک اضافی شئے ہو۔ یہ اضافی کردار جب اپنی بپتا سناتا ہے، تو ہمیں بے اختیار اس کردار سے محبت سی ہو جاتی ہے۔ وہ محبت جو انسانیت کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ نانی بی کی کہانی اس لیے بھی اتنی پر تاثیر ہے کہ کہانی کار نے اسے خود ان ہی کی زبانی بیان کروائی ہے اور جیسا کہ شیریں نے تکنیک کے ضمن میں لکھا ہے کہ صیغہ واحد متکلم میں جذباتیت زیادہ ہوتی ہے۔ یوں بھی اندرونی کیفیت اور احساسات و جذبات کی عقدہ کشائی آپ اپنی زبان ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ پروین نے کہانی کی ابتدا میں نانی بی کے ظاہری خدوخال بیان کر کے ان کے کردار کی باطنی عقدہ کشائی کی راہ آسان کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے افسانے کی تاثیر میں اضافہ ہوا ہے۔

نانی بی کی سادگی، سچائی اور خالص محبت پروین جیسی بچی ہی سمجھ سکتی تھی۔ دنیا کی

آلائشوں سے پاک، جھوٹ، مکر اور فریب سے دور۔ دل سے دل کو راحت ہے۔ پروین اور نانی بی کی اس دلی وابستگی کی وجہ سے نانی بی پروین کو اپنی کہانی سنا کر راحت محسوس کرتی ہے اور پروین ان کی موت پر اپنی خوشی قربان کر کے۔ پروین انسانیت کی علمبردار ہے۔ وہ انسانیت کو کسی مخصوص زاویہ سے یا محدود دائرہ میں نہیں دیکھتی ہے۔ شاید اسی لیے اپنی ماں کی طرح وہ نانی بی سے متنفر نہیں ہوتی۔ برعکس اس کے انسانی ہمدردی انہیں ایک دوسرے سے اور بھی قریب کر دیتی ہے۔ اسی لیے افسانہ اس جملہ پر مکمل ہو جاتا ہے — ''امی! تم اب بھی نانی بی کو نہ سمجھ سکیں۔'' — نانی بی ایک خاموش احتجاج ہے۔ استعارہ ہے، ایسے لوگوں کا جو نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ جنھیں عام طور پر ہم جذبات واحساسات سے عاری سمجھتے ہیں۔ دکھ، درد خود آگہی کا منبع ہیں۔ آئینہ کی راوی پروین جب درد سے آشنا ہوتی ہے تو اس کی خود پسندی ذات سے آفاقیت کا سفر طے کرتی ہے۔ یوں بظاہر اکہرا دکھنے والے اس افسانہ میں تہہ داری پیدا ہو جاتی ہے، جس سے افسانہ کی معنویت میں اضافہ ہوتا ہے۔

آئینہ میں شیریں جہاں پروین کے کردار کے نفسیاتی ردعمل کو پیش کرتی ہیں، وہیں انگڑائی میں بھی وہ گلنار کے کردار کی نفسیاتی تبدیلیوں کو مدعا بناتی ہیں۔ انگڑائی شیریں کا مقبول عام افسانہ ہے، جس نے ادبی دنیا میں ان کی شناخت قائم کی ہے۔ عنفوان شباب میں حیاتیاتی تبدیلی کا نفسیاتی عمل لڑکا اور لڑکی دونوں میں یکساں طور پر ہوتا ہے۔ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ عنفوان شباب (adolescence) اور بلوغیت (puberty) کے تغیراتی عہد میں لڑکا اور لڑکی دونوں کا اپنے ہم جنس کی طرف مائل ہونا ایک متوازن (normal) رویہ ہے۔ شیریں نے انگڑائی میں حیاتیاتی / نفسیاتی تبدیلیوں کے تحت اسی عنفوان شباب کی متبدل نفسیاتی کیفیت کو گلنار کے کردار کی صورت میں بیانیہ کا روپ دیا ہے۔ انگڑائی کے متعلق عموماً ہم جنس پرستی (lesbianism) کے حوالے سے باتیں ہوتی آئی ہیں۔ حالانکہ حیاتیاتی / نفسیاتی تبدیلیوں (biological, psychological changes) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گلنار کی نفسیاتی کیفیت یا اس کا اپنی ٹیچر مس

فانس کی جانب راغب ہونا اسے ہم جنس پرستی کی طرف مائل نہیں کرتا، بلکہ یہ ایک متوازن رویہ ہے جو اس عمر کی لڑکیوں یا لڑکوں میں عموماً پایا جاتا ہے۔ گلنار اکیلی لڑکی نہیں ہے جو مس فانس سے پیار کرتی ہے بلکہ اس کی دیگر ہم جماعت لکشمی، زینت، نلینی اور موٹی لڑکی بھی مس فانس کی جانب ملتفت ہیں اور انہیں راغب کرنے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کرتی ہیں۔ یہ التفات حیاتیاتی / نفسیاتی تبدیلیوں کی ایک منزل ہے۔ جسے ہم جنس پرستی (lesbianism/gayism) قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ اسے same sex attraction or natural affection کہا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ارتقائی جذبہ یا کیفیت ہے جو ہارمونل (hormonal) تبدیلی کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ گلنار ایک ایسا ہی کردار ہے جو عنفوان شباب میں اس جذبہ کے تحت اپنی استانی کی طرف راغب ہو جاتی ہے، لیکن جوں ہی وہ اس دور سے گذر جاتی ہے اس کے جذبات hetrosexual ہو جاتے ہیں۔ حیاتیاتی تبدیلی کے زیر اثر وہ ایک نئے مرحلے میں داخل ہوتی ہے۔ جہاں وہ اپنے ہونے والے شوہر (جنس مخالف) پرویز سے محبت کرنے لگتی ہے۔ اپنی داخلی تبدیلیوں کی تفہیم اس کے لئے رفتہ رفتہ ممکن ہو پاتی ہے اور پھر اسے اپنی گذشتہ حرکتیں عجیب وغریب معلوم ہونے لگتی ہیں۔ افسانہ کے یہ اقتباس اس بات کا اشاریہ ہیں:

> میرے یوں شرما جانے سے وہ کیا سمجھی ہوں گی؟ یہی نا کہ میرے جذبات ان کی طرف اب بھی ایسے ہی ہیں۔ ہونہہ! انہیں کیا معلوم کہ میں اب... مگر انہیں یہ غلط فہمی ضرور ہوگی۔ میں پہلے تو ان کے سامنے یونہی شرمایا کرتی تھی... عجیب لڑکی تھی کچھ سال پہلے!۔
>
> کبھی میں یہ سوچا کرتی تھی کہ میری شادی ہو جائے تو میں اپنے شوہر سے محبت بھی کرسکوں گی۔ ایک دفعہ زرینہ نے جو پامسٹری جانتی تھی میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا۔ ''تمہارے شوہر کو تم سے بیحد محبت ہوگی۔'' تو مجھے اپنے اس ہونے والے شوہر پر کتنا رحم آیا تھا کہ میں اس کی محبت کا جواب نہ دے سکوں گی اور اب؟... اب تو میں اپنے

پرویز کو دیوانہ وار چاہوں گی۔

گلنار کے کردار کی حیاتیاتی تبدیلی کی تفہیم میں ابو بکر عباد سے کئی جگہ چوک ہوئی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے: ''اپنے منگیتر پرویز کی محبت پانے کے بعد وہ مس فانس کو بھول چکی تھی۔'' (ص: ۶۰) حالانکہ متن سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ گلنار نے صرف اس کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ ابھی وہ اس کی محبت سے نا آشنا ہے۔ یہ محبت گلنار کی ہے۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''کیوں کہ وہ مس فانس کو اپنی گذشتہ زندگی کی بربادی کا ذمہ دار سمجھتی ہے۔'' (ص: ۶۰) جبکہ گلنار کے افکار، اس کے مکالمہ یا بین المتون سے اس بات کے کوئی شواہد نہیں ملتے ہیں کہ گلنار اپنی گذشتہ زندگی پر پشیماں ہے یا اسے اپنی بربادی تصور کرتی ہے۔ تیسری جگہ لکھتے ہیں: ''یہ عشق اس حد تک بڑھا کہ اسے اس لیڈی ٹیچر کی قربت میں جنسی اور ذہنی تسکین کا احساس ہونے لگا۔'' (ص: ۶۰)

اک بات کا رونا ہو رو کر کے صبر آئے
ہر بات پہ رونے کو کہاں سے جگر آئے

یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ پوری فضا ابو بکر صاحب نے ہم جنس پرستی کے اثبات کے لئے تیار کی ہے۔ جس کا نتیجہ وہ یہ نکالتے ہیں:

> افسانے کے مرکزی کردار گلنار کا تعلق متوسط طبقے کے ایک ایسے مسلم گھرانے سے ہے جہاں پردے کا سخت ماحول اور بزرگوں کے بے جا آداب ملحوظ رکھنے کی وجہ سے بچے ایک طرح کے نفسیاتی دباؤ کے تحت پرورش پاتے ہیں۔ یہ نفسیاتی دباؤ ان میں بے باکی اور جذبات واحساسات کے برملا اظہار کی جرأت کے فقدان کا باعث بنتا ہے اور انہیں احساس کمتری اور جنسی گھٹن میں مبتلا کرنے کا سبب بھی بنتا ہے، یہی وجہ ہے کہ گلنار جنس مخالف کی طرف مائل ہونے کے بجائے اپنی ہم جنس ٹیچر مس فانس کے عشق میں مبتلا ہو کر انہیں دیوانگی کی حد تک چاہنے لگتی ہے۔''

(منقولہ نوری نہ ناری ص: ۶۷۔۶۸)

گلنار کے کردار میں ہم جنسیت کی طرف مائل ہونے کی یہ توجیہ دور کی کوڑی لانے کے مثل ہے۔ اس میں کوئی تامل نہیں کہ گلنار ایک متوسط مسلم گھرانے کی لڑکی ہے اور اس بات سے بھی انکار نہیں کہ عموماً لڑکیوں میں ہم جنس پرستی کا ایک سبب سماجی پابندیاں یا social norms ہوتے ہیں۔ لیکن گلنار کے کردار میں ان پابندیوں کا کوئی دخل افسانہ نگار نے نہیں دکھایا ہے۔ پردہ کا سخت ماحول، بزرگوں کے بے جا آداب کا لحاظ یہ ابو بکر صاحب کا متوسط طبقہ سے متعلق اپنا خیال ہے۔ بین السطور سے اگر یہ باتیں اخذ کی جا سکتی ہیں تو اس کے برعکس یہ بھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ گلنار کے یہاں پردے کا کوئی خاص اہتمام نہیں تھا، بزرگوں کی تعظیم یا بے جا آداب کا معاملہ نہیں تھا۔ نفسیاتی دباؤ، احساس کمتری اور جنسی گھٹن جیسی باتوں کا تو کوئی شائبہ بھی نہیں تھا۔ ابو بکر نے متوسط طبقہ سے متعلق ایک stereotype یا general statement کے تحت گلنار کے کردار کی جذباتی اور نفسیاتی تبدیلیوں کی توجیہ کر لی ہے۔ جبکہ متن میں اسکے برعکس شواہد موجود ہیں — گلنار کا ابا سے ضد کر کے گھر سے دور کالج میں داخلہ لینا، ہاسٹل میں رہنا، پڑھائی، لکھائی میں اوّل آنا، اساتذہ کی منظور نظر ہونا، پڑھائی کے ساتھ ہی اسٹیج پرفورمینس میں حصہ لینا اور سب کی واہ وائی حاصل کرنا، اس کی چھوٹی بہن زبیدہ کا مس فنانس کو لے کر اپنی بڑی بہن سے برملا مذاق کرنا اور بالآخر گلنار کے رویہ کے متعلق اس کی امّی کا یہ جملہ: ''گلنار آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ مس فنانس کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ تمہیں کچھ پاس ہے بڑوں کا۔ اور وہ تو تمہاری استانی ہیں۔ امّی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔'' ان تمام باتوں سے یہ قطعی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے کہ گلنار نفسیاتی دباؤ کا شکار تھی، احساس کمتری اور جنسی گھٹن میں مبتلا تھی اور اپنی ماں کی نصیحتوں پر اس کا یہ ردّ عمل ''امّی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں'' بزرگوں کے بے جا آداب ملحوظ رکھنے کی نشانی نہیں۔ میری ناقص تفہیم ابو بکر عباد کی مکمل تفہیم کا ساتھ نہیں دے پا رہی ہے۔ اس لئے میں گلنار کی جذباتی اور نفسیاتی تبدیلیوں کو حیاتیاتی تبدیلی کی زد میں رکھتا ہوں اور اسے ہم جنس پرستی پر لکھے گئے افسانے کے بجائے ایک بہترین

نفسیاتی/حیاتیاتی تبدیلیوں کا افسانہ مانتا ہوں، جو نفسیات کی باریکیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سیدھے سادے اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ گلنار کے بجائے مس فانس کے کردار کو مرکز میں رکھ کر اگر انگڑائی کی تفہیم کریں تو اسے ضرور ہم جنس پرستی پر لکھا ہوا افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسی صورت میں افسانہ اپنے مرکز سے ہٹ جائے گا۔ مس فانس کو مرکز میں لانے کا مطلب ہے افسانہ کی نئی بنت جو کسی صورت ممکن نہیں۔ گلنار کے کردار کی فطری نشوونما پر کھڑی کی گئی یہ عمارت اردو افسانہ میں خاصی اہم ہے:

> جدید اردو ادب میں بہت کم افسانے ایسے ملیں گے جو کردار کی ایسی فطری نشوونما اور حیاتیاتی تبدیلی دکھاتے ہوں۔ (حسن عسکری، دیباچہ اپنی نگریا)

سیدھے سادے اسلوب میں کہانی بیان کرنے والی شیریں آزاد نگارستان، بھارت ناٹیہ اور کفارہ میں رمزیہ و علامتی پیرایہ اختیار کر لیتی ہیں۔ آزاد نگارستان طنزیہ انداز میں رقم کیا گیا افسانہ ہے۔ یہ شیریں کا واحد افسانہ ہے جس میں انہوں نے طنزیہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ عموماً طنز شیریں کے اسلوب کا حصہ نہیں ہے۔ مجموعہ میگھ ملہار میں انہوں نے اپنے خاص ژون سے نکلنے کی کوشش کی تھی۔ اس لئے اس مجموعہ میں ہمیں کئی تجربے ملتے ہیں۔ آزاد نگارستان بھی ان کے اسلوب کی ایک نئی جہت متعین کرتا ہے۔ نام نہاد ترقی پسند تحریک سے شیریں نالاں رہتی تھیں۔ ترقی پسندوں کی مارکسیت اور نری ترقی پسندی کو وہ ادب کے حق میں سم قاتل قرار دیتی ہیں۔ ان کے ادیبوں پر لگائے جانے والے پہرے، ان کی ذہنی آزادی کو سلب کرنے کے مختلف طریقوں کا وہ سد باب کرتی ہیں۔ افسانہ آزاد نگارستان ان کا ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں وہ ترقی پسندوں کو طنز کے نشتر چبھوتی ہیں۔ افسانہ میں ایک ادبی پارلیمان کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ جہاں ادب اور سیاست کے حوالے سے بحث و مباحثہ ہوتا ہے، ادیبوں کو ہدایتیں دی جاتی ہیں اور ساتھ ہی تنبیہ بھی کی جاتی ہے کہ نیا ادب کس زاویہ کا اور کن موضوعات پر ہونا چاہئے۔ سیاسی پالیسی کی طرح ادبی پالیسی کا تعین افسانہ میں موضوع بحث ہے۔ یہ ایک سیدھا سادہ طنزیہ افسانہ ہے جو بیانیہ میں

ڈھل گیا ہے۔

آزاد نگارستان جہاں ایک بھرپور طنزیہ ہے وہیں بھارت ناٹیہ ایک تمثیلی بیانیہ ہے۔ تقسیم ہند، پاکستان کا وجود اور مملکت اسلامیہ کی حمایت اس افسانہ کا موضوع ہے۔ یہ پہلا افسانہ ہے جس میں تقسیم کو مثبت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ شیریں کا ماننا تھا کہ ہندو مسلم دو جدا قومیں ہیں، ان کی تہذیب و ثقافت بھی علیحدہ ہے۔ بایں وجہ انہیں الگ الگ ہی رہنا چاہئے تاکہ دونوں آزادانہ طور پر امن و سکون سے پھلتے پھولتے رہیں اور ان کے درمیان دوستانہ مراسم قائم رہ سکیں۔ افسانہ میں مسلمان اور انگریزوں کی آمد اور سرزمین ہند کے تئیں ان کے سلوک اور رویہ کو پیش کیا گیا ہے۔ پہلا اجنبی (مسلمان) کیسے اس ملک میں رچ بس گیا۔ آپسی لین دین کے ذریعہ اس نے یہاں کی تہذیب اور زبان کو کس طرح متاثر کیا اور اس کے ملاپ سے کیسے راج کماری بھارتی (ہندوستان) کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے اجنبی (انگریزوں) نے اپنے مکر اور فریب کے ذریعہ اس ملک کی خوبصورتی کو گہنا دیا۔ اس کی دولت کو لوٹ لیا، ماتھے کا وہ جھومر جسے پہلے اجنبی نے بڑے پیار سے سجایا تھا، اس کے قیمتی نگینے کو بھی اس نے اڑا لیا۔ نوآبادیاتی تسلط نے سونے کی اس چڑیا کو پوری طرح تہی دست کر دیا۔ اس کی ملواں تہذیب و ثقافت کو جسے پہلے پردیسی اور بھارتی نے اپنے پیار سے جنم دیا تھا، اسے مسخ کر کے اپنی بالکل نامانوس تہذیب و ثقافت کو اس پر مسلط کر دیا۔ بھارتی کو اس دوسرے اجنبی کا ساتھ برداشت نہیں۔ وہ احتجاج درج کراتی ہے، مسلسل احتجاج۔ مسلسل احتجاج کی صورت میں بالآخر اس دوسرے اجنبی کو اسے چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔ لیکن جاتے جاتے اس نے نفرت کا وہ بیج بھارتی کے بطن میں ڈال دیا، جس کے نتیجہ میں دو جڑواں بچے (ہندوستان اور پاکستان) جنم لیتے ہیں۔ یوں بھارتی کی وہ شخصیت جس میں پہلے اجنبی کی شخصیت گھل مل گئی تھی دو حصوں میں بٹ جاتی ہے:

> اس کی روح ان دونوں میں تھی صرف اس کی شخصیت بٹ گئی تھی اور پردیسی کی وہ
> شخصیت جو اس میں حلول کر گئی تھی اب الگ ہو کر مجسم ہو گئی تھی اور بڑے ہو کر ان کی

الگ الگ شخصیتیں، الگ الگ صلاحیتیں آزادی سے ابھریں گی...

مصنفہ کی یہ امید تقسیم کی حمایت میں تھی۔ وہ تقسیم کو ایک مثبت انداز میں پیش کرتی ہیں۔ گو کہ وہ اس خون خرابہ کو درست نہیں مانتیں، لیکن ہندو، مسلم کی بہتری اور سالمیت کے لئے وہ تقسیم کی حامی ہیں، اور تقسیم سے زیادہ مملکت اسلامیہ کے لئے مطمئن و پر امید ہیں۔ اس نظریاتی بحث سے پرے بھارت ناٹیہ پہلی بار ماہ نو کراچی 1948 (اگست، ستمبر) میں 'آزادی کی صبح' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس عنوان کے تحت افسانے کے آخری اقتباس میں مصنفہ نے اس کے عنوان کا جواز پیش کیا ہے، جبکہ 1962 میں میگھ ملہار میں جب یہ افسانہ شامل کیا گیا تو اس کے آخری اقتباس کو حذف کر دیا گیا، درمیان میں کچھ جملے کی ساخت میں تبدیلی لائی گئی، ایک اقتباس کا اضافہ کیا گیا اور ایک نیا عنوان 'بھارت ناٹیہ' دیا گیا۔ میں نے اس کتاب میں مجموعہ میں شامل متن کا اعتبار کیا ہے۔ اور آزادی کی صبح کا آخری اقتباس حاشیہ میں درج کر دیا ہے۔ اور عنوان میں دونوں نام شامل کر دیے ہیں۔

'کفارہ' شیریں کا آخری افسانہ ہے۔ اس کے بعد خاموشیوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے۔ سکوت اندر سکوت۔ کفارہ بنیادی طور پر انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ اس کی اشاعت سے متعلق آصف فرخی نے منٹو نوری نہ ناری کے دیباچہ میں رقم کیا ہے کہ یہ افسانہ 1962 میں لکھا گیا ہے۔ جبکہ محمود ایاز (ایڈیٹر سوغات) کے نام ایک خط میں شیریں اس افسانہ کا ذکر کرتی ہیں جسے ایاز صاحب نے حاشیہ کے ذریعہ واضح کیا ہے کہ یہ افسانہ کفارہ ہے، جسے مرحومہ کی خواہش پر انہوں نے ہی انگریزی سے ترجمہ کیا تھا اور اسے پہلی بار سوغات کے شمارہ 3، ماہ دسمبر 1961 میں شائع کیا گیا تھا۔ 'کفارہ' صرف جسمانی ہی نہیں روحانی تجربہ بھی ہے۔ شیریں کو یہ افسانہ رقم کرنا تھا، شاید اسی لیے خدا تعالیٰ نے انھیں اس شدید آزمائش سے گزارا اور وہ قبل از مرگ موت کے تجربہ سے دوچار ہوئیں، تاکہ اس تجربہ کے ساتھ وہ اپنا تخلیقی سفر مکمل کر سکیں۔ شیریں نے اپنے تجربے اور محدود مشاہدے کی بنیاد پر جو کچھ لکھا پوری حساسیت کے ساتھ لکھا ہے۔ ان کی تخلیقی زندگی کا اختتام 'کفارہ' سے اچھا ممکن

بھی نہیں تھا۔ شاید اسی احساس نے پھر انھیں قلم اٹھانے سے باز رکھا۔ 'کفارہ' روح کی اوڈیسی اور موت کا تجربہ ہے۔

میں نے اپنی زندگی خدا کے ہاتھوں میں دے دی۔ ریڑھ کی ہڈی کے دہانے پر اعصابی مرکز میں اترتی ہوئی سوئی کے ساتھ موت مجھ میں داخل ہوئی اور یکے بعد دیگرے میرے سارے عضلات، میرا پورا بدن بے حس، سرد اور بے جان ہوتا گیا۔
میں نے ساکت اور بے جان پیکر کو میز پر سفید چادروں میں لپٹا ہوا چھوڑ دیا۔ میں نے اپنے آپ کو آزاد محسوس کیا۔ ایک دم آزاد اور بے قید، جیسے میں اپنے جسم کے زنداں سے رہا ہو کر ایک بے حد و بے کراں وسعت میں داخل ہو گئی تھی۔
روح اپنی لاحاصل تلاش کے سفر سے لوٹ کر دوبارہ اپنے زنداں میں داخل ہو گئی، جو میرا جسم تھا۔

'کفارہ' کا موضوع ایک طرف جہاں روح کی اوڈیسی کو قرار دیا جا سکتا ہے وہیں موت کے تجربہ اور طمانیت کی تلاش بھی کہا جا سکتا ہے۔ موت جو زندگی کے تعاقب میں ہے اور زندگی جسے موت کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ کفارہ ایک اساطیری اور علامتی افسانہ ہے جس کا کوئی ایک موضوع متعین کرنا انتہائی مشکل ہے۔ قاری اپنی ذہنی ساخت اور صلاحیت کے مطابق موضوع متعین کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ایک ہاتھی ہے جس کی حقیقت کے مختلف زاویہ ہیں۔ یہ مونالزا کی تصویر ہے جس کی مسکراہٹ کے مختلف ڈائمنشن ہیں۔

زندگی روح سے عبارت ہے اور موت روح سے علیحدگی کا نتیجہ۔ 'کفارہ' میں زندگی اور موت کی کشمکش نے روح سے رشتہ استوار کیا ہے۔ موت یہاں مرکز میں ہے اور روح اپنے حصار سے نکلنا چاہتی ہے۔ روح کی یہ اوڈیسی، موت کا علامیہ ہے۔ کفارہ ایک مکمل بیانیہ ہے۔ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو زندگی اور موت کی جنگ میں جیت کر بھی ہار جاتی ہے۔ زچگی کے عالم میں ایک عورت جس قیامت سے گزرتی ہے اس کا حاصل موت قرار پاتا ہے۔ وہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود موت کو جنم دیتی ہے۔ موت کا یہ سایہ اس

کے پورے وجود پر حاوی ہو جاتا ہے۔ موت اس کی تمام کوششوں کا حاصل ہے۔ زندگی نے بظاہر موت پر فتح پالی لیکن موت نے بالحقیقت زندگی کو ڈس لیا اور پھر زندگی موت کی طرح سخت اور تلخ اذیت بن گئی۔ کفارہ میں موت اس سخت و تلخ تجربہ کی بنیاد بنتی ہے۔ اس بنیاد پر جو عمارت کھڑی ہوتی ہے وہ طمانیت اور سکون کی تلاش ہے۔ 'کفارہ' کا موضوع طمانیت اور سکون کی تلاش بھی ہے۔ افراتفری اور خون خرابے کے ماحول میں جہاں چہار جانب موت کا سایہ منڈلا رہا ہے۔ زمین میں خون مسلسل بہہ رہا ہے۔ انسانیت دم توڑ رہی ہے، اس کی کوکھ بانجھ ہو چکی ہے اور زندگی کی امید ماند پڑ چکی ہے۔ ایسے میں طمانیت محض عارضی ہے۔ شاید اسی لیے مصنفہ کو اطمینان تو حاصل ہوتا ہے لیکن جز وقتی اور پھر وہی بے اطمینانی، بے کلی مقدر ٹھہرتی ہے، جو عالم انسانی کا خاصہ ہے۔ ''سروم دکھم دکھم''—

مجھے شہادت کی آرزو نہیں، مجھے آخری دید کی تمنا نہیں، مجھے صرف نفس مطمئنہ بخش دے۔

اس طمانیت اور نفس مطمئنہ کی تلاش میں مصنفہ مختلف تہذیب اور مذاہب کی خاک چھانتی ہیں اور بالآخر اسلام کی آغوش میں پناہ پاتی ہیں۔ شیریں بنیادی طور پر ادب برائے تعمیر کی قائل تھیں۔ حسن عسکری کے ساتھ اسلامی ادب کے نظریہ کی حمایت کرتی تھیں۔ بنا بریں نفس مطمئنہ کی تلاش میں وہ اسلام کی آغوش میں پناہ لیتی ہیں اور اپنے اسلامی نظریے کی حمایت کرتی ہیں:

سفید بیضوی گنبد، مرمر کے ستون، پھیلی ہوئی محرابیں اور شفاف فانوس، یہ یقیناً بادشاہی مسجد تھی، ان جانی، اجنبی راہوں پر بھٹک کر، میں گھر لوٹ آئی تھی۔ مرکزی قبے کے نیچے میں سجدے میں گر گئی اور خشوع و خضوع سے نماز پڑھنے لگی۔ میرا سارا وجود ایک عجیب اور انوکھی مسرت سے لبریز تھا۔ بالآخر مجھے سکون مل ہی گیا۔

'کفارہ' تکنیکی اعتبار سے بھی ایک اہم افسانہ ہے۔ شیریں نے اس افسانہ میں ماضی و حال کی بندشوں کو ختم کر دیا ہے۔ ''تمام وقت ازلی اور ابدی حال ہے۔'' یہی کفارہ کی

تکنیک کا حاصل ہے۔ تکنیک کا یہ استعمال شیریں کا ہی خاصہ تھا جہاں شعور، لاشعور اور اجتماعی لاشعور، حال کے نقطے پر سمٹ آئے ہیں۔ مکاں سے لامکاں کا سفر گھنٹوں میں طے کرنا اور ابدیت کو حال میں سمونا شعور کی رو کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ شیریں نے 'کفارہ' کی شروعات بھلے ہی عام بیانیہ میں کی ہو لیکن درمیان میں راوی کا لاشعوری سفر تاریخی، اساطیری اور دیومالائی تانے بانے میں پھیلا کر شعور کی رو کی تکنیک کے ذریعہ تہہ دار بنا دیا گیا ہے۔ شعور اور لاشعور کی اس خلیج کو مصنفہ تکنیکی خوبی سے پاٹتی ہیں۔ تکنیک کے حوالے سے شیریں کا مطالعہ خاصہ وسیع تھا۔ مغربی ادب کے مطالعہ نے انھیں تکنیکی وسعتوں سے متعارف کرایا تھا۔ چنانچہ اردو ادب میں بھی انھوں نے تکنیکی تنوع پیدا کرنے کی خوب سے خوب کوشش کی ہے۔ میگھ ملہار، بھارت ناٹیہ، آئینہ اور کفارہ ان کے تکنیکی تنوع کی بہترین مثال ہیں۔

> کفارہ اپنی معنویت، فنی تکمیل، گہرائی اور تاثر کے اعتبار سے جدید اردو افسانے میں ایک سنگ میل ہے۔ (بقول محمود ایاز، سوغات شمارہ 12,13,14,1963)

اس میں کوئی کلام نہیں کہ افسانوی دنیا میں عموماً شیریں کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ ان کی انانیت، شہرت کی خواہش اور خودستائی کی وجہ سے ناقدوں نے انہیں خاطر میں نہیں لایا— ساون سے بھادو دُبلا تھوڑے ہے— یہ مثل یوں ہی وجود میں نہیں آئی۔ جہاں ایک طرف شیریں کی نرگسیت آڑے آئی وہیں ناقدوں کی ادبی غیرت اور حمیت نے انہیں للکار ادے دیا بایں ہمہ انہیں افسانوی روایت سے خارج از بحث قرار دے دیا گیا۔ پھر ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے کلامیہ نے ادب پر غلبہ حاصل کر لیا، اور شیریں اس دھند میں کہیں کھو سی گئیں۔ اس دورانیہ میں شیریں کے افسانوں پر کی جانے والی تنقید کا ایک نمونہ شہزاد منظر کا یہ اقتباس ہے:

> جو ادب پارہ وقت کی چھلنی میں چھننے کے بعد بھی زندہ تابندہ رہتا ہے وہی صحیح معنوں میں شاہکار اور کلاسیک کہلاتا ہے... اس پس منظر میں اگر ہم ممتاز شیریں کے

افسانوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے... آج جب ہم ۲۹ سال کے تناظر میں ان کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہیں، تو ہمیں بہت کم ایسے افسانے نظر آتے ہیں جو آج بھی اچھے اور معیاری کہے جا سکتے ہوں۔

(جدید اردو افسانہ ۲۳۴۔۲۳۵)

شہزاد منظر کے اس تنقیدی بیان کی روشنی میں کئی سوالات قائم ہوتے ہیں— کیا یہ ضروری ہے کہ کوئی فن پارہ شاہکار یا کلاسیک کا درجہ حاصل کرنے لائق ہو تبھی اسے ادب میں اعتبار حاصل ہو؟ کیا میر غالب، اقبال کے دور کا ہر شاعر شاہکار یا کلاسک کا درجہ رکھتا ہے؟ کیا ہمیں اس پورے دور کو محض ان ہی تینوں پر ختم کر دینا چاہیے؟ کیا افسانے میں پریم چند، کرشن چندر، بیدی، منٹو اور عصمت جیسا شاہکار پھر کوئی پیدا ہوا ہے یا ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو کیا اس کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ کسی فنکار میں شاہکار یا کلاسک بننے کی صلاحیت نہیں ہے تو وہ افسانے لکھنا چھوڑ دے کیوں کہ اس کا لکھا ادب میں عبث محض قرار پائے گا۔ ہماری ادبی تنقید میں اگر خالصیت کا یہی پیمانہ کام کرتا رہا تو ہمارا ادب سنسکرت زبان کے مثل محدود ترین ہو کر رہ جائے گا۔ حالانکہ ادب کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہونا چاہئے۔ پاپولر لٹریچر، جاسوسی ادب، گیت، دوہے، ٹھمری وغیرہ کو ہماری خالصیت پسند طبیعت نے پہلے ہی راندۂ درگاہ قرار دے دیا ہے۔ اب کلاسیک اور شاہکار کی اس بحث سے ہم اپنے ادب کے ایک بڑے ذخیرہ سے تہی دست ہو جائیں گے۔ بنابریں ہمیں اپنے تنقیدی رویے میں نرمی کی ضرورت ہے تا کہ ایک عہد کے ادب میں شاہکار اور کلاسیک کے علاوہ بھی ادب پارے بار پا سکیں۔

آج کے ادبی منظر نامہ میں جہاں فکری آزادی کے ساتھ بیان کی بھی آزادی ہے۔ ایسے میں ہمیں تعصب اور ذات پروری سے اوپر اٹھ کر ان لوگوں کی بازیافت کرنی چاہیے جو ماضی کے دھندلکوں میں کہیں گم سے ہو گئے ہیں۔ ان کے فن کی جانچ، پرکھ کر کے ادب میں انہیں re-establish کرنا چاہئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیریں نے اردو

افسانے میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ تکنیکی اعتبار سے بھی اور موضوعاتی اعتبار سے بھی۔ انہوں نے افسانوی ادب میں نفسیاتی گرہ کشائی سے کام لیا ہے۔ اساطیر اور دیومالا کو بھی شامل کیا ہے، انسانی ہمدردی سے بھی افسانے خلق کیے ہیں، جذبے کی خالصیت اور Intensity of Feeling پر خصوصی توجہ دلائی ہے اور سہ بعدی تکنیک کو وسیع پیمانہ پر اردوادب میں متعارف کرایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی تخلیقات میں کئی ایک خامیاں پائی جاتی ہیں لیکن اپنی تمام کمی کوتاہیوں کے باوجود شیریں کے افسانے اس لائق ضرور ہیں کہ ان پر بات کی جائے اور انہیں ادبی ڈسکورس کا حصہ بنایا جائے۔ آصف فرخی کا یہ جملہ شیریں کی افسانہ نگاری کے مناسب حال ہے:

> ممتاز شیریں کو اردو افسانے کی روایت سے بارہ پتھر باہر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس روایت کی نکتہ داں بھی ہیں اور اس روایت میں ایک خود آ گہی کی نکتہ پرور بھی۔

(حکایت شیریں، مشمولہ سوغات، شمارہ3، 1992)

جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا کہ شیریں کی ادبی شخصیت کئی جہتوں کی حامل ہے۔ افسانہ نگاری اور تنقید نگاری کے علاوہ ترجمہ نگاری میں بھی انہیں کافی درک حاصل تھا۔ مترجم کی حیثیت سے انہوں نے جان سٹین بک کے ناول 'The Pearl' کا ترجمہ 'درشہوار' (1957) کے نام سے کیا ہے۔ علاوہ ازیں انگریزی، روسی، نارویجین اور کنٹر زبانوں کے مختلف افسانوں کو بھی اردو میں منتقل کیا ہے۔ ان ترجموں پر بسا اوقات تخلیق کا گمان گذرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ افسانہ گھر تک رسالہ 'ماہ نو' کے چالیس سالہ مخزن کی دوسری جلد میں شیریں کے افسانے کے طور پر شامل کیا گیا، حالانکہ فی الاصل یہ کنٹر زبان کا افسانہ ہے جسے انہوں نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ترجمہ نگاری ایک جدا فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس کی اپنی باریکیاں اور قواعد ہیں۔ آج کے اس گلوبل عہد میں ترجمہ نگاری ایک انڈسٹری کی حیثیت سے فروغ پا رہا ہے۔ فی الحال اس کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے ہم اتنا جان لیں کہ ترجمہ نگاری کی جہاں متعدد قسمیں بتائی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے:

لفظی ترجمہ، معنوی ترجمہ اور تخلیقی ترجمہ۔ کسی تخلیقی فن پارے کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا۔ اس طور پر کے اس کے تمام اظہاریہ (expression) کی ادائیگی ہو جائے، انتہائی مشکل امر ہے۔ بایں ہمہ تخلیقی فن پارے کا تخلیقی ترجمہ ہی زیادہ مناسب حال معلوم ہوتا ہے۔ زبانوں کا اپنا مزاج اور اپنی تہذیب ہوتی ہے۔ مترجم پر لازم ہے کہ وہ ترجمہ کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھے کہ زبان کا مزاج مجروح نہ ہو اور بات ایک تہذیب سے دوسری تہذیب میں با آسانی منتقل ہو جائے۔ شیریں نے ترجمہ کرتے ہوئے حتی الوسع اس بات کا خیال رکھا ہے۔ ان کے مترجم افسانے زندگی کا رس (کنوٹ ہامزون)، ایک پرانی کہانی (ماستی وِنکٹیش آئینگار)، نیا جنم (پورلے گرکویست)، میاں بیوی (لوئی گیلو) اور گھر تک (نا معلوم) اردو زبان کے مزاج اور اس کے اپنے رنگ میں ڈھالے ہوئے ہیں۔ ان میں کہیں بھی مغائرت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ افسانہ 'گھر تک' اور 'ایک پرانی کہانی' فی الاصل کنڑ زبان کے افسانے ہیں۔ مؤخر الذکر افسانہ رسالہ نقوش، ماہ ستمبر، اکتوبر: 1952 کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ کنڑ زبان کے معروف ادیب ماستی وِنکٹیش آیئنگار کا ہے۔ جنھیں بقول شیریں بابائے کنڑی کہا جاتا ہے۔ کنڑ زبان میں ان کی وہی حیثیت ہے جو بنگالی زبان میں ٹیگور کی ہے۔ 'ایک پرانی کہانی' بظاہر عورت کے حسن اور اس کی جنسی کشش کے آگے عبادت / نیکی کے غرور کی شکست کی کہانی ہے لیکن بین السطور میں ہندوستانی فلسفہ 'کن کن میں بھگوان' اور تصوف کی دنیا میں 'جزء میں کل' کا فلسفہ رواں دکھائی دیتا ہے۔ شیریں نے افسانہ کا عمدہ تخلیقی ترجمہ کیا ہے، اس طور پر کے افسانہ کا بین السطوری فلسفہ کہیں مجروح نہیں ہوتا ہے۔ اوّل الذکر افسانہ 'گھر تک' رسالہ ماہ نو کے چالیس سالہ مخزن کی دوسری جلد میں شامل ہے۔ اس کے متعلق مزید تفصیلات کا پتا نہیں چل سکا ہے۔ ابوبکر عباد نے اپنی کتاب 'ممتاز شیریں: ناقد اور کہانی کار' میں محض یہ ذکر کیا ہے کہ یہ افسانہ 'گھر تک' کنڑ زبان کا ایک افسانہ ہے جسے ممتاز شیریں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے، لیکن اس بات کی کوئی دلیل پیش نہیں کی ہے اور نہ کسی قسم کی کوئی توجیہ

کی ہے۔ابوبکر صاحب کی اس بات سے انکار ممکن ہے، لیکن اس سلسلہ میں میری تلاش بھی لاحاصل ثابت ہوئی ہے۔ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر افسانہ 'ایک پرانی کہانی' کو سامنے رکھ کر ہم افسانہ 'گھر تک' کا جائزہ لیں تو اس بات کا گمان گذرتا ہے کہ یہ افسانہ کنڑ زبان کا ہو سکتا ہے، کیونکہ افسانہ کا مزاج اور اس کا ماحول 'ایک پرانی کہانی' (افسانہ) سے کافی میل کھاتا ہے۔' زندگی کا رس' ایک نارویجین افسانہ نگار کنوٹ ہامزوں (knut hamsun) کا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ فی الاصل نارویجین زبان میں لکھا گیا تھا۔ انگریزی میں اسے The Call Of Life کے نام سے ترجمہ کیا گیا اور اردو میں شیریں نے اسے 'زندگی کا رس' عنوان دیا۔ شیریں کا یہ مترجم افسانہ رسالہ نقوش، ماہ نومبر، دسمبر: 1952 میں شائع ہوا تھا۔ افسانہ کا محور ایک بیس/ بائیس سالہ نوجوان لڑکی ہے، جس کا نام 'ہلین' ہے۔ گھر کے ڈائنگ روم میں اس کے 53 سالہ شوہر کی لاش ٹھٹھری پڑی ہے، اور وہ اپنے بیڈ روم میں ایک غیر مرد کے ساتھ اپنی جنسی تسکین چاہتی ہے۔ افسانے کی کہانی اسی بنیاد پر قائم کی گئی ہے۔ شیریں نے اسے انگریزی سے اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ در ترجمہ یہ افسانہ اردو زبان کے مزاج میں ڈھل گیا ہے۔ افسانہ کا ماحول، اس کے مکالمے، شیریں نے اس خوبصورتی سے اردو میں منتقل کئے ہیں کہ ترجمہ تخلیق کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ شیریں کے ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ ترجمہ کرتے ہوئے بھی تخلیقیت کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ ان کے مترجم افسانے بھی ان کے اپنے افسانے معلوم ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کے دو اور مترجم افسانے 'نیا جنم' اور 'میاں بیوی' کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ 'نیا جنم' پورلے گرکویست کا افسانہ ہے جو رسالہ شعور شمارہ 2: 1957 میں شائع ہوا تھا۔ ابوبکر صاحب نے اس افسانے کی اشاعت کے متعلق رسالہ 'شاہکار' کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کے ابتدائی صفحات کے پھٹے ہونے کے سبب اس رسالہ کی کوئی تفصیل درج نہیں کر سکے ہیں۔ خیر میری اپنی تلاش کی بنیاد پر مجھے شیریں کا یہ مترجم افسانہ رسالہ 'شعور' سے دستیاب ہوا ہے۔ پورلے گرکویست کا یہ افسانہ ایک نوجوان شادی شدہ عورت کی جنسی

آزادی کا اشاریہ ہے، جو جنسی آزادی کو اپنا حق مانتی ہے۔ یہ افسانہ ایک عورت کے گرد گھومتا ہے جس کا افسانہ میں کوئی نام نہیں بتایا گیا ہے، جس کا شوہر آرتھر اور عاشق جانسن ہے۔ یہ تثلیث افسانے کا بیانیہ خلق کرتی ہیں۔ افسانہ 'میاں بیوی' لوئی گیلو کا افسانہ ہے، جو رسالہ 'نقش' کراچی، شمارہ 3-2:1960 میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانہ کا پلاٹ شوہر، بیوی کی آپسی چپقلش کے گرد بنا گیا ہے۔ یہ ایک سیدھا، سادہ سا افسانہ ہے جو نفسیاتی باریکیوں کو پیش کرتا ہے۔ شیریں نے ان ترجموں میں فنی مہارت اور فن ترجمہ نگاری سے متعلق اپنی سوجھ بوجھ کا عمدہ ثبوت دیا ہے۔ یہ ترجمے شیریں کی متعدد زبانوں پر دسترس کا ثبوت ہیں۔ ان ترجموں کے سبب انہوں نے ادب میں ایک مترجم کی حیثیت سے بھی اپنے وجود کا احساس دلایا ہے:

> ہاں وہ ضرور اسے دھمکی دے گا کہ اس سے قطع تعلق کرلے گا۔ وہ اسے مارنے کی بھی دھمکی دے گا۔ مگر اسے یقین تھا کہ وہ ان دھمکیوں کو بروئے عمل نہیں لائے گا۔ وہ کچھ بھی کرے، مگر اسے کبھی نہیں چھوڑے گا اور نہ ہی اس پر ہاتھ اٹھائے گا یونہی ساتھ ساتھ ان کے دن بسر ہوں گے۔ ان میں سے کسی ایک کے مرنے تک، شاید یہی حقیقت تھی جو اس کو پاگل بنادیتی تھی۔ (میاں بیوی)

> سورج کسی شریر لڑکے کی طرح دن بھر بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے تھک کر اب سونے جارہا تھا۔ اور بدلیاں سارے آکاش پر یوں بکھر گئی تھیں جیسے کسی پیچھا کرنے والے سے سہم کر ادھر ادھر بھاگ رہی ہوں اور چھپنے کی کوشش میں ناکام ہوکر گھبرائی گھبرائی ادھر ادھر بکھر گئی ہوں۔ اور ہوا بھی خاموش تھی۔ اس گڈریے لڑکے کی طرح جس کی بھیڑ بکریاں بھاگ نکلی ہوں اور وہ ان کا پیچھا کرتے کرتے تھک کر خاموش ہو گیا ہو۔ ہوا اب ندی کے کنارے کنارے بڑے بڑے درختوں کے درمیان آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔ (ایک پرانی کہانی)

> مجھے دیکھتے ہی سب پھر پھوٹ پڑے۔ نئے سرے سے کرب، ان کے سینوں میں امڈ

آیا۔ میں بہت دیر تک شالمنا کی قبر پر آنسو بہاتا رہا۔ میں نے سوٹ کیس سے ٹوپی اور جوتے نکالے، اور انہیں شالمنا کی قبر پر رکھ دیا۔ شالمنا نے ایک بار پوچھا تھا۔ "بھیا یہ پیڑ پودے جنگل میں اکیلے کیسے رہتے ہیں" میرا جی چاہا ساری رات وہیں گزار دوں، شالمنا کو اکیلا نہ چھوڑوں۔ (گھر تک)

مرتب اور مدیر کی حیثیت سے بھی شیریں نے ادب میں خود کو متعارف کرایا ہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے لئے فسادات کے افسانوں کا ایک بہترین انتخاب 'ظلمت نیم روز' (1989) کے نام سے یکجا کیا ہے۔ اور آٹھ سالوں (1952-1944) تک رسالہ نیادور کی ادارت سنبھالی ہے۔ نیادور کی ادارت شیریں اور ان کے شوہر صمد شاہین دونوں مشترکہ طور پر کرتے تھے۔ 'نیادور' کی ادارت نے شیریں کو ادبی حلقہ میں خاصی شہرت بخشی ہے۔ علاوہ ازیں پاسترناک پر انگریزی میں ایک کتابچہ بھی لکھا تھا، جس کا نصف حصہ بقول شیریں کسی رسالہ کے پبلشر نے گم کر دیا تھا۔ اس نامکمل حصہ کا اردو ترجمہ شیریں کے کہنے پر محمود ایاز نے کیا۔ یہ نامکمل تحریر مضمون کی شکل میں پہلی بار رسالہ فنون، جولائی 1963 میں بعنوان 'پاسترناک: ہیرو بطور ادیب' شائع ہوا۔ بعد میں رسالہ سوغات، 1992 کے گوشہ ممتاز شیریں میں بھی اسے شامل کیا گیا۔ پاسترناک پر ایک مضمون کا حوالہ انوار احمد نے شیریں پر تحریر شدہ کتابچہ (ممتاز شیریں، کتابیات) میں دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رسالہ 'قند' مردان کے ممتاز شیریں نمبر میں 'بورس پاسترناک کا فن اور تکنیک' کے عنوان سے ایک مضمون شامل ہے لیکن رسالہ کی فہرست دیکھنے اور اس کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ انکشاف ہوتا ہے کہ پاسترناک پر کسی قسم کا کوئی مضمون اس رسالہ میں شامل نہیں ہے۔ ممکن ہے انوار صاحب کو مغالطہ ہو گیا ہو یا اپنے گمان کی بنیاد پر حوالہ دے دیا ہو۔ کیونکہ قند کا ممتاز شیریں نمبر ہندوستان، پاکستان دونوں جگہ کمیاب ہے، بلکہ ہندوستان میں تو نایاب ہو گیا ہے۔

شیریں نے اپنے افسانوں کے انگریزی ترجمہ کا انتخاب footfalls echo کے نام سے تیار کیا تھا، لیکن اس کی اشاعت بھی انہیں نصیب نہ ہو سکی۔ اس انتخاب کے

متعلق دریافت ہوا ہے کہ 2006 میں تنظیم الفردوس نے اسے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ ان کے علاوہ آصف فرخی کے مطابق شیریں نے کامیو کے ناول 'اجنبی' کا ترجمہ بھی کیا تھا لیکن وہ شائع نہ ہو سکا۔ حالانکہ شیریں نے اس کی تردید اپنے ایک خط بنام سلیم الرحمان میں کیا ہے:

> اجنبی کا یا کسی اور کتاب کا ترجمہ میں نہیں کر رہی۔ جن دنوں میں ''اجنبی'' کا ترجمہ کر رہی تھی۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ ایک اور مکتبے والے کسی اور صاحب سے اس کا ترجمہ پہلے ہی کرا چکے ہیں۔ (سوغات، ستمبر: 1992)

اس کتاب میں بنیادی طور پر میرا سروکار شیریں کی تخلیقات سے ہے یعنی — اپنی نگریا اور میگھ ملہار — یہ دونوں کتابیں شیریں کا اہم سرمایا ہیں، جن سے افسانوی دنیا میں ان کی شناخت ہے۔ ان کے علاوہ شیریں کے نامکمل افسانوں کو بھی اسی میں شامل کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ شیریں کے افسانوں سے ہی متعلق ہیں۔ اس لئے اس کے مدنظر کتاب میں 'نامکمل افسانے' کے ضمنی عنوان کے تحت انہیں بھی درج کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ محض ایک ،دو صفحے ہی ہیں لیکن ان کے ابتدائیہ اور فکری اٹھان سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر یہ افسانے مکمل ہو جاتے تو عمدہ افسانے ہو سکتے تھے۔ ساتھ ہی کتاب کی ابتداء میں ان کی نامکمل آپ بیتی ''ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے'' بھی درج کر دی گئی ہے۔ تاکہ شیریں کا خاندانی پس منظر اور ان کی ابتدائی کہانی ہم انہیں کی زبانی جان سکیں۔ انسان کی ابتدائی نشو و نما، اس کا گھریلو ماحول، اس کی تربیت، یہ تمام عناصر کسی شخص کی ذہنی ساخت متعین کرنے اور اس کی شخصیت کی تعمیر میں اہم ہوتے ہیں۔ یہ ابتدائی نقوش ذہن پر گہرے مرتسم ہوتے ہیں اور لاشعور کا ایک اہم حصہ بن جاتے ہیں، لاشعور کی یہ تہیں انسان کے حرکات و سکنات اور اس کے افکار کی صورت میں وقتاً فوقتاً ظہور پزیر ہوتے ہیں۔ شیریں نے آپ بیتی میں اپنے بچپن کا ایک واقعہ درج کیا ہے، جو ان کی عمر کے آخری پڑاؤ میں افسانہ 'کفارہ' کی تخلیق میں معاون ثابت ہوا ہے:

میری امی کی ایک پھوپھی تھیں، عائشہ خانم جنہیں ہم بھی عاشو پھوپھی کہا کرتے تھے.... وہ ہمیں قیامت کے آثار اور روز محشر کے قصے بھی سنایا کرتیں۔ کچھ ان کی باتیں ذہن میں رہ گئی تھیں اور قرآن شریف کے وہ حصے پڑھ کر جن میں قیامت کا ذکر ہے۔ میں مسلسل کئی دن تک قیامت کے nightmarish خواب دیکھتی رہی.... خوف کی کپکپی طاری ہے اور میں سجدہ ریز ہو گئی ہوں۔ عجب خدا ترسی کا عالم تھا۔ پھر اچانک یہ سب کچھ نظروں سے غائب ہو گیا اور ہر طرف نور ہی نور چھا گیا۔ مجھے احساس ہوا یہ نور الٰہی ہے جو خیرہ کن ہونے کے باوجود انتہائی طمانیت بخش ہے۔ پھر برسوں بعد آج سے تین سال پہلے جب حقیقت میں میں نے موت کو اپنے بہت قریب محسوس کیا تھا، مجھے اس طمانیت بخش نور کی۔ اس نفس مطمئنہ کی جستجو تھی (اس کیفیت کو میں نے اپنے افسانہ 'کفارہ' میں بیان کیا ہے۔)

تحریریں انسان کی پرتیں کھولتی ہیں۔ انسان ، بالخصوص تخلیق کار کے کئی پرسونا (persona) ہوتے ہیں۔ یہ مختلف اصناف میں متعدد صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ آپ بیتی، خطوط نگاری اور ڈائری نویسی؛ ان اصناف میں انسان کھلتے کھلتے کھل جاتا ہے۔ اس کی ذاتی زندگی جلوہ نما ہو جاتی ہے۔ شیریں نے ڈائری گرچہ نہیں لکھی لیکن ان کے ذاتی خطوط جو انہوں نے اپنی پیاری دوست اور بھانجی 'زینت جہاں' کو لکھے ہیں، ان کی ذاتی زندگی کے مختلف گوشوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ شیریں کے یہ تمام خطوط رسالہ 'قند' کے ممتاز شیریں نمبر میں شائع ہوئے تھے، جو اصلاً انگریزی زبان میں تھے، رسالہ کے ایڈیٹر نے خطوط کی ضخامت کے سبب اس کے اہم اہم حصہ کو ترجمہ کروا کے رسالہ میں شامل کیا ہے۔ میں نے ان تمام خطوط کو بعینہ درج کر دیا ہے۔ شیریں نے ان میں اپنے مختلف ممالک کے قیام، سیر و تفریح اور روزمرہ کے معمولات قلم بند کئے ہیں۔ ان خطوط کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں عورت کی جمالیاتی حسیت کی عمدہ عکاسی دکھائی دیتی ہے۔ شیریں جن کی جمالیاتی حسیت خاصہ بیدار تھی ، وہ جب ترکی ، روم اور پاکستان کے مختلف شہروں کی

خوبصورتی کا ذکر کرتی ہیں تو وہ جنت نما نظر آتے ہیں۔ ترک نسل، وہاں کے لوگوں کا تجزیہ قابل داد ہے۔ فنون سے ان کی گہری وابستگی ان کی زندہ دلی کا ثبوت ہیں:

روم کی عظیم اور رفیع الشان عمارتوں کے مقابلہ میں وینس کی عمارتیں اپنی نزاکت اور نفاست کی وجہ سے ایسی نظر آتی ہیں جیسے ہاتھی دانت سے تراش کر بنائی گئی ہوں۔
تمہیں معلوم ہوگا کہ ویانا بھی موسیقی کے لئے مشہور ہے۔ روم اور فلورنس میں مصوروں کا راج ہے تو ویانا اپنے موسیقاروں سے آباد ہے۔ franz listz beethoven, mozart یہاں کے مشہور موسیقار ہیں، اور stranss بھی جس کو رقص کا بادشاہ کہنا چاہئے کیوں کہ اسی نے رقص کی مشہور دھن blue danube ترتیب دی تھی۔

جب ہم رات کے وقت انقرہ میں داخل ہوئے تو اس وقت اس کا روپ سہاگ رات میں سجی ہوئی دلہن کی مانند دکھائی دے رہا تھا اور اس شہر کی ہیروں کی طرح چمکتی ہوئی لاتعداد روشنیاں ہمارے استقبال کو موجود تھیں۔

ان ذاتی خطوط کے علاوہ شیریں نے ادبی معاملات سے متعلق بھی متعدد لوگوں کو خطوط لکھے ہیں۔ نیا دور کی ادارت کے سبب یہ خطوط متعدد ادبی شخصیتوں کو لکھے گئے ہیں۔ ہنوز محمود ایاز، سلیم الرحمان، ضمیر الدین احمد، اوپندر ناتھ اشک، اختر انصاری اور نظیر صدیقی کو مرقوم خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔ ان خطوط کی خاصی اہمیت ہے۔ ان کے حوالے سے ہی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ 'کفارہ' انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ بورس پاسترناک پر شیریں نے ایک کتاب کا مسودہ تیار کیا تھا، ظلمت نیم روز کی ترتیب و تدوین، شیریں کے افسانوں کے انگریزی collection اور منٹو: نوری نہ ناری؛ شیریں کی ان تمام ادبی سرگرمیوں کا پتا ہمیں ان ہی خطوط کے ذریعہ چلتا ہے۔ ان کی اہمیت کے پیش نظر اس کتاب میں ان خطوط کی شمولیت کا جواز نکلتا ہے۔ ان خطوط کی وساطت سے شیریں کی تنقیدی صلاحیت واضح ہوتی ہیں۔ تنقیدی بصیرت کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ بالخصوص اوپندر ناتھ آشک کو

لکھے گئے خطوط میں ان کے متعدد افسانوں پر کیے گئے تبصروں کے حوالہ سے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ شیریں بطور ناقد اردو ادب میں اعلیٰ درجہ رکھتی ہیں۔ وہ ایک افسانہ نگار سے زیادہ ایک ناقد کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کی اس اہمیت کے مدِّ نظر جلد ہی آپ قارئین کی خدمت میں شیریں کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ بھی پیش کیا جائے گا، ان شاء اللہ۔ راقم الحروف اس کام پر بھی مسلسل لگا ہوا ہے۔ اس کے مشمولات میں ان کی دونوں تنقیدی کتابوں (معیار اور منٹو نوری نہ ناری) کے علاوہ مختلف رسائل میں شائع شدہ متعدد مضامین، میگھ ملہار اور ظلمت نیم روز کا دیباچہ اور شیریں کے انٹرویو شامل ہوں گے۔

میری اس کاوش کا لب لباب اردو ادب کے وہ قارئین ہیں جو میری طرح شیریں کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ دیگر افسانہ نویسوں اور تنقید نگاروں کی طرح ادب میں ان کی چھان پھٹک کرنا چاہتے ہیں۔ ادب کے تئیں ان کے نظریات وخیالات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن تلاش بسیار کے باوجود کوئی امید بر نہیں آتی۔ یہ کتاب شائد ان کی تشنگی دور کرنے میں معاون ثابت ہو۔ میری مطلب بر آری اس وقت ہوگی جب شیریں کو ادبی stream میں جگہ دی جائے گی اور ادب کے نئے قارئین کے درمیان ان کے افکار بحث کا حصہ بنیں گے۔ شیریں کی تحریروں سے متعلق جہاں تک میری رسائی ممکن ہو سکی ہے اس سے یہی نتیجہ اخذ کر سکا ہوں کہ ——اس خاک کے پتلے کا ہر رنگ نرالا ہے—— ایذرا پاؤنڈ نے لکھا ہے:

> لوگ کتابوں کو نہیں سمجھتے جب تک کہ ان کو تھوڑا بہت زندگی کا تجربہ حاصل نہ ہو۔ بہر حال کوئی کسی گہری کتاب کو اس وقت تک سمجھ نہیں پاتا جب تک کہ اس کے مشمولات کا کم سے کم ایک حصہ اس کے سامنے خود اس پر گزر نہ جائے۔ کتابوں کے خلاف تعصب ان لوگوں کی حماقت کو دیکھ کر پھیلا ہے، جنھوں نے محض کتابیں پڑھی ہیں۔

(مطالعے کی الف، بے)

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میری یہ کوشش اہم ہے یا میں نے شیریں کے ناتراشیدہ گوشوں کی تلاش کی ہے۔ میں ایک طفل مکتب ہوں جو زندگی کی دوڑ میں کھڑا ہونا سیکھ رہا

ہے۔ زندگی نے ابھی مجھ پر اپنے دروا نہیں کیے ہیں یا یوں کہیں کہ میرے لئے پینڈورا کا باکس ابھی بند ہے، اور زندگی کا تجربہ صفر کے مثل ہے۔ ایسی صورت میں شیریں کے گہرے فن اور افسانوں کی تفہیم مجھ کم عقل کے لئے کہاں ممکن ہو سکے گی۔ بس ایک ننھی (ادنی) سی کوشش ہے جو شاید میرے حصہ میں لکھی تھی۔ میں اپنی قسمت پر نازاں ہوں اور اس مالک کا انتہائی مشکور ہوں جس نے یہ گراں قدر کام میرے مقدر کیا۔ لیکن ساتھ ہی شیریں کی بدقسمتی پر رونا بھی آیا کہ اس عظیم فنکارہ/ ادیبہ کو مجھ جیسا کم علم اور نااہل نصیب ہوا، جو اس کی عظمت کے موتی سے اپنے دامن کو مالا مال کرنا چاہتا ہے۔ اس کتاب کو پیش کرتے ہوئے میری کیفیت میگھ ملہار (افسانہ) کے کردار شیام کی مانند ہے، جو وہ فنون کی دیوی کو قید سے رہائی دلاتے وقت محسوس کر رہا تھا:

> ''اور اس کے قلب و روح ایک وجدانی کیفیت سے سرشار ہو گئے۔ اس احساس سے کہ وہ نہ صرف دیوی کو قید سے آزاد کر رہا ہے بلکہ وہ فن کو موت سے اور حسن کو ابدی فنا سے بچا رہا ہے۔''

اس کتاب کی تکمیل کے سلسلہ میں اپنے دوست و احباب کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں جن کے مفید مشوروں اور ہر قدم تعاون سے یہ کام انجام کو پہنچا۔ یاسمین رشیدی اور رضینہ خان یہ دو نام میری اس کاوش کا محرک ہیں۔ ان کی دوستی نے مجھے عورت کے اس روپ سے آشنا کیا جس سے میں اب تک انجان تھا۔ عورت جس کے کئی روپ ہیں۔ یہ اپنے ہر روپ میں قابل تعظیم ہے۔ بقول شیریں ''عورت ایک ناقابل فہم معمہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے معصوم ظاہر میں کتنی پیچ در پیچ، تہ دار شخصیت چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔'' یہ ایک دائرہ ہے جو بظاہر صفر کی مانند ہے لیکن اس دائرہ میں پوری کائنات سمٹ آتی ہے۔ مجھے کائنات کے اس رخ سے آشنا کرنے کے لئے اور اس معمہ کی تفہیم میں معاونت کے لئے میں ان کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ کتاب کا نام اور اس کے سرورق کی تجویز بھی انہیں دونوں کی ہے۔ ''شیریں کتھا'' کتھا کے اس لفظ میں عورت کی وہ پیچداری دکھائی دیتی ہے جو اس کے وجود

کا حصہ ہے۔ رضینہ کا یہ مشورہ مجھے پسند آیا اور میں نے اس تجویز کو حتمی مان لیا۔ سرورق پر دی گئیں تصویر یاسمین کا آئیڈیا ہے۔ چونکہ شیریں کی تحریریں محبت اور جنس کی ابدیت سے عبارت ہیں بایں ہمہ اس مشورہ کو بھی پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا۔ صدف حنیف کا بھی شکریہ کہ اس نے شیریں کے مترجم افسانے کی تلاش میں میری حتی الوسع مدد کی۔ شاہد جمال اور عبداللہ کا بہت مشکور ہوں کہ ان دونوں نے چھوٹے بھائی کی طرح میری مدد کی اور پروف ریڈنگ میں کماحقہ معاونت کی۔ کمپوزنگ اور سرورق کی ڈیزائننگ کے لئے تنویر بھائی کا شکریہ کہ انہوں نے میرے ساتھ ایک دوست کی طرح ٹریٹ (treat) کیا۔ ان کے علاوہ کئی کرم فرما اور رفقاء ہیں جن کی محبتیں اور دعائیں ہر قدم ساتھ رہیں۔ محمد فضل، آصف اقبال خان، سعداللہ سعدان بھی دوستوں کا بھی انتہائی مشکور ہوں کہ ان کے تعاون سے ہی یہ کتاب عالم وجود میں آسکی۔

فروری 2016 ضیاءاللہ انور

نئی دہلی

سوانحی خاکہ

نام : ممتاز شیریں
پیدائشی نام : ممتاز محل
گھریلو نام : تاج (جنوبی ہند کے مطابق 'تاجتاں')
تاریخ پیدائش: 12 ستمبر 1924ء ہندوپور (آندھرا پردیش)
تاریخ نکاح : 23 اگست 1942ء
تاریخ وفات: 11 مارچ 1973 اسلام آباد (پاکستان)
والدین : قاضی محمد عبدالغفور، نور جہاں
شوہر : صمد شاہین (میسور)
اولاد : پرویز، نگریز
تعلیم : میٹرک - مہارانی ہائی اسکول، میسور۔ درجہ اوّل 1938
ایف۔اے - مہارانی کالج، میسور۔ درجہ دوم 1940
بی۔اے - مہارانی کالج، میسور۔ درجہ دوم 1942
ایم۔ اے - کراچی یونیورسٹی، کراچی 1955
اعزاز : سکریٹری: منٹو میموریل کمیٹی (پاکستان)، مجموعہ میگھ ملہار آدم جی ایوارڈ

کے لئے رنراپ رہا، افسانہ کفارہ کو بہترین آفسانہ کا ایوارڈ، 1954 میں ادیبوں کی بین الاقوامی کانفرنس، ہالینڈ (P.E.N) میں پاکستان کی نمائندگی کی۔

سیر و سیاحت: بنگلہ دیش (ڈھاکہ)، ہالینڈ (ہیگ)، تھائی لینڈ (بنکاک)، ترکی (انقرہ)، انگلینڈ (لندن)

کتابیں : اپنی نگریا، میگھ ملہار، معیار، منٹو: نوری نہ ناری، (مرتب) ظلمت نیم روز، Foot Falls Echo (ذاتی افسانوں کا انگریزی ترجمہ و انتخاب)، (نامکمل آپ بیتی) ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے، (مدیر) رسالہ نیا دور۔

●●●

ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے...

میری زندگی کے 35 سال یوں گزرے کہ معلوم ہوتا تھا مجھ پر کچھ بیتی ہی نہیں۔ میری زندگی میں ایسے کوئی نشیب و فراز نہیں آئے۔ کوئی ٹھوس اور تلخ تجربے نہیں ہوئے۔ کبھی تنہا بڑھ کر دنیا سے ٹکر لینے کا موقعہ نہیں ملا۔ ماں باپ کے گھر، پھر شادی کے بعد، شوہر کے ساتھ میری زندگی بڑی 'محفوظ' مضبوط سہاروں کے ذریعہ گزری۔

زندگی صرف حادثات، واقعات اور ٹھوس تجربات پر مشتمل نہیں ہوتی۔ کسی فرد کی حیاتاتی اور ذہنی نشو و نما، کردار اور رویہ میں غیر محسوس تبدیلی سیاحت اور دوسری تہذیبوں کا اثر۔ مذہب و اخلاق کا تصور، زندگی (اور میری زندگی بھی) ان سب کا مرکب ہے۔

بس ایک پر سکون، ہموار، خوشگوار اور متوازن زندگی تھی کہ بیتی جا رہی تھی۔ اب پچھلے تین سال سے میری زندگی پر غم کا سایہ پڑا ہے کہ یکے بعد دیگرے عزیز ہستیاں مجھ سے چھن گئی ہیں اور میں خود موت کی وادی سے واپس آئی ہوں۔ وقت ایک ایسا مرہم ہے کہ زخموں کو مندمل کر دیتا ہے اور روز مرہ کی عام زندگی میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ بڑے بڑے حادثات کے بعد بھی انسان کو اپنے معمول پر واپس لے آتی ہے۔

سلسلہ روز و شب اصل حیات و ممات... روز و شب یونہی بیت جاتے ہیں لیکن زندگی کے اس بے رنگ معمول میں ایسے ڈرامائی لمحات اور کیفیات بھی آتے ہیں جب شعور احساس تیز اور بلند ہوتا ہے۔ یہ لمحات ماہ و سال پر بھاری ہوتے ہیں اور ایسے لمحے میری

زندگی میں بھی آئے ہیں جب وقت ایک اندرونی حقیقت بن گیا ہے اور ساری زندگی کی شدت ان لمحوں میں سمٹ آئی ہے۔

عرصۂ دراز کی بات ہے۔ جنوبی ہند کے ایک چھوٹے سے شہر ہندو پور میں ہیضہ کی وبا یوں پھیلی کہ آن کی آن میں سینکڑوں موتیں واقع ہو گئیں۔ ہر گھر سے نوحے بلند ہونے لگے اور اس شہر کے سب سے بڑے گھر میں ایک گیارہ سالہ لڑکا بے سدھ بستر مرگ پر پڑا تھا۔ بچے کی حالت دیکھ کر ماں کو ضبط کا یارا نہ رہا۔ ماں روتی ہوئی صحت کی طرف دوڑی۔ آنسو بھری آنکھیں آسمان کی جانب اٹھائیں اور دامن پھیلا کر خدا کے حضور میں صدق دل سے یہ دعا مانگی:

"پاک پروردگار، موت و حیات تیرے ہاتھ میں ہے۔ میری زندگی میرے بچے کو بخش دے۔ میں اپنے بچے کی جان کے عوض اپنی جان کی بھینٹ دیتی ہوں۔"

یہ دعا لبوں سے نکلی ہی تھی کہ ماں نڈھال ہو کر بستر سے لگ گئی۔ آہستہ آہستہ اس کی حالت غیر ہوتی گئی اور بچے کی طبیعت سنبھلتی گئی۔ حتیٰ کہ چند دنوں میں وہ پوری طرح صحت یاب ہو گیا اور ماں موت کی نیند سو گئی۔

جنوبی ہند کے ایک غیر معروف شہر کے ایک معزز گھرانے کی ماں کی یہ قربانی آل سس ٹس کی اسطور نہیں بن سکی اور نہ شہنشاہ بابر کی قربانی کی طرح تاریخ کے صفحات میں رقم ہوئی۔ لیکن ماں کے ایثار کی یہ کہانی اس علاقہ میں زبان زد عام تھی اور یہ سچی کہانی میں بچپن سے سنتی آئی ہوں کیوں کہ وہ ماں جس نے اپنے بچے پر جان نچھاور کی تھی میری نانی تھیں اور وہ بچہ جس کے لیے یہ قربانی دی گئی، میرے نانا ابا تھے جن کے زیر سایہ میری پرورش ہوئی اور جو میری زندگی پر اثر انداز ہونے والوں میں سب سے پہلا اور سب سے بلند مقام رکھتے ہیں۔

مدتوں بعد اس شہر میں طاعون کی وبا آندھی کی طرح آئی، بے شمار جانیں ضائع ہوئیں، گھر کے گھر خالی ہو گئے، ساری بستی ویران ہو گئی۔ لوگوں نے شہر چھوڑ کر بہت دور میدانوں میں خیمے لگا کر پڑاؤ ڈال دیے۔ نفسا نفسی کا عالم تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ سب اپنی اپنی جان بچا کر بھاگ رہے تھے۔ ایسے میں ایک گھر کی بہو کو یہ بیماری لگی تھی۔ بن ماں باپ کی بچی تھی۔ ساس نندیں بھی چھوڑ کر کیمپ میں چلی گئیں۔ صرف ایک نند بیمار کے ساتھ رہ گئی کہ وہ اپنی بھاوج کو اس حال میں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ نند بھاوج کا رشتہ کشیدگی، رنجش اور آپس میں جلن کا رشتہ ہوتا ہے۔ نند بھاوج کی محبت کا یہ مثالی نمونہ تھا کہ ایک نند نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر بھاوج کی اس تندہی سے تیمارداری کی کہ دن کو دن نہ سمجھا، رات کو رات نہ سمجھی اور لب مرگ مریضہ کا سر زانو پر لیے بیٹھی رہی اور بھاوج نے اس کی گود میں دم توڑ دیا۔

یہ دوسری نیک اور نڈر بی بی جنھوں نے اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر طاعون جیسی مہلک، متعدی بیماری میں مبتلا مریضہ کی تنہا دیکھ بھال کی تھی، میری نانی اماں تھیں۔

یہ اگلے وقتوں کی نیک بیبیاں تھیں۔ سوچتی ہوں کہ میں ان دو نیک، نڈر بیبیوں کی نہایت بزدل نواسی ہوں۔ میرا اپنا تجربہ اس سے بالکل برعکس تھا۔ آج سے ٹھیک تین سال پہلے جب میں خود موت سے ہمکنار تھی ایک اجنبی ملک میں، اپنے وطن اور عزیزوں سے ہزاروں میل دور، ایک ماہر امریکن ڈاکٹر نے گھنٹوں موت سے مقابلہ کر کے مجھے بچا لیا۔ میری مسیحائی کی گئی۔ رات دن ایک کر کے نہایت جانفشانی اور تندہی سے میری تیمارداری کی گئی۔ حتیٰ کہ میری زندگی کے لیے ایک زندگی کی پیش کش کی گئی اور ایک ننھی سی جان مجھ پر بھینٹ چڑھا دی گئی۔

گو اس وقت دو زندگیوں (ماں اور بچے کی) میں سے ایک کے انتخاب کا سوال نہیں تھا اور نہ یہ میرے اختیار میں تھا۔ تاہم اگر یہ انتخاب میرے سامنے اور اختیار میرے ہاتھ میں ہوتا تو کیا میں اپنے بچے کے لیے اپنی جان کی قربانی دے سکتی تھی، نہیں۔ یقیناً مجھ

میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ جب لوگ پرسہ دینے کے لیے آتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے آپ کی جان بچ گئی۔ آپ کی زندگی زیادہ قیمتی تھی، تو میں احساس ندامت میں ڈوب ڈوب جاتی تھی۔

میرے لیے ایک زندگی کی پیش کش کی گئی اور میری پرنانی اور نانی اماں نے اوروں کے لیے اپنی زندگی کی پیش کش کی تھی!

ہندو پور میرا آبائی وطن ہے۔ یہ شہر صوبہ میسور کی سرحد پر واقع ہے۔ ان دنوں مدراس پریزیڈنسی میں تھا اور اب آندھرا پردیش میں شامل ہے۔ میرے آباؤ اجداد باہر سے آئے تھے۔ جنوبی ہند میں بس گئے تھے۔ ہندو پور کے نواح میں ان کی زمینداریاں تھیں اور ہندو پور میں آم کے باغات تھے۔ ہمارے پرنانا ٹیپو خان شہر کے اکابرین میں سے تھے۔ ان کی موت کے بعد کچھ ایسے خاندانی جھگڑے آن پڑے کہ ہمارے نانا جان ٹیپو قاسم خان بددل ہو کر میسور چلے آئے کہ یہاں اپنوں سے دور ایک نئی دنیا بسائیں گے۔

میرے ابا جان قاضی محمد عبدالغفور لڑکپن میں یتیم ہو گئے تھے۔ نانا ابا نے انھیں اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا تھا۔ بنگلور بھیج کر بنگلور کے سینٹ جوزف کالج میں انھیں تعلیم دلوائی تھی اور اپنی بیٹی کا ان سے بیاہ کر دیا تھا۔ میری امی نور جہاں اکلوتی بیٹی تھیں اور نانا ابا اور نانی اماں انھیں دور نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا امی کو لے کر ابا جان بھی نانا جان کے ساتھ ہی میسور چلے آئے اور یہاں ملازمت اور مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یوں میسور میرا وطن بن گیا۔

دنیا کے مختلف ملکوں اور حسین شہروں کی سیر و سیاحت کرنے اور ان میں سے بعض میں قیام کرنے کے باوجود مجھے اب بھی میسور سے اتنا ہی پیار ہے۔ چھوٹا سا صاف ستھرا، خوبصورت شہر، معتدل اور خوشگوار آب و ہوا، حسین باغ، مہاراجہ میسور کا عالیشان محل اور صرف چند میل دور پر وہ بہشت بر روئے زمین، یعنی کرشنا راج ساگر، رنگین فواروں اور

چکاچوند کرنے والی روشنیوں کے ساتھ برندابن گارڈنز جو دریائے کاویری کے بندھ سے متصل شالامار گارڈنز کی طرز پر بنائے گئے ہیں اور شالامار سے زیادہ حسین ہیں۔ سال بہ سال میسور کا دسہرہ، وردنتی اور راج محل کے دربار کی رونق... یہ تھا میسور اور کسی شہر آرزو، کسی بہشت گم گشتہ کا تصور میرے ذہن میں وابستہ ہے تو وہ شہر میسور سے ہے۔

میسور کا ماحول نہایت خوشگوار تھا۔ ریاست میسور دیسی ریاستوں میں سب سے ترقی یافتہ 'موڈل اسٹیٹ' سمجھی جاتی تھی۔ مہاراجہ سری کرشناراج وڈیر (موجودہ مہاراجہ میسور کا چچا) نہایت رعایا پرور اور عدل گستر فرمانروا تھے اور مسلمانوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ دیوان میسور سر مرزا اسمٰعیل کے سیاسی تدبر کا شہرہ تھا۔ ہندو مسلمان یہاں آپس میں رفاقت سے رہتے تھے۔ چھوٹی سی اقلیت تھے لیکن مسلمانوں نے اپنی قومی انفرادیت کو برقرار رکھا تھا۔ یہ سلطان ٹیپو کی سرزمین تھی اور مسلمان یہاں سرخرو اور سربلند تھے۔

مسلمانوں کے ذہن میں اپنے تاریخی ماضی کا تصور بسا ہوا تھا اور میسور ہمارے لیے سلطان ٹیپو کی سرزمین تھی۔ میسور سے صرف آٹھ دس میل کے فاصلہ پر ٹیپو سلطان کا دارالسلطنت سرینگپٹن واقع ہے۔ سرینگپٹن کوئی خرابہ نہیں۔ سویا ہوا شہر معلوم ہوتا ہے جہاں ٹیپو کی خوابیدہ روح کا احساس چھپا ہوا ہے۔ گھٹا چھاتی ہے تو اب بھی یوں لگتا ہے جیسے اس آخری رات کی طرح (4 مئی 1799ء کی) سلطان شہید کی یاد میں بادل آنسو بہانے لگیں گے۔ گنجام گنبد جس کے نیچے حیدر علی اور سلطان شہید محو خواب ہیں۔ دریا دولت باغ جہاں سرو صنوبر کے درمیان سلطان کا سادہ محل ہے جس کی دیواروں پر میسور کی جنگوں کے نقوش رقم ہیں اور دریائے کاویری کا رومان پرور سنگم، سرینگپٹن کے یہ سارے تلازمات میسور کے تصور کے ساتھ میرے شعور کا ایک حصہ ہیں۔

میں بہت چھوٹی سی تھی لیکن بچپن کی بعض یادیں بہت واضح ہوتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ غالباً دسہرے کے موقع پر ایک شورش وہنگامہ برپا ہوا تھا اور چیلنج دیا

گیا تھا کہ مہاراجہ صاحب اب کے سر مرزا اسمٰعیل کو ساتھ لے کر نکلیں گے تو انھیں جوتوں کے ہار پہنائے جائیں گے۔ جلوس کی آمد آمد تھی۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے دلوں میں متضاد جذبات موجزن تھے۔ سب کی نگاہیں بے تابی سے محل سرا کی جانب لگی تھیں۔ اتنے میں مہاراجہ کی سواری نکلی۔ وہ حسب معمول ایک نہایت سجے سجائے ہاتھی پر سونے کی عماری میں رونق افروز بڑی شان سے سر مرزا اسمٰعیل کو اپنے پہلو میں بٹھائے نکلے۔ مسلمانوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ غیر مسلموں کے چہرے مرجھا گئے لیکن انھیں ہمت نہ ہوئی کہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنائیں۔ جوتیاں تھامے ہوئے ہاتھ نیچے ہو گئے، جوتیاں نہ برسیں، پھول ہی پھول برسے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں سے۔

ویسے جنوبی ہند میں اور خاص طور پر ریاست میں ہندو مسلمان آپس میں رفاقت سے رہتے تھے۔ 1947 میں فسادات کے زمانے میں بھی ریاست میسور میں امن وامان تھا۔ ریاست بھر میں بہت کم وارداتیں ہوئی تھیں جو نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یہ رفاقت کسی 'مشترکہ کلچر' یا ایک دوسرے میں ضم ہونے کی بنا پر نہ تھی۔ مسلمان یہاں چھوٹی سی اقلیت میں تھے لیکن اپنی قومی انفرادیت سختی سے قائم کیے ہوئے تھے۔ مسلمان یہاں سرخرو اور سربلند تھے۔ یہ سرزمین سلطان ٹیپو کی سرزمین تھی۔

میسور میں ہمارا گھر — یعنی وہ ایک گھر جس سے 'اپنے گھر' کا تصور وابستہ ہے، جہاں میرے بچپن اور نوجوانی کے دن گزرے، عید گاہ محلے میں ہے، عید گاہ سے بہت قریب اونچائی پر پرانی وضع کا یہ تنہا بنگلہ تھا۔ بڑے بڑے ستونوں اور قوسوں والا بہت بڑا ہال، برآمدے اور بہت سے کمرے جن کی ترتیب عجب بے ڈھنگی تھی اونچی دیواروں والا بڑا سا کمپاؤنڈ اور تینوں جانب کمپاؤنڈ کی دیواروں کے ساتھ ساتھ اونچے اونچے درخت پیچھے صحن میں مختلف پھلوں کے درخت اور سامنے چمپا چنبیلی کی بیلیں کمان بناتی تھیں۔ بھرا ہوا گھرانا افراد پر مشتمل تھا۔ نانا جان، ابا جان، امی ہم چار بہنیں اور دو سب سے چھوٹے بھائی۔ بھائی

بہنوں میں میں سب سے بڑی تھی۔

چونکہ 'پہلوٹھی' کی بچی تھی مجھے ابا امی نے نہیں نانا، نانی نے لاڈ پیار، ناز و نعم سے پالا۔ ابا نوعمر تھے اور لاپرواسے اور امی میری پیدائش کے وقت خود بھی بچی تھیں۔ پندرہ سال کی چھوٹی سی لڑکی۔ نانی اماں نے مجھے اپنے ہاتھوں میں لیا اور محبت سے پالا پوسا۔ نانی اماں سے ایک بوڑھی عورت کا تصور ابھرتا ہے۔ لیکن میری نانی جوان اور حسین تھیں۔ ان کے مزاج میں نفاست تھی اور کپڑے پہننے کا انھیں بڑا سلیقہ تھا۔ سفید یا ہلکے پیسٹل رنگوں کے کپڑے پہنتی تھیں۔ کشیدہ کاری کیے ہوئے، جو ان پر بہت سجتے تھے، ان کی تصویر میرے ذہن میں اب بھی تازہ ہے۔

نانی اماں خلیق، ملنسار اور مہمان نواز تھیں۔ ساتھ ہی جہاندیدہ اور تجربہ کار بھی۔ اس کے برعکس میری امی بہت ہی معصوم، ناتجربہ کار، گوشہ نشین، خوشحال گھرانے کی اکلوتی اولاد۔ انھیں دنیا جہان سے محفوظ رکھا گیا۔ نہ باہر کہیں آنا جانا، نہ لوگوں سے ملنا جلنا، ہنسنا بولنا۔ مکمل (Recluse) بن کر ساری زندگی انھوں نے یونہی گزار دی۔ اب کہ وہ بیوہ ہو گئی ہیں۔ نانا جان کی خدمت گزاری میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں اور یہی گویا ان کی زندگی کا 'مشن' ہے۔

میری امی کا تصور میرے لیے ہمیشہ بہن کا سا رہا۔ ان کا سلوک بھی ہم سے بہنوں کا سا تھا۔ ہم بلا جھجک دل کی باتیں انھیں بتا دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ شادی بیاہ کے معاملوں میں اپنے انتخاب کا ان پر اظہار کر دیا کرتے تھے۔ میں اپنی ماں کو آپا کہا کرتی تھی اور نانی اماں کو اماں، کہ وہ سچ مچ میری ماں تھیں۔

میں چھ سات سال کی تھی کہ یہ محبوب ہستی جسے میں ماں سمجھتی تھی مجھ سے چھن گئی۔ نانی اماں کی موت میرے بچپن کی سب سے غمگین اور گہری یاد ہے۔ اس چھوٹی عمر میں میں پہلی دفعہ موت کی حقیقت سے دوچار ہوئی گو موت کے راز کو سمجھنے کا مجھ میں ادراک نہ تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی بے جان جسم کو دیکھتی رہی، جنازے کے ساتھ گئی، ان کے

محبوب آم کے باغ میں انھیں دفن ہوتے دیکھا۔ رات رات بھر نانا جان کی آہ و فغاں سنی۔ ان کی تڑپ اور بے پناہ کرب و اضطراب دیکھا۔ نانا جان اور نانی اماں کا مثالی جوڑا تھا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اس زمانے میں ان کی محبت کی شادی ہوئی تھی۔

جب ان کا انتقال ہوا نانی اماں کی عمر بیالیس تینتالیس سال کی ہوگی۔ نانا جان کی عمر بھی اس وقت کچھ زیادہ نہ تھی لیکن انھوں نے لوگوں کے مجبور کرنے کے باوجود دوبارہ شادی نہیں کی اور ان کی چھوڑی ہوئی ایک نشانی اپنی اکلوتی بیٹی اور نواسیوں نواسوں کے لیے (یعنی ہمارے لیے) اپنی ساری زندگی وقف کردی۔

اپنی موت سے بارہ دن پہلے نانی اماں میسور سے ہندوپور جانے کے لیے بے قرار ہو اٹھی تھیں گویا ایک ندائے غیب تھی کہ انھیں بے اختیار اپنی جانب کھینچ رہی تھی اور اپنے آبائی وطن کی مٹی انھیں نصیب ہوئی۔

وطن کی مٹی کی کشش کتنی زبردست ہوتی ہے۔ چاہے کوئی ساری عمر باہر گزار دے۔ آخر میں یہ مقناطیسی کشش اپنی جانب کھینچ ہی لیتی ہے اور اپنی مٹی وطن کی مٹی میں مل جاتی ہے۔ میری اپنی زندگی ایک مستقل سفر بن گئی ہے۔ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف مغرب سے مشرق اور مشرق سے مغرب کی طرف۔ نہ جانے کہاں کس دیارِ غیر میں موت آ لے گی اور کون سی مٹی نصیب ہوگی۔ بہر حال ساری زمینیں اللہ کی ہی ہیں اور کبھی یوں محسوس ہوتا ہے ساری دنیا ہی اپنا وطن ہے۔

میرا وطن کون سا ہے؟ ہندوپور جہاں میرے بزرگ رہتے آئے ہیں اور جہاں میں پیدا ہوئی یا میسور جہاں میں پلی بڑھی، تعلیم حاصل کی شادی کی بچپن اور نوجوانی کا زمانہ گزرا اور جہاں اب بھی میرے نانا جان، امی، بہنیں، بھائی سبھی رہتے ہیں یا پاکستان جس کی تقدیر سے میں نے اپنے آپ کو وابستہ کرلیا ہے اور جو میرا روحانی وطن ہے۔

ہمارے آبائی وطن ہندوپور کی مٹی نے ایک اور ہستی کو جو میرے قریب تھی یا

قریب ہونی چاہیے تھی اپنی آغوش میں لے لیا۔ یہ میرے ابا جان تھے۔ ابھی ایک سال کا عرصہ بھی نہیں ہوا کہ پچھلی عید الفطر کے دو ہفتہ بعد 15 مارچ 1963 کو میرے ابا جان رحلت فرما گئے۔

موت ہمیشہ بے درد نہیں ہوتی۔ یہ قید حیات و بند غم سے آزادی کا پیام لاتی ہے۔ آخری عمر میں ابا جان کی زندگی کچھ ایسی حسرت ناک تھی کہ موت ان کے لیے رہائی کا باعث بنی۔ طویل بیماری نے دل، جگر، پھیپھڑے سب تباہ کر دیے تھے۔ تفکرات اور پریشانیوں میں گھرے ہوئے وہ زندگی سے بے زار تھے۔ میں نے دل کڑا کر کے سوچا شاید موت ان کے لیے رحمت تھی۔

ابا جان کی موت کی صرف ایک اطلاع — ایک منحوس خبر مجھ تک پہنچی۔ میں اس وقت ڈھاکہ مشرقی پاکستان میں تھی۔ سینکڑوں میل دور۔ نہ ان کا آخری دیدار کر سکی، نہ ان کی کوئی خدمت مجھ سے ہو سکی۔ یہ سعادت میری سب سے چھوٹی بہن نجمہ نسرین کو نصیب ہوئی۔ جو ان کی سب سے چہیتی بیٹی تھی اور جس کے گھر میں ابا جان نے اپنے آخری دن گزارے تھے۔ میری چھوٹی بہن نجمہ نسرین نے مجھے یہ اطلاع دی تھی اور اپنے سادہ جملوں میں ابا کے آخری دنوں، آخری سفر، ان کی موت اور تجہیز و تکفین کی تصویر کھینچی تھی۔

میری بہن کے قلم میں اظہار کی قوت نہیں لیکن اس کے خط میں بے پناہ خلوص اور سچا درد و کرب تھا۔ ایک ایسا معصومانہ خلوص جو شاید اپنے اندر نہیں پاتی sophistication نے مجھ پر تصنع کا ایک ہلکا سا ملمع چڑھا دیا ہے.... میری بہن نے اپنے سادہ جملوں میں ابا کے آخری دنوں، آخری سفر، ان کی موت اور تجہیز و تکفین کی ایسی تصویر کھینچی تھی کہ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا میں ڈاکٹر ژواگو کا آغاز اور انجام پڑھ رہی ہوں بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں اور اس حقیقی المیے کے مرکزی کردار میرے اپنے ابا ہیں۔

ابا جان کی چونسٹھ سالہ زندگی کا بیشتر حصہ میسور اور بنگلور میں گزرا تھا۔ لیکن مرنے سے صرف دو دن پہلے وہ بضد ہو گئے تھے کہ ہندوپور جائیں گے۔ ہندوپور میں ان کا کوئی نہ

تھا۔ ماں باپ، بہن بھائی سب انتقال کر چکے تھے اور میسور میں ان کی بیوی۔ بیٹے، بیٹیاں (سوائے میرے) بھی موجود تھے لیکن ایک بے نام آواز تھی کہ انھیں بلا رہی تھی۔ وطن عزیز کی مٹی انھیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ٹرین میں اپنے آخری سفر پر روانہ ہوتے ہوئے انھوں نے اپنے کمپارٹمنٹ کی کھڑکی کھول لی اور لیٹے لیٹے ہی باہر نظریں جمائے رہے۔ انھیں ہر لحہ یہ اندیشہ ستاتا رہا کہ کہیں غفلت میں آنکھ نہ لگ جائے اور ایسے میں ہندوپور کا اسٹیشن نہ نکل جائے۔ رات بھر وہ جاگتے رہے اور ٹکٹکی باندھے کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے۔ ہندوپور کا اسٹیشن آ گیا تو ان کے بے جان لبوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ان کی منزل آ گئی تھی۔ آخری منزل!

اپنے نرم اور حساس ظاہر کے پس پردہ شاید میں بہت سخت دل ہوں۔ میں نے باپ کی موت کا وہ سوگ نہیں منایا جو ایک بیٹی کو منانا چاہیے۔ میں نے باپ کی موت کو اس طرح محسوس نہیں کیا جس طرح دو سال پہلے اپنے نوزائیدہ بچے کی موت کو محسوس کیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ طویل جدائی ہو۔ پاکستان آنے کے بعد، پندرہ سال میں اپنے ماں باپ سے دور رہی ہوں اور اس دوران میں شاذ ہی چند ہفتے ابا جان کے ساتھ گزارے ہوں گے۔ اس پندرہ سال کے طویل عرصے میں ہم دو ہی مرتبہ ہندوستان گئے تھے اور وہ بھی قلیل مدت کے لیے۔ لیکن کیا یہ طویل زمانی ومکانی فاصلہ بھی باپ بیٹی کے اتنے قریب اور گہرے رشتہ کے نشان دھندلا سکتا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ موت ابا جان کے لیے ایک تکلیف دہ زندگی سے نجات کا باعث تھی۔ اس میں خدا کی مصلحت تھی اور ہمیں صبر و شکر سے کام لینا چاہیے۔

ابا جان میرے لیے ایک دوست تھے۔ وہ آزاد خیال اور وسیع المشرب واقع ہوئے تھے اور ہم پر کسی قسم کی پابندی لگانے کے قائل نہ تھے۔ وہ مجھے پڑھنے لکھنے سے نہیں روکتے تھے۔ کتابیں کہیں سے مانگ تانگ کر چھپ چھپ کر پڑھنے کی مجھے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ اچھی ادبی کتابیں وہ خود لا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب میں نو دس کی تھی

وہ میرے لیے مرزا محمد سعید کی کتابیں، شرر اور راشد الخیری کے ناول اور منشی پریم چند کی ساری کتابیں لے آئے تھے۔ اس دور کے معیاری ادبی رسائل بھی منگواتے تھے۔ یوں مجھ میں بچپن ہی سے ادب سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔

ابتدائی تعلیم بھی میں نے کسی کانونٹ یا اسکول میں نہیں بلکہ گھر پر ابا جان ہی سے حاصل کی تھی۔ چنانچہ میری ابتدائی ذہنی اور ایک حد تک ادبی تربیت کے ذمہ دار ابا جان ہیں اور میری مذہبی اور اخلاقی تربیت نانا جان کے زیر سایہ ہوئی۔ یوں تو ابا جان، امی، نانی اماں اور نانا جان ان سب نے اپنے اپنے طور پر میری پرورش اور تربیت میں حصہ لیا ہے اور ان سب کی متضاد کرداری خصوصیات میری شخصیت میں غیر محسوس طور پر گھلی ہوئی ہیں۔ سب سے غالب اثر میری زندگی پر اور خصوصیت سے ابتدائی نصف زندگی پر نانا جان کا رہا ہے۔

نانا جان کو ہم جان بلاتے تھے اور وہ حقیقتاً ہمارے گھر کی اور سب کی 'جان' تھے۔ بہت ہی نیک، شریف النفس، ثقہ، وضع دار بزرگ تھے۔ میرے نانا ابا، ٹیپو قاسم خان، سوتی کپڑے کی گول ٹوپی، سفید کرتہ اور سفید دھوتی یا پاجامہ میں ملبوس، سفید براق داڑھی، نورانی چہرہ، جو رنگ کی صباحت سے زیادہ ایک باطنی نور کا آئینہ دار ہے۔ یوں لگتے ہیں جیسے تاجکستان، روسی ترکستان اور ازبکستان کی تصویروں میں سے باہر نکل آئے ہوں۔ کہتے ہیں کہ جوانی میں وہ بڑے جامہ زیب تھے۔ ولایتی کپڑے پہنتے تھے۔ پھر خلافت کی تحریک میں انھوں نے مستعدی سے حصہ لیا تھا اور اپنے سارے ولایتی کپڑے نذر آتش کر دیے تھے۔ اس وقت سے وہ یہی سادہ لباس زیب تن کیے رکھتے ہیں۔ بڑے ثقہ وضع دار بزرگ ہیں۔ نانا جان جوانی ہی میں اہل حدیث فرقہ میں شامل ہو گئے تھے۔ لہٰذا پیورٹن قسم کے عقائد رکھتے تھے۔ ہم سب کی زندگی بھی سخت پیورٹن نوعیت کی تھی۔ فاتحہ، نیاز کوئی رسم و ریت روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ ہم سب ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ قرآن کی باقاعدہ تلاوت اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ فروعی مسئلوں کے پیچیدہ باریکیوں میں گئے بغیر ہم نے مذہب اسلام کی سادہ پاکیزگی کو اپنایا تھا۔

خواہ کوئی مذہبی پابندی ہو یا روزمرہ کے معمولات میں پابندی یا اخلاقی حدیں... ہمیں یہ بالکل احساس نہ ہوتا تھا کہ ہم پر کوئی دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ ہم بخوشی اس راستہ پر چل رہے تھے اور نانا ابا کی تعلیمات اور نصیحتوں کو سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔ شرافت اور سادگی کی زندگی بسر کرنا، کبھی جھوٹ نہ بولنا، دوسروں کی دل آزاری نہ کرنا، کسی کی برائی اور غیبت نہ کرنا، امارت اور شہرت یا کسی بھی بات پر غرور نہ کرنا یہ سارے اصول جو اسلامی اصول تھے، غیر محسوس طور پر ہماری زندگی کے معمول میں شامل ہو گئے تھے۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے سچ بولنا، حتیٰ کہ اپنے آپ سے سچ بولنا کتنا مشکل مرحلہ ہے۔ لیکن ان دنوں واقعی ہم جھوٹ نہیں بولا کرتے تھے۔ ٹیپو قاسم خان کی نواسی اور جھوٹ بولے، ناممکن سی بات تھی۔ ہم تینوں بہنیں کبھی خلوت میں بھی کوئی بیہودہ باتیں نہ کرتی تھیں۔ عجب سادہ اور پاکیزہ زندگی تھی۔ اس وقت نیکی اور بدی کا میرے پاس سفید و سیاہ کا تصور تھا۔ کوئی درمیانی رنگ نہیں تھا اور نیکی اور پرہیزگاری کی زندہ مثال میرے لیے نانا ابا تھے۔

میرے اس دورِ معصومیت میں جب میری زندگی سادہ اور پاکیزہ تھی، مجھے چند ایسے تجربات پیش آئے اور میں نے ایسے وژن خواب کی صورت میں دیکھے ہیں جن کی نوعیت Mystic قسم کی ہے۔ میں ان دنوں اکثر سچے خواب دیکھا کرتی تھی۔ میری امی کی ایک پھوپھی تھیں، عائشہ خانم جنھیں ہم بھی عاشو پھوپھی بلایا کرتے تھے۔ وہ اکثر ہمیں ایسی باتیں بتایا کرتی تھیں کہ جب خدا کے کسی نیک بندے کو موت آتی ہے تو موت کا فرشتہ نہایت حسین شکل میں اپنے دائیں پنکھ پر جنت لے آتا ہے اور جب وہ کوئی بد روح قبض کرنے آتا ہے تو اس کی شکل نہایت ڈراؤنی ہوتی ہے اور اس کے بائیں پنکھ پر دہکتی دوزخ ہوتی ہے۔ وہ ہمیں قیامت کے آثار اور روزِ حشر کے قصے بھی سنایا کرتیں۔ کچھ ان کی باتیں ذہن میں رہ گئی تھیں اور قرآن شریف کے وہ حصے پڑھ کر جن میں قیامت کا ذکر ہے، میں مسلسل کئی دن قیامت کے Nightmarish خواب دیکھتی رہی کہ سورج سوا نیزے پر ہے، چاند اور سرج کا نور ماند پڑ گیا ہے۔ آسمان پگھلے ہوئے تانبے کا سا ہو گیا ہے۔ سورۂ

القیامت، سورۃ المعارج، سورۂ تکویر اور انفطار وغیرہ کے سارے مناظر سامنے ہیں۔ خوف کی کپکپی طاری ہے اور میں سجدہ ریز ہوگئی ہوں۔ عجب خدا ترسی کا عالم تھا۔ پھر اچانک یہ سب کچھ نظروں سے غائب ہو گیا اور ہر طرف نور ہی نور چھا گیا۔ مجھے احساس ہوا یہ نور الٰہی ہے جو خیرہ کن ہونے کے باوجود انتہائی طمانیت بخش ہے۔ پھر برسوں بعد آج سے تین سال پہلے جب حقیقت میں میں نے موت کو اپنے بہت قریب محسوس کیا تھا مجھے اس طمانیت بخش نور کی، اس نفس مطمئنہ کی جستجو تھی (اس کیفیت کو میں نے اپنے افسانہ 'کفارہ' میں بیان کیا ہے۔)

انھیں دنوں میں نے ایک اور خواب میں آنحضرت صلعم کو دیکھا کالی کملی والے بزرگ میرے قریب آئے۔ انھوں نے مجھے بتایا وہ رسول اللہ صلعم ہیں۔ گیسوئے دراز نورانی چہرے کا وہ جمال کہ دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ دست مبارک میرے سر پر رکھا اور مجھے دعائیں دیں۔ کہا کہ میں بہت اچھی لڑکی ہوں اور تاکید کی کہ آئندہ بھی اسی راہ پر قائم رہنا۔ رسول کا دیدار اس وقت ہوا تھا جب میری زندگی واقعی سادہ اور معصوم تھی۔ اب کسی شدید کشمکش کے موقع پر میں اس دست مقدس کے لمس کو یاد کرتی ہوں اور گھبرا کر سوچتی ہوں کہ کیا اب بھی مجھ میں وہ اچھائی ہے؟ اور کوئی خاطر خواہ تسکین بخش جواب نہیں پاتی۔

نہیں معلوم میرے تخیل کی شدت اور ارتکاز سے یہ ظہور ہوا تھا یا خداوند تعالیٰ کا کرم تھا کہ میں نے یہ وژن دیکھے اور روحانی (Elation) محسوس کیا۔ عقیدہ راسخ تھا۔ شکوک و شبہات دل میں جگہ نہ پاتے تھے۔ میں سادگی سے ہر بات پر ایمان لے آتی تھی۔ اب میں خود اپنے بچوں کے 'استفہامیہ دماغ' دیکھتی ہوں اور ان کو اس کم سنی میں، ایمان و عقل، جبر و اختیار، تقدیر و تدبیر کے مسئلوں پر خاصے انٹلکچوئل انداز میں بحث کرتے سنتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔

یہ میری نوجوانی کا وہ دور تھا جب میری زندگی 'محفوظ' (Sheltered) تھی۔ میں نے زندگی کی پیچیدگیاں نہیں دیکھی تھیں۔ دنیا کی ترغیبوں اور برائیوں کا سامنا نہیں کیا تھا۔

اب میرے لیے نیکی اور بدی کا سیاہ اور سفید کا تصور کئی رنگوں میں بٹ گیا ہے۔ اب باہر کی دنیا دیکھ کر اور مختلف ملکوں اور تہذیبوں کے درمیان رہ کر یہ محسوس کیا ہے کہ مختلف قوموں کی اخلاقی قدریں جدا ہیں۔ ان کی حد بندیاں الگ ہیں۔ ادب کے وسیع مطالعے نے یہ سمجھایا ہے کہ انسانی فطرت بہت پیچیدہ ہے۔ نیکی اور بدی کا مرکب اور جن لوگوں میں بعض برائیاں ہیں وہ دوسری حیثیت سے اچھے بھی ہو سکتے ہیں۔

گراہم گرین نے کہا ہے:

"It is easy to sympathise with the unjustly condemned the difficult thing is to sympathise with the justly condemned."

شاید یہ بھی، یہ وسیع المشربی اور رواداری کا جذبہ مجھ میں پیدا ہو گیا ہے۔ میرے شوہر شاہین کہتے ہیں کہ ''نیکی اور بدی کے اس مرکب تصور کو اور اس 'رواداری' کے جذبہ کو تم ادب کی حد تک ہی محدود رکھو ورنہ زندگی کے لیے اور خصوصیت سے اپنی ذاتی زندگی کے لیے تمھارے نانا ابا کی دی ہوئی تربیت اور ان کی قائم کی ہوئی حدیں ہی ٹھیک ہیں۔'' شاہین خود بھی بہت پڑھے لکھے ماڈرن اور آزاد ہونے کے باوجود ثقہ پیورٹن اصولوں کے پابند ہیں۔ نماز روزے کے خواہ وہ پابند نہ ہوں انھوں نے بھی ایک پاکیزہ زندگی بسر کی ہے۔

نانا ابا کی تعلیمات تو اسلام کی تعلیمات ہی تھیں پھر ان سے کیسے روگردانی کی جاسکتی تھی؟ اپنے زمانے کے اعتبار سے وہ روشن خیال بزرگ تھے، شادی بیاہ کے معاملوں میں انھوں نے لڑکیوں کی اپنی مرضی کا خاص خیال رکھا۔ وہ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے حامی تھے۔ ہم سب بہن بھائیوں کو انھوں نے گریجویٹ ہونے تک کالجوں میں تعلیم دلوائی بلکہ میرے چھوٹے بہن بھائیوں کو ابتدائی تعلیم کے لیے کونونٹ میں داخل کروایا۔ جب میری باری تھی تو انھوں نے کہہ دیا تھا:

''جس عمر میں کونونٹ کی لڑکیاں میٹرک یا سینئر کیمرج کرتی ہیں، ہماری

تاج بٹیا تو اس عمر میں بی اے کر لے گی۔"

اور ہوا بالکل یہی اور ان کی بات صحیح ثابت ہوئی۔ چنانچہ مجھے ابتدائی تعلیم کے لیے کونونٹ یا اسکول میں داخل نہیں کرایا گیا۔ گھر پر امی پھر ابا جان نے تعلیم دی اور ایک بڑی جماعت میں ایک نیم انگریزی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ وہاں سے ڈبل پروموشنز لے کر میں بہت جلد مہارانی ہائی اسکول آ گئی۔ پھر وہاں سے مہارانی کالج۔ مہارانی ہائی اسکول اور مہارانی کالج لڑکیوں کے لیے بہترین تعلیمی ادارے تسلیم کیے جاتے تھے۔ میسور یونیورسٹی کا معیار تعلیم بہت اونچا تھا اور اتنا سخت گیر کہ وہاں انٹرمیڈیٹ اور بی اے میں برسوں میں کوئی ایک فسٹ کلاس نکل آتا تھا۔ وہاں کا سیکنڈ ڈویژن ہی فسٹ ڈویژن کے برابر سمجھا جاتا تھا اور پھر کسی نے ریاست بھر میں کوئی رینک (درجہ) بھی حاصل کر لیا تو سمجھو ذہانت کی سند مل گئی۔ بی اے کرنے کے بعد میسور یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کا میرے لیے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم تھی جس کے نانا ابا سخت مخالف تھے۔

نانا ابا کی تعلیمات تو اسلام کی تعلیمات ہی تھیں پھر ان سے روگردانی کیسے کی جا سکتی تھی؟ ہم پر کسی دباؤ کا احساس نہ تھا اور نہ ہم میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ عنفوان بلوغیت کی اس قید و بند نے میرے سائیکی 'Pshyche' پر اثر ڈالا ہو اور میری شخصیت اس طرح نہ ابھر سکی ہو جس طرح کہ ایک آزاد فضا میں اس کے ابھرنے کا امکان تھا۔ تاہم مجھے اس وقت یہ مطلق احساس نہ ہوا تھا کہ یہ قید و بند میرے لیے مضر ہے اور نہ کسی قسم کی گھٹن اور فرسٹریشن کا احساس تھا (آزاد زندگی میں اور طرح کے فرسٹریشن اور جذباتی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں) شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے گھر کا ماحول خوشگوار تھا۔ میرا ہائی اسکول اور کالج کا کیریئر بہت اچھا رہا۔ عزیز سہیلیوں کے درمیان کالج کی زندگی — (Stimulating) اور فرحت انگیز تھی۔ پردے کی پابندی بھی پابندی معلوم نہ ہوتی تھی کیوں کہ میسور اور بنگلور میں پردے کا رواج عام تھا (یہاں عورتیں اور لڑکیاں برقعے نہیں پہنتی تھیں۔ تانگوں پر پردے اور کاروں میں بلائنڈز لگتے تھے) اور سبھی معزز گھرانوں کی

تعلیم یافتہ لڑکیاں پردہ کرتی تھیں۔

نانا جان کا یہ رویہ درست ہی تھا کہ کم از کم بیاہ ہونے تک لڑکیوں کو ایک حد میں رکھا جائے۔ اس کے بعد ان کے شوہروں کی مرضی پر منحصر ہے جس قدر چاہیں آزادی دیں۔ اب نانا جان میری بے پردگی کا برا نہیں مانتے اور نہ ہی انھیں میرے افسانوں اور مضامین پر کوئی اعتراض ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اب وہ بھی وسیع المشرب ہو گئے ہیں۔ یوں بھی اپنے زمانے کے اعتبار سے وہ روشن خیال بزرگ تھے۔ چنانچہ جب میں نے مہارانی کالج بنگلور سے بی اے کر لیا تو پھر کئی سال بعد میں نے کراچی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔

کالج کی زندگی کا دور، زندگی کا بہترین دور ہوا کرتا ہے۔ میری زندگی میں اور بھی پررونق اور مسرتوں سے معمور دور آئے ہیں لیکن اس زمانے کی اور نوخیزی کی سادہ مسرتوں کی بات ہی اور تھی۔ میں کالج میں پروفیسرز اور لیکچرر کی 'فیوریٹ' تھی۔ ہمارا کالج اسٹاف ان دنوں بہت اچھا تھا (اب وہ بات نہیں رہی)۔ پروفیسرز اور لیکچرر مرد اور عورتیں سب آکسفورڈ، کیمبرج، لندن، جرمنی کے پڑھے ہوئے علمی قابلیت رکھتے تھے۔ میں لڑکیوں میں بھی ہر دلعزیز تھی (یہ بات میرے حق میں اچھی ثابت نہ ہوئی کہ میں گھر پر بھی سب کی چہیتی لاڈلی تھی۔ بچپن ہی سے 'Child Prodigy' سمجھی جاتی تھی اور اسکول کالج میں بھی تحسین کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ چنانچہ مجھ میں 'نارسیسیت' اور خود پسندی پیدا ہو گئی) میری بڑی اچھی سہیلیاں تھیں، معزز گھرانوں کی مسلمان، ہندو اور عیسائی لڑکیاں۔ بہترین اور گہری دوستیاں اسی زمانے میں ہوا کرتی تھیں۔ میری بہترین اور سب سے عزیز دوست ('انگڑائی' کی زرینہ اور 'آئینہ' کی زینی) مرزا مہرین غازی تھیں۔ ایرانی نژاد تھیں اور سر مرزا اسمٰعیل کی رشتہ کی بھانجی لگتی تھیں (آج کل وہ اپنے میاں کے ساتھ تہران میں رہتی ہیں)۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتیں۔ ''ممتاز تم کالج کی سب سے ذہین لڑکی ہو اور تمھارے نانا جان ہیں کہ ایسی لڑکی کو سات پردوں میں چھپا رکھا ہے۔ اس کے باوجود شہر بھر میں تمھارا شہرہ

ہے۔ تمھارے نانا جان نے تمھیں اس قدر قید و بند میں نہ رکھا ہوتا تو نہ جانے تم کیسے چمکتیں، تمھاری پرسنلٹی کیسے ابھرتی۔''

ان دنوں بھی جب میں بنگلور کے مہارانی کالج سے بی اے کر رہی تھی اور ہوسٹل میں مجھے آزادی میسر تھی میں نے کوئی ایسی بات نہ کی تھی جو میرے نانا ابا کو ناگوار گزرتی گو وہ بنگلور میں موجود نہ تھے لیکن غائبانہ طور پر ان کی موجودگی کا احساس چھایا رہتا تھا۔

صرف ایک مرتبہ انھوں نے کہا تھا ''تاج بٹیا (وہ میرے پیدائشی نام ممتاز محل کی مناسبت سے مجھے پیار سے تاج بلایا کرتے تھے یا جنوبی ہند کے دستور کے مطابق تاجماں) اللہ تعالٰی نے تمھارے قلم کو اظہار کی قوت بخشی ہے اسے اصلاحی کاموں کے لیے وقف کرو۔ افسانوں اور تنقید پر اسے کیوں ضائع کرتی ہو؟ میں نے جواب دیا ''نانا جان ادب بھی اصلاح کا ذریعہ ہے اس کا اثر غیر محسوس طور پر زیادہ گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔'' یہ جواب سن کر وہ خاموش ہو گئے۔ اب سے تین سال پہلے جب ہم بنکاک سے واپسی پر میسور گئے تھے، نانا ابا خود افسانوی انداز میں اپنی سوانح لکھ رہے تھے۔

انھیں میرے شوہر سے کوئی شکایت نہیں تھی اگر شکایت تھی تو بس اتنی کہ وہ مجھے نہ صرف پاکستان لے گئے بلکہ دنیا جہان میں جانے کہاں کہاں لیے گھوم رہے ہیں۔ دس دس سال تک 'بچی' کی صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ بے چارے نانا ابا، انھوں نے کتنی محنت سے ہمیں پالا پوسا، ہم سے کتنی محبت کی۔ ان کی اس بے اندازہ محبت کا جواب میرے پاس کیا ہے؟ لیکن وہ اب بھی میرے لیے دنیا بھر میں دو چار محبوب ترین ہستیوں میں سے ہیں اور اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ عزیز ہیں اور آج تک ان کی شخصیت کا اثر میری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔

نانا ابا کی ثقاہت، پاکیزگی اور پرہیزگاری، ابا جان کی وسیع المشربی، لبرل خیالات، آزاد اور بے فکر زندگی، عیش کوشی اور آرام طلبی، امی کی سادگی، معصومیت، دنیا سے بے پروائی اور ناتجربہ کاری، صبر و قناعت اور گوشہ نشینی اور نانی اماں کا خلق، ملنساری، ہر

دلعزیزی، خوش ذوقی اور نفاست یہ سب متضاد اثرات اور خصوصیات غیر محسوس طور پر میرے کردار اور شخصیت میں گھلے ہوئے ہیں لیکن یوں کہا جا سکتا ہے کہ میری ابتدائی نصف زندگی پر نانا ابا کا اور بقیہ نصف (نصف سے کچھ زیادہ) زندگی پر میرے شوہر صمد شاہین کا اثر سب سے غالب رہا ہے۔

بی اے ہونے تک میرے سترہ سال پورے ہوئے تھے اور نانا جان کے خیال میں شادی کے لیے یہ بالکل مناسب عمر تھی۔ چنانچہ اسی عمر میں اسی سال 23 اگست 1942 کو میری شادی صمد شاہین سے ہو گئی۔ میرا بیاہ بغیر کسی رسم و ریت کے نہایت سادہ انداز میں ہوا۔ نانا ابا سادگی پسند تھے، رسومات کے قائل نہ تھے اور جو نانا ابا کی رائے تھی، وہی ابا، امی کی بھی رائے تھی۔ نہ مجھے مایوں بٹھایا گیا نہ مہندی کی رسم ہوئی نہ جنوبی ہند کے دستور کے مطابق 'شکرانے' کی رسم۔ حتیٰ کہ آرسی مصحف کی رسم بھی ادا نہیں کی گئی۔

میری شادی گویا مشرق کی 'طے ہوئی' اور مغرب کی 'محبت کی شادی' کے بین بین درمیانی نوعیت کی تھی۔ یعنی دونوں گھر والے بھی رضامند تھے اور ہم دونوں کی اپنی مرضی اور پسند بھی تھی اور میں نے ایک خالص مشرقی لڑکی کی طرح اپنے ہونے والے شوہر سے محبت کی تھی۔ ہمارے ٹھیٹ مشرقی گھرانے میں مغربی انداز کی 'کورٹ شپ' کا کوئی دخل نہ تھا لیکن نانا ابا نے اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ ہم دونوں —— یعنی شاہین اور میں کسی 'شاپرون' کی موجودگی میں ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔

صمد شاہین کی عمر اس وقت 26-25 سال کی تھی۔ سجیلے، جامہ زیب اور وجیہہ نوجوان تھے، طرحدار شخصیت کے مالک (اور اب بیس اکیس سال بعد بھی ان میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور نہ اس طویل قربت نے میرے پہلے تاثر کو ڈزالوژن میں تبدیل کیا ہے) وہ ابھی طالب علم تھے پونا اور بمبئی میں ایم اے ایل ایل بی کے لیے ٹرم ڈال رہے تھے۔ ابھی شادی کا ارادہ نہ تھا لیکن جب وہ چھٹیوں میں گھر آئے تو ان کے

چھوٹے بھائی صادق سہیل نے انھیں رضامند کرلیا۔ شاہین اپنے چھوٹے بھائی سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ یہ دو بھائی جو چودہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں، گویا ایک جان دو قالب ہیں۔ صادق سہیل سب سے چھوٹے ہونے کے باوجود بہت سنجیدہ، ذمہ دار، دور اندیش اور دانشمند ہیں اور خاندان اور گھر کے سارے معاملوں میں انھیں کا دخل ہے۔ چنانچہ وہی میرے لیے پیام لے آئے تھے اور سارے انتظامات اور امور انھوں نے طے کیے تھے۔

جب نانا ابا نے منظوری دے دی، اس رشتہ کو منظور کرلیا اور بات پکی ہوگئی تو انھوں نے مجھے بلا کر کہا "تاج بیٹی تمھارے لیے یہ انتخاب بہت موزوں رہے گا۔ تم دونوں کا جوڑا بہت اچھا ہے۔ تم لکھنے پڑھنے کی شوقین ہو اور صمد بھی تمھارے ہم ذوق ہیں۔ بات طے کرنے سے پہلے میں نے تمھارا ارادہ بھی معلوم کرلیا تھا۔ تمھاری امی اور بہنوں کے ذریعہ مجھے علم ہوگیا تھا کہ تم بھی صمد کو بہت پسند کرتی ہو۔ بیٹی ان کی دو باتوں سے میں خاص طور پر متاثر ہوا ہوں۔ ایک تو یہ کہ تمھارے منگیتر نے صاف انکار کردیا کہ ہماری جانب سے کوئی جہیز، روپیہ حتیٰ کہ زیور بھی نہ دیا جائے۔ آج کل کے نوجوانوں میں یہ بات کہاں ہوتی ہے؟ گو ان کے پاس بھی خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ وہ ریاست میسور کے متمول ترین کافی پلانٹرز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے اپنے خاص کافی اسٹیٹ ہیں لیکن ان کے کافی کے باغات سے زیادہ مجھے ان کی لائبریری نے متاثر کیا ہے۔ جس لڑکے نے اس عمر میں اتنی بڑی لائبریری جمع کر رکھی ہو، کتابوں کے انتخاب میں جس کا ذوق اتنا اچھا ہو اور اپنی نوجوانی میں لہو و لعب اور فضولیات میں پڑے بغیر جس نے پڑھنے لکھنے کو اوڑھنا بچھونا بنایا ہو، ایسا سنجیدہ طبیعت اسکالر ٹائپ نوجوان ہی تمھارے لیے بہترین رفیق حیات ثابت ہوسکتا ہے اور تم جیسی ذہین لکھنے پڑھنے کی شوقین لڑکی کے لیے اس گھر میں بہت اچھا ماحول ملے گا۔"

میں حیران رہ گئی کہ نانا ابا اتنے کھلے طور پر مجھ سے میرے ہونے والے شوہر کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور میرا رشتہ طے کرنے میں انھوں نے ان سب باتوں کا اور

میری اپنی پسند کا خیال رکھا تھا۔ بزرگوں کی طے کی ہوئی شادیوں کو دقیانوسی سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بزرگ اپنے بچوں کی آئندہ زندگی کی بہتری کا ہر طرح لحاظ رکھ کر یہ طے کرتے ہیں۔ طرفین کی خاندانی شرافت حسب نسب، سماجی حیثیت، مادی خوشحالی، لڑکے لڑکی کی تعلیم، کردار کی درستی، یہ سب باتیں ان کے پیش نظر ہوتی ہیں۔ (یوں دیکھا جائے تو مغرب کی شادیاں بھی اس اعتبار سے طے کی ہوئی ہوتی ہیں کہ ان سب باتوں کا لحاظ رکھ کے لڑکے لڑکیوں کو آپس میں ملنے دیا جاتا ہے۔)

شاہین حقیقتاً میرے لیے بہت اچھے شوہر اور موزوں رفیق حیات ثابت ہوئے اور ان کے گھر میں بھی مجھے بہت اچھا ماحول ملا، اتنا اچھا کہ مجھے اپنا 'نے ہر' جو صحیح معنوں میں 'نے ہر' تھا چھوٹنے کا غم نہ رہا۔ یہ بھی بھرا پرا پر رونق گھر تھا۔ میرے دیور صادق سہیل ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے اور شاہین کی امی اپنے چہیتے بیٹے کے سہرے کا ارمان دل میں لیے ہی اس دنیا سے سدھار گئی تھیں۔) ان کے علاوہ جیٹھوں، نندوں کے بیٹے بیٹیاں تھیں جو میسور، پھر بنگلور میں ہائی اسکول اور کالجوں میں تعلیم پا رہی تھیں۔ نوعمر لڑکے لڑکیوں کی موجودگی سے گھر میں بڑی رونق رہا کرتی تھی۔ شاہین کی بھانجیاں، بھتیجے سب مجھ سے دو چار سال چھوٹے تھے اور آپس میں ہم سب دوستوں بلکہ بھائی بہنوں کی طرح رہا کرتے تھے (کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی رنجشیں پیدا ہوتی تھیں تو بہت جلد دور ہو جایا کرتی تھیں) مجھے یوں محسوس ہوتا تھا میکے میں میں اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو چھوڑ آئی ہوں تو ان کے بدل یہاں بھی مجھے چھوٹے بھائی بہنیں مل گئی ہیں۔

شاہین کے خاندان میں یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی لڑکی باہر سے بیاہ کر لایا تھا۔ ان کے یہاں آپس میں ہی شادیاں ہوا کرتی تھیں اور دوسرے سب بھائی عم زاد، خالہ زاد بہنوں سے بیاہے گئے تھے۔ خاندان بھر میں اس کا خوب چرچا ہوا کہ شاہین شہر سے ایک گریجویٹ پڑھی لکھی لڑکی بیاہ کر لائے ہیں لیکن اس کا کسی نے برا نہیں مانا اور سسرال میں جہاں کہیں بھی گئے بڑی گرمجوشی اور محبت سے میرا استقبال کیا گیا۔

شادی کے ڈیڑھ ایک مہینے بعد شاہین مجھے باری باری اپنی بہنوں اور بھائیوں کے کافی اسٹیٹز (Estates) پر لے گئے پھر اپنے اسٹیٹز پر لے گئے۔ ہم دونوں چاہتے تھے کہ شادی کے ابتدائی مہینے شہر سے دور ایک پرسکون، پرفضا مقام میں گزاریں اور واقعتاً یہ نہایت پرفضا مقام تھا۔ ویسٹرن گھاٹز میں کوئی پانچ چھ ہزار فیٹ کی بلندی پر یہ کافی کے باغات واقع تھے۔ ان باغات کو گھیرے ہوئے پہاڑیاں تھیں اور جنگل اور ہمارے اسٹیٹز کے عین درمیان شارولی ندی بہتی تھی۔

کافی کے باغات کے علاوہ سنترے اور کیلے کے باغ تھے، کٹھل، آم اور دوسرے امرود کے درخت، اناس اور دوسرے پھلوں کے آرچرڈ، چھوٹی الائچی اور کالی مرچ بھی خوب ہوتی تھی جو بڑی قیمت پر بکتی تھی اور دنیا کی بہترین کافی 'پی بیری' ہمارے اسٹیٹز پر ہوتی تھی۔

مشرقی بنگال میں سلہٹ کے چاء کے باغات کی طرح، جنوبی ہند کے کافی کے باغات بھی پہاڑوں کی ڈھلانوں پر ہوتے تھے۔ سینکڑوں ایکڑ پر پھیلے ہوئے باغات میں کافی کے پھول لگتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے چیری بلوزم کا موسم ہو۔ پھر کافی کے پودے سرخ سرخ پھلوں کے گچھوں سے لد جاتے تھے۔ پکے سرخ پھلوں کو توڑ کر کھلیانوں میں سکھایا جاتا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے بڑا رومانی لگتا تھا۔ نوخیز عمر اور شادی کے ابتدائی مہینے، ہر بات میں رومانیت ہی رومانیت نظر آتی تھی۔

لیکن یہاں آن کر مجھے مختلف نوعیت کا تجربہ ہوا۔ یہاں میں نے مزدور طبقے کو قریب سے دیکھا۔ یہاں مجھے پہلی مرتبہ براہ راست مزدور طبقے سے واسطہ پڑا۔ اس وقت ترقی پسند ادب کا دور دورہ تھا اور میں نہ صرف اردو کے ترقی پسند ادیبوں کو پڑھا کرتی تھی بلکہ مغربی ادب میں بھی خاص طور پر 1930ء کے ادیبوں کو اور ان تحریروں کو پڑھا کرتی تھی جو نچلے طبقے اور مزدور طبقے سے متعلق تھیں۔ ان کے زیر اثر مجھ میں آسودہ طبقے سے ہونے پر احساس انفعالیت سا پیدا ہو گیا تھا اور اس طبقے سے میں نے جو ہمدردی محسوس کی

تھی وہ پر خلوص ہونے کے باوجود Qaive قسم کی تھی۔ اس طبقے سے مجھے اب تک اتنی ہی واسطہ رہا تھا کہ گھر کے نوکروں کی مصیبت بھری داستانیں ہمدردی سے سنیں۔ کہیں برسر راہے شہر کے مزدوروں کو کام کرتے دیکھ کر اپنے آپ پر رقت طاری کر لی اور یہاں میں نے اپنے اسٹیٹز پر سینکڑوں مزدوروں کو کافی کے باغات میں اور کسانوں کو اپنے کھیتوں میں کام کرتے دیکھا تو یہ احساسِ انفعالیت اور گہرا ہو گیا اور یہ اچانک ہوا کہ ہم 'دوسرے کیمپ' میں ہیں یعنی خود سرمایہ دار ہیں۔ مزدور عورتیں مجھے 'اسٹیٹ کی رانی' کہا کرتی تھیں تو عجب سی ندامت محسوس ہوتی تھی لیکن ایک بات سے اطمینان تھا کہ ہمارے ہاں ان مزدوروں، کسانوں کی حالت دوسری جگہوں سے بہت بہتر تھی۔ انھیں مزدوری مناسب دی جاتی تھی۔ ان کے لیے پکے، ہوادار مکانات بنوائے گئے تھے۔ دوائیاں مفت تقسیم کی جاتی تھیں۔ ان کی فریادیں سنی جاتی تھیں، ان کے آپس کے جھگڑے چکائے جاتے تھے۔

یہ مزدور سرحد مالابار کے گھاٹی مزدور تھے جو بنگلور سے لائے جاتے تھے۔ ان کی جنسی زندگی آزاد تھی اور آئے دن شکایتیں آتی رہتی تھیں کہ فلاں کی بیٹی کو کوئی اڑا لے گیا۔ فلاں کی بیوی شوہر بچوں کو چھوڑ کر فلاں کے ساتھ رہنے لگی ہے۔ کھلیانوں کے پاس ہمارے اسٹیٹز پر کام کرنے والے مزدوروں کی ایک پوری کی پوری بستی آباد تھی۔ ان کے تہوار ہوتے تھے تو گہری رات میں مزدور بستی سے گانے بجانے کی آوازیں گونجتی تھیں۔ بڑے بڑے الاؤ جلتے تھے اور ان کے گرد لوک ناچ ہوتے تھے۔ سارا ماحول اور پس منظر اتنا Exotic تھا کہ اس پر ایک کتاب ہی لکھی جا سکتی تھی۔ ان دنوں میں نے ملک راج آنند کی کتاب 'Two Leaves and a Bud' پڑھی تھی جو چائے کے باغات کے پس منظر میں لکھی گئی تھی اور کافی کے باغات کے پس منظر میں ایک ناولٹ لکھنے کا مجھے بھی خیال آیا ہوا تھا۔ لیکن ہم زیادہ دیر یہاں نہ رہے اور بعد میں بھی ہم شاذ ہی اپنے اسٹیٹز جاتے تھے۔ سارے انتظامات ایک منیجر کے سپرد تھے اور اپنے اسٹیٹز کے ساتھ ہمارے اسٹیٹز کی دیکھ بھال بھی شاہین کے چھوٹے بھائی صادق سہیل کیا کرتے تھے اور ہم شہر ہی میں رہتے تھے۔

یہاں تین چار ماہ رہ کر ہم میسور واپس ہوئے تو شاہین ہائی کورٹ میں ایڈووکیٹ ہو گئے لیکن ان کی پریکٹس برائے نام تھی اور کورٹ کے کیسوں کے مطالعہ میں ان کا جی بالکل نہ لگتا تھا۔ ہماری لائبریری ایسٹیٹز پر تھی اور یہاں ہم چن چن کر بہترین کتابیں ساتھ لے آئے تھے اور بس کتابیں تھیں اور ہم تھے۔ دن رات مطالعہ اور ادبی بحث میں گزرتے پھر ہم نے وہ اسکیم بنائی جس کی ہم دونوں کو دیرینہ آرزو تھی۔ یعنی ایک معیاری ادبی رسالہ نکالنے کی اسکیم۔ شہر میسور میں رسالے کے اجراء کے لیے زیادہ سہولتیں نہ تھیں۔ لہٰذا ہم بنگلور منتقل ہو گئے اور 1944 میں شادی کے سال بھر بعد ہم نے بنگلور سے 'نیا دور' (اور ایک انگریزی ہفتہ وار 'میسورین') نکالا۔ بہت جلد شمالی ہند کے اچھے اچھے ادیبوں کا تعاون ہمیں حاصل ہو گیا اور آن کی آن میں 'نیا دور' کو جو کتابی صورت میں اردو کا پہلا رسالہ تھا، وہ ترقی حاصل ہوئی کہ اس کا شمار ہندوستان بھر کے دو ایک سب سے معیاری ادبی رسالوں میں ہونے لگا۔

'نیا دور' کو ہم نے نہایت محبت اور محنت سے پروان چڑھایا۔ 'نیا دور' کے اجراء کے چند مہینوں بعد ہمارے ہاں بچہ پیدا ہوا لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے 'نیا دور' بھی اپنا بچہ ہے۔ اب مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید میں نے اپنے دو بچوں سے زیادہ 'نیا دور' پر توجہ دی تھی اور بچے میری ماں، بہنوں، بھتیجے اور بھانجیوں میں ہاتھوں ہاتھ پل گئے تھے۔ میں ابھی کمسن تھی بیس سال کے اندر دو بچوں کی ماں بن گئی تھی اور مجھ میں بچوں کی تخلیق سے اپنی زندگی اور شخصیت کی تکمیل کا شعور ابھی پوری طرح بیدار نہ ہوا تھا لیکن شوہر، دو ننھے بچوں اور 'نیا دور' کے ساتھ میری ننھی سی دنیا مکمل تھی۔

شادی کے بعد چار سال میسور اور بنگلور میں بڑے اطمینان اور سکون سے گزرے تھے کہ 1947 کے فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس آگ کے شعلوں نے ریاست میسور کو صرف چھوا ہی تھا۔ یہاں بظاہر امن و امان تھا۔ بہت کم وارداتیں ہوئی تھیں۔ ہمارے محلے بسون گڑھی میں جو خالص مسلمانوں کا محلہ تھا، یہ خبر پھیلی تھی کہ پاس کے مندر سے سر

شام سنکھ بجنے کی آواز آتی ہے اور دوسرے محلوں کے ہندو یہاں جمع ہوتے ہیں اور اس مسلمان محلے پر حملہ کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ ایک خوف و ہراس کی کیفیت پیہم چھائی رہتی تھی۔ تاہم فسادات کی آگ کے بھڑکنے کا یہاں امکان کم ہی تھا۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد ہم نے پاکستان جانے کا ارادہ کر لیا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ہم خطرے میں گھرے ہوئے تھے۔ یہ ہماری دیرینہ آرزو تھی اور عرصے سے یہ عقیدہ ہمارے دل میں جاگزیں تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل پاکستان سے وابستہ ہے۔ ہمارے رشتہ داروں میں سے کوئی بھی ہمارے ساتھ پاکستان آنے پر تیار نہ تھے۔ شاہین کے بھائیوں نے انھیں سمجھایا کہ وہ پاکستان میں ایک نئی زندگی کا آغاز کیسے کریں گے؟ زندگی گویا 'صفر' سے شروع کرنی ہوگی اور بہت ممکن ہے کہ شاہین اپنی ساری آبائی جائیداد، مکانات، کافی اسٹیٹز سب کچھ کھو بیٹھیں۔ لیکن شاہین مصر رہے کہ آبائی جائیداد کھونے کا انھیں افسوس نہیں ہوگا اور پاکستان میں انھیں پچاس روپے کی نوکری قبول ہے۔ چنانچہ دو ہی ہفتہ بعد یعنی اگست کے آخر میں وہ پاکستان چلے گئے۔ کراچی کے سندھ مسلم مدرسہ کالج اور سندھ مدرسہ لاء کالج دونوں جگہ انگریزی ادب اور قانون کے لیکچرر ہو گئے۔ پانچ مہینے بعد 1948 کے آغاز میں وہ واپس آ کر مجھے اور بچوں کو، جو اس وقت دو تین سال کے تھے، اپنے ساتھ پاکستان لے آئے۔

پاکستان آنا ہمارے لیے نقل وطن تھا یا ہجرت؟ ہم فسادات کی قیامت سے نہیں گزرے تھے اور اپنے رشتہ داروں کو اچھی حالت میں چھوڑ آئے تھے۔ بچھڑے ہوؤں کا خیال کسے نہیں آتا اور اپنے وطن کے گلی کوچے یاد نہیں آتے۔ میں میسور اور بنگلور کے لیے 'نوسٹولجیا' [ناسٹلجیا] محسوس کرتی ہوں اور شاہین کو اگر کوئی مقام بے انتہا عزیز تھا تو وہ ان کا اپنا کافی اسٹیٹ 'بیلگوڈ' تھا۔ شاہین کی پیدائش اور ہمارے ہنی مون کا وہ پر فضا مقام، وہ جنگل، وہ باغات، وہ پہاڑیاں، ندی اور جھرنے... شاہین کے بچپن اور نوجوانی کی یادیں

یہیں سے وابستہ تھیں اور وہ اس مقام کے لیے 'نوسٹولجیا' [ناسٹلجیا] محسوس کرتے ہیں۔ تاہم پاکستان آنے کے بعد ایک نئی سرزمین میں اپنی ایک نئی دنیا بسانے کا احساس اس نوسٹولجیا پر غالب آ گیا اور ہم نے اپنے آپ کو اس نئے روحانی وطن سے مکمل طور پر وابستہ کر لیا۔

لہٰذا ہجرت کا احساس جلاوطنی کے احساس پر منتج نہ ہوا۔ ویسے 'اجنبی' اور 'جلاوطن' ہونے کا احساس موجودہ دور کے انسان کے خمیر میں ہے۔ وہ اس دنیا میں خود اپنے وطن میں بلکہ اپنے جسم کی قید میں اپنے آپ کو 'اجنبی' اور 'جلاوطن' کر سکتا ہے۔

پاکستان آنے کے بعد ہماری زندگی ایک مستقل سفر بن گئی ہے۔ ایک سفر سے دوسرا سفر، مشرق سے مغرب کی طرف اور مغرب سے مشرق کی جانب۔ لیکن پاکستان کا سفر میرے لیے سب سے بڑا سفر تھا۔ گو مکانی فاصلہ کے اعتبار سے میں نے اس سے بڑے سفر کیے ہیں۔ کیوں کہ یہ سفر صرف جسمانی نہیں، ذہنی، جذباتی اور روحانی سفر بھی تھا۔ ایک نئی زندگی کا آغاز اور ایک نئے ملک سے اپنی ساری وفاداریوں، حب الوطنی اور جذباتی لگن کا وابستہ ہونا ایک اہم تجربہ تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف اپنا انفرادی تجربہ نہ تھا بلکہ قوم کا اجتماعی تجربہ بھی تھا۔

...(ناتمام)

●●●

اپنی نگریا

ممتاز شیریں کے افسانے ایک اعتدال پسند اور متوازن مزاج کی پیداوار ہیں۔ ان کے افسانوں کی یہ خصوصیت واقعی قابل غور ہے کہ ان کا ہر افسانہ نسائیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ نسائیت سے میرا مطلب جھوٹی شرم وحیا اور ریا کاری نہیں ہے، بلکہ سنجیدگی، ملائمت، توازن، نرمی، اس بات میں ممتاز شیریں اردو کی زیادہ تر لکھنے والیوں سے الگ ہیں۔

— محمد حسن عسکری

آئینہ

میں ایک بڑے آئینہ کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ میری توجہ بال بنانے پر نہ تھی۔ یونہی کنگھی کیے جا رہی تھی۔ دراصل میں اپنے چہرہ پر طرح طرح کے جذبات کے اظہار کا مطالعہ کر رہی تھی اور کیا کہنے بڑا ہی مزہ آ رہا تھا...... بال بنانے میں ضرورت سے زیادہ دیر لگ رہی تھی۔ امّی کہیں گی "کچھ کام بھی کروگی پرویں! تم ہو، آئینہ ہے اور بس جب دیکھو آئینہ کے سامنے"...... نہیں آج امّی بھی کچھ نہ کہیں گی۔ آج تو وہ مجھ سے بہت خوش ہیں۔ ابھی ابھی، آج ہی میرا رزلٹ معلوم ہوا ہے نا؟ رزلٹ اور آئینہ نے خوشی کی تصویر پیش کردی۔ سیکنڈ ڈویژن! اور میرے گال تمتمار ہے تھے...... ہونہہ! سیکنڈ ڈویژن بھی کوئی بڑی بات ہوئی میرے لئے؟ میں تو ہمیشہ جماعت میں اوّل آیا کرتی تھی۔ مجھے تو فسٹ ڈویژن میں کامیاب ہونا چاہئے تھا۔ ایک ہلکی سی تحقیر اور ناز...... ارے میں یوں بھی بھلی معلوم ہوتی ہوں؟...... پھر بھی اگر کسی دوسرے امتحان کا نتیجہ ہوتا تو کچھ پروانہ تھی۔ بی اے! ان دو ننھے سے حرفوں میں کتنی شان ہے۔ کتنا دبدبہ! اب تو میں گریجویٹ ہوں۔ آئینہ کی تصویر پر رعب اور فخر چھا گیا...... گویا میں اپنی صورت نہیں دیکھ رہی تھی۔ بلکہ پردہ فلم کی کسی ہیروئن کے چہرہ پر بدلتے جذبات کو یا کسی مصوّر کی بنائی ہوئی تصویروں کو جن میں مصوّر نے خاص خاص جذبے کو کینوس پر کھینچا ہے...... اب لڑکیاں میرا پیچھا نہ چھوڑیں گی۔ خوب ستائیں گی۔ "مٹھائی کھلاؤ۔ مٹھائی کھلاؤ" اور میں کہتی پھرتی تھی نا کہ اس سال

ہرگز کامیاب نہ ہوں گی۔ میں نے امتحان کے لئے ذرّہ بھر بھی تیاری نہ کی تھی اور وہ کہتی تھیں ''آخر تم کامیاب نہ ہو تو کسی اور کی کامیابی کی امید بھی ہو سکتی ہے۔'' اور مجھ سے شرطوں پر شرطیں باندھا کرتی تھیں۔ بھلا مٹھائی پر راضی ہو جائیں گی۔ شاید پارٹی ہی دینی پڑے۔ ہاں، کیوں نہ آج ہی اپنی چند خاص سہیلیوں کو بلا کر پارٹی دوں۔ خوب لطف آئے گا۔ گھر بیٹھے بیٹھے میرا جی اکتا گیا ہے...... اوہ! امی بھی ادھر آ نکلیں۔ ''آج میں سہیلیوں کو چائے پر بلاؤں امّی؟''

''ہاں، ہاں'' کیوں نہیں بیٹی۔ شوق سے بلاؤ۔ آخر ایسی خوشی کے موقع بار بار نہیں آتے'' آہا! آج امّی نے کتنی جلد اجازت دے دی۔ زینی کو ضرور بلاؤں گی وہ تو پارٹی کی جان ہوگی پھر۔ اور صرف اسی کو معلوم ہے نا کہ...... اوں...... اماں! بڑی شریر ہے وہ تو سب سے کہہ دے گی۔ پروین کو ڈبل کنگریچولیشن دو۔ ایک تو اس کے گریجویٹ بننے پر اور دوسرا اس سے بڑھ کر اس کی اینگیجمنٹ (Engagement) پر۔'' اور سب لڑکیاں مجھ پر ٹوٹ پڑیں گی۔ چھیڑتی چھیڑتی میرا ناک میں دم کر دیں گی۔ اور میں بناوٹی غصہ سے یوں منہ بنا لوں گی...... ارے تو غصہ بھی مجھے بھاتا ہے۔ منہ پھلائے ہوئے میں بھی مَیں اچھی لگتی ہوں۔ یہ تو آج ہی معلوم ہوا۔

ہاں ہاں لڑکیاں کہا کرتی تھیں نا ''غصہ کا اظہار کرتی ہوئی تم تو بالکل مادھوری کی سی دکھائی دیتی ہو'' لیکن میں نے آج تک توجہ سے نہ دیکھا تھا۔ واللہ یہ آئینہ بھی بڑی انوکھی ایجاد ہے۔ اپنی تصویر کو جس پوز میں، جس پہلو میں چاہو دیکھ لو جس طرح بھی چاہے دیکھ لو...... ہاں۔ تو میں اپنے چہرے پر یوں مصنوعی غصہ پیدا کر دوں گی۔ گو جی تو یہی چاہتا ہوگا کہ وہ یونہی چھیڑتی جائیں۔ ہاں۔ گھنٹوں یونہی چھیڑتی رہیں۔ کیسا لطف آئے گا ان کی اس چھیڑ چھاڑ میں۔ ایک خاص لذت...... چائے کے اختتام پر زینی مجھ سے گانے کے لئے اصرار کرے گی تو کیا گاؤں؟...... ہاں وہ فلمی گیت گاؤں گی۔ وہ گیت—

ساجنا جمنا پیچھے کھیلوں۔ کھیلوں اکیلی کیا؟

اور جب میں یہ گیت گا رہی ہوں گی تو زینی ایسی معنی خیز۔ ایسی شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہوگی...... اور پھر وہ برس ہی تو پڑے گی۔ ساتھ ہی گدگداتی ہوئی ''اکیلی، اکیلی؟ ہم اتنی سکھیاں جو ہیں۔ ہونہہ! اب ہماری حقیقت ہی کیا ہے۔ اسے تو اپنا ساجن چاہئے۔ اپنا...... نہ ہو تو'' ...... اُف...... میں...... کے خیال ہی سے کیسے شرما جاتی ہوں۔ میں نے ذرا سی نظریں اٹھا کر آئینہ میں پھر دیکھا۔ یہ تصویر تو سب سے دلکش تھی۔ میں...... کے سامنے شرماتی ہوئی بھی ایسی ہی نظر آؤں گی نا۔

چھوٹی بی بی! کیا ہے خیرن بی۔ ایک خبر سنانے آئی تھی۔ ''خبر'' میں نے مڑ کر پوچھا۔ ''ہاں ہاں کہو نا کیا خبر''۔

''ارے آج تو تم بہت خوش نظر آ رہی ہو۔ بی بی! ہاں یاد آیا۔ بڑی بیگم کہہ رہی تھیں تم کسی بڑے امتحان میں کامیاب ہوگئی ہو۔ ایسی خوشی کے وقت تمہیں بُری خبر سنا کر رنجیدہ کروں۔ چھی چھی۔ توبہ توبہ'' وہ جانے لگی۔

''ارے ٹھہرو خیرن بی! آخر کچھ معلوم بھی ہو۔''

''کچھ نہیں بی بی۔ وہ جو ہمارے محلے میں نانی بی رہتی تھیں نا۔ وہی جو بچپن میں تمہیں کھلایا کرتی تھیں...... ارے توبہ میرے منہ سے تو نکل ہی گیا تھا، نا بابا۔ چھی چھی خوشی کے وقت یہ خبر کیسے سناؤں۔''

''میری خوشی جائے بھاڑ میں۔ آخر کہتی کیوں نہیں ہو۔ اور یہ نانی بی کی بات ہے تو میں سنوں گی ہی۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے۔''

''اوئی میرے اللہ میں نے کیا کیا! بڑی بیگم مجھ پر خفا ہو جائیں تو؟ جس وقت ہم تم چھوٹی تھیں۔ انہوں نے تاکید کی تھی کہ ''نانی بی'' کا نام تمہارے سامنے نہ لیا کروں۔''

''امی تمہیں کچھ نہ کہیں گی۔ اس کا ذمہ میں لیتی ہوں۔''

''کل رات نانی بی جاتی رہیں۔ بیٹی ہم سب محلہ کی عورتیں ان کے پاس جمع تھیں، خیرن بی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''مرتے وقت تمہارا ہی نام زبان پر تھا۔''

گویا تصویروں کے سٹ کو مکمل کرنے میں ایک اور جذبہ کی کمی تھی — اداسی کی جھلک — اور میں بال گوندھتی ہوئی آئینہ کے سامنے سے چلی آئی۔

نانی بی — میری بوڑھی انا، وہی جس نے اتنے سال مجھے اپنی گود میں کھلایا تھا۔ اب اس دنیا میں نہیں ہے؟ کاش میں اپنی انا کو مرنے سے پہلے ایک بار دیکھ لیتی۔ میں کیا کچھ نہ دیدوں گی۔ پھر اپنی انا سے صرف ایک بار ملنے کے لئے! میری انا کیا تم میرے سہانے بچپن کی ان تمام یادوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئی ہو؟ ان ننھی ننھی دلچسپیوں کی یاد کو، ان خیالات کو جو تمہارے بڑھاپے اور میرے بچپن کے جوڑ سے پیدا ہو گئے تھے؟ آخر تم نے اس دنیا کو چھوڑا کیسے؟ تم جو اس دنیا کو اتنا عزیز رکھتی تھیں گو اس دنیا میں تمہارے لئے کوئی خوشی نہ تھی۔ ہاں میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تاہم تمہیں زندگی سے محبت تھی۔ تم زندہ رہنا چاہتی تھیں۔ ایک بے بسی۔ ایک مایوسی کے ساتھ اس دنیا سے چمٹی ہوئی تھیں۔ غم کے مارے بھی اس مصیبت بھری دنیا سے کیسے چمٹے رہتے ہیں!...... اور تم تو، نانی بی! چھوٹی چھوٹی مصیبتوں کو بھی سہہ نہ سکتی تھیں۔ ستائی ہوئی تصور کرتی تھیں۔ میں نے تمہیں کبھی ہنستے نہ دیکھا تھا۔ تمہارے لئے اس دکھ بھری دنیا میں اگر ذرا سی خوشی اور دلچسپی کا کوئی ذریعہ تھا تو وہ میں ہی تھی۔ تم مجھے گود میں لے کر سب کچھ بھول جاتی تھیں...... ہاں میری انا، تم مصیبت زدہ تھیں۔ مگر دنیا کو تم سے ہمدردی نہ تھی۔ امی، ابا کو بھی نہیں۔ گو ان کے گھر میں تم اتنا کام کیا کرتی تھیں۔ آخر کیوں؟ اگر تمہارے چہرہ پر تمہارے دلی دکھ کا ذرا بھی اظہار ہوتا تو شاید لوگوں کو تم سے کچھ ہمدردی ہوتی۔ مگر تم یوں دکھائی دیتی تھیں گویا تم میں جذبات ہی نہیں۔ ایک پتھر کی مورت سی...... اور میری غریب انا! تمہارے چہرہ میں کچھ ایسی چیز بھی نہ تھی جو ذرا سی بھی کشش رکھتی جو لوگوں کے دلوں میں رحم کے جذبہ کو ابھار سکتی۔ سیاہ رنگ۔ پچکے ہوئے گال، روکھے سفید بال، پوپلا منہ، لٹکتے ہوئے ہونٹ، بے نور، اندر کو دھنسی ہوئی، چھوٹی چھوٹی منکوں کی سی آنکھیں۔ انسانی زندگی کی بوسیدگی کی مکمل تصویر! تمہاری یہ ہیئت

اور اس پر ظاہری بے حسی دلوں میں رحم کی بجائے ایک ہلکی سی نفرت، ایک خوف سا پیدا کر دیتی تھی۔ گویا تم پرانے قصوں کی کوئی جادوگرنی ہو۔ اور امی تو تمہیں جادوگرنی ہی سمجھتی تھیں۔ جب کبھی وہ تمہیں ڈانٹ بتائیں تو تم کچھ جواب دینے کی بجائے خاموش نگاہوں سے گھورنے لگتیں۔ شاید تمہارے یوں دیکھنے سے تمہارا مدعا طلب رحم ہوتا۔ مگر تمہاری پھیکی بے نور آنکھیں اس کو ظاہر نہ کر سکتی تھیں۔ اور امی کسی خوف سے سہم جاتیں۔ گویا تم ان پر آنکھوں کے ذریعہ جادو اتار رہی ہو۔ ابا بھی تم سے دور دور رہتے تھے۔ جب کبھی انہیں تم سے بات کرنے کی ضرورت ہوتی تو وہ دوسری طرف منہ پھیر کر نہایت بے پروائی سے جواب دیتے...... وہی خوف ملی ہوئی نفرت کا جذبہ...... گھر میں کوئی بھی تمہیں چاہتا نہ تھا۔ مگر میری بوڑھی بے بس انا، میں تمہیں چاہتی تھی، ننھے سے دل سے۔ اس محبت نے مجھے ایک چھوٹی فلاسفر بنا دیا تھا۔ کیونکہ میں ہی تمہیں سمجھ سکتی تھی۔ ابا کا علم، ان کی عمر، امی کا تجربہ تمہیں سمجھنے میں مدد نہ دے سکے تھے۔ مگر میں گو ننھی سی تھی۔ تمہیں اچھی طرح سمجھتی تھی کیونکہ مجھے تم سے محبت تھی۔ ہمدردی تھی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ تم میں کوئی جادو کی طاقت نہیں تھی۔ تم بے بس تھیں، کمزور تھیں۔

دس بارہ سال پہلے کی زندگی میری آنکھوں میں پھرنے لگی۔ بہت سی تصویریں میرے دماغ کے پردہ پر ابھرنے لگیں۔ اس وقت کی تصویریں جب میں ننھی سی تھی۔ ہر وقت نانی بی کے دامن سے چمٹی پھرتی تھی۔ نانی بی رسوئی میں کھانا پکا رہی ہوتیں (وہ مجھے کھلانے کے علاوہ گھر کا سب کام بھی کر لیتی تھیں) میں بھی دوڑی ہوئی وہاں جا پہنچتی۔ امی روکنے کی کتنی ہی کوشش کرتیں، طرح طرح کے کھلونے میرے سامنے لا رکھتیں۔ مٹھائیاں منگواتیں۔ مگر میں مچلنے لگتی۔

''اوں'' یہ مٹھائیاں نہیں کھاؤں گی۔ مجھے تو کھوپرے کی مٹھائی پسند ہے۔ نانی بی لے دیں گی۔'' امی بڑبڑانے لگتیں۔ ''کمبخت بازار کی سستی مٹھائیاں دلا کر بچی کی صحت

خراب کرتی ہے۔" میں پھر بھی اپنی ہٹ سے باز نہ آتی تو لڑکے کو دوڑا کر وہی سستی مٹھائی منگا دیتیں۔ مٹھائی ملتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلتی۔ میں تو نانی بی کے ہاتھ سے مٹھائی کھاؤں گی۔" امی جھلا اٹھتیں۔ "اری پروین! کہاں بھاگ چلی۔ خدایا اس بوڑھی نے تو میری بچی پر جادو کر دیا ہے۔" ہاں امی نانی بی نے سچ مچ مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ محبت کا جادو، وہ مجھ سے کتنا پیار کرتی تھیں، میری ننھی پربن، ارے کیا نام ہے تمہارا...... اونہہ بابا کیسے کیسے نام نکل گئے ہیں اس جمانے میں۔ ہم پرانے جمانے کی بوڑھیاں کیسے بول سکیں۔ یہ جمانا ہی کیا میرا نام بھی بجرگوں نے کچھ ایسا ہی رکھا ہے۔ جھا۔را۔ جہرہ۔ مجھے کھود بولنے نہیں آتا۔ میں تمہیں شہجادی پکارا کروں گی۔ چھوٹی شہجادی ہاں تم ایک شہجادی کی طرح کھُبصورت ہو۔ ہوں، تو میری چھوٹی شہجادی کو کیا چاہئے یہ مٹھائی تمہارے ہاتھ سے کھلا دو نانی بی" میں اپنی مٹھی کھول کر ننھی سی ہتھیلی پسار دیتی۔ نانی بی ذرا ذرا سی مٹھائی توڑ کر مجھے کھلانے لگتیں۔ اور یہ معمولی مٹھائی اس سوکھے ہاتھ سے کھاتے ہوئے مجھے ایسا مزہ آتا کہ امی کے پاس بیٹھ کر خوبصورت ننھی طشتریوں میں سجے ہوئے گلاب جامن، برفی، دودھ پیڑے اور حلوہ سوہن کھاتے ہوئے کبھی نہ آتا تھا۔

میں نے ایک دن امی سے نانی بی کا نام پوچھا۔ "نانی بی اور کیا" انہوں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "نہیں امی کچھ ایسا نام جھارا" "زہرہ" اور مجھے بڑا ہی تعجب ہوا۔ زہرہ! نانی بی کا نام "زہرہ" ایسا پیارا نام۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی کے نام کا سا! اور امی مجھے پروین کہہ کر بلاتیں تو مجھے خاک اچھا نہ لگتا۔ اوں"...... امی شہجادی کہو۔ پروین نہیں" امی سر پیٹ لیتیں۔ "ارے کیا ہو گیا میری بچی کو؟ میرے اللہ اس بوڑھی نے کچھ کھلا نہ دیا ہو۔" آخر امی کو نانی بی سے اتنی چڑ کیوں تھی؟ شاید اس نفرت کا سبب حسد بھی تھا۔ ان کی اپنی بچی انہیں چھوڑ کر کسی اور سے ایسی چمٹ جائے انہیں کیسا بُرا معلوم ہوتا ہوگا۔ پھر جب نسیم اور نسرین پیدا ہوئے تو امی نے یوں انتقام لینا شروع کیا کہ ساری توجہ ان دونوں پر صرف کر دیتیں۔ ہر بات میں ان کی طرفداری کرتیں اور مجھے جھڑکتی رہتیں۔ جب کبھی امی

مجھے جھڑک دیتیں تو میرے ننھے دل میں بہت دکھ بھر آتا اور میں نانی بی کے سینے سے چمٹ کر زور زور سے سسکیاں لینے لگتی۔ ''نانی بی میں تم...... تمہاری بے ٹی ہوں۔ امی کی نہیں۔'' رونہ میری ننھی! میری شہجادی کو کس نے رلایا'' وہ اپنے لٹکے ہوئے نچلے ہونٹ کو اور سامنے لاکر میری تھوڑی پکڑ کر رونے لگتیں۔ ''میری بچی! نہ جانے بیگم کا دل اتنی پیاری بچی کو جھڑکنے کیسے چاہتا ہوگا۔ وہ ان دو چھوٹے بچوں پر ہی کیوں جان چھڑکتی ہیں؟ وہ میری شہجادی کے سے کھبصورت بھی تو نہیں۔''

آخر امی یہ کب تک سہہ سکتی تھیں وہ صرف انتقام کے لیے مجھ سے بے توجہی برتا کرتیں۔ دل میں تو مجھی کو سب سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ مجھے یوں الگ ہوتی دیکھ کر کئی بار انہوں نے نانی بی سے ہمارے گھر کا کام چھوڑ دینے پر مجبور کرانا چاہا مگر یہ خیال کر کے کہ مجھے بہت ہی دکھ پہنچے گا اور نانی بی اس سلیقہ سے سب کام سنبھال لیتی تھیں کہ ان کے کام میں کوئی نقص نکالنا مشکل تھا۔ نئے نوکروں سے ایسے سلیقہ کی امید نہ تھی۔ پھر نانی بی کے جادو کا ڈر! امی چپ ہو رہتیں۔ مگر آخر یہ ہو کر ہی رہا۔ ایک دن نسرین نے میری سب سے پیاری گڑیا توڑ ڈالی۔ اس پر میں نے اسے زور سے نوچا۔ وہ تھی ہی امی کی لاڈلی۔ منہ بسورتے ہوئے امی کے پاس دوڑی۔ ''ارے کیا ہوا میری بچی کو؟''...... ہونہہ ان کی بچی کو بچھو نے کاٹ کھایا تھا— امی کا یہ کہنا تھا کہ نسرین نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ ''آپا پروین نے میرا۔ منہ۔ نوچ لیا۔ خون۔ نکل۔ آیا ہے۔ اوں۔ اوں۔ اوں'' اف رے مکاری گویا سچ مچ خون نکل آیا تھا۔ بس کیا تھا۔ امی نے مجھے گھسیٹ کر طمانچے پر طمانچے لگانے شروع کیے۔ میں نے سسکتے ہوئے کہا ''نہیں امی نسرین نے میری گڑیا توڑ دی ہے۔'' میں نے خیال کیا کہ یہ کہہ کر بچ جاؤں گی۔ مگر امی کہیں سننے والی تھیں۔ میں نانی بی کی بچی جو ہوئی۔ ''اونہہ! گڑیا توڑ ڈالی تو دوسری منگوا دیں گے۔ گویا تیری موئی گڑیا میری بچی سے زیادہ ہے دیکھ تو میری بچی رو رو کر ہلکان ہوئے جا رہی ہے۔'' اور ساتھ ہی ایک ایسا چانٹا رسید کیا کہ میں مارے درد کے بے حس ہو گئی۔ نانی بی میرے رونے کی آواز سن کر

باورچی خانہ سے بھاگی بھاگی آئی تھیں۔ یہ دیکھتے ہی مجھے امی سے چھین لینا چاہا۔ ''بیگم آکھر کیوں بچی کو مارے دیتی ہو کیا کھسور کیا تھا اس ننھی نے ننھی سی جان، ناجوں کی پلی، اتنی مار سہہ سکے گی۔'' امی کی آنکھوں سے گویا آگ برس رہی تھی۔ میں اپنی سسکیوں کو روکے سہمی سہمی کھڑی تھی۔ ''دور ہو جاؤ''۔ امی نے مجھے کھینچ کر نانی بی سے الگ کرتے ہوئے گرج کر کہا۔ ''تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی؟ کیا حق ہے تمہارا اس بچی پر۔ میں اس کی ماں ہوں جو چاہے کرسکتی ہوں۔''

''نہیں بی بی! سوچو تو۔ ننھی سی جان...... گستہ اترنے پر تمہیں خود رنج ہوگا۔''

''چلی جاؤ، میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی۔ دور ہو جاؤ، میری نظروں کے سامنے سے۔'' امی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ میں دوڑ کر نانی بی سے چمٹ گئی۔ پھر کیا تھا۔ امی آگ بگولہ ہو گئیں۔ مجھے بے تحاشا تڑ تڑ مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ خود مارتی مارتی تھک گئیں۔ ''اچھا لے جاؤ، اس دیوانی کو بھی لے جاؤ میرے سامنے سے۔ یہ میری بچی نہیں۔'' امی نے ایک زور کا چانٹا رسید کر کے مجھے دھکیل دیا۔ نانی بی کی منکوں کی سی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ ''میرے اللہ کھدا جانے کیوں کچھ روج سے بیگم کا دل اس بچی سے پھر گیا ہے۔'' نانی بی اپنے میلے آنچل سے آنسو خشک کرتی ہوئی مجھے گود میں لے کر چلی آئیں۔ روتے روتے میری ہچکی بندھ بندھ گئی تھی۔ کچھ دیر تک تو یہ حالت رہی گویا مجھے آس پاس کی چیزوں کا احساس ہی نہیں۔ اتنے میں نسرین میرے سامنے آکھڑی ہوئی اس کے ایک ہاتھ میں میری ٹوٹی ہوئی گڑیا تھی اور دوسرے میں چاکلیٹ کا ڈبہ۔ وہ میری طرف شریر نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے وہ گڑیا زور سے صحن میں پھینک دی۔ میرا منہ چڑا چڑا کر بہت سے چاکلیٹ منہ میں بھر لئے اور ''نوکرانی کی بیٹی'' کہہ کر قہقہہ لگاتی ہوئی زور سے بھاگی۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ میری ہی گڑیا ٹوٹے۔ میں خود ہی خوب پٹوں اور پھر نسرین میری ہنسی اڑائے، میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''نانی بی میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ مجھے اپنے گھر لے چلو۔ تمہارا گھر کہاں ہے، نانی بی؟ میں امی کے پاس جانے

کے لئے کبھی ضد نہ کروں گی۔ تمہاری بیٹی بن کر رہوں گی۔''

میری بھولی بچی! میرا گھر کہاں؟ گھر ہوتا تو یہاں تمہارے گھر میں رات دن کیوں پڑی رہتی؟'' پھر نانی بی نے مجھے منانے کی بہت کوشش کی۔ مٹھائی لے آئیں۔ ہنسانے والی کہانیاں سنائیں مگر اس دن مجھے اتنا دکھ پہنچا کہ کوئی چیز میرے آنسو کو تھما نہ سکتی تھی۔ میں دن بھر روتی رہی اور رات کو یونہی روتی روتی باورچی خانہ میں ہی نانی بی کے پہلو میں سوگئی۔ دوسری صبح امّی کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ امّی دروازے کے کواڑ سے لگی کھڑی تھیں۔ ان کا منہ سوجا ہوا تھا۔ اور آنکھیں سرخ تھیں۔ شاید وہ بھی روئی تھیں۔ وہ کچھ کہے بغیر نانی بی کی طرف گھور کر دیکھ رہی تھیں، دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش، گویا ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس ہی نہیں مگر جونہی امّی نے یہ دیکھ لیا کہ میں جاگ رہی ہوں۔ یک لخت منظر ہی بدل گیا۔ میں سہمی ہوئی نظروں سے امّی کو تک رہی تھی۔ امّی نے لپک کر مجھے گود میں اٹھالیا اور چومنے لگیں۔ ''میری بچی، مجھ سے ڈرتی ہے۔ کیوں ڈرتی ہو ننھی۔ میں تمہاری ماں نہیں ہوں؟'' زہرہ بی! (امّی نے پہلی دفعہ نانی بی کو نام سے پکارا تھا ورنہ ہمیشہ نانی بی ہی کہا کرتیں) تم نے میری بچی کو ڈس لیا ہے۔ تم ناگن ہو! تم کون ہوتی ہو میری بچی کو مجھ سے چھیننے والی؟ تم نے میرے اپنے خون کو چھینا ہے۔ میرے جگر کے ٹکڑے کو چھینا ہے۔ تم ڈائن ہو۔ کہتی ہو میرا دل بچی سے پھر گیا ہے۔ اس کی ذمہ دار تم ہو۔ تمہاری طرف سے میں نے میری ننھی کو اتنا ستایا۔ میں حسد کی آگ میں بھُن رہی تھی۔ سن رہی ہو اپنے ظلم کی داستان؟''

''بی بی، میں کیا کروں بچی کا دل مجھ سے لگ گیا ہے؟''

''بچی کا دل لگ گیا ہے! شرم نہیں آتی بوڑھے منہ سے جھوٹ بولتے۔ تمہیں اپنے سفید چونڈے کی لاج نہیں؟ خدا کی قسم تم نے بچی کو کچھ کھلا دیا ہے۔ جادو کر دیا ہے ورنہ وہ ایسی کریہہ صورت بوڑھی سے مانوس ہو جاتی (میں دل ہی دل میں ملامت کر رہی تھی وہ غصہ میں کیسی کیسی باتیں کہے جا رہی تھیں) میں نے کلیجہ پر پتھر رکھ کر بہت دنوں تک یہ سہا

ہے۔ اب میں ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ ہونہہ! برداشت میں ایک موئی نوکرانی کی خاطر یہ رنج سہوں؟ ہونہہ! میں بھی کتنی دیوانی ہوں! ادنیٰ نوکرانی سے دبوں؟'' امی جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھیں۔ ''سنتی ہو، کان کھول کر سُن لو۔ تم اب ایک لمحہ بھی اس گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ چلی جاؤ اسی وقت۔ تمہاری یہ منحوس صورت ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ اٹھو، بوریا، بستر باندھ لو...... بیٹھی کیا تک رہی ہو۔ مجھے پھٹے پھٹے دیدوں سے؟ کیا مجھ پر بھی جادو کرنے کا ارادہ ہے۔''

''بیگم میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں مجھے کبھی کبھی بچی کو آ کر دیکھنے کی اجاجت دو۔ اس دکھ بھری دنیا میں یہ ننھی سی جان ہی میرے دل بہلاوے کا جریہ (ذریعہ) ہے بی بی۔ اس کو بھی نہ چھین لو۔ کھدا واسطے اتنا جلم (ظلم) نہ کرو۔ اللہ میاں تمہیں برکت دے۔ میں نے بہت دنوں تمہارا نمک کھایا ہے۔''

''بچی کو دیکھنے، بچی کو دیکھنے۔ اب تمہارا سایہ بھی اس پر پڑنے نہ دوں گی۔ اگر پھر کبھی تم نے اس گھر میں قدم رکھا۔ تمہاری منحوس صورت دکھائی!...... میری بچی کو پھر مجھ سے چھیننے...... میری ننھی، میں تمہاری ماں نہیں۔'' امی نے مجھے بھینچ لیا۔ اور رونے لگیں۔ اور میں حیرت سے کبھی ادھر دیکھ رہی تھی کبھی اُدھر۔ ان دونوں عورتوں میں کتنا فرق تھا! ایک جذبات مجسم دوسری گویا پتھر کی مورت۔ امی کی خوبصورت آنکھیں سوجی ہوئی اور سرخ تھیں۔ ان کی لانبی گھنی پلکوں پر آنسو تھرتھرا رہے تھے۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ پھول کی سی تراش کے ہونٹوں کے کونے کانپ رہے تھے۔ مرمریں گردن اور سینہ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ غم اور حسن کا امتزاج۔

ادھر نانی بی پھٹی پھٹی آنکھوں سے امی کو تک رہی تھیں۔ خاموش نگاہوں سے۔ اگر ان پھیکی، بے نور آنکھوں میں جذبات کے اظہار کی قوت ہوتی تو ان نگاہوں میں یاس اور رنج کی ایک دنیا ہوتی مگر بظاہر وہ جذبات سے عاری معلوم ہوتی تھیں۔ پتھرائی ہوئی، وہ بے حس بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے سکتے کا عالم۔ مگر میرا ننھا دل بچی انصاف کرنا چاہتا تھا۔ کوئی

اور ہوتا تو ضرور امی کی طرفداری کرتا۔ آخر ''غمگین حسن'' اپنے اندر بہت اثر رکھتا ہے نا۔ مگر مجھ پر نہ تو اس حسن کا کوئی اثر تھا، نہ نانی بی کے پچکے ہوئے گالوں اور پوپلے منہ سے نفرت تھی۔ ہاں مجھے امی پر ترس آ رہا تھا، مگر اس دل کا کیا حال ہوگا جس سے ایک عزیز چھین لی گئی ہو۔ امی کے پاس دولت تھی، عزت تھی، ہر طرح کا آرام تھا۔ چاند سے بچے تھے، اس قسمت کی ستائی ہوئی بوڑھیا کے پاس کیا رکھا تھا۔ رہنے کے لئے ٹھکانہ بھی تو نہیں۔ ہاں امی کے چہرے سے بہت رنج ظاہر ہو رہا تھا۔ مگر میں اچھی طرح جانتی تھی۔ ان سادہ نگاہوں میں کتنی یاس چھپی ہوئی تھی۔ اور اس سوکھے سینے کے اندر رکا ہوا سیلاب تھا۔ کتنی دبی ہوئی ہلچل تھی۔ کیسا طوفان تھا۔

نسیم کے رونے کی آواز آئی اور امی مجھے گود سے اتار کر آنسو پونچھتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ نانی بی خاموشی سے اپنا بستر اور کپڑے باندھ رہی تھیں۔ امی کے جاتے ہی میں دوڑی ہوئی ان کے گود میں جا بیٹھی۔ ''نانی بی مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی نانی بی'' میں نے سسکتے ہوئے کہا۔ نانی بی نے مجھے گلے لگالیا۔ پھر کیا تھا جیسے بند ٹوٹ گیا ہو۔ رُکا ہوا سیلاب امڈ آیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ نانی بی کا دل پگھل کر آنکھوں کے ذریعہ بہہ رہا ہے۔ ''میری بچی، میری ننھی شہجادی، تمہیں چھوڑ کے کیسے جاؤں''۔ ''اچھی نانی بی اقرار کرو، تم مجھے دیکھنے کبھی کبھی آیا کرو گی نا؟'' ''نہیں بیٹی اب اس گھر میں کھدم نہ رکھوں گی۔'' ''کیوں نانی بی! مجھ سے روٹھ تو نہیں گئی میں تمہارے لئے سب کچھ کروں گی۔ تم جو کچھ کہو وہ سنوں گی۔ نہ روٹھو نانی بی! آتی رہو مجھے دیکھنے۔''

''اچھا میں جو کچھ کہوں وہ سنو گی؟'' ''ضرور''۔ ''مجھے وہ آئینہ کا ٹکڑا دے دو نا اچھی بٹی۔'' نانی بی نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا۔ میں بھاگی بھاگی اپنے کمرے میں گئی اپنے چھوٹے ٹرنک میں سے ریشمی بٹوہ نکالا۔ اس بٹوے میں میں نے قارون کا خزانہ جمع کر رکھا تھا۔ بہت سی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، رنگین منکے موتیاں۔ کانچ کے ٹکڑے۔ گڑیوں کے ننھے زیور، نئے ڈھالے ہوئے تانبے کے پیسے، جسے میں ''ساون'' کہا کرتی تھی۔ سفید چمکتی

ہوئی چونیاں، دونیاں...... اسی میں مَیں نے نانی بی کا آئینہ رکھا تھا۔ آئینہ کے ٹکڑے پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ چکنائی کے دھبے بھی تھے۔ پھر بھی کیسا پیارا لگتا تھا وہ آئینہ۔ کیسے خوبصورت کنارے ان پر رنگین شیشوں سے تراشے ہوئے خوبصورت پھول تھے۔ سنہری، عنابی، فیروزی آسمانی۔ اس دن جب میں نے نانی بی سے یہ آئینہ مانگا تھا تو انہوں نے پیار سے چمکار کر کہا۔ ''میری اچھی بیٹی تمہیں مٹھائی لا دوں گی۔ یہ نہ لو'' میں کوئی چیز مانگوں اور نانی بی نہ دیں۔ وہ کبھی نہ، نہ کرتی تھیں۔ ہو نہ ہو اس میں کچھ ہوگا ہی اور میں آئینہ لینے پر مُصر ہوگئی۔ ''ہونہہ میں تو یہ آئینہ ہی لوں گی''۔ بچپن کی ضد۔ میں نے ہٹ کر کے رو رو کے آخر آئینہ چھین ہی لیا۔ آئینہ دیتے ہوئے نانی بی کی آنکھوں میں آنسو نکل آئے تھے۔ مگر میں تو چھوٹی تھی۔ ان آنسو کے معنی کیسے جان سکتی؟ پھر وہ آئینہ میرے ہی پاس رہا۔ کئی بار نانی بی نے ترسی ہوئی التجا بھری آواز میں مجھ سے وہ آئینہ واپس مانگا تھا۔ مگر میں ہر دفعہ رونے لگتی۔ ''ہوں، وہ غلیظ آئینہ کا ٹکڑا مجھ سے پیارا ہے؟'' نانی بی ناچار چپ ہو جاتیں'' مگر آج جب کہ وہ مجھ سے جدا ہو رہی تھیں، مجھے چھوڑ کر چلی جا رہی تھیں میں وہ آئینہ تو کیا سب کچھ دینے کو تیار تھی۔ میں بٹوہ لئے نانی بی کے پاس واپس آئی اور سب خزانہ ان کے سامنے انڈیل دیا۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طرح کی مسرت محسوس کر رہی تھی گویا میں اپنی پیاری چیزیں دے کر بہت بڑا ایثار کر رہی ہوں۔

''یہ سب کچھ لے لو نانی بی۔ مگر ضرور آتی رہنا۔ نہیں تو میں خوب رووٗں گی۔''

''اچھا بیٹی اللہ نے مجھے جیتا رکھا تو جب تم اپنا گھر بساؤ گی وہیں آ کر جان و دل سے تمہاری کھدمت کروں گی۔ مرتے دم تک وہیں پڑی رہوں گی۔ پھر مجھ پر دو مٹھی کھاک ڈال دینا بیٹی۔'' نانی بی نے ایک سرد آہ بھر کر اپنی چادر اوڑھ لی اور اپنے سامنے پھیلی ہوئی چیزوں سے صرف آئینہ اٹھا لیا۔ اسے آنکھوں سے لگا لیا اور اپنے میلے رومال میں لپٹ کر کرتے میں چھپا لیا۔ پھر مجھے گود میں لے کر میری بلائیاں لیں، گلے سے لگایا۔ پیار کیا۔ اور مجھے آہستہ سے اتار کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کپڑوں کی گٹھری بغل میں دبائی اور سر جھکائی

خاموشی سے چلی گئیں۔ اب میں رو نہیں رہی تھی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ نانی بی پھر آئیں گی۔ جب تم اپنا گھر بساؤ گی کی شرط کو تو میں سمجھ نہ سکی تھی! میں اپنے بکھرے ہوئے خزانہ کو سمیٹ کر بٹوے میں ڈالنے لگی۔ کیسی پیاری چیزیں تھیں۔ نانی بی نے ان سب کو چھوڑ کر اس گرد آلود ٹوٹے پھوٹے آئینہ کو ہی کیوں چن لیا تھا؟ اس وقت میں اس گتھی کو سلجھا نہ سکی۔ اس آئینہ کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے چند سال اور گذرنے تھے۔ اس کے بعد میں اس آئینہ کی یاد کے بغیر نانی بی کا تصور کر ہی نہ سکتی۔ اب اس وقت کی تمام یادوں میں جب نانی بی کا اور میرا ساتھ تھا اس آئینہ والے واقعہ کا نقش ہی سب سے گہرا ہے۔ ہاں وہ نقش جو کبھی تحت الشعور میں چھپا ہوا تھا۔ اب کتنا صاف ہے! نانی بی کا ایک ایک لفظ ان کی ایک ایک حرکت۔ اس دن کی جب انہیں آئینہ ملا تھا۔ ان کی وہ آئینہ لینے کے لئے التجائیں۔ وہ آخری سین جب انہوں نے آئینہ کو آنکھوں سے لگا کر سینہ میں چھپا لیا تھا۔ دل کے پاس۔ یہ تصویریں بار ہا ابھرتی ہیں۔ یہ یادیں بار ہا میرے دماغ میں گھومنے لگتی ہیں۔ اور میں سوچتی ہوں۔ بظاہر اس بے حس مجسمہ میں ایسے جذبات بھی تھے؟ اس بجھے ہوئے دل کی راکھ میں اتنی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں۔ اس سوکھے سینے میں اتنی آگ سلگ رہی تھی۔ ایسی یاد چٹکیاں لے رہی تھی، یہ آئینہ انہیں راستہ میں پڑا ہوا ملا تھا۔ جب ہم ہوا خوری کے لئے جا رہے تھے ہر شام مجھے نانی بی ہوا خوری کے لئے باہر لے جایا کرتی تھیں۔ ہم گھر سے بہت دور نکل جاتے۔ ایک کھلے میدان کی طرف جہاں بہت سی خودرو گھاس بے ترتیبی سے اُگی ہوئی تھی۔ اور دور دور پر کہیں کہیں گھنے درخت تھے۔ شام ہوتے ہی میٹھی بولی بولتی ہوئی چڑیاں ان درختوں پر آبیٹھتیں۔ ان کے چہچہوں سے ساری فضا شیریں نغموں سے معمور ہو جاتی۔ مجھے یہ جگہ بہت پسند تھی اور میں ہر روز نانی بی کی چادر کھینچتی ہوئی انہیں اس طرف لے جاتی۔ راستہ میں ہمیں ایک چھوٹی سی دوکان ملتی تھی۔ جہاں صرف پان اور بیڑی بکتی تھی۔ نانی بی ہر روز وہاں جاتی تھیں۔ ایک پیسہ کے پان اور سیپاری خرید لیتیں۔ وہیں سے ایک پان میں بہت سا چونا بھی مانگ لیتیں۔ دوکان کے سامنے کچھ تختے بچھے ہوئے تھے۔ نانی بی وہیں بیٹھ کر

بڑے انہماک سے پان کی نسیں نکالنے لگتیں۔ بوڑھا دکاندار اندر جا کر ''پان کوٹنی'' لے آتا، اور نانی بی کے سامنے رکھ دیتا۔ اتنے میں دو چار پوپلے منہ والی بوڑھیاں اور آ جاتیں۔ سب کی سب پان خرید کر ''پان کوٹنی'' کا انتظار کرتی ہوئی نسیں نکالنے لگتیں۔ ایک بوڑھے میاں بھی چلم لئے آ جمتے۔ اچھی خاصی محفل جم جاتی۔ مجھے اس بوڑھوں کی مجلس سے بڑی دلچسپی تھی۔ اپنی دونوں مٹھیوں میں نانی بی کی چادر تھامے ان سے لگ کر کھڑی ہو جاتی اور ان سب کی عجیب عجیب حرکتوں کو غور سے دیکھتی رہتی۔ بوڑھیاں نسیں نکالتی ہوئی، پان کوٹتی ہوئی اور بوڑھے میاں چلم بھر کر کش لگاتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیتے۔ کبھی اپنے بیٹا بیٹی۔ پوتے پوتوں کی، کبھی محلے والوں کی اور اکثر ''ہمارے جمانے'' اور اب کے ''جمانے کی'' اب کے جیور بھی کوئی جیور ہوئے! بابا اب کی چھوکریوں کا دماگ تو آسمان پر چڑھ گیا ہے۔ ایک بوڑھی منہ پر زور سے ہاتھ مار کر کہتی۔ پرانے جیوروں کے نام ہی سے کان پکڑتے ہیں۔ ہونہہ ہاتھوں میں دو چوڑیاں، گلے میں باریک ''سنکل'' کانوں کی لو میں ایک ''باریک'' کرن پھول یا جھومر اور بس بھلا یہ بھی کوئی جیور ہوئے۔ ہمارے جمانے میں جو پہنتی تھیں کان بھر کر سونے کی پتیاں۔ ہاہا ''نخشاروں'' پر جھومتی ہوئی کیسی بھلی لگتی تھیں۔''

''اور یہ بھی دیکھا، ناک چھدوانا تو گویا عیب ہی ہو گیا۔ چھی چھی کیسی بُری لگتی ہے ناک۔'' ایک بوڑھیا نتھنے چڑھا کہ نفرت ظاہر کرتی۔

''نا نا یہ جمانے کی چھوکریاں بھی کیسے بال بناتی ہیں۔ تیل نام کو نہیں۔ روکھے بال سر سے دو انگل اوپر اٹھے ہوئے۔ موٹی موٹی لٹیں نکلی ہوئیں۔ سر کو اچھا خاصا کوڑے کا ڈھیر بنا لیتی ہیں، سر کیا ہوا کھاد کا جھوا ہوا۔'' اور ٹیڑھی ٹیڑھی مانگ نکالے کیسے اتراتی پھرتی ہیں۔ حشر کا دن پُل صراط پر سے پھسل پھسل گر نہ پڑیں تو جب جانیں۔ کیا ہمارے بجرگوں نے جھوٹ کہا تھا ''بیچ میں سیدھی مانگ نکالی تو پل بھر میں سیدھے پل صراط طے کر لو''۔ اب تو اللہ ہی بچائے ان ٹیڑھی مانگ والوں کو۔ سیدھی مانگ نکالو چہرہ پر کیسا نور جھلکتا ہے۔ ٹیڑھی مانگ تو کیسی اچھی صورت بگاڑ دیتی ہے۔ اب اس بچی ہی کو دیکھ لو بوا۔ کیسا پھول سا مکھڑا،

چاندی سی پیشانی، سیدھی مانگ نکالتی تو چہرہ پر کیسی رونکھ آجاتی اب تو کرستان لگتی ہے کرستان''۔اور ایک بوڑھی بھویں چڑھا کر نفرت سے منہ پھیر لیتی۔

کوئی اور میرے ریشمی فراک کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی ''لتاں اب کے کپڑے تو دیکھو کیسے کیسے پھیشن۔''

''واہ بُوا، وہ پھیشن کی بھی تم نے ایک ہی کہی۔ ذرا دیکھو تو پنڈلیاں ننگی۔ بازو ننگے۔لعنت بھیجو لعنت۔''

اور یہ رنگ تو دیکھو بُوا، کیسا پھیکا چھی چھی، یہی کیا اب کے سب رنگ پھیکے۔ سچ پوچھو تو اُجلے رنگ میں اور ان میں کوئی فرق ہی نہیں۔''

''اونہہ اجلا رنگ! اب کی چھوکریاں اجلے کپڑے پہننے کو بھی عار نہیں سمجھتیں۔ ابھی سے بوڑھیاں بنی پھرتی ہیں، بھلا ان بھئی چھوکریوں کو کہیں اجلا رنگ ساجتا ہے۔''

''ان بھئی چھوکریاں کا۔ ارے بابا اب تو گجب ہوگیا گجب! سہاگنیں تک اجلے کپڑے بے دھڑک پہن لیتی ہیں، گجب ہوگیا گجب۔ توبہ توبہ کچھ سہاگ کا پاس بھی ہے انہیں؟''

''اور ہم کچھ کہیں تو یہ موئی لڑکیاں کہیں ہماری باتوں کو پاس خاطر میں لاتی ہیں۔ اللہ کی ماران پر۔ الٹا ہم سے ٹھٹھا مجاکھ کرتی ہیں۔ ہم بوڑھیوں سے مجاکھ۔ ہمارا منہ چڑاتی ہیں۔ اللہ اللہ ان پر کیا کبھی بڑھاپا نہ آئے گا۔''

کبھی شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگتیں......

''ہمارے زمانے کی شادیاں، شادیاں تھیں۔ کئی ہفتے لگتے تھے، کیسی کیسی رسمیں۔ اب دیکھو چٹ منگنی پٹ بیاہ، اور بیاہ بھی کیسا بیاہ، ادھر نکاح پڑھا گیا، ادھر دلہن کی رخصتی ہوئی۔ نہ کوئی رسم نہ ریت۔''

''اور اب کی دلہنیں تو خالہ! اتاری چھوریاں۔ توبہ توبہ آنکھ کا پانی بہہ گیا ہے۔ کیسی ہنسی خوشی رخصت ہوتی ہیں۔ اپنے خسم کے گھر کو ہم تھے کہ تین تین روز تک آنکھ کا پانی نہ

سوکھتا تھا۔ رورو کر بے سُدھ ہو جاتے تھے۔ اللہ اللہ کیا زمانہ آیا۔"

"پرسوں میں ایک شادی میں گئی تھی۔ اماں! کاہے کو بولوں اس دلہن کی بے شرمی"
اور سب بوڑھیاں تھوڑیوں کی ہاتھ لگائے آنکھیں پھاڑے بڑے غور سے سننے لگتیں۔

"جب اس کی ہمجولیاں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں تو ہنس رہی تھی۔ بھری مجلس میں نوشہ کے گھر والے بھی پاس ہی بیٹھے تھے، توبہ توبہ ہم پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ماں بیچاری نے سر پیٹ لیا۔ کیا کرتی سمدھنوں کو منہ دکھانے سے رہی۔ جب رخصتی کا وقت آیا تو وہ تیار ہی بیٹھی تھی۔ اوئی، میرے اللہ ایک بوند بھی نہ تھی، اس چھوکری کی آنکھوں میں؟ نا بابا ہم سے تو رہا نہ گیا۔ آخر بیٹی والوں کی لاج رکھنی تھی سمدھنوں کے سامنے۔ ہم دو چار بوڑھیوں نے مل کر کپڑے برابر کرنے کے بہانے اسے اتنے زور سے نوچا کہ اس کے چیخ نکل گئی۔ جب کہیں جا کر دو بوند پانی نکلا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ چھوکری ہم پر پلٹ نہ پڑی۔ ورنہ رہی سہی عزت بھی جاتی رہتی۔"

"اچھا کیا بہت اچھا کیا۔ اس بے شرم کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔" سب ایک زبان ہو کر کہتیں۔ اور بوڑھے میاں بڑے زور سے سر ہلا ہلا کر داد دیتے۔ یہ بوڑھے میاں سر کو ہاتھ لگائے ہمہ تن گوش ہو کر بوڑھیوں کی باتیں سنا کرتے۔ جب کبھی ان کے بات کرنے کی باری آتی تو پگڑی ذرا ہٹا کر (کیسی پگڑی ایک بڑے سے رومال کو سر کے گرد لپیٹ لیا کرتے تھے) اپنے چمکتے ہوئے گنجے سر کو زور زور سے کھجلانے لگتے۔ اور بڑی ہی سوچ بچار کے بعد ایک جملہ نکالتے گویا انہیں کی رائے آخری اور فیصلہ کن ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہوتیں۔ مگر یہاں بھی نانی بی خاموشی سے سب کی باتیں سنتیں۔ "اب کے جمانے" پر اتنے اعتراضات سن کر بھی کوئی رائے ظاہر نہ کرتی تھیں اور نہ ہی ان کے چہرہ سے کوئی جذبہ کا اظہار ہوتا۔ شاید ان باتوں سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا...... پھر جب یہ محفل برخاست ہو جاتی تو میں نانی بی کی چادر کھینچتی ہوئی انہیں اس میدان میں لے جاتی۔

یہاں ہم کسی گھنے درخت کے سائے میں بیٹھ جاتے۔ میں گرے ہوئے سرخ

پھولوں سے کھیلنے لگتی۔ پھر انہیں سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر لیتی اور نانی بی کی گود میں آ بیٹھتی۔

''ایک اچھی سی کہانی بولو نانی بی۔'' آج کون سی کانی (کہانی) بولوں'' اور ساتھ ہی اپنی نسوار کی ڈبیا نکال لیتیں۔ ایک چٹکی بھر کر نتھنوں میں چڑھا لیتیں۔ پھر ایک میلا سا رومال اپنی سوسی کے ''لہنگے'' کے نیفے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالتی ہوئی کہانی شروع کرتیں۔ اچھا سنو ''ایک باچھا تھا۔ اس کی سات بیٹیاں تھیں۔'' پھر ناک پونچھتی ہوئی آہستہ آہستہ کہتیں۔ اس نے سب شہجادیوں کو باری باری اپنے دربار میں بلایا۔ پوچھا تمہیں کون پالتا ہے، سب بولیں ''آپ'' مگر چھوٹی شہجادی بولی، اور نانی بی اس میلے سے رومال کو پھر نیفے میں ٹھونس لیتیں۔ اس سے پونچھنے پر بھی کالی کالی دھول کی ایک تہہ سی ان کے نتھنوں پر جمی رہتی۔ اتنی باتیں ایک ساتھ کہنے سے ان کے پوپلے منہ کے کناروں پر پان کی لال لال پیک بہہ آتی۔ اور وہ ایک طرف پھر کر پیک کو تھوکتی ہوئی اپنی کہانی کو جاری رکھتیں۔ چھوٹی شہجادی بولی۔ ''ہم سب کو اللہ میاں ہی پالتے ہیں اور ہجور آپ کو بھی۔'' اس جواب کو سن کر باچھا..........

''کیسی چھوٹی شہجادی نانی بی؟'' مجھ جیسی؟ میں بیچ میں کہہ اٹھتی اور وہ لپک کر مجھے اٹھا لیتیں۔ ''ہاں بیٹی تمہاری جیسی شہجادی ایسی ہی کھوبصورت شہجادی'' میں خوشی سے پھول جاتی اور نانی بی کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگتی۔ ''ننھی کیسا پیارا مکھڑا ہے تمہارا۔ اہا۔ چاند کا ٹکڑا'' نانی بی میری بلائیاں لینے لگتیں۔ تٹ، تٹ، تٹ، ''دیکھو تو سب انگلیاں ٹوٹیں۔ کتنا پیار ہے مجھے اپنی بچی سے۔'' اور میں اپنی ننھی ننھی بانہیں نانی بی کی گردن میں ڈال دیتی۔ اس وقت مجھے ان نتھنوں پر جمی راکھ دھول اور پوپلے منہ سے بہتی ہوئی پیک سے بھی نفرت محسوس نہ ہوتی۔

پھر نانی بی اپنی ہتھیلی پر ذرا سا چونا پھیلا کر۔ پھونک پھونک کر خشک کر لیتیں اور اس میں تھوڑی سی نسوار انڈیل کر ملنے لگتیں۔ ساتھ ہی ساتھ آہستہ آہستہ کہانی بولتی جاتی تھیں۔ ناس گھس گھس کر چھوٹی چھوٹی گولیاں بناتیں۔ اور ایک پیاری بڑی سفید ڈبیا میں۔ بالکل

میرے کریم کی ننھی سی ڈبیا کی سی۔ انہیں ڈالتی جاتی تھیں۔ یہ سب کرتی ہوئی وہ بڑی ہی دیر سے کہانی سناتی تھیں۔ ایک ایک جملہ مزے لے لے کر، نانی بی کو کہانی سنانے میں بڑا ہی کمال حاصل تھا۔ بار بار کسی نہ کسی بہانہ سے ایسی جگہ ٹھہرا دیتیں۔ جہاں میرا اشتیاق بڑھا ہوتا۔ ان کی پیک تھوکنے کے بہانے یا گولیاں بنانے میں بہت ہی منہمک ہوں میں بے تاب ہو جاتی۔

اس کے بعد کیا ہوا نانی بی؟ جلدی جلدی کہونا۔

نا بٹی جلدی بولوں تو کھاک مجا آئے گا۔" اور یہ سچ تھا۔ ان کے یوں بیان کرنے میں کہانی کا دوگنا مزا آتا اور وہ واقعات کو ایسی تفصیل سے اتنی اچھی طرح کرتیں کہ میں اپنے آپ کو اس ماحول میں تصور کرنے لگتی۔ مجھے نانی بی کی ہر کہانی کی "شہجادی" سے محبت ہو جاتی مگر نہ جانے کیوں ان کی ہر "شہجادی" پر کوئی نہ کوئی مصیبت آپڑتی۔ پھر کہیں سے ایک "شہجادہ" آٹپکتا۔ شکار کھیلتے ہوئے یا اور کچھ طریقے سے، اور اس شہجادی کو مصیبت سے نجات دلا کر اپنے محل لے جاتا۔

دونوں ہنسی خوشی زندگی گذارنے لگتے۔ نانی بی کی ہر کہانی یوں ہی ختم ہوتی۔ یہ شہجادہ کتنا اچھا ہے۔ چھوٹی شہجادی کو بچانے والا۔ میں سوچا کرتی۔

"میں چھوٹی شہجادی ہوں، نانی بی! مجھے بھی ایک ایسا چھوٹا شہجادہ لے جائے گا۔" میں نہایت بھولے پن سے پوچھ بیٹھتی۔ اور نانی بی کی بے نور آنکھوں میں ایک لمحہ کے لئے چمک آجاتی۔

"ہاں کیوں نہیں میری ننھی! جب تم بڑی ہو کر انگریجی پڑھوگی۔ کھوب پڑھ کر بی اے پاس ہو جاؤ گی تو...... اس پر تم ہو بھی کھوبصورت تمہیں ضرور ایک بڑا آدمی بیاہ لے جائیگا۔ کوئی بہت بڑا افیسر۔"

"ہوں، ہوں، بڑا افیسر نہیں چاہئے۔ چھوٹا شہجادہ۔" میں مچلنے لگتی۔

"ہاں ننھی۔ وہ شہجادہ ہی ہوگا۔ میری شہجادی وہ دن کب آئے گا۔ اللہ مجھے اس

وکھت تک جیتا رکھے۔ تمہیں دلہن بنی دیکھ لوں۔ تو چین سے مر سکوں گی......، آہ نانی بی، شہجادہ تمہاری شہجادی کو لینے آ گیا ہے۔ مگر تم اس دنیا میں نہیں ہو۔ کاش تم چند ہی دن اور زندہ رہتیں وہ دن بھی دیکھ لیتیں جس کو دیکھنے کی تمہاری آخری آرزو تھی — کو دیکھ کر فرط خوشی سے پھولے نہ سماتیں۔ ان کے حسین چہرے کی کتنی ہی بلائیاں نہ لیتیں تم ضرور انہیں شہزادہ ہی سمجھتیں......

ہاں تو ہمارا معمول تھا۔ میں ہر روز نانی بی کے ساتھ اس میدان میں جاتی۔ کچھ دور پر ایک چھوٹا سا گدلے پانی کا تالاب تھا۔ کئی بار میں نانی بی سے کہنا چاہتی تھی کہ اس تالاب تک ہو آئیں، مگر نانی بی کے کہانی بولتے ہی میں اندھیرا ہو جاتا، اور ہم گھر لوٹ آتے۔ ایک دن جب نانی بی نے ابھی کہانی شروع نہیں کی تھی میں نے ایک آدمی کو بندریا ساتھ لئے آتے دیکھا۔ اس کے پیچھے بہت سے بچے شور مچاتے آرہے تھے، تالاب کے پاس آکر وہ بندر والا اکڑوں بیٹھ گیا اور اس نے تماشہ دکھانا شروع کیا۔ لڑکے اسکے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ چند بے فکرے مرد بھی جمع ہو گئے۔ "میں بندر کا تماشہ دیکھوں گی نانی بی تالاب کے پاس لے چلو۔" نانی بی میری ہر خواہش کو پورا کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے دور لیجا کر ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا کیا۔ جہاں سے میں اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔ "یہاں نہیں اور بھی قریب لے چلو نانی بی۔" "نا بیٹی، یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ اتنے گیر مردوے کھڑے ہیں۔ اوئی میرے اللہ" اور نانی بی نے چادر کھینچ کر اپنے چہرہ کو اور زیادہ ڈھانپ لیا۔ "اچھا تم نہیں آؤ گی تو میں بھی یہیں رہوں گی۔" میں نانی کی چادر تھامے تماشہ دیکھنے لگی۔

"اچھا بیٹا اب اپنی ماں کے گھر کا کام کرو۔" بندر والے نے ڈگڈگی بجا کر حکم دیا۔ بندریا نے جلدی سے ایک چھڑی اٹھالی اور اسے سر پر رکھ کر ادھر اُدھر پھرنے لگی۔ گویا بہت کام کر رہی ہے۔ "اچھا اب ساس کے گھر کا بھی کام کر دو بیٹا" بندریا نے زور سے چھڑی زمین پر پھینک دی اور منہ پھلائے ایک طرف جا کر بیٹھ رہی۔

"بندریا نے چھڑی کیوں پھینک دی نانی بی۔" کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے چادر کو دو

ایک جھٹکے دے کر پھر وہی پوچھا۔ پھر بھی نانی بی نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو نانی بی ایک مٹی کے ڈھیر میں کرید کرید کر کوئی چیز نکال رہی تھیں۔ انہوں نے میری بات سنی تھی۔ کچھ دیر بعد نانی بی نے وہ چیز نکال لی۔ ایک آئینہ کا ٹکڑا۔ ''کیسا آئینہ نانی بی مجھے بھی دکھاؤ نا!'' نانی بی نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بڑے غور سے آئینہ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں۔ بہت دیر کے بعد انہوں نے دبی آواز میں کہا۔ مجھ سے نہیں اپنے آپ سے۔

''آہ! انہوں نے ایسا ہی آئینہ میرے لئے منگوایا تھا۔''

''ایسا آئینہ کس نے منگوایا تھا نانی بی؟'' ''وہی ہمارے گھر والے، ہمارے آدمی۔''

''تمہارے گھر والے کون نانی بی''۔ ''وہی بجرگوں نے جن سے میرا بیاہ کیا تھا۔'' ''تو تمہارا بیاہ ہوا تھا نانی بی۔ باجے بجے تھے، تمہارے بیاہ میں؟ اور تم نے اچھے اچھے کپڑے اور زیور پہنے تھے۔ اپنے بیاہ کا قصہ سناؤ نانی بی، آج کہانی کے لئے اصرار نہ کروں گی۔''

''میری بھولی بچی۔ ہاں میں نے اچھے اچھے جیور اور کپڑے پہنے تھے۔ مگر بیاہ کے معنی یہی نہیں۔ اچھا آج کانی (کہانی) نہ سنوگی۔ مگر میری جندگی کہانی سے کیا کم ہے بیٹی۔ کیا بتاؤں کیسے دھوم دھام سے ہوا تھا میرا بیاہ! کہتے ہیں پانچ ہزار کھرچ ہوئے تھے پانچ ہزار برابر ایک مہینہ لگا تھا، پورا ایک مہینہ۔ کیا کہوں میں تو گہنوں سے گویا لد گئی تھی۔ گلے میں اتنا مال کہ بوجھ سے گردن جھکی پڑی تھی۔ جھومر، مانگ میں موتی، پیشانی پر ٹیکہ جھومتا ہوا، ہاتھوں میں کنگن، پونچیاں، گوٹ اور گوٹوں کے بیچ میں ہاتھ بھر کر ہری ''ریشم کی چوڑیاں'' اتنی بڑی سی نتھ۔ پاؤں میں چار جوڑی جیور، کان بھر کے سونے کی پتیاں۔ اور مجھے کیسا سنوارا گیا تھا۔ بال پیشانی پر اُتار کر ایسے صاف کئے گئے تھے ایسے صاف کہ اپنی صورت دیکھ لو۔ منہ پر چمکتا ہوا ریز چمکیاں پھر مہندی، کاجل مسی سے سولہ سنگار اور میں ایسی کا ہے کو تھی بیٹی۔'' نانی بی نے پچکے ہوئے گالوں پر ہاتھ پھیر کر آئینہ میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گول صورت، پھولے پھولے گال، کیسی رونق تھی چہرہ پر۔ اب کیا دیکھتی ہو بیٹی ہڈی چمڑا ہو کر رہ گئی ہوں۔ اس جمانے میں کیسی بھاری جوان تھی میں۔ ایک ایک باجو یہ موٹا

درواجے میں نہ سماتی تھی...... اور کپڑوں کی بھڑک کا کیا کہنا لال دامنی پہ بڑے بڑے طلائی بوٹوں والی" نانی بی نے بوٹوں کی چوڑائی بتانے کے لئے اپنی ہتھیلی پھیلادی۔ "ہرا بناری لہنگا اور اطلس کا کرتہ کیسی بن سنور کر بیٹھی تھی میں۔" میں نانی بی کے قصہ کو بڑی دلچسپی سے سُن رہی تھی اور تصور میں نانی بی کو دلہن بنی دیکھ رہی تھی پچکے ہوئے نہیں "پھولے پھولے گالوں والی" نانی بی کو۔

"میں ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھی۔ اور ہم تھے ہی کتنے، ایک بھائی، ایک بہن، بابا نے میرے بیاہ پر جی کھول کر روپیہ کھرچ کیا۔ "ان" کے ماں باپ تو ہم سے بھی زیادہ مال والے تھے۔ کیا مجال میرا دل کوئی چیج مانگے اور وہ نہ ملے۔ بات ابھی جبان پر بھی نہیں آئی تھی وہ چیج میرے کھدموں میں۔ کیا کہوں بیٹی میرے بیاہ کے بعد چند سال کیسے سکھ سے گجرے۔ ان کے بابا مجھ پر جان چھڑکتے تھے اور میں ساس کی آنکھوں کا تارا تھی۔ کیسے ارمانوں سے بہو کو بیاہ لائی تھیں۔ آکھر ایک ہی تو بیٹا تھا۔ جگر کا ٹکڑا۔ میں بیچوں پر بیٹھی رہتی۔ کام کرنے کی بھی ایک بات تھی۔ میں تو ادھر کا تنکا ادھر اٹھا کر نہ رکھتی تھی اور 'وہ' مجھ سے کتنا پیار کرتے تھے، مجھے گھر کی "پاچھا جادئی" کہا کرتے تھے، مجھ سے پوچھے بنا کوئی کام نہ کرتے ہر وقت کوئی نہ کوئی اچھی چیج میرے لئے لے آتے، کیسے کیسے پیار کے ڈھنگ آتے تھے انہیں۔ نہ جانے کہاں سے سیکھ آئے تھے۔ ایک دن مسہری پر بیٹھی اپنے دامن میں گوٹا ٹانک رہی تھی۔ پیچھے سے آکر میری آنکھیں بند کر دیں۔" پھر جلد ہی کچھ شرماتے ہوئے نانی بی نے اپنی زبان دانتوں میں دبالی۔ چھی چھی کیسی باتیں کر رہی ہوں بچی کے سامنے۔ کھیر تم تو بڑی ہی بھولی بچی ہو۔ ان باتوں کو کیا سمجھوگی۔ "ہاں آنکھیں بند کر دیں۔ اور چیج میرے کانوں میں پہنا کر ہاتھ ہٹالیا۔ اوئی میرے اللہ میں تو شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ انہوں نے دوسرے ہاتھ سے آئینہ میرے چہرے کے سامنے پکڑ رکھا تھا۔ کہنے لگے دیکھو کیسے بھلے لگتے ہیں جھومر تمہارے کانوں میں۔ میں نے جلدی سے جھومر نکال ڈالے۔ مجھے تو بڑے بُرے لگتے تھے۔ اتنے لانبے لانبے لٹکتے ہوئے، نا بابا مجھے تو

کھاک اچھے نہیں لگتے۔ وہ ہنس کر بولے "تم تو پرانے ڈگر پر چلتی ہو۔ آ کھر دن رات چار دیواری میں بند رہتی ہونا۔ تم کیا جانو۔ جمانہ کیسے بدل رہا ہے۔ ارے بھئی یہ نیا پھیشن ہے، نیا پھیشن، "پھیشن ویشن کیا جانوں مجھے تو انہیں پہنتے شرم لگتی ہے۔" کھیر جانے دو، یہ آئینہ تو تمہیں پسند ہے۔ دیکھو اسے بھی نہ نہ کہنا۔ بڑی دور سے منگوایا ہے، چھتر (۷۰) روپے لگے ہیں چھتر (۷۰)" ہا آئینہ! آئینہ کیا کہوں۔ کیسا پیارا تھا۔ کھیر یہ تو ایک ٹکڑا ہے۔ اس سے اس کی کھوبصورتی کی کیا کھبر ہے۔ کناروں پر کیسے کیسے رنگا رنگ پھول گویا ہیرے جواہرات جڑے تھے۔ دل میں تو بہت کھوس تھی مگر یونہی گلہ کرنے لگی۔ ارے بھلے آدمی کاہے کو اتنا روپیہ کھرچ کرتے ہو مجھ پر۔ تمہیں تو پیسوں کی کھدر ہی نہیں۔ کیا ٹھیکریاں ہو گئی ہیں تمہاری نجر میں۔ چھتر (۷۰) روپے بابا۔" اور وہ میری طرف کیسے پیار سے دیکھ کر بولے تھے "جہرہ تمہیں یوں کھوس دیکھ کر کھیمت ویمت سب کچھ بھول جاتا ہوں۔" "تمہاری کھوسی پر چھتر (۷۰) روپیہ تو کیا سب کچھ سدکھے ہیں" آہ! ان کی کونسی کونسی بات یاد کروں۔ ان باتوں کو یاد کروں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ نانی بی نے آنسو پونچھے اور دبی آواز میں کہنے لگیں "آہ اس جمانے میں وہ مجھے کتنا چاہتے تھے، چھتر (۷۰) روپیہ دے کر، اتنی دور سے، پرائے ملک سے میرے لئے آئینہ منگوائے تھے۔ اللہ اللہ یہ آئینہ تو ان کی یادگار، محبت ہے۔" اور انہوں نے اس آئینہ کے ٹکڑے ٹکڑے کو آنکھوں سے لگالیا۔ "اور میں کیسے پھکر سے وہ آئینہ میری سہیلیوں کو بتاتی پھرتی تھی۔ وہ کہتیں "اری جہرہ ٹو تو بڑے بھاگ والی ہے، کیسا اچھا میاں ملا ہے تجھے......

"آہ کسی کے بھاگ ہمیشہ ایک سے ہوتے ہیں، یہ آسمان کا چکر! یہ جمانا کسی کو سکھی نہیں دیکھ سکتا۔ اپنا دکھڑا کیا سناؤں بیٹی۔ میرا استارہ بھی گردش میں آ گیا۔ میری کھسمت ایسی پھوٹی خدا وہ دن دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ نانی بی پھر رونے لگیں۔ میرے سسر جاتے رہے۔ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔" نانی بی آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر اپنا آنچل پھیلا دیا۔ "میرے باپ سے بھی جیادہ تھے۔ اللہ کا دیا اتنی دھن

دولت تھی۔ باپ کے مرنے پر انہیں کے ہاتھ آئی۔ انہوں نے دنیا ہی کیا دیکھی تھی۔ پیسہ ہاتھ لگا اور ان کا ہر کوئی دوست اور ہمدرد بن گیا۔ اتنے دوست پیدا ہو گئے ہر وکھت انہیں گھیرے رہتے۔ وہ تاریخوں کے پل باندھتے اور یہ تھے سیدھے سادھے آدمی۔ پھولے نہ سماتے اپنی تعرپھ سن کر سب کو سچے دوست جان کر کھوب کھاطر کرتے۔ انہوں نے دنیا ہی کیا دیکھی تھی کہ اچھے بُرے کی تمیج کرتے اور پھر کھدا نے انہیں ایسا نرم دل دیا تھا۔ کسی کو اپنے درواجے سے دھتکار کر نکالنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ تم جانو بہت سے لچے لفنگے گنڈے بھی جمع ہونے شروع ہوئے۔ بری صوبت (صحبت) سے اللہ ہر ایک کو بچائے۔ جب پیگمبر کا بیٹا تک کھراب ہو گیا تھا تو ہم جیسوں کی کیا بساط۔ پیسہ تو ہر ایک کو کھراب کرتا ہی ہے۔ پھر بھری جوانی۔ ان شہدوں نے اپنی جیبیں بھرنے کے لئے ان کو شراب اور جوئے کا چسکہ لگا دیا۔ کھدا ان سب کو گارت کرے۔ میرے ہیرے ایسے آدمی کو کھراب کیا۔ پھر کیا تھا بیٹی! باپ کی اتنی محنت سے کمائی ہوئی پونجی مہینوں میں اڑ گئی۔ پھر میرے جہیج کی چیزیں بھی ایک ایک کر کے بک گئیں۔ یہاں تک تو کھیر تھی۔ جب کچھ نہ رہا تو کیا کہوں بیٹی!" نانی بی زور زور سے سسکیاں لینے لگیں..... تو میرے گہنے مانگنے لگے۔ شراب کے نشہ میں پُور آدھی آدھی رات کو آتے اور جیور کے لئے تنگ کیا کرتے۔ کبھی ہاتھ روک لیتی تو بس میری شامت ہی آ جاتی۔ اتنا مارتے، اتنا مارتے، لاتوں سے، گھونسوں سے، لکڑی کہیں دیکھ پاتے تو اس سے بھی بے دھڑک پیٹتے۔ میرے ہاتھ پاؤں سوجھ جاتے اور ان پر نیلے نیلے نشان ابھر آتے۔ سارے جیور کپڑے برتن سب ٹھکانے لگ گئے۔ یہاں تک کہ میرے بدن پر ایک دامنی کے سوا کچھ نہیں رہا۔ پھاکوں پھاکے گجار کے میرے دیدے اندر دھس گئے۔ گلوں میں گڑھے پڑ گئے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ ایک رات انہوں نے خوب شراب پی لی تھی۔ لڑکھڑاتے گرتے پڑتے آئے اور باہر دریچہ سے پکارا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے درواجا کھولا۔ مگر وہ اندر نہیں آئے۔ مجھے وہیں پر بلایا۔ گئی، تو کیا کہوں بیٹی انہیں برابر ہوش بھی نہ تھا۔ رہا سہا کپڑا بھی کھینچنے لگے۔ یا اللہ میں کیا کرتی۔ پوری طاکت لگائی۔ بہت روئی

بھی۔ مگر انہوں نے دامنی کھینچ ہی لی۔ وہ دامنی تھی ریشم کی۔ یوں چند پیسوں کی امید میں مجھے ننگ دھڑنگ چھوڑ کر چلے گئے۔ میں اس رات کیا سوتی۔ بدن پر ایک کپڑا نہیں بھوکی، ٹھنڈ سے ٹھٹھری ہوئی، ایک کونے میں دُبکی بیٹھی رہی۔ رات بھر اپنی پھوٹی کھسمت پر رویا کی۔ صبح رسوئی میں ادھر اُدھر سے کچھ کوئلے جمع کر کے انہیں سلگا کر چولھے کے پاس بیٹھی آگ تاپ رہی تھی۔ ایسے میں کیا دیکھتی ہوں۔ میرا بھائی آ کھڑا ہوا ہے، کھدایا! مجھ پر گھروں پانی پڑ گیا۔ جمین میں گڑ جاتی ایسی حالت میں مادر جاد ننگی کھدایا جمین سکھ (شق) ہو جاتی اور میں اس میں سما جاتی۔ آہ! ہم جیسی گھناگاروں کی دعا کہاں کھبول ہوتی ہے۔ وہ تو اگلی نیک بی بیوں کا ہی بکھ تھا۔ اِدھر دعا ہونٹ سے نکلی اور جمین سکھ ہو گئی۔ کھیر، کیا کرتی، اِدھر اُدھر دیکھا تو ہانڈیاں پکڑنے کا کالکھ سے بھرا کپڑا پڑا تھا۔ تن ڈھانکنے کو وہ بھی کنیمت تھا۔ جلدی سے اوڑھ کر کونے میں سمیٹ کر بیٹھ رہی۔ بھائی، پھٹی پھٹی حیران نجروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ جبان سے ایک لفج بھی نہ بولا۔ میرے میکے والوں کو کچھ کھبر نہ تھی کہ مجھ پر یہاں کیا گجر رہی ہے۔ ہاں ایک دو دپھے میرا بھائی آیا تھا مگر میں کچھ نہ بولی۔ لاکھ کھراب آدمی ہو۔ کتنا ہی ستائے۔ آکھر میرے میاں تھے۔ میں ان کے کھلاپھ کیسے جبان کھولتی۔ اب میرا بھائی چند دنوں کے لئے مجھے میکے لے جانے آیا تھا۔ پچھلی دپھے کہہ گیا تھا جہرہ کتنے دن ہو گئے تمہیں میکے آئے۔ بچاری اماں بہت یاد کرتی ہیں۔ اب میں نوکری کی خاطر پرائی بستی جا رہا ہوں۔ وہاں سے لوٹ آؤں گا تو اب کی دپھے تمہیں جرور بلا کر جاؤں گا۔ اور بیٹی جب وہ آیا تو میں ایسے حال میں تھی۔ ایسی لاچار ایسی بے بس، اسے کتنا دکھ پہنچا ہوگا؟ آکھر کھون سے کھون لگا تھا۔'' اس کے بعد دیر تک نانی بی کچھ بول نہ سکیں۔ روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ کیسی بری حالت ہو رہی تھی ان کی۔ آواز ہی نہ نکلتی تھی۔ لٹکا ہوا نچلا ہونٹ اور زیادہ لٹک آتا اور آنسو ابل ابل آتے۔ نانی بی کو اس حالت میں دیکھ کر میرا ننھا دل بھر آیا۔ گو میں ان کی کہانی کو پورے طور پر سمجھ نہ سکی تھی۔ پھر بھی نانی بی کو یوں روتی دیکھ کر میں بھی رونے لگی۔ انہوں نے بہت مشکل سے اپنی حالت سنبھالی۔

آنسو پونچھے اور مجھے سینے سے لگالیا۔ ''رونہ ننھی، تم کاہے کو روتی ہو ننھی شہجادی۔ اتنا درد ہے میرا بچی کو۔''

''اچھی نانی بی، تمہیں کہانی سنانے سے اتنا دکھ ہوتا ہے تو نہ سناؤ۔ میں اچھی بچی ہوں۔ ضد نہیں کرتی۔ چلو گھر چلیں۔''

''نہیں بیٹی، تمہیں اپنی دکھ بھری کانی سنا کر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے۔ اب تلک میں کسی سے نہ بولی تھی۔ کس سے بولتی۔ اس کھود گرجی (خودغرضی) دنیا میں میرا کوئی درد پہچاننے والا نہیں، مگر تم بیٹی ننھی ہو۔ پر کیسا درد بھرا دل رکھتی ہو۔ اب تم یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتیں۔ جب بڑی ہوگی تو سمجھوگی۔ نانی بی کی یاد کے ساتھ تمہیں آج کی باتیں یاد آئیں گی...... اور دکھ سکھ کا کہنا ہی کیا وہ اس جندگی میں لگا ہی رہتا ہے۔ پھر میں اتنا سکھ نہیں پاتی تو اتنا دکھ کاہے کو اٹھاتی۔ کھیر۔ لو تمہیں باکھی کہانی بھی سنائے دیتی ہوں۔ کم سے کم دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے۔''

یہ تمہارا کیا حال ہوا ہے جہرہ، میرے بھائی نے پوچھا۔ میں پھر بھی کچھ نہ بولی۔ کھدا ہا جر ناجر ہے۔ ان کے کھلاف میری زبان نہ کھلی۔ مگر میرے آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ میرا بھائی روتا ہوا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ آیا۔ ایک گٹھڑی پھینک کے وہ بولا ''لو جہرہ یہ پہن لو'' اور آپ دوسری طرپھ منہ پھیر کر توشہ دان میں سے کچھ کھانے کی چیجیں نکالنے لگا۔ میں نے گٹھڑی کھولی کپڑے پہنے اور ہم دونوں کھانے پر بیٹھے، کھاتے ہوئے اس نے کوئی بات نہ کی۔ نجریں نیچی کئے بیٹھا رہا۔ کھا چکنے کے بعد آہستہ سے دبی آواج میں بولا، چلو جہرہ گھر چلو، مجھے اس بدماس کے سب کرتوت معلوم ہو چکے ہیں۔ کھدا کی قسم میں تمہیں پھر اس نالائکھ کے گھر بھیجوں۔ اس جالم کو ہمارے گھر میں کھدم رکھنے دوں تو میں ایک باپ کی اولاد نہیں پھر بھی اس بے گیرت (بے غیرت) نے کھدم رکھا تو محلہ بھر میں پھجیتی (فضیحت) کراؤں گا پھر وہ کچھ نہ بولا۔ کھاموشی سے مجھے گاڑی میں بٹھا کر گھر لے آیا۔ میں تبھی سمجھ گئی تھی کہ وہ ایسا جرور کرے گا۔ آہ! میں تبھی سمجھ گئی تھی کہ وہ مجھے ان سے پھر

ملنے نہ دے گا۔ نانی بی بہت زور سے سسکیاں بھر کر رونے لگیں۔ ''وہ گھسہ میں یہ باتیں کہتا تو اور بات تھی۔ گھسہ اتر ہی جاتا اور مجھے کچھ آس ہوتی لیکن یہ کہتے وقت اس کے چہرہ پر کیسا سکون تھا۔ گھسہ نام کو نہیں...... میں تبھی جان گئی کہ اس کا ارادہ پکا ہے۔ نانی بی نے سرد آہ بھری۔ ''میرا گمان صحیح نکلا۔ کچھ دن بعد وہ آئے۔ آہ بٹی، بٹی'' میں تعجب سے تکنے لگی۔ نانی بی کے سینے میں ایک ہل چل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ ''آہ کیا کہوں...... بے...... ٹی...... ان کے چہرہ پر پچھتاوا تھا۔ اداسی تھی۔ وہ جرور اپنے کیے پر رنجیدہ تھے اور بٹی ان کے ہاتھ میں ایک نئی ساری بھی تھی۔ میں درواجا کھولنے بھاگی۔ بہت جلد بھاگی۔ پھر بھی میرا بھائی آ ہی گیا...... آ ہی گیا۔ مجھے جور سے دھکیل کر آگے بڑھا۔ انہیں ایسی ایسی باتیں سنائیں، انہیں شہدا، لفنگا، بدماس کہا۔ بے سرم کہا۔ بے گیرت کہا۔ میرے اللہ! انہیں کبھی نہیں، وہ بے گیرت نہ تھے۔ ان میں سرتکھوں کا خون تھا، میں بھائی کے پاؤں پر گر پڑی۔ ''اللہ واسطے ایسا نہ کہو بھائی۔'' اس نے مجھے بھی بے گیرت کہا۔ اللہ اللہ یہ سن کر بھی وہ کھاموس کھڑے تھے۔ صرف اتنا بولے ''میں تمہارے گھر پڑے رہنے نہیں، جہرہ کو لینے آیا ہوں۔'' اب اس کا تم سے کوئی تعلکھ نہیں۔ سرم نہیں آتی اسے اتنا ستا کر۔ میرا بھائی دانت پیس کر برس پڑا۔ کیا میری بہن اتنی سستی ہے۔ ہمارے پاس دو ٹکڑے روٹی بھی نہیں کہ اسے پال سکیں؟ کھدا کی کھسم اگر میری بہن بھوکوں مرے۔ پر اسے، تم جیسے جالم کے پاس نہ بھیجوں گا۔ مار ہی تو دیا اسے میرے بھائی نے ان کے ہاتھ سے ساری کھینچ کر نالی میں پھینک دی۔

''مجھے جہرہ سے تو پوچھ لینے دو۔ اگر وہ نہ کہے تو میں جرور چلا جاؤں گا۔ اگر راجی ہے تو تمہارا کوئی حکھ نہیں اس پر وہ میری بیوی ہے۔ میں اسے ضرور لیجاؤں گا۔ ''ہونہہ!'' کیوں نہ کہے گی؟ پھر آ جائے گی تمہارے ساتھ اپنا مردہ نکلوانے اور میں پیچھے سے رو رو کر التجا کر رہی تھی۔ ''بھائی میں جاؤں گی۔ بھائی مجھے جانے دو'' اور بھائی نے مجھے آگ برساتی نجروں سے دیکھا۔ چپ بے گیرت کہیں کی۔''

''نہیں میں جبرہ ہی سے پوچھوں گا۔ انہوں نے دہلیز پر کھدم رکھتے ہوئے کہا۔ کھریب تھا، میرا بھائی انہیں دھکا دے کر باہر نکال دے۔ بے سرم اندر کھدم رکھتا ہے؟ ایسا بے سرم نہ ہوتا تو عورت جات کے گھٹنے بیچتا۔ کیا پوچھتا ہے جبرہ سے وہ تو رو رو کر کہہ رہی ہے۔ 'میں اس جالم کے ساتھ نہ جاؤں گی، آہ بھائی نے کیسا جھوٹ بولا...... کیسا جھوٹ بولا۔ ''اگر تجھ میں جرا بھی گیرت ہے تو جا فوراً یہاں سے چلا جا۔ پھر کبھی ادھر نہ پھٹکنا۔'' پھر میرے بھائی نے اتنے جور سے کواڑ بند کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے ڈرتے کھڑکی میں سے جا کر دیکھا۔ وہ ہمارے گھر سے کچھ دور پر کھڑے تھے۔ آہ بٹی میں نے اچھی طرح دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں پانی کھڑا تھا...... ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر وہ چلے گئے۔ ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔ وہ بڑے گیرت والے تھے بٹی۔ اتنا ہونے کے بعد پھر اس گھر پر آتے؟...... آہ میرے بھائی نے مجھے کیوں جانے نہ دیا؟ نہ جانے دیا تو کیا ہوا۔ میں موکھا پا کر رات وہاں سے چلی آئی۔ وہاں سے نکل کر انہیں بہت ڈھونڈا بھی مگر کہاں ملتے۔ میرے ایسے نصیب کہاں۔ وہاں سے جو نکلی۔ بٹی، تو نوکری کے لئے ماری ماری پھری۔ مگر پھر اس گھر میں کھدم نہ رکھا... میں ماں کے ہاں چین سے رہ سکتی تھی۔ مگر میری گیرت کیسے کھولتی کے وہاں پڑی رہوں۔ مجھے کسی کے گھر کی نوکری تو کیا کوئی مجوری کرنا منجور تھا۔ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا، بھیک مانگنا منجور تھا۔ مگر اس درواجے پر جانا منجور نہ تھا۔ جوان پر بند ہوا تھا...... اگر ہمارے بابا اس وقت پر جندہ ہوتے تو کبھی ایسا نہ کرتے۔ مجھے جرور بھیج دیتے۔ انہیں بٹی کا لاکھ درد سہی۔ وہ میاں کا درجہ پہچانتے تھے۔ کہا کرتے تھے۔ عورت کا ٹھکانا سوہر کا گھر ہی ہے۔ بھائی نے جوش میں یہ نہ پہچانا۔ بابا ہوتے تو جرور بھیج دیتے...... سبھی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ ان کی تو بھری جوانی تھی۔ بعد میں سنبھل ہی جاتے اور مجھے تو ایسا معلوم پڑتا کہ وہ تبھی ڈیڑھ دو مہینوں میں ہی بہت سنبھل گئے تھے پھر میری جندگی کیسے سکھ سے گجرتی! ایک دو دن تکلیف سہہ ہی لیتی۔ اور پھر وہ مارتے تھے تو کیا کچھ جان کر مارا کرتے تھے۔ شراب پی کر انہیں ہوش تھوڑا ہی رہتا تھا۔ صبح جب ان کی حالت اچھی رہتی تو

ان نیلے سوجے ہوئے حصّوں پر ہاتھ نہ پھیرا کرتے۔ پھر ایک دو دفعہ تو انہوں نے گرم پانی میں روئی بھگو کر سینکا بھی تھا۔ ان دنوں بھی کبھی کبھی کیسی پیار بھری نجروں سے دیکھ لیا کرتے تھے۔ میں سب کچھ بھول جاتی او کھدا! کھدایا!! ان کی ایسی ایک نجر ہی بس تھی...... ایک نجر ہی بس تھی۔'' نانی بی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ میں تو ڈر ہی گئی ان کا سوکھا جسم ایسے ہل رہا تھا گویا اس کے اندر بھونچال آ گیا ہو۔ کچھ دیر تک نانی بی خاموش ہو گئیں۔ پھر جب طوفان آہستہ آہستہ تھما کہنے لگیں۔

''اور ان میں کوئی ایسی ویسی بات بھی نہ تھی۔ سراب جوئے کا کیا کہنا اگر یہ لت پھرشتوں کو بھی پڑے تو نہ چھوٹے۔ مگر کسی کی کیا مجال کہ دوسری باتوں میں ان کی طرف انگلی اٹھائے۔ ایسے تھے وہ۔ گیر عورت کی طرپھ کبھی نجر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ اور بیٹی! جب مرد میں یہ گن ہو۔ یہ بات ہو تو عورت کیا کچھ نہیں سہہ لیتی۔''

نانی بی کی طویل کہانی ختم ہو گئی۔ مگر اس کہانی کی بہت سی باتیں میرے دماغ کے کسی کونے میں جا گھسی تھیں۔ صرف ایک بات مجھے اہم معلوم ہو رہی تھی۔ ''نانی بی کا آدمی انہیں مار کر ان کے زیور چھین لیا کرتا تھا۔'' اور میں بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی کہ نانی بی اپنی کہانی ختم کریں۔ تو اپنی ننھی زبان سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ہمدردی ظاہر کر کے انہیں تسلی دوں۔ جب نانی بی نے رونا بند کیا اور آنسو پونچھ لئے تو میں بڑی ہمدرد صورت بنائے بولی۔

''نانی بی! تم سچ مچ کتنا دکھ اٹھائی ہو۔ کیسا خراب تھا تمہارا آدمی تمہیں یوں مار کر تمہارے اچھے اچھے زیور چھین لیتا تھا؟ کیسا خراب آدمی۔ تمہیں اس کی صورت دیکھ کر نفرت ہوتی تھی نا؟''

''نپھرت بیٹی؟ اس کی صورت سے پھرت؟'' کیا بتاؤں تمہیں وہ کیسا تھا کیسا ہنس مکھ کیسا بانکا سجیلا جوان!! گھٹا ہوا بدن، چوڑا چکلا سینہ اور صورت کا تو کیا کہنا، چوڑی صورت، یہ اونچی ناک، چوڑی پیشانی، موٹی موٹی کالی آنکھیں۔ میں تو گھنٹوں بیٹھی اس

صورت کو تکا کرتی۔ پھر بھی جی نہ بھرتا، جب اُجلے اُجلے کپڑے پہنے، لال کشمیری رومال کندھوں پر ڈالے باہر نکلتا تو دیکھنے کو یہ دو آنکھ بس نہیں تھے۔ میں جلدی جلدی لال پیلا پانی لے آتی اور ڈیوڑھی کے باہر کھدم رکھتے ہی اتار پھینکتی کہ کہیں چاند سے مکھڑے کو نجر نہ لگ جائے۔ اس کی صورت سے پھرت بیٹی! وہ تو باچھاہوں کا باچھا تھا۔ شہجادوں کا شہجادہ!!"

"کیا کر رہی ہو پروین؟ اگر تم نے اپنی سہیلیوں کے نام چٹھیاں لکھ دی ہیں تو لاؤ انہیں رحیم کے ہاتھ بھجوادوں سب سامان آ گیا ہے، تم آؤ نا خیرون بی کی کچھ مدد کرو۔ بیچاری اکیلی اتنی چیزیں کیسے تیار کر سکے گی۔ دو ایک تم کر لو۔ تم دیکھتی ہو تسنیم تو میری گود چھوڑتا ہی نہیں۔"

"نہیں امی آج پارٹی نہیں دوں گی۔"

"کیوں بیٹی؟ تم بھی عجیب ہو۔ آج خوشی کا دن ہے۔ جی بھر کے خوشیاں مناؤ۔"

"اس دنیا میں تو صرف خوشی ہی نہیں ہے امی! اس کے ساتھ غم بھی تو لگا ہوا ہے۔"

"ہونہہ" امی زور سے ہنس پڑیں۔ ابھی سے قنوطی ہوتی جا رہی ہو۔ اپنی زندگی کے سب سے رنگین زمانے میں ہی۔"

"امی! شاید آپ کو معلوم نہیں۔ کل نانی بی انتقال کر گئیں۔" میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"پھر وہی نانی بی! سچ مچ اس بوڑھی نے تم پر جادو کر دیا تھا۔"

امی تم اب بھی نانی بی کو نہ سمجھ سکیں۔

●●●

انگڑائی

"آپا، گلنال آپا! وہ دیکھو مچھ فنا..." جاوید ننھے ننھے ہاتھوں سے میری ساری کھینچ رہا تھا۔

ارے ہٹ بھی۔ جب دیکھو آپا آپا...... دیکھ تو میری ساری کا ناس کیے دے رہا ہے۔ سفید ساری کل ہی تو پہنی تھی۔ اور یہ دھول میں اٹے ہوئے ہاتھ! مٹی سے کھیل رہا تھا کیا بدتمیز! میں نے غصہ سے اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ اس نے رونی صورت بنالی۔ "نہیں تو آپا...... مچھ فنانچھ ہمالے لوڈیل......" اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ "انہیں بلاؤ نا...... مچھ فنانچھ کتنی اچھی ہیں۔ اُچھ دن مجھے کیک دیا تھا اول کوکو...... کچھی اچھی کوکو...... آپا انہیں بلالو اچھی آپا۔"

"ارے!" میں چونک پڑی۔ "مس فنانس یہاں!" میں نے...... نگاہ ڈالی، ہاں وہ سچ مچ کچھ دور پر کسی عورت سے باتیں کرتی ہوئی آرہی تھیں۔ "تو انہیں بلالوں؟" میں نے سوچا۔ پھر جلدی سے کمرہ کا جائزہ لینے لگی۔ کتابیں بکھری ہوئی اور فرنیچر! ایک کرسی دیوار کی طرف منہ کیے کونے میں پڑی ہے۔ تو ایک کمرے کے عین بیچ میں، گویا اپنی پالش سے بے نیازی پر نازاں بیٹھی ہو۔ اور صوفہ! ہونہہ، یہ بڑا سا سوراخ اور اس میں سے میلی میلی روئی جھانکتی ہوئی...... ٹیبل کلاتھ؟ اس پر تو جاوید نے بڑے ہی خوشنما نقش بنا رکھے ہیں۔ اور سیاہی کے برتنے میں تو بڑی فیاضی دکھائی ہے۔ میرے اللہ! ایک چیز بھی سلیقہ کی ہے؟ اف

کس بدتمیز نے فرش پر کاغذ بکھیرے ہیں؟ ایسے شریر بچے بھی کسی کے ہوتے ہیں؟ اور یہ دھول کی ایک انچ موٹی تہہ!...... یہ کریمن بھی کہاں مرگئی؟ کم بخت سے یہ بھی نہیں ہوتا کہ صبح صبح کمروں میں جھاڑ دے دیا کرے۔

''کریمن! او کریمن ذرا جھاڑن لیتی آنا، کیا تم نے یہ دھول بیچنے کے لئے جمع کر رکھی ہے؟'' ''آئی بی بی! ابھی آئی۔ ذرا توے سے روٹی تو اتارلوں، جل جائے گی'' بھاڑ میں جائے وہ اور اس کی روٹی۔ کمبخت ہر وقت چولہے میں گھسی رہتی ہے...... آخر میں کیوں اتنا جل رہی تھی۔ مجھے خود شرم آنے لگی۔ بے چاری غریب کیا کرے ایک ہی تو تھی اور گھر کا سارا کام اسی کے سر۔ ہم ایسے کوئی امیر تو نہ تھے کہ دس رکھتے۔ ایک بھی غنیمت ہے۔

میں نے جلدی سے ٹیبل کلاتھ بدلا اور کرسیوں کو اپنی اپنی جگہ گھسیٹ کر فرش پر بکھرے ہوئے کاغذ سمیٹنے لگی۔ سمیٹتے سمیٹتے اٹھ کر کھڑکی پر نظر ڈالی تو میری سانس جیسے رک گئی۔ اُف مس فنانس کتنی نزدیک آگئی تھیں! ''ذکیہ! زبیدہ!'' میں حلق پھاڑ چلائی، جواب ندارد! دروازے میں جا کر دیکھا تو بس جل ہی گئی۔ دونوں آنگن میں موجود! ذکیہ جاوید کو اٹھائے کھڑی تھی تو زبیدہ گیٹ پر چڑھی ہوئی گردن بڑھا بڑھا کر مس فنانس کو دیکھنے کی کوشش کررہی تھی۔

''ذکیہ! کچھ مدد بھی کروگی؟ شرم نہیں آتی تمہیں یوں باہر کھڑی ہو۔'' ''خفا کیوں ہوتی ہو آپا! میں ہمیشہ گیٹ میں تھوڑے ہی کھڑی ہوتی ہوں؟ یونہی آج''...... پھر وہ میرے پھولے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر ہنس پڑی۔ ''اخاہ، آپا! آج تو آپ کے غصہ کا پارہ سو ڈگری پر چڑھا ہوا ہے۔ اہاہا، ابھی اتارے دیتی ہوں۔ اپنی آپا کا ٹمپریچر۔ دیکھو نا، ایسے مزے کی بات بتاؤں گی۔'' منہ بنا کر تال بجاتے ہوئے۔ ''بتادوں آپا؟...... اوو...... اوں...... مس فنانس یہاں سے گذر رہی ہیں۔''

''یہ تو مجھے معلوم ہی ہے، اچھا آؤ ذرا کمرے کو صاف کرنے میں مدد دو، تمہیں تو بس باتیں ہی آتی ہیں۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''تو آپا مس فنانس کو بلاؤ گی؟'' اس

نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ زبیدہ بھی ناچ رہی تھی۔ اوہ! ابھی تک یہ بچے مس فنانس کو اتنا چاہتے ہیں!

ذکیہ پھر دروازے کی جانب تکنے لگی۔ میں بھنا گئی۔ کاغذ سارے کمرے میں پھیلے پڑے تھے۔

''ہونہہ! میں نہیں بلاؤں گی! دیکھو تو گھر کتنا صاف ہے۔'' میں نے جھنجھلا کر سمیٹے ہوئے کاغذوں کو زمین پر دے مارا۔

''کیا کہہ رہی ہو آپا؟'' ذکیہ تعجب سے میرا منہ تکنے لگی۔ میں نے اس کی طرف توجہ کئے بغیر زبیدہ کو پکارنا شروع کیا۔ ''زبیدہ! آجاؤ اندر۔''

''کیوں آپا؟'' زبیدہ نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

''آجاؤ! اگر مس فنانس تمہیں دیکھ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ ہمارا ہی گھر ہے اور وہ یقیناً مجھ سے ملنے آئیں گی۔'' میں نے جاوید کو بھی اندر گھسیٹتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تو اور اچھا ہوگا، وہ کیوں نہ آئیں آپا؟''

''گویا تم نے گھر کو بہت اچھی طرح سجا رکھا ہے! ہم ابھی سب ٹھیک کر دیں گے انہیں آنے دو آپا!'' دونوں نے نہایت اشتیاق سے التجا کی۔

''کہہ جو دیا کہ نہیں بلائیں گے۔''

''اوہ آپا! مس فنانس! اور اتنے دنوں کے بعد انہیں دیکھنا نصیب ہوا۔ آخر تمہیں کالج چھوڑے ہوئے دو تین ماہ ہو گئے نا؟ اتنے دنوں بعد اتفاقاً وہ خود ہمارے شہر میں آئیں، ہمارے گھر پر سے گذریں اور تم!...... تم انہیں نہ بلاؤ آپا تم تو مس فنانس پر'' ذکیہ سنجیدہ لہجہ میں کہتی کہتی یکایک زور سے ہنس پڑی۔ اور شرارت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ''ہوں! اچھا میں جان گئی...... جب سے پرویز بھیا......''

''اری چپ! بہت باتیں بنانے لگی ہے۔'' میں نے زور سے اس کے ایک چٹکی لی۔

''ہونہہ آپا! تم بہت بنتی ہو۔ ابھی دیکھو نا پرویز کا نام آتے ہی کیسے شرما گئیں'' میں

یونہی شرماتی لجاتی، سمٹی سمٹائی سب کچھ بھول کر وہیں کھڑی رہی گویا اس نام نے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔ کیسا حسین نام ہے۔ کتنا پیارا نام ہے! — پرویز

میں اس شیریں تصور سے چونکی تو سامنے کیا دیکھتی ہوں، دروازے کے کواڑ کھلے پڑے ہیں، پردہ ہوا سے اُڑا جا رہا ہے اور مس فنانس ہمارے گھر کے بالکل مقابل میں کھڑی مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں۔ جونہی میں نے انہیں دیکھا وہ مسکرا کر ہمارے گھر کی طرف بڑھنے لگیں۔

''یا اللہ! اب کیا کیا جائے؟'' میں ذکیہ کو جھنجھوڑنے لگی۔ ''اب تم ہی سب کچھ دیکھ لو۔ دیکھو وہ آ رہی ہیں۔'' میں بے تحاشا وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے میں جا کر دم لیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے جھانک کر دیکھا مس فنانس برآمدے کے بازو والے کمرے میں کرسی پر بیٹھی تھیں اور ذکیہ ایک خوشنما برتن میں کیلے اور سنگترے لئے ہوئے ان کے پاس کھڑی تھی۔ گلنار کو بلاؤ نا'' مس فنانس کہہ رہی تھیں، اچانک انہوں نے مجھے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا، اور مسکرا کر آواز دی ''گلنار!'' میں شرما کر دروازے کی اوٹ میں ہوگئی...... میرے یوں شرما جانے سے وہ کیا سمجھی ہونگی؟ یہی نا کہ میرے جذبات ان کی طرف اب بھی ایسے ہی ہیں۔ ہونہہ! انہیں کیا معلوم کہ میں اب...... مگر انہیں یہ غلط فہمی ضرور ہوگی۔ میں پہلے تو ان کے سامنے یونہی شرمایا کرتی تھی۔ جب وہ کہیں سے آنکلتیں تو میں بھاگ کر کہیں جا چھپتی۔ وہ میری طرف دیکھتیں تو دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیتی گو دل تو یہی چاہتا کہ وہ یونہی دیکھتی رہیں۔ عجیب لڑکی تھی کچھ سال پہلے! رفتہ رفتہ میں اُن سے کھل کر بات کرنے لگی تھی۔ پھر بھی جب کبھی اُن سے اچانک مڈبھیڑ ہو جاتی تو میری بدحواسی نہ پوچھیے۔ وہ دن بھی کیا دن تھے! چھٹی ہونے پر کالج کے برآمدے میں گھنٹوں ان کا انتظار کرنا میرا معمول تھا۔ ہفتہ بھر میں جس دن ان کا گھنٹہ نہ ہوتا وہ دن کس قدر منحوس دکھائی دیتا تھا! ہاں میں ان پر مرتی تھی۔ انہیں دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی۔ اور لڑکیاں کیسے مجھے ''تنگ کرتی تھیں'' گلنار! نہ جانے تم کیوں مس فنانس پر مرتی ہو وہ کون سی ایسی حسین ہیں کہ بلکہ

انہیں بدصورت بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔" جی چاہتا ان چڑیلوں کے منہ نوچ لوں۔
انہیں کیا معلوم کہ وہ مجھے کیسی حسین نظر آتی تھیں! دوسری لڑکیاں تو کیا میں زرینہ سے بھی
اس دن خفا ہو کر روٹھ گئی تھی۔ گو زرینہ میری سب سے پیاری سہیلی تھی۔ ہاں اس دن میں
نے کالی ساڑھی پہن رکھی تھی اور پربھا سے سادو مانگ کر سیاہ 'بوٹو' بھی لگایا تھا۔ میں اور
زرینہ ہاسٹل کے کامپاؤنڈ میں ٹہل رہے تھے۔ اندرا بھی کہیں سے آنکلی۔ "اہا۔ آج تو تم
بلا کی حسین نظر آرہی ہو گلنار!" "مس فانس کی سی؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا تھا۔
"ہونہہ! مس فانس!" زرینہ نے طنز سے کہا تھا۔ "مس فانس! وہ تین دفعہ مر کر جنم لیں تو
شاید تمہارا حسن انہیں نصیب ہو!" مجھے کتنا غصہ آیا تھا اس پر "روٹھ گئی گل؟ اچھا بھئی وہ تجھ
سے پانچ گنا زیادہ حسین ہیں! خوش ہو گئی اب تو؟" پھر وہ قہقہہ پر قہقہہ لگانے لگی۔ اور اندرا
بھی مسکرانے لگی۔ جی میں آیا زرینہ سے لڑ پڑوں آخر وہ کون ہوئی مس فانس کی توہین کرنے
والی! یہاں میرا جی جل رہا ہے اور وہ یوں کھڑی ہنس رہی ہے! اگر ایک بات بھی ان کے
خلاف کہی جاتی تو میں زرینہ سے تو کیا کالج بھر کی لڑکیوں سے لڑنے کے لئے تیار تھی۔ بھلا
میں ایک ہی تھی کئی لڑکیاں میرا ساتھ دیتیں۔ اور بھی تو بہت سی لڑکیاں انہیں چاہتی تھیں۔
للیتا غریب لڑکی وہ تو مجھی کو ان کی محبت کا حقدار سمجھتی۔ میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ
پیدا کرتی بلکہ مس فانس کو مجھ سے محبت کرتے دیکھ کر اور خوش ہوتی۔ کیسی بے لوث لڑکی تھی!
اس کے برخلاف وہ لکشمی! حسد کی پتلی! کیا کیا جتن نہ کرتی تھی کہ مس فانس کی توجہ میری
بجائے اس پر ہو۔ نہ جانے کہاں سے لاتی تھی ایسی خوبصورت ساریاں اور انہیں کس سلیقہ
سے پہننے کی کوشش کرتی۔ جھوٹے موتیوں سے طرح طرح کے زیور بنا کر پہنا کرتی اور بعد
میں تو اس نے برقی مشین سے اپنے بالوں کو گھنگھریالے بھی بنا لیا تھا، ہونہہ۔ ان سب
جتنوں سے کیا ہوتا وہ حسین تو تھی نہیں مس فانس مجھی کو دیکھا کرتیں۔ وہ جل مرتی۔ مس
فانس کے خاص سبجیکٹ پر تو وہ دنیا بھر کی کتابیں پڑھتی۔ مگر کہیں مجھ سے اچھا لکھ سکتی تھی۔
مجھ سے زیادہ نمبر بھی کبھی لئے تھے؟ آخر کچھ بن نہ پڑتا تو مجھ سے خوب جلا کرتی اور ہمیشہ اسی

کوشش میں لگی رہتی کہ ایسی باتیں کرے جن سے میرے دل کو ٹھیس لگے۔ یہ دیکھ کر کہ میں حسین سمجھی جاتی تھی وہ کیسے کڑھتی تھی۔ کہا کرتی ''ہونہہ، اسٹر خ وسفید رنگ کے بغیر بھی کوئی حسین کہا جا سکتا ہے۔ دراز قد اور چھریرا بدن تو حُسن کے ضروری جزو ہیں۔'' وہ خود بھی گوری تو نہ تھی لیکن تھی دراز قد اور دبلی پتلی مگر اس کے چھریرے بدن میں خاک بھی حسن نہ تھا۔ وہ ایسے دکھائی دیتی تھی گویا ایک لانبی سی لکڑی کو تراش کر صاف کر دیا گیا ہو نہ وہ بدن کے دلکش نشیب وفراز، نہ کوئی لچک، نہ کوئی ادا، چپٹی بے جان لکڑی۔ جی چاہتا منہ توڑ جواب دوں۔ ''ہونہہ! خوبصورتی کے لئے دلکش نقش صبیح رنگ سے زیادہ ضروری ہیں اور بھرا ہوا گول بدن اتنا ہی خوبصورت ہوتا ہے جتنا نازک جسم بلکہ اس سے کہیں زیادہ دلکش۔'' مگر مسکرا کر چپ ہو رہتی اور یہ ظاہر نہ ہونے دیتی کہ میں اس کے طعن کو سمجھ گئی ہوں۔ کبھی وہ کسی کی گوری رنگت والی لڑکی کو دکھا کر کہتی ''دیکھو گلنار وہ لڑکی کیسی حسین ہے'' اور اس کی بتائی ہوئی لڑکی، اتنی بدصورت، اتنی کریہہ صورت ہوتی کہ میں بے اختیار ہنس پڑتی نکٹی ناک، پھیلے ہوئے نتھنے، بے حد موٹے ہونٹ، بھدا جسم، مگر ہاں سفید رنگت! میں ہنس کر کہتی ''تمہاری حسن شناسی کی داد دیتی ہوں۔'' جب ان باتوں سے کام نہ چلتا تو سیدھی ذاتیات پر اتر آتی اور بار بار مجھے 'کالی' کہتی حالانکہ میرا رنگ اچھا خاصہ گندمی تھا...... اور زینت وہ تو مس فنانس کے پیچھے ہی لگی رہتی تھی۔ کیسی سادگی سے شکایت کرتی تھی۔ ''گلنار! مس فنانس تو تمہیں کو زیادہ چاہتی ہیں۔'' اور وہ بے حد موٹی لڑکی، لڑکی نہیں بلکہ عورت...... وہ بھی تو انہیں کا دم بھرا کرتی تھی! اور اپنی محبت کیسی عجیب طرح سے جتایا کرتی تھی۔ مس فنانس کو بھی بے اختیار ہنسی آجاتی اور للیتی......

''گلنار بی بی!''

''کیا ہے کریمن؟''

''بیگم نے میٹھے ٹکڑے اور سموسے بنانے کے لئے کہا ہے۔ وہ جو کوئی مس صاحب آئی ہیں نا!

بہت کام ہے بیٹی، ذرا اس روٹی کے ٹکڑے تو کاٹ لو۔ اچھی بیٹی عمر بھر دعا دیتی رہوں گی۔"

میں نے کواڑ کھولے اور آہستہ آہستہ سے جھانک کر دیکھا کہ کہیں مس فنانس ادھر دیکھ تو نہیں رہی ہیں؟ امی بھی پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ امی سے باتیں کرنے میں مشغول تھیں۔ میں نظر بچا کر جلدی سے باورچی خانہ میں چلی آئی۔ چاقو کو اچھی طرح صاف کر کے روٹی کاٹنے بیٹھ گئی۔ کریمن نے گلا ہوا قیمہ چولھے پر رکھا اور اس میں نمک مرچ پیاز ڈال کر بھوننے لگی...... تو یہ میٹھے ٹکڑے پکائے جا رہے ہیں۔ یہ انہیں بہت مرغوب تھے نا! اور میں نے کتنی دفعہ میٹھے ٹکڑے اپنے ہاتھوں سے پکا کر انہیں بھیجے تھے۔ ان دنوں وہ یہیں کالج میں پروفیسر تھیں اور جب ان کا ٹرانسفر ہوا تھا تو میں کتنا روئی تھی! وہ منا رہی تھیں، تسلی دے رہی تھیں اور میں روتی جاتی تھی...... پھر میں نے رو دھو کر ابا کو مجھے اسی جگہ بھیجنے پر رضامند کر لیا جہاں مس فنانس کام کر رہی تھیں اور ان سے جا ملی تھی۔ دیکھتے دیکھتے دو سال یونہی گذر گئے۔ مجھے اس کالج کا آخری امتحان دینا تھا اور اس کے بعد مس فنانس سے دائمی جدائی! میں اس کا خیال بھی نہ کر سکتی تھی۔ کاش اس کالج میں ایم۔اے کا کورس بھی ہوتا اور میں دو اور سال ان کے ساتھ رہ سکتی!...... پھر میں نے اس مرتبہ فیل ہونے کی ٹھان لی تھی۔ ایک ایسی لڑکی کے لئے جو جماعت میں ہمیشہ اوّل آیا کرتی ہو، فیل ہونا کتنی شرم کی بات تھی۔ اس بات کا مجھے خیال تک نہ آتا تھا۔ پروفیسروں نے مجھ سے کتنی امیدیں باندھ رکھی تھیں...... میں کانوکیشن میں بہت سے تمغے اور انعامات حاصل کروں گی۔ سب لڑکیوں میں اوّل آنا تو میرا معمول تھا۔ اس کے الگ تمغے ملیں گے۔ سوشیالوجی اور انگریزی میں تو ریاست بھر میں اول رہوں گی۔ لڑکے دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے۔ اور کالج کا نام کیسے چمکے گا۔ ان کی امیدوں پر پانی پھرنے کی مجھے پروا نہ تھی۔

آخر وہ دن آ گیا جب امتحان ختم ہو چکا تھا اور میں مس فنانس سے آخری بار ملی تھی۔ انہیں خدا حافظ کہہ کر جب ہاسٹل لوٹی تو سیدھے اپنے کمرے میں جا کر بستر پر گر پڑی اور

تکیوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اتنا کہ آنکھیں سرخ ہو گئیں اور تکیہ پوش بھیگ گیا۔ پھر جب زرینہ آئی تو اس نے مجھے گلے لگالیا اور تسلی دینی شروع کی۔ وہ جتنا مناتی تھی میں اور زیادہ روتی جاتی تھی...... اس رات زرینہ کتنی دیر تک میرے پاس بیٹھی سمجھاتی رہی یہاں تک کہ میری آنکھیں جو رونے کی وجہ سے بری طرح جل رہی تھیں۔ نیند کے غلبے سے بند ہونے لگیں۔ کتنی محبت کرنے والی لڑکی تھی زرینہ!......

''تو تم نے ٹکڑے کاٹ لئے بیٹی؟ ادھر لاؤ انہیں میں گھی میں بھون دوں اور اچھی بٹی ذرا ان پوریوں میں قیمہ بھر کے سموسے بنالینا۔ بیگم نے جلدی تیار کرنے کا حکم دیا۔ کیا کروں بٹی! تم دیکھتی ہو بہت بوڑھی ہو گئی ہوں۔ ہاتھ سے زیادہ کام بن نہیں پڑتا۔ ورنہ میں تمہیں کام کرنے کو کہتی، توبہ توبہ اس بوڑھے منہ میں کیڑے نہ پڑ جاتے یہ نازک ہاتھ جو صرف قلم پکڑتے تھے، ان کو میں 'موئی نوکرانی' کام کرتے دیکھتی! آنکھیں نہ پھوٹ جائیں!'' بوڑھی کریمن خوشامد کرنے لگی، میں بغیر جواب دیئے قیمہ بھر کر سموسے بنانے لگی۔

......وہ خود بھی مجھے کتنا چاہتی تھیں۔ کئی بار انہوں نے مجھے اپنے گھر پر بلایا تھا اور کتنا اصرار کرتی تھیں کہ میں ان کے ساتھ سیر کو جایا کروں۔ اس دن ان کی آواز میں کیسی التجا تھی ''صرف ایک بار آ جاؤ گلنار! میں تمہیں اپنی کار میں گھمالاؤں گی۔ فلاں فلاں گارڈن لے جاؤں گی۔ میں نے بصد ناز ان کی التجا کو ٹھکرا دیا تھا...... اور اپنے پرچوں میں مجھے کتنے زیادہ مارکس دے دیتی تھیں، اسی پچاسی فی صدی! یہ دیکھ کر لڑکیاں مجھ سے بہت جلتیں، کہا کرتیں، ''آخر تم تو ان کی فیوریٹ ہونا! ہمیں کہاں سے ملیں اتنے نمبر''...... میرا نام اس چٹخارے سے لیتی تھیں گویا ان کے منہ میں لذیذ مٹھائی رکھی ہو۔ جب میری طرف دیکھ کر مسکراتی تھیں تو ان کا تبسم کتنا محبت آمیز ہوتا تھا۔ میرے دل میں بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوتی کہ انہیں مس فنانس کی بجائے ''انجلنا'' کہا کروں یا کم از کم ایک بار چپکے سے کہہ دوں۔ ''میری انجلنا'' مگر مجھے کبھی جرأت نہ ہوئی تھی۔ ان کے سامنے کہتی نہیں تھی تو کیا

خطوں میں تو جو جی میں آیا لکھ دیتی تھی۔ میرے دل کی ملکہ، میری جان، ملکہ حسن، میری آسمانی اینجلنا، اور کیا کچھ نہیں لکھا کرتی تھی۔ عجیب رومان بھرے خط لکھا کرتی تھی میں تو! اور وہ کبھی خفا نہ ہوتی تھیں۔ انہوں نے بھی تو ایک دن...... اس دن میں اور لتا ان کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ میں بیٹھی تھیں۔ باتوں میں لتا نے پوچھا تھا "مس فنانس آپ گھوڑے کی سواری جانتی ہیں؟" "نہیں" انہوں نے جواب دیا۔ "مگر بہت دنوں سے سیکھنے کی خواہش ہے اور اس کے لئے رائڈنگ سوٹ بھی سلانے والی ہوں۔" اور پھر اچانک میری طرف مخاطب ہو کر کہا "کوٹ اور پتلون گلنار!" اس انداز سے کہا تھا کہ میں شرم سے پانی پانی ہوگئی تھی۔ "میں تو اس سوٹ میں بالکل مرد معلوم ہوں گی نا؟" میں دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھی رہی۔ ہاں ان میں کچھ کچھ مردانہ جھلک بھی تو تھی۔ بہت دراز قد، چوڑا چکلا سینہ، اور ایسی نظروں سے دیکھتی تھیں کہ میں بے اختیار شرما جاتی۔ خواہ وہ کتنی ہی لڑکیوں کی بھیڑ میں کھڑی ہوں، وہ باتیں تو اور لڑکیوں سے کر رہی ہوتیں مگر نظر مجھی پر جمی ہوتی اور نارنجی ساری میں وہ کیسی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ شاید ساری کی عکس کی وجہ سے چہرہ کا رنگ سنہری ہو جاتا اور رخساروں پر ہلکی سرخی جس میں کچھ نیلاہٹ کی آمیزش بھی ہوتی...... اور دور سے تو چیچک کے داغ بھی دکھائی نہیں دیتے تھے......

میں نے سموسوں کی سینی کریمن کے آگے رکھ دی۔ کریمن انہیں تلنے لگی۔ اب کہیں فرصت ملی ان کاموں سے! اتنی دیر چولھے کے پاس بیٹھنے سے بہت گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھوئے، ساڑی کے آنچل سے انہیں خشک کرتے ہوئے پھر اس کمرے کی طرف نگاہ دوڑائی جہاں مس فنانس بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہی ساحرانہ مسکراہٹ جو مجھ پر جادو سا کر دیتی تھی۔ اب میں بخوشی ان کے پاس جانے کو تیار تھی۔ دفعتاً میری نظر ساڑی پر پڑی۔ جگہ جگہ مٹی لگی ہوئی تھی اور جاوید کے ہاتھوں کے نشاں صاف نظر آرہے تھے۔ میں یہ ساری پہن کر کیسے جا سکوں گی؟ اتنے میں زبیدہ آنکلی۔

"زبیدہ!" میں نے آواز دی۔ توجہ کئے بغیر بھاگی جا رہی تھی۔ "زبیدہ ادھر تو آؤ!"

''ہونہہ۔ انہیں آؤں گی مجھے مس فنانس کے پاس جانا چاہئے۔''

''میری اچھی منّی مان لے گی اپنی آپا کی بات۔ چاکلیٹ دوں گی منّی کو!''

''کیا ہے آپا؟'' چاکلیٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''اچھی منّی مجھے الماری میں سے ایک ساڑی لادونا! دیکھو یہ کیسی میلی ہو رہی ہے مس فنانس کے پاس یہ پہن کر کیسے جاؤں۔ یہ لو الماری کی کنجیاں!''

''ہاں آپا۔ جلدی جاؤ مس فنانس بار بار تمہیں یاد کر رہی ہیں۔''

.....تو وہ اب بھی مجھے چاہتی ہیں؟ ہاں شاید دو ماہ پہلے میں نے ایک لڑکی کے ذریعہ انہیں خط بھیجا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا نا کہ وہ خط پا کر کیسے خوش ہو گئی تھیں......اور اس دن بھی تو وہ خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھیں نا جب میں اطلاع دیئے بغیر اچانک اس کالج میں آ گئی تھی جہاں وہ اب کام کر رہی تھیں۔ میں ایک ایسی جگہ چھپ گئی تھی جہاں سے میں تو انہیں دیکھ سکتی تھی۔ مگر وہ مجھے نہ دیکھ سکتی تھیں۔ اور ایک لڑکی کو ان کے پاس بھیجا تھا کہ انہیں اطلاع کر دے۔ میں اس کالج میں داخلے کے لئے آئی ہوں۔ انہوں نے فرطِ مسرت سے کئی بار میرا نام دہرایا تھا۔ ''گلنار! گلنار! گلنار! یہاں! سچ کہو۔'' لڑکی نے انہیں یقین دلایا ''وہ کہاں ہے بتاؤ نا؟'' لڑکی انہیں بتا رہی تھی میں کس جگہ ہوں مگر وہ دیکھے بغیر ''گلنار، گلنار، تم کہاں ہو؟'' کہتی ہوئی ہر طرف گھوم رہی تھیں۔ انہیں یوں بے تاب دیکھنے میں بڑا ہی مزہ آیا تھا......

''لو اللہ اللہ کر کے سب چیزیں تیار ہو گئیں اب میں اس بوڑھے جسم کو ذرا آرام تو دے لوں......''

کم بخت بوڑھی جب دیکھو بڑبڑاتی رہتی ہے۔ میں جھلا کر رہ گئی۔

''خدا بھلا کرے گلنار بی بی کا مجھ بوڑھی کی کتنی مدد کرتی ہے۔'' کریمن باورچی خانہ میں ٹاٹ بچھا کر وہیں لیٹ گئی۔ ''اہا بیٹی تم یہیں ہو۔ ابھی ابھی یاد کر رہی تھی۔ دیکھا بہت دراز عمر ہو گی۔ میری بی بی کی! اور بیٹی تمہارے لئے کتنی ہی دعائیں میرے منہ سے نکلتی

ہیں۔ جھوٹ نہیں کہتی۔ کتنی ہی جگہ کام کیا، پرنا بابا ایسی بچی کہیں نہ دیکھی۔ ذرا سے لونڈے تک مجھے ڈانٹ بتاتے تھے۔ میری بی بی نے تو اب تک ایک سخت لفظ بھی نہ کہا۔ اب تو میرے کام کرنے کے دن گئے۔ اسی لئے تو تمہارے ہاں بھی کام چھوڑ دیا تھا۔ سچ کہتی ہوں بٹی صرف تمہاری شادی کی خبر سن کر آئی تمہیں ان آنکھوں سے دلہن بنی دیکھوں۔ بہت دنوں سے یہی ارمان ہے۔ خدا کرے، بہت اچھا دولھا نصیب ہو۔"

بھلا پرویز سے اچھا دولھا بھی کوئی ہوگا؟ ایک ہلکی سی مسکراہٹ میرے لبوں تک آگئی میں نے جلدی سے منہ پھیر لیا کہ کہیں کریمن دیکھ نہ لے۔

پھر جیسے دماغ خیالات سے یکلخت خالی ہو گیا ہو اور ان کی جگہ پرویز! پرویز! پرویز پرویز!— اور میں ایک حسین دنیا میں جا پہنچی، جذبات کی ایک رنگین دنیا، ہاں! نہایت حسین، کالج اور مس فنانس والی دنیا سے کہیں زیادہ حسین!!

کبھی میں یہ سوچا کرتی تھی کہ میری شادی ہو جائے تو میں اپنے شوہر سے محبت بھی کر سکوں گی۔ ایک دفعہ زرینہ نے جو پامسٹری جانتی تھی میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا "تمہارے شوہر کو تم سے بے حد محبت ہوگی"۔ تو مجھے اپنے اس ہونے والے شوہر پر کتنا رحم آیا تھا کہ میں اس کی محبت کا جواب نہ دے سکوں گی اور اب؟...... اب تو میں اپنے پرویز کو دیوانہ وار چاہوں گی۔

"آپا ساری لے لو۔" میں نے زبیدہ سے ساری لے کر میز پر رکھ دی اور بال بنانے لگی۔

آخر میں مس فنانس کو کیسے بھلا سکی؟ وہ بھی تو مجھے بہت چاہتی تھی۔ ہونہہ! چاہتی ہوں گی۔ کبھی انہوں نے زبان سے اس کا اظہار بھی کیا تھا؟ میں ساتھ ہوتی تھی تو ڈر کے مارے مری جاتی تھیں۔ "گلنار! لڑکیاں کیا کہتی ہوں گی؟ گلنار اگر پرنسپل دیکھ لے تو؟"

لڑکیاں دیکھیں تو دیکھیں کیا ہم نے کوئی جرم کیا تھا کہ یوں ڈریں اُف رے بزدلی! اور جب ہمارے مضامین کی کاپیاں تصحیح کر کے کلاس میں لاتی تھیں تو میرے لکھے

ہوئے نظریوں اور نکتوں کی تو بہت تعریف کرتیں مگر کبھی لڑکیوں کو بتایا بھی تھا کہ یہ میرے پیش کیے ہوئے نکتے ہیں۔ جوابات کے پرچے واپس کرتے ہوئے تو کبھی بھولے سے بھی میرا نام لیا تھا...... مگر وہ مجھی کو سب سے زیادہ نمبر دیتی تھیں...... ہونہہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ میں تو ہر پرچہ میں اول آتی تھی...... لیکن کوئی استانی اتنے نمبر نہیں دیتی تھیں۔ مس فنانس تو اسی پچاسی دے دیتی تھیں...... ہونہہ! صرف زیادہ نمبر دے دیئے تو کیا ہوا۔ مجھے کتنی خوشی ہوتی اگر وہ کلاس میں لڑکیوں کے سامنے میری تعریف کرتیں اور کہتیں۔ دیکھو گلنار نے کتنے نمبر لئے ہیں۔ فلاں نمبر نے اتنے مارکس لئے ہیں، فلاں نمبر نے یہ کیا ہے، وہ کیا ہے، وہ کیا ہے، فلاں نمبر، فلاں نمبر میں تو بس "فلاں نمبر" ہی ہو کر رہ گئی تھی اور وہ مس جونس تھیں آکسفورڈ کی ایم اے وہ تو آدھ آدھ گھنٹے تک میرے مضمون کی تعریف کرتی تھیں۔ گو ان کے جانچنے کا معیار بہت ہی اعلیٰ تھا۔ اور مسز سوشیل! سروجنی نے کہا تھا کہ وہ میرا پرچہ لئے بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں۔ "ماشاء اللہ گلنار نے تو اس دفعہ کمال ہی کر دیا۔ کتنے اچھے جواب ہیں۔ میں نے تو اس پرچہ کو کئی مرتبہ پڑھا۔" وہ دوسری ٹیچرس اور لڑکیوں کے سامنے ہمیشہ میری تعریف کرتی رہتی تھیں۔ اور مس کملا بائی بھی۔ لیڈی ٹیچرس تو کیا مرد پروفیسر بھی میری ذہانت اور قابلیت کی داد دیتے تھے! فقط تھیں تو مس فنانس جو تعریف میں ایک لفظ بھی کہنا شاید اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھیں۔ ہونہہ!

اور میرا دل کیسے چاہتا تھا کہ وہ میرے حسن کی تعریف کریں۔ ہمیشہ نہ سہی کبھی کبھی بے تابی سے کہہ دیں۔ "گلنار! تم کتنی حسین ہو!" کم از کم ایک دفعہ بے اختیار ان کے منہ سے نکل جائے۔ "آج تو تم بہت خوبصورت نظر آرہی ہو گلنار! یا یہی سہی۔" "یہ ساری تو تمہیں بہت جچتی ہے۔" میں اس کے لئے کتنے ہی جتن کرتی تھی جس دن ان کا گھنٹہ ہوتا وہی ساریاں پہنتی جو مجھے بھاتی تھیں۔ بالوں کو خاص توجہ سے سنوارتی۔ کبھی کبھی بوٹو لگاتی۔ اچھی اچھی خوش رنگ چوڑیاں پہنتی اور مجھے اپنی کلائیوں اور انگلیوں پر بہت ہی ناز تھا۔ میں اپنے ہاتھ میز پر اس انداز سے ٹیکے رہتی کہ چوڑیاں جم کر کلائیوں پر آپڑیں۔ اور مس فنانس

کی سیٹ سے انگلیوں کی خوبصورتی کا اچھی طرح جائزہ لیا جا سکے...... مگر یہ تو ظاہر تھا کہ وہ مجھے حسین سمجھتی تھیں۔ ورنہ یوں نہ تکتی رہتیں۔ اور جب کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ آج خصوصیت سے اچھی نظر آ رہی ہوں ایسے موقعوں پر تو وہ مجھے بہت ہی توجہ سے دیکھ رہی ہوتیں۔ ان کی نگاہ مجھ پر سے ہٹتی ہی نہ تھی...... اچھا یوں ہی سہی۔ لیکن کیا میں ایک پتھر کا مجسمہ تھی یا نقاش کی کھینچی ہوئی تصویر تھی کہ یوں خاموش داد ملتی۔ آخر میں ایک انسان تھی۔ ایک سترہ سالہ نوخیز لڑکی رومانی اور جذباتی! کبھی تعریف کر دیتیں تو ان کا خزانہ کھو جاتا؟ مانا بھی کہ وہ پروفیسر تھیں مسز سوشیل بھی تو پروفیسر ہی تھیں۔ کیا وہ میری صورت کی تعریف نہ کرتی تھیں۔ اس دن جب مجھے ایک ٹیابلو میں حصہ لینا تھا جس میں یہ بتایا جانے والا تھا کہ ملکۂ نور جہاں رقص اور موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔ مسز سوشیل میرا میک اپ کرتی ہوئی کیسے سراہتی جاتی تھیں ''گلنار! نور جہاں کی تمثیل کے لئے تم ہی موزوں ہو۔'' ''تم کیسی اچھی انگریزی لکھتی ہو۔ مسٹر سوشیل بھی تمہارے ہی گن گاتے رہتے ہیں وہ بھی تمہارے ٹیچر رہ چکے ہیں نا؟'' پوڈر لپ اسٹک، روژ لگا چکنے کے بعد انہوں نے کہا ''اب آنکھیں اوپر اٹھاؤ ان کا میک اپ بھی کر دوں۔'' اور میں نے آنکھیں اٹھائیں تو واللہ کتنی خوبصورت آنکھیں!!'' ...... اور کس شدت سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش مسز سوشیل کی بجائے مس فنانس ہوتیں! آخر میں مسز سوشیل کو ہی کیوں نہ چاہتی تھی؟ مس فنانس میں کون سے سرخاب کے پر لگے تھے؟ .... اور زرینہ بھی تو میری آنکھوں کی تعریف کرتے تھکتی ہی نہ تھی!! اور للتا! وہ تو اشعار لکھا کرتی تھی میری آنکھوں پر! زینی بھی کہا کرتی تھی نا۔ ''گلنار، تم چشمہ نہ پہنا کرو۔ یہ تمہاری حسین آنکھوں کو چھپا دیتا ہے۔'' سبھی تعریف کرتی تھیں۔ اسی لئے تو میں اس کا خاص خیال رکھتی تھی کہ مس فنانس میری آنکھوں کو دیکھیں اور ان کی کلاس میں چشمہ بھی تو اتار کر رکھ دیتی تھی۔ گو مجھے بورڈ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے میں بہت دقت ہوتی۔ ہونہہ! اس بے حس پر کچھ اثر بھی ہوتا تھا؟ مگر پرویز، پرویز کی حسن شناس نگاہیں پہلی ہی نظر میں میری آنکھوں کا حسن دیکھ لیں گی۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھیں

گے" "تمہاری آنکھیں، غزالی آنکھیں، کتنی سیاہ! کیسی مدھ بھری!!" ایک بار میں نے صرف اس لئے ڈرامہ میں پارٹ کیا تھا کہ مس فنانس دیکھیں "سینٹ جون" Saint Joan اول کا انتخاب ہوا تھا۔ اور میں جون بنی تھی۔ مجھے کیسی اچھی طرح سنوارا گیا تھا۔ میں خود آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ پھر مجھے ہنسی بھی آگئی۔ جون، ایک دیہاتی لڑکی، پھر ایک قیدی جو کورٹ میں لائی جا رہی تھی۔ کیا اس وقت وہ بنی سنوری ہوگی۔ لیکن یہاں کے فلموں اور اسٹیجوں پر تو صرف یہی خیال رکھا جاتا ہے کہ جو لڑکی ہیروئن کا پارٹ کرے وہ خوبصورت ہو اور اسے اچھی طرح سنوارا جائے۔ لیکن یہ تو مسز سوشیل اور مس جونس کی غلطی نہ تھی۔ انہوں نے میرا ٹھیک میک اَپ کیا تھا۔ مس جونس نے اپنا خاکی رنگ کا رائڈنگ سوٹ مجھے پہنایا تھا۔ خاکی کوٹ اور خاکی پتلون۔ اور میرے لانبے بال پنوں میں لپیٹ کے شانوں پر ڈال دیئے گئے تھے۔ بالوں میں کنگھی تک نہ کی تھی۔ بال پیشانی پر اور رخساروں پر نہایت بے ترتیبی سے بکھیر دیئے گئے تھے۔ غلطی تو ویدیہی کی تھی جس نے ڈیوک اوف وارک کا پارٹ کیا تھا۔ وہ اپنے لبوں پر لپ اسٹک لگا رہی تھی۔ ڈرامے کا وقت ہو گیا تھا۔ مجھے جاتی دیکھ کر اس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچ لیا۔ "ہائے گلنار، یہ کیا؟ تم تو ہیروئن ہو، نہ روژ لپ اسٹک!" اس نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا دیا اور گالوں پر روژ مل دیا۔ اور جاتے ہوئے میں نے آئینہ پر نظر ڈالی تو خود ہی ٹھٹھک گئی۔ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے روکھے بال اور بھی اچھے لگ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا مس فنانس آج میری تعریف سب سے کریں گی۔ بلکہ تعریف کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔ ڈرامے کے اختتام پر مسز سوشیل، مس جونس، مسز ڈیانیل، دوڑی ہوئی اسٹیج پر چڑھ آئیں اور پردے کے پیچھے آ کر بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے مجھے مبارک باد دی کہ میں نے جون کے مشکل پارٹ کو بہت اچھی طرح نبھایا تھا۔ سب میری اداکاری پر عش عش کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ اور مس فنانس؟ انہوں نے حاضرین میں شامل ہو کر ڈرامہ دیکھا تک نہیں۔ پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر اداکار لڑکیوں کو ہدایات دیتی رہیں۔ میں نے کتنی التجا کے ساتھ

کہا تھا کہ حاضرین میں بیٹھ کر ڈرامہ دیکھیں۔ ان کے دونوں شانے پکڑ کر نہایت ملتجی نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا۔ میری یہ ملتجی نگاہیں پتھر سے دل کو پگھلا دیتیں۔ لیکن وہ تو شاید پتھر سے بھی زیادہ بے حس تھیں۔ ''گلنار کیا کروں میں نے اپنے ذمہ یہ کام لیا ہے تو مجھے کرنا ہی ہوگا۔'' واہ رے تمہارا کام! تاہم انہوں نے پردے کے پیچھے سے تو دیکھا تھا۔

اس رات مجھے ہاسٹل لوٹنے میں بہت دیر ہوگئی تھی۔ گو ہاسٹل کالج ہی کے کمپاؤنڈ میں تھی۔ لڑکیاں قدم قدم پر مجھے گھیرے لیتی تھیں۔ ''گلنار! تم نے تو کمال ہی کر دیا، تمہاری اداکاری کے کیا کہنے''۔ ''تم اسٹیج پر کیسی حسین نظر آ رہی تھی گلنار! ان سب سے پیچھا چھڑا کر تھکی ہاری ہاسٹل لوٹی۔'' زرینہ باہر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ ''میری اچھی گلنار، تم بال کٹوا کر یونہی میک اپ کیا کرنا۔ آج تو تم پری معلوم ہو رہی ہو۔ لیکن بھئی جون کے لئے تمہارا میک اپ ٹھیک نہ تھا۔ انکویزیٹر (Inquisitor) کہہ رہا تھا۔ "Joan you look very Pale today" اور تمہارے گالوں سے شفق پھوٹ رہی تھی!'' ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہم دوڑتے ہوئے ڈائننگ ہال پہنچے۔ سب لڑکیاں کھانے پر بیٹھ چکی تھیں۔ میرے جاتے ہی سبھوں نے تعریفوں کی بوچھار کر دی۔ اور اس رات میں کیسی خوش خوش بستر پر جا لیٹی تھی۔ نیند ہی نہ آتی تھی۔ ہونہہ! ان سب تعریفوں کی مجھے کیا پروا؟ کل میں اپنی مس فنانس اپنی اینجلنا سے ملوں گی۔ وہ یہ کہیں گی۔ یوں تعریف کریں گی...... دوسری صبح ان امنگوں اور امیدوں کو لئے ہوئے گئی تو اپنی اینجلنا کے پاس کیا رکھا تھا؟ ایک جذبات سے عاری چہرہ اور پھیکی بے مزہ باتیں...... زرینہ سچ کہتی تھی ''گلنار تم اتنی رومانوی لڑکی اور مس فنانس کی سی بے حس اور سرد مہر کہیں تمہارا جوڑا بھی ہے۔ تم تو آگ ہو اور وہ برف...... ہاں وہ ضرور جذبات سے بالکل عاری تھیں۔ بے حس اور مردہ دل۔ پتھر کا مجسمہ برف کا تودہ! بھلا پرویز سے ان کی کیا مناسبت؟ میرے پرویز کی رگ رگ میں زندگی ہے، بجلی ہے۔ تصویر ہی میں وہ کتنے رومانٹک معلوم ہوتے تھے اور میں نے اس دن چوری سے جھانک کر انہیں دیکھ بھی لیا تھا نا! جب ابّا نے انہیں

سلامی دینے (نذرانہ پیش کرنے کے لئے) کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس دن بھی زرینہ آئی ہوئی تھی اور جبین بھی۔ ''دولھا بھائی آ گئے''۔ زبیدہ کی آواز آئی اور میرا دل کیسے دھڑ کنے لگا۔ زرینہ اور جبین بھاگ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں۔ زرینہ مجھے بھی گھسیٹنے لگی۔ ''اٹھو گلنار! تم بھی اپنے دولھا کو دیکھ لونا۔'' میں پہلے تو جھجکی۔ گو میرا جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ انہیں ایک نظر دیکھ لوں۔ ''امی کیا کہیں گی''؟ ''اری امی کی بچی اُٹھ۔ ایسا زریں موقع کھودے گی۔'' زرینہ نے آخر مجھے کھینچ ہی لیا۔ وہ ابا کے سامنے کیسے شرمائے شرمائے کھڑے تھے۔ پھر جب وہ ہال میں آئے تو ہم نے دروازے کے سوراخوں میں سے جھانکنے کی کوشش کی۔ کمبخت سوراخ کتنے چھوٹے تھے! آخر ہمیں ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ جبین نے ہمارے کمرے کی روشنی گل کر دی تا کہ باہر والے ہمیں دیکھ نہ سکیں۔ اور زرینہ نے آہستہ سے چٹخنی کھول کر ایک کواڑ کو ذرا سا کھول دیا۔ پھر کیا تھا جبین اور زرینہ دونوں ٹوٹ پڑیں مگر میں جانے کیوں پیچھے ہٹ گئی......

''بڑا خوبصورت نوجوان ہے گل!'' زرینہ نے فرطِ مسرت سے گلے لگا لیا۔ میں نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔ ''میری گل! ایسا اچھا جوڑ ہے تیرا اور اس کا'' وہ میری ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں سے کیسی محبت ٹپک رہی تھی!...... وہ پھر جھانکنے لگی۔ فارم بھی بہت اچھا ہے، اور آنکھیں کیسی حسین ہیں۔ اِدھر آ تو گل! بڑی آئی کہیں کی امی سے ڈرنے والی۔ زرینہ مجھے پھر گھسیٹنے لگی۔ ''دیکھا تو نے اپنے پرویز کی آنکھوں کو؟ بخدا تیری آنکھوں کا جواب ہیں وہ تو!'' ...... ہاں میں نے دیکھا سب کچھ دیکھا۔ اس خوبصورت چہرہ کو، ان تبسم آمیز ہونٹوں کو، ان حسین آنکھوں کو جن میں شوخی اور بے تابی کوٹ کوٹ کر بھری تھی...... ''اری بڑا رومیانٹک معلوم ہوتا ہے گل! تجھ پر دیوانہ نہ ہو جائے تو میرے ذمہ! ابھی سے کہے دیتی ہوں گل، وہ تجھے آنکھوں میں بٹھائے گا، گلے کا ہار بنا لے گا۔'' اور میں وفورِ جذبات سے پھنکی جا رہی تھی۔ اس کے بازوؤں میں گر پڑی...... ''دیوانی، مس فنانس پر مری جاتی تھی۔ آخر تو نے کیا امیدیں باندھ رکھی تھیں۔

اس پتھر کی سی بے حس عورت سے۔ مسرت ہو یا رنج، غصہ ہو یا بے تابی، وہی پھیکا چہرہ، وہی بے نور آنکھیں! پرویز کو دیکھو کتنا اکسپریشن ہے اس کے چہرہ پر، گویا جذبات کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں"...... ہاں وہ اس وقت مجسم اضطراب نظر آرہے تھے۔ ان کی آنکھیں کس بے تابی سے ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ کیوں؟ شاید اس لئے کہ کہیں میں نظر آجاؤں؟

جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ دروازے توڑ دوں، سب کی موجودگی کو فراموش کرتے ہوئے ان کے سامنے جا کھڑی ہو جاؤں...... کاش میں کسی پردہ کی آڑ ہی میں کھڑی ہوتی، ایک لمحہ کے لئے پردہ کھسک جاتا اور میں ان کی طرف شوخ نظروں سے دیکھ کر مسکرا دیتی۔ پھر جلدی سے نظریں جھکا کر شرما جاتی اور انہیں دم بخود کر دیتی! ہاں وہ ضرور دم بخود ہو جاتے۔ میں اس نیلی جارجٹ کی نقرئی بارڈر والی ساری میں بہت دلکش نظر آرہی تھی نا...... ہونہہ! میں یہ ساری کیوں پہن کر جاؤں۔ میں جارجٹ کی ساری پہنوں گی جو میرے پرویز کی لائی ہوئی ہے۔ میں نے ساری کھینچ کر پھینک دی جو ابھی ابھی پہن رہی تھی۔ اور ذکیہ کو آواز دی۔ ذکیہ ایک برتن میں سموسے لئے جا رہی تھی۔ ذکیہ، ذرا میری نیلی ساری لے آنا وہی جارجٹ کی۔""اچھا لے آؤں گی مگر تم جلد آنا امی کہہ رہی تھیں کہ وہ مس فنانس کے ساتھ کھانے پر نہیں بیٹھیں گی۔ ان کی بجائے تم بیٹھو تو بہتر ہے۔"

میں نے بے پروائی سے اس کمرے کی طرف نگاہ کی۔ مس فنانس ہاتھ پر ٹھوڑھی رکھے اوپر دیکھ رہی تھیں۔ جذبات سے خالی بے نور آنکھیں، بے حد پتلے، پھیکے رنگ کے ہونٹ، زرد چہرہ جس پر چیچک کے داغ ہی داغ تھے۔ مجھے ایسا دکھائی دینے لگا کہ وہ داغ بڑھ رہے ہیں، گہرے ہو رہے ہیں اور پھیلتے جا رہے ہیں، ان کی صورت کیسی کریہہ ہوتی جا رہی تھی! میں جلدی سے اندر کھسک گئی اور سر کو زور سے جھٹکا دیا کہ دماغ پر کھنچی ہوئی تصویر ہٹ جائے۔ اس کی جگہ دماغ کے پردہ پر ایک اور تصویر ابھرنے لگی۔ پرویز کی! وہ خوبصورت نیلی آنکھیں، بڑی بڑی، بادامی نشیلی، لانبی خمیدہ پلکیں، بیضوی چہرہ، کشادہ حسین پیشانی، اور ہونٹ؟ کتنی حسین تراش تھی ان ہونٹوں کی۔ رسیلے بھرے ہوئے اور کناروں پر

وہ ہلکا سا خم گویا وہ مسکرانے کے لئے ہی بنائے گئے ہوں۔ وہ سانولا سانولا رنگ، شیام سندر! ہاں میرے شیام اور میں رادھا! میں نے میز پر رکھی ہوئی تصویر اٹھالی، پرویز کی، اور فرط بے تابی سے اسے چوم لیا۔ ''یہی ساری نا؟'' میں نے گھبرا کر تصویر رکھ دی۔ ذکیہ ساری لئے کھڑی تھی۔ ''ہاں یہی'' ''آپا جلدی آؤ نا۔ سموسے ٹھنڈے ہو رہے ہیں اور یہاں ساریوں پر ساریاں بدلی جا رہی ہیں۔ ادھر یہ بے پروائی اور ادھر دیکھو تو بے چاری مس فنانس نے گلنار گلنار ہی کی رٹ لگا رکھی ہے۔''

''اچھا ابھی آئی۔ میں نے پھر تصویر اٹھالی۔ اور سب کچھ بھول کر اسی حسین تصور میں کھوگئی۔ کیسا ہنس مکھ چہرہ۔ آہا یہ ہونٹ، نظر پہلے ان ہونٹوں پر ہی جا جمتی تھی۔ یہ ہونٹ اور...... اُف کیا خیال آگیا۔ میں مارے شرم کے عرق عرق ہوگئی۔ میں نے تصویر رکھ دی اور ساری پہننے لگی...... ان کی شخصیت میں کتنی دلکشی تھی! اُف کس بلا کا سجیلا پن! گھٹا ہوا بدن، دراز قد، چوڑا چکلا سینہ، لابنے مضبوط بازو۔ ان بازوؤں میں...... اُف پھر کیسے خیال آرہے تھے...... جیسے رگ رگ میں بجلیاں کوندرہی تھیں، دل کی دھڑکن کیسی تیز ہو رہی تھی! اور خون جیسے اُبلا جا رہا ہو۔ نس نس میں گرمی، آگ، اُف یہ جذبات کا ہجوم، یہ طوفان! میں بستر پر گر پڑی اور تکیوں میں منہ چھپالیا۔ یہ ہیجان، کیسی لذت تھی اس میں!

''گلنار آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟'' میں نے چونک کر دیکھا۔ امی کھڑی تھیں۔ ان کا چہرہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔ ''مس فنانس کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ تمہیں کچھ پاس بھی ہے بڑوں کا اور وہ تو تمہاری استانی ہیں۔'' امی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔

''تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔'' ''تمہیں کو یاد کر رہی ہیں۔'' ''تمہارے نام کی رٹ لگا رکھی ہے۔'' اچھا ابھی جاؤں گی...... ہاں، کیوں نہیں؟ ضرور جاؤں گی۔ یہ ساری پہن کر جو میرے پرویز نے لا کر دی ہے۔ اور ہاں وہ انگوٹھی بھی پہنوں گی جو پرویز سے میرے منسوب ہونے کی نشانی ہے۔ میں نے ایک چھوٹی سی مخمل کی ڈبیا نکالی۔ کیسی خوبصورت انگوٹھی تھی۔ میری انگیجمنٹ رنگ 'P.Engagement Ring' پرویز کے نام کا پہلا

حرف کس خوبصورتی سے تراشا گیا تھا! ہیروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی۔ اوران سفید نگینوں میں ایک سبز رنگ جگمگا رہا تھا۔ میں نے فخر سے دیکھا اور انگوٹھی پہن لی۔ ہاں اسی طرح جاؤں گی۔ اور انہیں بتادوں گی کہ مجھے اپنی شادی کی کس قدر خوشی ہے۔ وہ اپنے دل میں خیال کر رہی ہوں گی کہ میں ان سے شرمندہ ہوں۔ منہ بسوائے ہوئے بڑی ہی مغموم صورت بنائے ان کے پاس آؤں گی۔ دردبھرے لہجہ میں اپنی مصیبت بیان کروں گی کہ میرے دل پر کیا بیت رہی ہے اور شاید رونے بھی لگوں۔ ہونہہ! میں انہیں کیسے حیران کردوں گی! ساری پر نظر پڑتے ہی کہہ اٹھیں گی نا۔ ''کیسی خوبصورت ساری ہے'' اور میں بڑے فخر سے کہوں گی کہ یہ پرویز لائے ہیں۔ پرویز ہی کی باتیں کروں گی۔ خوشی سے جھومتی ہوئی انہیں بتاؤں گی کہ پرویز کس قدر حسین ہیں۔ انہیں میری شادی میں شرکت کرنے کے لئے اصرار کروں گی اور...... جذبات کی شدت کا پورے طور پر اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دوں گی کہ میں پرویز سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ یہ سن کر بس جل ہی جائیں گی جلیں گی؟...... ضرور۔ اس وقت جب میں چھٹی لئے بغیر گھر آئی تھی۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھیں نا۔ ''گلنار! کہیں تمہاری شادی تو نہیں ہو رہی ہے؟'' میں نے کہا ''نہیں'' انہیں یقین ہی نہ آیا۔ ''تم مجھ سے چھپاتی ہو گلنار!'' اور جبھی تو انہوں نے میری منگنی کی خبر ملنے پر مبارکباد تک نہ لکھ بھیجی تھی...... اور اب تو میرے چہرے پر بجائے رنج کے یہ وفورِ شوق، مسرت اور بے تابی دیکھ کر کیسے جل اٹھیں گی۔ ہونہہ! جلیں گی تو جلیں! خوب جلیں میری بلا سے!!

میں نے چلتے چلتے پرویز کی تصویر بھی لے لی۔

●●●

گھنیری بدلیوں میں

وہ بچے گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرہ پر ایک ملکوتی حسن جھلک رہا تھا۔ وہ مخصوص حسن جو صرف ماتا ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ کچھ اداس سی بچے پر جھکی ہوئی، وہ میڈونا نظر آرہی تھی۔ مقدس مریم کی اس تصویر کی مانند جس میں وہ یسوع مسیح کو گود میں اٹھائے ماتا بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ کتنی خوبصورت ہیں بچے کی آنکھیں۔ بالکل اپنے باپ کی سی، بڑی بڑی بادام کی سی، اور یہ لانبی لانبی پلکیں، اسے کتنی خواہش تھی کہ بچے کی آنکھیں ایسی ہی ہوں۔ ان دنوں جب وہ امید سے تھی تو اپنے شوہر کی آنکھوں کو ہمیشہ تکا کرتی تھی اور آئینہ میں دیکھتے ہوئے اپنی آنکھوں کو زیادہ توجہ سے نہ دیکھا کرتی، اس خوف سے کہ کہیں بچہ کی آنکھیں اس کی آنکھوں سے مشابہ نہ ہو جائیں گو اس کی اپنی آنکھیں بھی خوبصورت تھیں، کالی رسیلی آنکھیں جن میں ستاروں کی سی چمک بھی تھی اور خاموش نیلے سمندر کی سی گہرائی بھی۔ مگر اس کے شوہر کی آنکھیں کچھ اور ہی طرح سے حسین تھیں۔ بڑی بڑی بادام کی سی نیلی آنکھیں اور لانبی اوپر کو مڑی ہوئی پلکیں دونوں کی آنکھیں خوبصورت تھیں لیکن وہ چاہتی تھی کہ بچے کی آنکھیں اس کے شوہر کی سی ہوں۔ لانبی پلکوں کی جھالر میں دو چھلکتے ہوئے جام۔ وہ ان آنکھوں کو اس وقت بھی تکا کرتی تھی جب وہ اس پر محبت کی کرنیں برسا رہی ہوتیں۔ اس وقت جب وہ نشہ سے بوجھل ہو جاتیں۔ اس وقت بھی جب وہ آنکھیں نیند کے غلبہ سے بند ہوئی جاتیں۔ اور لانبی پلکیں اس کے خوبصورت رخساروں

پر کانپ رہی ہوتیں۔ اس وقت بھی جب وہ بند ہو جاتیں۔ بادام کی سی آنکھیں اور رخساروں پر جھی ہوئی وہ ریشمیں پلکیں۔ وہ چاہتی تھی کہ بچے کی آنکھیں بھی ایسی ہی ہوں۔ باپ کی سی! لڑکی کے دل میں اس کی یاد پھر ٹیس بن کے اٹھ رہی تھی۔ اس نے ایک سرد آہ بھری۔ آج تو وہ چند لمحے بھی اس کے ساتھ نہ گذار سکی تھی۔ صبح اٹھتے ہی وہ تھوڑا سا ناشتہ کر کے آفس چلا گیا تھا۔ پھر جب وہ پانچ بجے لوٹا تو دوست پیچھے لگے تھے۔ یہ دوست آشنا بھی کیا بلا ہوتے ہیں جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ لڑکی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ کبھی کبھی تو شام ہی سے آدھمکتے ہیں اور آدھی آدھی رات تک بیٹھے گپیں ہانکتے رہتے ہیں۔ پھر وہ کوئی ایسے گہرے دوست تو نہ تھے یونہی اس سے بحث کرنے آیا کرتے تھے بھلا اس کے شوہر سے کہیں بازی لے جاسکتے تھے؟ کتنا اعلیٰ ذوق تھا اس کے شوہر کا! لڑکی کے دل میں فخر و محبت کے جذبات اُمڈ آئے۔ کیا ان لوگوں کو اتنا بھی احساس نہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے ملنے کے لئے کتنے بے چین ہوں گے۔ شاید ان لوگوں کے سینے میں دل ہی نہیں۔ اگر ہوتے تو کم از کم انہیں اتنا تو احساس ہوتا کہ وہ بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ آج بھی جب وہ اس کی آواز سن کر بھاگی بھاگی دروازہ کھولنے گئی تھی تو اسے یہ دیکھ کر کتنا غصہ آیا تھا کہ دو تین دوست بھی ساتھ ہیں۔ دن بھر کے صبر آزما انتظار کے بعد بھی وہ اس سے نہ مل سکی تھی۔ اُف آج وہ کتنا ترس گئی تھی لمحہ بھر کے ساتھ کے لئے۔ خیر یہ دوست تو سات بجے ہی چلے گئے تھے۔ اب تو وہ اس کے پاس بیٹھ سکے گی۔ لیکن اسی وقت بچہ رونے لگا تھا اور اسے بچہ پر غصہ آگیا تھا۔ ہاں اس ننھے سے ایک ماہی بچے پر بھی۔ نہ جانے ان عورتوں کے دل کیسے ہوتے ہیں جو بچوں ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتی ہیں۔ ایک بچہ ہو جائے تو شوہر کی محبت کم ہو جاتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسے تو اپنے شوہر ہی سے محبت رہے گی۔ مامتا ہرگز اس محبت کی برابری نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے بچہ سے بھی اس لئے محبت تھی کہ وہ اس کا بچہ تھا۔ اس کے اپنے جمیل کا۔ جب جمیل پنگھوڑے پر جھکا ہوا محبت سے بچہ کو کھلا رہا ہوتا تو اس کا دل مسرت سے معمور ہو جاتا تھا۔ ہاں وہ بچہ کو سلا کر جمیل کے پاس گئی تھی۔ تب کسی نے آکر جمیل کو آواز دی

اور اسے بلا کر کہا۔ فلاں کے ہاں تمہاری دعوت ہے۔ وہ ٹال رہا تھا۔ ''دیکھئے آج میری طبیعت کچھ خراب ہے لیکن وہ آدمی اصرار کر کے اپنے ساتھ لے گیا تھا...... اور وہ! اس کا دل درد کے بوجھ تلے دبا ہوا! وہ آج ہی نہیں کئی دنوں سے یہ درد محسوس کر رہی تھی جب سے وہ کورٹ جانے لگا تھا۔ لیکن یہ کیوں؟ آخر بھی عورتوں کے شوہر دن بھر کام پر چلے جاتے ہیں۔ وہ یوں نہیں تڑپتی رہتیں۔ عجیب لڑکی ہے وہ بھی! لیکن ایک ماہ پہلے ان کی زندگی کیسی حسین تھی۔ وہ جانتی بھی نہ تھی کہ جدائی کیسی ہوتی ہے۔ وہ دن بھر ساتھ رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی محبت میں سرشار، زندگی کا ہر لمحہ حسین نظر آتا تھا۔ اس کے لئے آنے والی گھڑی میں مسرت پنہاں تھی اس کے لانبے مضبوط بازوؤں میں بھنچی ہوئی، جب اس پر جھکی ہوئی ان حسین آنکھوں میں امرت ہی امرت چھلک رہا ہوتا جب ان نگاہوں میں محبت کی وہ گرمی ہوتی کہ وہ اس کی تاب نہ لا کر آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں میچ لیتی۔ وہ محسوس کرتی کہ فردوس میں جا پہنچی ہے یا کوئی حسین سپنا دیکھ رہی ہے۔ اسے اس سے زیادہ مسرت مل ہی نہیں سکتی۔ وہ فرطِ مسرت سے دیوانی ہو جائے گی...... لیکن اب اس کے ساتھ رہ کر بھی وہ گویا اس سے دور تھی۔ دن بھر تو اسے کورٹ میں رہنا پڑتا۔ لوٹتے ہی مطالعہ میں مصروف ہو جاتا۔ پھر آفس سے لائے ہوئے مقدموں کے فائل بھی دیکھنے ہوتے تھے۔ کاش وہ ان کی شادی کے چند دنوں بعد ہی پریکٹس شروع کر دیتا۔ وہ کم از کم اس تنہائی کی عادی تو ہو جاتی۔ لیکن انہوں نے پورا ایک سال دنیا کے بکھیڑوں سے آزاد رہ کر گذارا تھا اپنی رومان کی بستی میں۔ انہیں زمینوں سے کافی آمدنی ہوتی تھی لیکن جمیل کہا کرتا تھا مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ مجھے اس کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ میں سوسائٹی کا ایک بیکار عضو ہوں۔ پھر اس کے اشتراکی اصول۔ ''یہ آمدنی تو غریب مزدوروں کے پسینے کی کمائی ہے۔ جب تک میں اپنی محنت سے نہ کماؤں چین نہیں آتا۔ میں نے گاؤں میں زمینوں کی دیکھ بھال بھی مختار پر چھوڑ رکھی ہے۔ یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیکار بیٹھا ہوں۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔'' اور اس نے پریکٹس شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وکالت نے اس سے جمیل کو چھین لیا ہے۔ اس کی زندگی

سے ساری رنگینی نچوڑ لی ہے کیا اب دن یونہی بیتتے جائیں گے؟ وہ پھر مسرت نہ دیکھ سکے گی۔ بچہ اس کی گود میں ہلا۔ اس کی بھنچی ہوئی ننھی سی مٹھی گال پر سے کھسک کر لڑکی کی گود میں آگری۔ لڑکی نے جھک کر بچے کا منہ چوم لیا۔ ''میرے ننھے اب تم ہی میرے لئے خوشی کی ایک کرن ہو۔ وہ رقت بھری آواز میں بولی۔ بچے نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ لڑکی کے لبوں پر ایک لمحہ کے لئے پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ یکا یک بچے نے منہ بنایا جیسے اُسے تکلیف ہو رہی ہے اور درد سے چیخنے لگا۔ ''میرے اللہ میرا بچہ بیمار ہے!'' اس نے بچے کو سینے سے چمٹا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ سسکیاں جو نہ جانے کتنے دنوں سے اس کے گلے میں گھٹی ہوئی تھیں۔ اُبل پڑیں۔ وہ آنسو جنہیں وہ اب تک پی کر رہ گئی تھی ایک طوفان بن کر بہہ نکلے۔ وہ اٹھی بچہ کو گرائپ واٹر پلایا اور آہستہ آہستہ اس کا پیٹ دبانے لگی۔ لیکن بچہ برابر چیختا جا رہا تھا۔ ''میرے ننھے تُو تو یہ بھی نہیں بتا سکتا تجھے کیا درد ہے۔ میرے بچے کا سارا درد مجھے دیدے الہٰی۔ یہ ننھی سی جان اسے سہہ نہیں سکتی۔'' لڑکی نے اپنی پُرنم آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں۔ بچہ کو بھینچ کر سسکیاں لینے لگی...... بچہ اس کے سینہ سے لگ کر سو گیا تھا۔ اس نے آہستہ سے اسے زانو پر لٹا لیا۔ وہ اب رو نہیں رہی تھی۔ آنسوؤں کی دو بڑی بڑی بوندیں اس کی خوبصورت آنکھوں سے رخساروں پر ڈھلک آئی تھیں۔ ٹن کی آواز آئی۔ لڑکی نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اب جلد ہی وہ آجائے گا۔

اس کے کانوں میں وہ مانوس آواز آئی۔ وہ پیاری آواز۔ اسے جمیل کی آواز سے بھی کتنی محبت تھی۔ جب کبھی وہ باہر سے آکر دروازہ کھولنے کے لئے آواز دیتا۔ اس کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ اس کی رگ رگ میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی۔ لیکن آج وہ اتنی خوش نہ ہو سکی۔ اس کے دل کو اس پیہم کسک نے اتنا مسل دیا تھا کہ وہ کھل ہی نہ سکتا تھا۔ اس کی خوشی اتنی دھیمی تھی جیسے کہیں دور گھنیرے بادل کی تہوں میں بجلی کی چمک دکھائی دے۔ اس کے دل پر غم کی ایسی ہی تہیں جمی تھیں۔ اس نے آنسو خشک کیے۔ بچے کو پنگھوڑے میں سلایا۔

جلدی سے آئینہ لیکر صورت دیکھی اور دروازہ کھولنے چلی۔ لیکن جمیل کے بھائی کو بھی ساتھ دیکھ کر ٹھٹھک گئی اور دروازہ کھولنے کے لئے لڑکے سے کہہ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ سر کو پیچھے جھٹکا دے کر آنکھیں میچ تصور کرنے لگی۔ جمیل کے کمرے میں آتے ہی وہ اس سے لپٹ جائے گی۔ دن بھر کے صبر آزما انتظار کے بعد آخر کار وہ چٹخنی کھولنے کے لئے بڑھی۔ لیکن اسے ایک شرارت سوجھی۔ نہیں، جب وہ آئے گا تو وہ اس کمرے میں نہیں ہوگی۔ اب وہ بھی اسے تڑپائے گی۔ وہ بھاگ کر دالان میں جا چھپی۔ وہ اسے کمرے میں نہ پا کر کتنا مضطرب ہو جائے گا۔ وہ بھی دن بھر اس سے دور رہ کر کتنا بے چین رہا ہوگا...... وہ اسے دیوانہ وار سب کمروں میں ڈھونڈھتا پھرے گا۔ پھر جب وہ دالان میں مل جائے گی تو کتنی بیتابی سے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لے گا۔ کچھ دیر تک وہ کچھ بول ہی نہ سکے گا۔ پھر وہ جھک کر آہستہ سے کہے گا۔ ''نجمی! میری جان'' اور وہ اس کے سینہ میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے گی۔ اتنا کہ اس کا دل پگھل کر آنکھوں کے رستے بہ جائے۔ جمیل اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اسے تسلی دے گا۔ ''نجمی، میری نجمی'' اور وہ اپنی نمناک آنکھیں اٹھا کر کہے گی۔ ''آج کل تم مجھ سے کتنے دور ہو جمیل!'' وہ اسکی ٹھوڑی پکڑ کر کہے گا۔ تمہاری جدائی میں مجھے بھی اتنا ہی درد ہوتا ہے لیکن کیا کریں زندگی صرف رومان ہی تو نہیں۔'' اور وہ جھک کر اس کے ہونٹ چوم لے گا۔'' ''لو جانی، آج میں تمہاری خاطر کتابیں بھی نہیں پڑھوں گا۔'' اور وہ دونوں خوش خوش اپنے کمرے میں واپس آئیں گے۔ پھر وہ پیار کی باتیں، میٹھی میٹھی شکایتیں!

لیکن جمیل کو آئے دس منٹ گذر چکے تھے۔ وہ اب تک اسے ڈھونڈتا ہوا نہ آیا تھا۔ نجمہ مایوس ہوگئی۔ وہ کیوں نہیں آیا۔ آخر کیوں؟ کیا وہ اس سے ملنے کے لئے مضطرب نہیں ہے۔ شاید وہ وہیں کمرے میں لباس تبدیل کر کے لیٹ رہا ہوگا۔ اس نے تمام دن ذرا بھی آرام نہ کیا تھا۔ کتنی تکان محسوس ہو رہی ہوگی اس کو! وہ کتنی بے رحم ہے۔ وہ خود ہی اس کے پاس جائے گی۔ نجمہ کمرے میں آئی۔ وہ یہاں بھی نہ تھا۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر

دیکھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھا اپنے بھائی سے باتیں کر رہا تھا۔ تو اسے اب بھی انتظار کرنا ہوگا۔ وہ تلخی سے نچلا ہونٹ چبانے لگی۔ آخر وہ کب تک انتظار کرتی رہے گی۔ کب تک یہ درد سہتی رہے گی۔ وہ گھلی جا رہی تھی۔ آخر کب تک؟ وہ نڈھال ہو کر بچھونے پر گر پڑی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی لیکن کھانا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ کتنے دنوں سے وہ یونہی گھلی جا رہی ہے۔ وہ صبح صبح ہی آفس چلا جاتا ہے۔ وہ دن بھر اس کی یاد میں کھوئی اداس بیٹھی رہتی۔ جمیل کی یاد اسے اتنا ستا رہی ہوتی کہ وہ کتاب پر توجہ نہ کر سکتی۔ ہاں کچھ دیر تک اپنے بچے کو چاند کا ٹکڑا کہتے ہوئے اسے خیال آتا۔ بچہ تو صرف چاند کا ٹکڑا ہے۔ جمیل تو پورا چاند ہے۔ اس کی ساری خوشیاں سمٹ کر جمیل کی ذات میں سما گئی تھیں۔ اس کی دنیا جمیل تھی۔ کبھی کبھی آفس جاتے ہوئے وہ کہہ جاتا۔ ''میرا یہ سوٹ تہہ کر کے رکھ دو جانی''۔ ''نوکر سے کہہ دو نجمی شوز صاف کر کے ڈبوں میں رکھ دے۔'' وہ بڑی محبت سے اس کے کہے ہوئے کام کرتی تھی۔ بڑے پیار سے اس کے کوٹ تہہ کرتی۔ انہیں سینہ سے لگا لیتی۔ شوز صاف کرنے کے لئے وہ نوکر سے نہ کہتی۔ خود ہی برش لے کر ان پر سے گرد پونچھتی۔ اس کا جی چاہتا انہیں چوم لے ہاں جوتوں کو بھی! انہیں جمیل اپنے پاؤں میں پہنتا تھا نا۔ پھر جب اس کے آنے کا وقت قریب ہوتا اس کی اداسی کم ہونے لگتی۔ جیسے آہستہ آہستہ بادل چھٹ جائیں اور مطلع صاف ہو جائے۔ دل پر سے بوجھ اتر جاتا۔ اب جمیل آئے گا وہ دھڑکتا ہوا دل لئے دروازہ کھولنے جائے گی۔ کواڑ کھلتے ہی یہ معلوم ہونے سے پہلے کہ وہ اندر آ گیا ہے وہ اس کے بازوؤں کی گرفت میں ہوگی۔ اس کے نرم ہونٹوں کے لمس سے مدہوش ہو جائے گی اور اپنا سارا درد بھول جائے گی۔

......نہیں شاید یوں نہیں ہوگا۔ وہ تھکا ہوا آئے گا۔ پژمردہ اور وہ دروازے میں کھڑی ایک محبت بھری مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرے گی۔ وہ مسکراہٹ اس کی تکان دور کر دے گی۔ اس میں نئی جان ڈال دے گی۔ وہ اپنا تھکا ہوا سر اس کی گود میں رکھ دے گا۔ وہ ایک ماتا بھرے پیار سے اس کی خوبصورت پیشانی چوم لے گی۔ اور اپنی نازک

انگلیاں اس کے بالوں میں پھیرتی ہوئی آہستہ آہستہ کوئی میٹھا ترانہ چھیڑے گی۔ اور وہ اس کی گود میں اس راگنی سے مدہوش ہو جائے گا۔ پھر اس کے کان میں وہ مانوس آواز آتی "نجمہ" وہ اپنے خیالات سے چونکتی دوڑی ہوئی جا کر دروازہ کھولتی۔ وہ تھکا ہوا ہوتا۔ وہ اس کی تکان دور کرنے کے لئے اپنے ہونٹوں پر ایک نرم میٹھی مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتی لیکن وہ آتے ہی پوچھتا "آج کا اخبار آیا ہے نجمی!" اور وہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر آنے سے پہلے ہی سینے میں گھٹ کر رہ جاتی۔ وہ مایوس ہو کر اپنی پیاسی نظریں جھکا لیتی اور اخبار لے آتی۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر نہایت بے تابی سے اخبار لے لیتا اور وہ ایک دبی آہ کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ جاتی۔ اس انتظار میں کہ اخبار ختم ہونے پر وہ اس کی طرف توجہ کرے گا۔ لیکن جمیل اخبار ختم کر کے دوسری کتابیں اٹھا لیتا۔ وہ ملتجیانہ لہجہ میں کہتی "بہت تھک گئے ہو، ذرا آرام کر و نا!" "کیا کروں نجمی! پڑھنے کے لئے وقت ہی نہیں ملتا۔" "پڑھنا پڑھنا! اُف یہ پڑھنا کبھی ختم بھی ہوگا۔ یہ کتابوں کا انبار۔ ہر روز اس انبار میں اضافہ ہوتا رہتا، اچھی خاصی لائبریری بنا رکھی تھی اس پر بھی بس نہ تھا۔ وہ کوئی اَن پڑھ لڑکی تو نہ تھی کہ کتابوں سے بیر رکھتی اسے بھی کتابیں پسند تھیں۔ لیکن کوئی یوں بھی پڑھتا ہوگا۔ ان بے جان کاغذ کے تودوں کے سامنے اس کا دکھتا ہوا دل کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ جمیل کو اتنا بھی احساس نہیں کہ وہ دن بھر اس کے انتظار میں کتنی اداس رہی ہے۔ اُف یہ انتظار! مسلسل انتظار! وہ اس وقت بھی اس کا انتظار کر رہی ہوتی۔ گو وہ اس کے پاس ہی بیٹھا ہوتا۔ ساری توجہ تو کتاب پر مرکوز ہوتی۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ اب بھی اس کے پاس بیٹھا رہ کر بھی اس سے دور ہے، بہت دور...... یونہی گیارہ بج جاتے اور اسے نیند آنے لگتی۔ اسے جمائیاں لیتی دیکھ کر وہ کہتا "تمہیں نیند آ رہی ہے نجمی؟ سو جاؤ نا مجھے ابھی دس صفحے اور پڑھنے ہیں۔ میرا انتظار نہ کرو نجمی!" وہ بچھونے پر لیٹ جاتی۔ ابھی دس صفحے اور؟ وہ بیتابی سے کتاب پر نظریں جمائے رہتی۔ جمیل کو ورق الٹاتے دیکھتی۔ ایک دو، تین، چار، پانچ...... اور نیند کے غلبہ سے اس کے پپوٹے بند ہونے لگتے۔ پھر بھی وہ اس کے انتظار میں بیدار رہتی۔ چھ، سات،

آٹھ۔اس کے سر میں درد ہونے لگتا۔آنکھیں بری طرح جل رہی ہوتیں۔وہ ان جلتی ہوئی پلکوں کو بہ مشکل کھولے رہتی۔نو، دس، آخر کار وہ اطمینان کی ایک گہری سانس لیتی۔ لیکن..... مجھے غضب کی نیند آرہی ہے نجمی!" اور اس کی ابھرتی ہوئی امنگیں سینہ میں دب کر رہ جاتیں۔وہ جمیل پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالتی لیکن وہ سر سے پاؤں تک چادر تان کر سویا ہوتا۔وہ اس کے چہرہ کو بھی نہ دیکھ سکتی۔اس کا دل بے اختیار بھر آتا، آنسو اُبل آتے۔پھر اس کی جلتی ہوئی نمناک آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو جاتیں اور وہ سو جاتی۔ یونہی تشنہ لب، پیاسی!

آخر وہ کیا کر سکتی تھی؟ کیا وہ جمیل سے کہہ دیتی کہ وہ کئی دنوں سے اس کی محبت کی پیاسی ہے۔وہ اس کی ان محبت بھری نظروں، بے تاب بازوؤں کی گرفت اور شہد آگیں نرم ہونٹوں کے لمس کے لئے کتنا ترس گئی ہے۔اسی طرح رنگین لفظوں میں شاعرانہ وارفتگی کے ساتھ اس کے حسن کی تعریف کرے۔اسی بے تابی سے اپنی محبت کا اظہار کرے۔جیسے پہلے کیا کرتا تھا۔نہیں، اس کی خودداری یہ کہنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔عورت میں وقار ہونا چاہئے۔حسن کو تو ناز ہی بھاتا ہے۔حسن خود ہی نیاز بن جائے۔تو اس میں وہ وقعت کہاں رہے گی۔اگر یہ باتیں کہہ کر اپنا مقصد پالیتی تو اسے جمیل کی محبت میں وہ بیتابی، وہ بے ساختگی کہاں نظر آئے گی۔اس کے دل میں ہمیشہ یہ احساس ابھرے گا کہ وہ اسکے کہنے پر محبت کا اظہار کر رہا ہے۔اس لئے وہ زبان سے کچھ نہ کہتی۔لیکن اس کی آنکھیں تو سب کچھ کہہ دیتی تھیں۔کیا وہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں کتنی حسرت جھلکتی ہے۔کتنی یاس چھپی ہوتی ہے۔یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ مغموم حسن میں بلا کی کشش ہوتی ہے۔ان حسین آنکھوں کی اداسی پتھر سے دل کو بھی پگھلا نہ دیتی پھر جمیل کا دل تو اتنا نرم تھا۔اتنا محبت بھرا دل..... لیکن وہ اس کی آنکھوں کو دیکھتا ہی کب تھا۔اسے کتابوں میں لکھے ہوئے نئے نئے افسانے پڑھنے سے فرصت ہی کہاں ملتی تھی کہ وہ اس کی آنکھوں میں لکھی ہوئی مایوسیوں کا افسانہ پڑھتا۔

پھر ایک دن اس نے جمیل سے اشارتاً کہہ بھی دیا تھا۔ اس وقت جب وہ آلڈس ہکسلی (Aldaus Huxley) کا مشہور ناول "پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ" (Point Counter Point) پڑھ رہی تھی۔ مصنف نے تین چار عورتوں کے مختلف کردار کھینچے تھے۔ جمیل نے پوچھا "تم ان میں سے کون سے کردار کے خاکے میں ٹھیک بیٹھتی ہو؟ تم نے دیکھا' جانی' ہکسلی کے کردار اس ناول میں "ٹائپس" ہیں۔

بتاؤ تم ان میں سے کون ہوان تین چار عورتوں میں سے" جواب میں فوراً کہہ اٹھی تھی۔ "ایلینار" اس وقت ایلینار کا کردار اس پر اس قدر رچتا تھا کہ اسے جواب دینے سے پہلے سوچنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ گو ان میں سے ہر ایک کے احساسات پڑھتے ہوئے اسے خیال ہوا تھا کہ اس نے خود بھی کبھی نہ کبھی ایسا محسوس کیا ہے۔ لیکن اب فی الحال تو ایلینار کی تمثیل اس پر ٹھیک آئی تھی۔ عجیب اتفاق تھا جب جمیل نے اس سے یہ پوچھا تھا۔ وہ ایلینار ہی کے بارے میں پڑھ رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی ایلینار کی زندگی اس کی موجودہ زندگی سے کتنی ملتی جلتی ہے! ایلینار اس کا عکس ہے۔ ایلینار جس کا شوہر فلپ ہمیشہ کتابوں میں کھویا رہتا تھا۔ وہ اسے رومان و محبت کی دنیا میں لانے کی کوشش کرتی لیکن بے سود۔ فلپ جانتا ہی نہ تھا کہ جذبات کیا بلا ہوتے ہیں۔ اس کے [کو] تو گویا دل ہی نہ تھا۔ اگر تھا بھی تو اس میں دماغ ٹھنسا ہوا تھا وہ تو سراپا داغ تھا۔ خشک، ٹھوس، خیالات کا اڈا۔ ہر وقت سوچنا، سوچنا، فلپ معمولی سے معمولی بات میں بھی کھینچ کھانچ کر کوئی نہ کوئی فلسفہ، کوئی منطق ڈھونڈ نکالتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایسے واقعات پیش آتے جس سے دوسروں کے جذبات میں ہلچل مچ جاتی۔ مگر فلپ کے جذبات کا برانگیختہ ہونا تو درکنار وہ متاثر بھی نہیں ہوتا۔ ایسے موقعوں پر بھی اس کے ٹھوس دماغ کے پرزے فوراً کام پر لگ جاتے اور وہ کوئی منطقی نتائج اخذ کرنے لگتا۔ اور ایلینار غریب لڑکی! وہ محبت کی کتنی پیاسی تھی۔ خصوصاً اس کتاب میں وہ ایک سین پڑھ کر تو بہت متاثر ہوئی تھی۔ وہ سین جس میں فلپ اور ایلینار کار میں بیٹھے بمبئی کی گلیوں سے گذر رہے تھے۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ فلپ کار چلا رہا

تھا۔ ایلینار اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ مطلع صاف تھا اور چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سڑک پر دو رویہ درخت تیزی سے ان کی نظروں کے سامنے سے گذر جاتے۔ اس خوش گوار فرحت انگیز فضا میں، ایلینار کے دل میں رومانی جذبات اُٹھ رہے تھے۔ اس نے آہستہ سے اپنے شوہر کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر چاند پر نظریں جمائے بولی۔

''پیارے فل! تمہیں یاد ہیں وہ چاندنی راتیں؟''

فلپ بھی چاند کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن چاند بھی اس کے دماغ میں خشک اور ٹھوس خیالات کی تخلیق کر رہا تھا۔ یہ رومانی ماحول بھی اس میں کوئی لطیف جذبہ پیدا نہ کر سکا۔ وہ بیوی کے سوال پر چونکا۔ ''کون سی چاندنی راتیں؟'' اور ایلینار کی ساری اُمڈتی ہوئی اُمنگیں سرد ہو گئیں۔ ''تم وہ راتیں بھول گئے ہو فل؟ وہ حسین چاندنی راتیں جو ہم اس باغ میں گذارا کرتے تھے۔ ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ہم اکثر چاندنی راتوں میں اس باغ میں چلے جاتے۔ وہ محبت کی راتیں آہ! وہ دن بھی کیا دن تھے!'' ایلینار نے ایک سرد آہ بھری۔ ''تم ان محبت کی یادگار حسین راتوں کو بھول گئے ہو؟''

''میں بھولا نہیں ایلینار۔ لیکن تم صرف ''وہ چاندنی راتیں'' کہو تو میں انہیں راتوں کو کیسے خیال کر سکتا ہوں؟ میں تو اس وقت کچھ اور سوچ رہا تھا۔''

''تم اب مجھ سے محبت نہیں کرتے، فل!'' ایلینار رو پڑی۔ ''اب تمہیں مجھ سے پہلی سی محبت نہ رہی۔ اگر ہوتی تو تمہیں ان راتوں کی یاد آ جاتی۔ سچ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔''

''لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں ایلینار''...... ہاں ایلینار بھی جانتی تھی کہ فلپ اس سے محبت کرتا ہے لیکن ایسی محبت بھی کس کام کی جس کا اظہار ہی نہ ہو۔ وہ محبت جس کو کتابوں کے تودے نے دل کے کسی تاریک گوشہ میں کھسکا دیا ہے جو منطق کے بوجھ تلے دبی دم توڑ رہی ہے۔ ہاں فلپ کا دل بھی تو کتابوں سے بھرا پڑا تھا...... اور یہ سین پڑھتے

ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ وہ خود ایلینار ہے۔ اور جب جمیل نے پوچھا تھا کہ وہ ناول کی [کے] کرداروں میں سے کون ہے تو وہ جھٹ کہہ اٹھی تھی ایلینار! شاید یہ جواب سن کر جمیل نے قیاس کرلیا تھا کہ وہ کیوں اپنے آپ کو ایلینار کہہ رہی ہے۔ شاید اسے چڑ کا بھی لگا تھا اس نے جلدی سے پوچھا ''تو میں فلپ ہوں؟'' اس کے جی میں آیا تھا کہ کہہ دے ''ہاں فلپ [ہو تبھی] ہی تو ہر وقت کتابوں میں ٹھسے رہتے ہو۔'' لیکن اس نے کچھ سوچ کر یہ جواب نہ دیا تھا۔ ''فلپ — تو نہیں — ہو'' اس نے کہا تھا۔ لیکن ایک لمبی راگ کھینچ کر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ چند دنوں سے وہ پورا فلپ نہیں تو کم از کم تین چوتھائی فلپ ضرور ہے لیکن جمیل نے شاید اس اشارے کو نہ سمجھا۔

کیونکہ وہ اس جواب سے مطمئن ہو گیا تھا اور ہنس کر کہا تھا ''لیکن آگے چل کر تو دیکھو تمہاری ایلینار کیا گل کھلاتی ہے۔''

اس سے آگے پڑھ کر دیکھا تھا۔ ایلینار نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ اپنے شوہر کو کچھ دیر کے لئے تو رومانی دنیا میں لائے۔ اس کے سینہ میں کبھی کبھی جذبہ کی ایک لہر تو پیدا ہو جائے۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ فلپ اتنا غیر رومانی تھا۔ ہر وقت کی سوچ بچار نے اس کے جذبات کو سکھا دیا تھا۔ ایلینار آخر تنگ آ گئی تھی۔ اس میں بغاوت سی بیدار ہو گئی۔ آخر وہ کیوں اپنی خوشی کو اس خشک آدمی پر قربان کر دے۔ دیکھتی دکھاتی کیوں اپنے ارمانوں کا خون کرے کب تک اپنے دل کو پیاسا رکھے۔ وہ ایسے آدمی کی تلاش کرے گی جو محبت کا اظہار کرنا جانتا ہو۔ پھر ایک دوست ان کے گھر آیا تھا۔ جو ایلینار کی شادی سے پہلے اس سے محبت کرتا تھا۔ اس نے ایلینار کو یقین دلایا کہ وہ اب بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہے۔ ''آخر تم کیوں اس سرد مہر خشک فلپ کے ساتھ رہ کر اپنا حسن اپنی زندگی برباد کر رہی ہو۔ تم نہیں جان سکتیں [سکتی] ایلینار میں تمہیں کیسی محبت دے سکوں گا۔ تمہیں ایسی محبت نصیب ہی کہاں ہوئی ہے! تم نہیں اندازہ لگا سکتیں [سکتی] میری محبت کیسی ہوگی۔ اتنی شاعرانہ، اتنی گہری، اتنی گرم اور جوش بھری'' اور ایلینار نے ان باتوں سے مسحور ہو کر یہ فیصلہ

کرلیا تھا کہ وہ فلپ کو چھوڑ دے گی اور اس آدمی سے شادی کرلے گی..... تو ایلینار نے یوں کہا تھا وہ ایلینار جس کو وہ اپنا عکس سمجھ رہی تھی۔ تو کیا اب بھی وہ ایلینار ہے۔ کیا وہ بھی ایلینار کی طرح جمیل کا ساتھ چھوڑ دے گی؟ اُف وہ اس خیال سے کانپ گئی۔ نہیں، ہرگز نہیں، وہ ہمیشہ جمیل کی رہے گی۔ جمیل فلپ کی طرح سرد اور خشک تو نہیں تھا۔ صرف یہ بات تھی کہ جب سے اس نے پریکٹس شروع کی تھی۔ اس کو بہت کم فرصت ملتی تھی اور پڑھنے لکھنے کا اسے اس قدر شوق تھا۔ تھوڑا بہت جو وقت ملتا تھا۔ اسی میں صرف ہو جاتا۔ ورنہ وہ پہلے کتنی گرم جوشی سے محبت کا اظہار کیا کرتا! وہ محسوس کرتی کہ شاید ہی کوئی شوہر اپنی بیوی سے اتنی محبت کرتا ہے۔ وہ دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی ہے اور وہ خود بھی تو ایلینار سے الگ تھی۔ ایلینار نے معمولی تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنے شوہر کے بلند خیالات کو صرف تحسین کی نگاہ سے دیکھ سکتی تھی۔ نہ تو ان کتابوں کو پڑھ کر سمجھ سکتی تھی۔ جنہیں فلپ پڑھا کرتا تھا۔ نہ ہی اس سے تبادلہ خیالات کرسکتی تھی۔ فلپ کے خیالات کی اڑان کا ساتھ دینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اگر وہ فلپ کے ساتھ اس کی دلچسپی کی باتیں کرسکتی، اس کے خیالات میں حصہ لے سکتی تو شاید اپنے آپ کو اتنا تنہا محسوس نہ کرتی۔ لیکن وہ خود تو گریجویٹ تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی نہیں ذہین بھی، کالج بھر میں اس کی ذہانت کی دھوم تھی۔ جمیل تو اس کی ذہانت دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہوگیا تھا اور وہ دونوں ایک ساتھ کتابیں پڑھا کرتے۔ ناولوں اور افسانوں پر تنقیدی بحث کرتے۔ ان کے ذوق میں کتنی یکسانیت تھی۔ دونوں کو وہی افسانے پسند آتے۔ دونوں کو کسی افسانے میں وہی خاص خامی کھٹکتی اور وہ اپنی اس ہم خیالی پر خوشی سے جھوم جاتے۔ جمیل دیوانہ وار اسے بھینچ لیتا۔ ''واقعی، جانی ہم دونوں صحیح معنوں میں ایک ہیں'' پھر وہ اس پر جھک کر دبی آواز میں کہتا ع

''من تو شدم تو من شدی''

وہ اپنے ہونٹوں پر ان جلتے ہوئے ہونٹوں کو محسوس کرتی اور نیم بیہوش سی ہوکر آنکھیں میچ لیتی..... برآمدے سے کرسیوں کے پیچھے ہٹانے کی آواز آئی۔ شاید ان کی

باتیں ختم ہو چکی تھیں۔ ہونہہ! وہ اب آئے گا۔ بے شک آئے گا وہ پلنگ سے اٹھ کر مسکراتی ہوئی اس کا استقبال نہ کرے گی۔ یونہی منہ پھیر کر سوتی رہے گی۔ تکیوں میں منہ چھپا کر اوندھی لیٹ رہے گی۔ وہ سیدھے اس کے پاس آئے گا۔ کپڑے بدلنے سے پہلے۔ ''روٹھ گئی ہو جانی۔'' وہ اسے گدگدائے گا۔ وہ مچل کر کروٹ بدلے گی۔

''معاف کر دو نا'' وہ یوں بے حس پڑی رہے گی جیسے سچ مچ سو رہی ہے۔ ''دیکھو ہاتھ جوڑتا ہوں میرے من مندر کی دیوی!'' وہ آنکھیں کھولے بغیر مسکرا دے گی۔ ''معاف کر دو نا جانی!''

وہ آنکھیں کھول کر ناز سے کہے گی۔ ''اچھا معاف کیا۔''

''نہیں مجھے سزا ملنی چاہئے۔ ان نازک ہاتھوں سے ایک طمانچہ لگا دو نا۔''

''میں اور تمہیں تھپڑ ماروں۔ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ تم میرے سرتاج ہو جمیل!''

''ان پھول سے ہاتھوں کا تھپڑ بھی کوئی تھپڑ ہوگا۔ مارو نا جانی۔ دیکھو مجھے چین نہ آئے گا۔'' اور وہ شوخی سے مسکراتی ہوئی پیار سے اس کے گال پر ایک ہلکی سی تھپکی دے گی۔ اور جمیل اسی ہاتھ کو بے تابی سے چوم لے گا۔

لیکن وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ نجمہ نے اٹھ کر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ اس کمرے کی طرف نہیں۔ اپنے بھائی کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ شاید بھائی کو اپنے کمرے میں پہنچا کر آئے گا۔ کوئی آخری بات کرنی ہوگی۔ لیکن اُف! وہاں بھی وہ کرسی پر جم گیا اور باتیں شروع کر دیں۔ تو یہ انتظار ابھی ختم نہیں ہوا۔ آخر وہ کب تک انتظار کرے گی۔ صبر کی بھی حد ہوتی ہے۔ کوئی کب تک صبر کرے۔ نجمہ کے ہونٹ بھنچ گئے۔ کیا وہ جان بوجھ کر بے پروائی برت رہا ہے۔ جمیل سمجھتا ہوگا کہ وہ اس سے دور رہے تو وہ اس کی طرف اور کھنچی چلی آئے گی۔ ہونہہ! وہ کیوں کھنچے گی۔ بڑا فخر ہوگا اس بات کا۔ ''نجمہ مجھ پر جان چھڑکتی ہے۔'' ہونہہ! وہ کیوں جان دینے لگی۔ جب اسے اتنا ستایا جائے۔ وہ کیوں سارا دن اس کی یاد میں کھوئی رہے۔ اس کا صلہ اسے کڑھنے کے سوا کیا مل رہا ہے۔ جب وہی اتنا

بے پرواہو گیا ہے۔ تو وہ بھی بے پرواہو جائے گی۔ وہ بھی اس سے دور دور رہے گی۔ نجمہ پلنگ سے اُتر گئی اور تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی آئی۔ یہاں چارپائی پر بچھونا پڑا ہوا تھا۔ وہ چادر تان کر لیٹ گئی لیکن نیند کیسے آئے غصہ بُری طرح چڑھ رہا تھا۔ جسم جل رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا حلق میں کوئی چیز اٹک رہی ہے۔ سسکیاں اس کے گلے میں گھٹ رہی تھیں۔ مگر وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جمیل پر یہ ظاہر کرنا نہ چاہتی تھی کہ وہ اس کی پروا نہیں کرتی۔ آج رات وہ یہیں سوئے گی۔ جمیل کے ہزار منت کرنے پر بھی نہ جائے گی۔

بچہ جاگ اُٹھا۔ کہیں دودھ کا وقت تو نہیں؟ نجمہ نے گھڑی دیکھی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ دودھ کا وقت نہیں تھا۔ وہ لیٹے لیٹے ہی گہوارہ آہستہ سے جھلانے لگی۔ گیارہ! کیا وہ اب بھی نہیں آئے گا۔ کیا جمیل جان بوجھ کر اسے تڑپا رہا ہے؟ کیا وہ اب بھی نہیں آئے گا۔ کیا وہ اپنے ''قیمتی وقت'' میں سے پانچ دس منٹ بھی اسے نہیں دے سکتا؟ آخر وہ کورٹ سے لوٹتے ہی کیوں کتابوں میں گھُس جاتا ہے؟ صبح آفس جاتے ہوئے تو اتنی جلدی میں ہوتا ہے۔ ہر وقت یہی رٹ لگی رہتی ہے ''مجھے جلدی جانا ہے۔'' ''وقت نہیں ہے۔'' ''ابھی سے لیٹ ہو گیا ہوں'' ...... دروازہ کھلنے اور بجلی کا بٹن دبانے کی آواز؟ جمیل اس کے کمرے میں آگیا تھا۔ نجمہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ جلدی جلدی کپڑے بدل رہا تھا۔ وہ اس کے پاس آنے کے لئے کتنا بے تاب ہے۔ نجمہ مسکرائی۔ لیکن وہ تو نہیں جائے گی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور بے حس پڑی رہی تاکہ جمیل سمجھ لے وہ سو رہی ہے۔ اس نے اپنی گردن کے گرد کسی کے ہاتھوں کو محسوس کیا۔ جمیل اسے سوتی سمجھ کر پیار سے اس کی موتی کی مالا اور بُندے نکال رہا تھا۔ دوسرے لمحہ میں وہ جمیل کی گرفت میں تھی اور وہ محبت بھری آواز اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ''اٹھو نجمی پیاری، چلو ہمارے کمرے میں۔'' اور نجمہ بھول رہی تھی کہ وہ جمیل سے خفا ہے اس کا جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ مسکرا دے۔ یونہی آنکھیں بند کئے مسکراتی ہوئی وہ بہت دلکش نظر آتی تھی۔ جمیل کو اس کی یہ ادا بہت ہی پسند تھی۔ ہر صبح وہ اس سے پہلے بیدار ہو جاتا تھا۔ وہ نیم خوابی کی حالت میں آنکھیں بند کئے پڑی رہتی ......

پھر بھی اسے معلوم ہو جاتا کہ جمیل کی پرشوق نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں اور جمیل کہہ اٹھتا "اُف یہ حسن خوابیدہ! عورت سوئی ہوئی کتنی حسین لگتی ہے۔" اور وہ یونہی آنکھیں بند کیے مسکرا دیتی تو جمیل کیسے بے خود ہو جاتا تھا۔ نجمہ کے سارے عزم ٹوٹ رہے تھے وہ سب کچھ بھول کر اپنے آپ کو جمیل کے سپرد کر دینا چاہتی تھی۔ لیکن پھر اس پر غصہ چڑھا آ رہا تھا۔ جمیل نے اسے کتنا ستایا تھا۔ وہ اتنا جلد اس کی باتوں میں آجائے گی۔ "نجمی اٹھو بھی"۔ "ڈارلنگ" آؤ جانی۔ نہیں، وہ نہیں جائے گی، وہ کیوں بزدلوں کی طرح سوتی بن رہی ہے۔ وہ آنکھیں کھول کر جمیل کو بتا دے گی کہ وہ جاگ رہی ہے اور اس کے ساتھ آنا نہیں چاہتی۔ نجمہ نے آنکھیں کھول دیں۔ جمیل نے جھک کر اس کا گال چوم لیا۔ لیکن نجمہ جلدی سے منہ پھیر کر سو گئی۔ "تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو جانی؟" وہ منہ پھلائے رہی۔ "کیوں آخر کیوں بولو نجمی؟" وہ نہیں بتائے گی کہ وہ کیوں ناراض ہے۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اس کے لئے کتنی بے چین رہی ہے تو جمیل کو اور خوشی ہوگی۔ اسے خوش کیوں ہونے دے گی۔ وہ تو اس سے انتقام لے رہی ہے۔ وہ بھی اسے ستائے گی۔ خوب ستائے گی۔ "نجمی اب آ بھی جاؤ۔ وہ پھر منتیں کر رہا تھا۔ کیا وہ چلی جائے؟ وہ اب جانے پر راضی ہو جائے گی تو جمیل خیال کرے گا کہ وہ دو ایک میٹھی باتوں سے من جائے گی۔ وہ کیوں منے گی۔ وہ روٹھی رہ کر جمیل کو بتا دے گی کہ اسے منانا کوئی کھیل نہیں ہے۔ جمیل نے اسے اتنا تڑپایا ہے وہ دو ایک میٹھی باتوں سے مان جائے گی؟ لیکن مناتے مناتے جمیل خفا ہو جائے تو معاملہ طول نہ کھنچے گا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اسے یہیں ختم کر دیا جائے۔ طول کھنچے تو کھنچے وہ اتنا جلد نہ مانے گی...... جمیل اس کو اپنے بازوؤں میں اٹھا رہا تھا۔ اسی وقت بچہ جاگ اٹھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ جمیل کی گرفت سے نکل گئی اور بچہ کو گود میں لے لیا۔ جمیل کچھ دیر اس کے پاس ہی بیٹھ رہا۔ "نجمی نہیں آؤ گی؟" نجمی نے یونہی منہ پھلائے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ جمیل کے مردانہ وقار کو ٹھیس لگ رہی تھی۔ آخر وہ کب تک منائے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا" بچے کو سلا دیا...... اب وہ چلی جائے؟ بس ستا چکی نا؟ ہونہہ کہاں ستا چکی۔ صرف چند منٹ؟ نہیں،

جمیل کو رات بھر اس کے لیے تڑپنا ہوگا وہ صبح کو بھی نہیں جائے گی۔ آج ہی نہیں ہمیشہ اس سے دور رہے گی۔ اور اس وقت جمیل کو بھی تڑپنا پڑے گا۔ تب اسے محسوس ہوگا کہ وہ بھی کتنے دنوں سے اس کے لیے تڑپا کی ہے۔ نجمہ نے آخر نہ جانے کا فیصلہ کر لیا اور چادر تان کر لیٹ رہی۔

نجمہ کو نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ وہ غور سے سن رہی تھی کیا جمیل سو گیا ہے۔ نہیں تو وہ بھی کروٹوں پر کروٹیں بدل رہا ہے۔ جمیل بھی اس کے بغیر کتنا بے چین ہے۔ جمیل واقعی اس سے بے حد محبت کرتا ہے دل کی گہرائیوں سے۔ وہ کتنی ناشکر گزار ہے کہ ایسی گہری محبت کی قدر نہیں کرتی۔ ہونہہ! چلی ہے گلہ کرنے جمیل۔ اب پہلے کی طرح زبان سے محبت کا اظہار نہیں کرتا...... محبت کا اظہار محبت کے لئے کسوٹی تو نہیں ہے۔ اس کے برخلاف یہ کہا جاتا ہے کہ سچی محبت وہ ہے جس کا اظہار نہ کیا جائے۔ آج کل جمیل اپنی محبت کا شاعرانہ وارفتگی سے اظہار نہیں کر رہا تھا تو کیا ہوا۔ اس کی ہر بات، ہر حرکت سے کتنی محبت ٹپکی پڑتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خاموش محبت جھلکتی تھی۔ وہ ہمیشہ خیال رکھتا کہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ جمیل کتنا پریشان ہو جایا کرتا تھا۔ رات کے دو یا تین بجے جب اسے متلی سی محسوس ہوتی یا سینے میں جلن ہونے لگتی وہ آہستہ سے اُٹھ بیٹھتی۔ بہت ہی آہستہ سے تاکہ جمیل کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ لیکن جمیل اس کا جمیل! کتنی ہی گہری نیند میں ہو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ ''تمہیں کیا تکلیف ہو رہی ہے جانی؟ سینے میں جلن؟'' وہ کتنی دیر تک آہستہ آہستہ سہلاتا۔ اس کے کندھے پر سر رکھے ہوئے وہ محسوس کرتی کہ اسے کوئی تکلیف نہیں۔ جب اسے متلی ہوتی تو جھٹ دوڑ کر پانی اور بیسن لے آتا۔ خواہ باہر کتنی ہی سردی لگ رہی ہو...... یہ اس کا پہلا بچہ تھا، اور کبھی کبھی خوف اس کے دل کو جکڑ لیتا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ بچے کی پیدائش ماں کے لئے زندگی اور موت کی کشمکش ہے۔ ایک نئی زندگی کو جنم دیتے ہوئے ماں موت کے منہ میں چلی جاتی ہے...... اور ایک دن بے خبری میں اس نے اپنے تنہا رازدان، دکھ درد کے ساتھی جمیل پر یہ خوف ظاہر کر دیا تھا۔ اس کے سینہ سے لگ کر، سہمی ہوئی آنکھیں اس کی آنکھوں

میں ڈال کر کہا تھا" جمیل میں بچ نہ سکوں تو؟" اور جمیل کو جیسے بجلی مار گئی۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ اور اس نے اسے بھینچ کر سینے سے لگالیا۔ اس کی گرفت اتنی سخت پڑ گئی جیسے وہ اُسے نہیں چھوڑے گا اگر موت بھی چھیننے کی کوشش کرے۔ دم اس کے گلے میں گھٹ گیا تھا۔ بہت دیر بعد اس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔" ایسا نہ کہو نجمی! خدا ہمیں جدا نہیں کرے گا، وہ اتنا بے رحم نہیں ہے۔ وہ تمہیں مجھ سے نہیں چھینے گا۔ میری روح کو مجھ سے نہیں چھینے گا۔ موت کو بھی ہمارے پیار پر رحم آجائے گا...... جمیل کی حالت کس قدر دگرگوں ہو گئی تھی اُس دن۔ نجمہ اسے تسلی دیتی رہی تھی۔" میں نے یونہی کہہ دیا تھا۔ بھلا میں کیوں نہ بچوں گی۔ اتنی تندرست جو ہوں۔" لیکن جمیل کو جانے کیا ہو گیا تھا اس دن...... جب جمیل کے دل کی گہرائیوں میں اس کے لئے اتنی محبت نہاں ہے تو کیا یہ سراسر زیادتی نہیں ہے کہ وہ زبانی اظہار بھی چاہتی ہے؟ پھر جمیل تو اظہار بھی کیا کرتا تھا ایسی ہی شاعرانہ وارفتگی سے۔ صرف آج کل دن بھر کی تکان اور پھر کتابوں کے کثیر مطالعہ سے وہ ذرا خشک سا ہو گیا تھا۔ ورنہ اس کا جمیل فطرتاً کتنا شاعر مزاج اور رومانی تھا۔ رومانی ہی نہیں جذباتی بھی۔ جب وہ چند دن کے لئے بمبئی گیا ہوا تھا۔ تو کس قدر جذباتی ہو گیا تھا۔ صرف چند ہی دنوں کی جدائی نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ وہ رومانی خطوط جو بمبئی سے لکھا کرتا تھا ان سے کتنا اضطراب، کتنی بے تابی، کتنی جذباتیت چھلکی پڑتی تھی۔ وہ ان خطوں کو سینہ سے لگا لیتی۔ دیوانہ وار چومتی۔ ان کا ایک ایک لفظ اس کے دل پر نقش ہو جاتا تھا۔ بمبئی سے واپس ہونے کے بعد بھی۔ وہ جنون، وہ اضطراب! اُف ان دنوں وہ کتنا جذباتی ہو گیا تھا۔ وہ جمیل کے کشادہ سینے سے سر لگائے ان محبت پاس آنکھوں میں دیکھ رہی ہوتی۔ جمیل کا دل کس زور سے دھڑک رہا ہوتا وہ اسے اپنے آہنی بازوؤں میں جکڑ کر بھینچ رہا ہوتا۔ قریب اور قریب۔ گرم سانسوں کے درمیان اس کی بے تاب کانپتی ہوئی آواز نجمہ کے کانوں میں گونجتی۔" نجمی میری حسین ترین نجمی۔ اگر میں ایک دن اور بمبئی میں رہ جاتا، اس کے بعد ایک دن بھی تم سے جدا رہتا تو میں دیوانہ ہی ہو چکا ہوتا۔" تم نے تو مجھ پر جادو کر دیا ہے نجمی!"

"ڈارلنگ، مائی اون ڈارلنگ۔" میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ تم میری جیون ساتھی ہو۔ میری اپنی ہو، نجمی میری نجمی، پھر وہ اسے اتنے زور سے بھینچ لیتا جیسے اس کو اپنی ہستی میں سمو دے گا۔ اور وہ، وہ جمیل کے دل سے لگی ہوئی محسوس کرتی کہ جمیل کی محبت اُس کی رگ رگ میں پھڑک رہی ہے۔ وہ اپنے جمیل کے لئے جان بھی دے دیگی۔ اپنا سب کچھ جمیل کے قدموں میں نچھاور کر دے گی۔ اس کی محبت میں وہ آگ ہوگی کہ......

بچہ رونے لگا۔ نجمہ نے گھڑی دیکھی۔ ایک بج رہا تھا۔ اف! وہ اب تک سو نہ سکی تھی۔ بچہ کو دودھ دینے کا وقت تھا۔ وہ اٹھی۔ دریچہ میں رکھی ہوئی بوتل میں دودھ انڈیل کر اس میں تھوڑی سی شکر ملائی اور نپل لگا کر بچہ کے منہ میں دے دیا اور آہستہ آہستہ پنگوڑہ ہلانے لگی۔ بچہ یونہی دودھ پی کر سو گیا۔ گہوارہ کی کیں کیں بند ہوئی ہی تھی کہ ساتھ والے کمرے سے پلنگ کی کھڑ کھڑاہٹ کی آواز آنے لگی۔ جمیل بار بار کروٹ بدل رہا تھا۔ کیا جمیل کو بھی نیند نہیں آ رہی ہے؟ وہ اس کے پاس نہ ہونے سے بے چین ہے؟ جمیل کو اس سے کتنی محبت ہے۔ جمیل اس کا جمیل! معصوم، شاعر مزاج اور جذباتی۔ جمیل کی فطرت بلور کی طرح پاک اور شفاف ہے۔ وہ ضرور رومانی ہے۔ اس کا جمیل، اس کے دل کا مالک، اس کا پیارا جمیل کتنی بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ کیا اس لئے نہیں کہ وہ جان لے وہ ابھی تک جاگ رہا ہے۔ کیا جمیل کو معلوم ہو گیا تھا کہ بچہ اٹھنے پر نجمہ بھی جاگ اٹھی ہے اور اسے دودھ دے کر سلا چکی ہے۔ کیا وہ اس لئے کروٹیں نہیں بدل رہا تھا کہ وہ یہ معلوم کرے کہ وہ جاگ رہا ہے اس کے پاس چلی آئے گی۔ ہاں اس کی کروٹیں کہہ رہی تھیں۔

"دیکھو نجمی میں کیسے جان گیا کہ تم جاگ اٹھی ہو۔ اب آ بھی جاؤ جانی! دیکھو میں کتنی بے چینی سے ساری رات آنکھوں میں کاٹ رہا ہوں۔" نجمہ کا جی چاہ رہا تھا کہ چلی جائے۔ ضرور چلی جائے گی۔ اس سے لپٹ جائے گی۔ سینہ میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے گی۔ "مجھے معاف کرو جمیل۔ میرے سرتاج مجھ سے غلطی ہوئی۔" وہ جمیل کی آواز سننے کے لئے ہمہ تن گوش بن گئی تھی۔ کاش جمیل اس کو ایک ہی دفعہ پکارے!...... لیکن اب تو

وہ کروٹیں بھی بدل نہیں رہا تھا۔ کیا وہ سو گیا ہے؟ سو گیا ہوگا۔ وہ کیوں جاگے گا اس کے لئے؟ اسے تو اور بھی آرام ہوا۔ نجمہ کو پھر اس پر غصہ آنے لگا۔ وہ فطرتاً رومانی ہے تو کیا؟ اپنے جذبات کو یوں کچل کچل کر رکھتا ہے۔ وہ جذبات کے امڈتے ہوئے سیلاب میں بہہ جانا چاہتی تھی اور جمیل جذبات کو کمزوری سمجھتا ہے۔ عقل کو ہر بات میں رہنما کرنا چاہتا ہے۔ جمیل اتنا جذباتی دل رکھتے ہوئے بھی دماغ کو دل پر حاوی کرنا چاہتا تھا۔ اُف! یہ کتابیں! یہ خشک کتابوں کا مطالعہ ہی تو تھا جو اسے یوں اپنی جذباتی فطرت چھپانے پر مجبور کرتا تھا۔ کتابیں تو گویا اس کی رقیب ہو کر رہ گئی تھیں۔ اتوار کا دن بھی! وہ اس دن کا کتنی بے تابی سے انتظار کیا کرتی۔ لیکن اس دن بھی جمیل کو اپنا کوئی مقدمہ دیکھنا ہوتا یا لائبریری کو واپس کی جانے والی کتابیں پڑھ کر ختم کرنی ہوتیں...... شام کے چار بجے وہ بڑے اصرار سے اسے کچھ دیر سیر کر آنے پر آمادہ کرتی۔ کہیں جاؤ تو جمیل! دن بھر گھر بیٹھے تمہارا جی نہیں اکتاتا؟ جمیل کتابوں میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ اسے سیر تفریح تک کا خیال نہیں آسکتا۔ سنیما کو بھی وہ شاذ ہی جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو مہینوں نہیں جاتا تھا۔ جب تک کوئی بلند پایہ فلم نہ آتی۔ ''قسمت دیکھنے جائیں گے جمیل! تیسری دفعہ آیا ہے۔ ہم نے اب تک نہیں دیکھا۔'' ''ارے بمبئی ٹاکیز کی فلموں میں کیا ہوتا ہے نجمی چند ایک پاپولر قسم کے گانے اور ناچ۔ ہمیشہ ایک ہی قسم کی معمولی کہانی جس میں گہرائی ہی نہیں ہوتی۔ شروع سے آخر تک انٹرٹینمنٹ! ہمیشہ باکس آفس کی کامیابی پر نظر رہتی ہے ان کی۔ ''ہمراہی'' آئے گا تو ضرور جائیں گے''۔ ہمراہی یہاں جانے کب آئے گا۔ کتنے دنوں سے ہم نے کوئی فلم ہی نہیں دیکھا۔ Daphne De Murier کا ''ربیکا'' آرہا ہے۔ ضرور دکھاؤں گا تمہیں اور آئندہ ہفتہ تو چھاؤنی کے سنیما ہاؤس میں ایسے اچھے اچھے فلم آرہے ہیں۔ پھر کیا روز روز جائیں گے، پرل بک کا ڈریگن سیڈ، امپیریل میں آرہا ہے، پلازا، میں رشیل فیلڈ کا آل دِس اینڈ ہیون ٹو، جیمس ہلٹن کا رینڈم ہاروسٹ...... وہ زیادہ تر آتھرس کا نام ہی لیا کرتا تھا۔ اسٹارس کا شاذ ہی بہت اچھے اداکار ہوں تو ''ربیکا میں لارنس اولیور نے کام کیا ہے رینڈم

ہاروسٹ میں رولنڈ کولین نے"......اتوار کی شام وہ بڑے اصرار سے اسے باہر بھیجتی۔ جب اس کے لوٹنے کا وقت قریب ہوتا تو وہ کوئی ایسی ساری پہنتی جو اسے بہت بھاتی تھی۔ بالوں کو ایسے انداز میں بناتی جسے جمیل پسند کرتا تھا۔ کئی طرح سے آگے پیچھے بالوں میں پھول لگاتی۔ پیشانی پر تلک بھی لگالیتی۔ جب بن سنور کر آئینہ میں دیکھتی تو خوش ہو جاتی۔ اُف یہ نکھار! جمیل کے ہوش وحواس پر بجلی ہی تو گرادے گی۔ جمیل اسے دیکھتے ہی کیسے بے خود ہو جائے گا۔ پھر وہ رنگین سپنوں کے محل! اتنے میں جمیل کی آواز آتی۔ وہ تصور سے چونکتی۔ بیداری میں جمیل کا ساتھ تو ان سپنوں سے کہیں حسین ہوگا۔ جمیل کی آواز سن کر اس کی رگ رگ میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی۔ کچھ دیر بعد جمیل اس کے سامنے کھڑا ہوتا۔ خوبصورت اُدنی سوٹ میں ملبوس اس قدر اسمارٹ، اس قدر رنگیلا، اتنا شکیل، جمیل کو بے خود کرنے چلی تھی۔ وہ خود بے خود ہو اٹھتی۔ اس کی باہیں جمیل کو سمیٹ لینے کے لئے بے تاب ہو جاتیں۔ اس کا جی بے اختیار چاہتا بوسوں کی بارش کردے۔ جمیل کے رسیلے، بھرے ہوئے ہونٹوں پر، ان لانبی پلکوں والی حسین نیلی آنکھوں پر، اُبھرے ہوئے رخساروں پر شفاف پیشانی......'

"دیکھو نجمی! آج میں کیسی اچھی اچھی کتابیں لے آیا ہوں۔ خوش ہو جاؤ گی تم اور نجمہ کے جلتے ہوئے ہونٹ سرد پڑ جاتے۔ ان پر بوسے منجمد ہو جاتے۔ اس نے کتنی دیر سے جمیل کے لئے سنگھار کر رکھا تھا۔ اس کے ٹوٹے ہوئے سپنے! جمیل کسی پارک یا فلم دیکھنے گیا ہوگا۔ اور اس رومانی ماحول کے زیر اثر پہلے ہی سے اس کے دل میں امنگیں اٹھ رہی ہوں گی۔ پھر جب وہ اس کا حسن دیکھے گا تو کیسے بے خود ہو جائے گا اور یہاں جمیل نے پارک یا سنیما جانے کی بجائے بک اسٹالس اور لائبریریوں کی خاک چھانی تھی۔ جمیل ایک ایک کر کے کتابیں بیگ میں سے نکال کر اس کے سامنے رکھتا تھا۔

"بیٹرس اور سڈنی ویب کی سویٹ کمیونزم اتنی سستی مل گئی۔ سوچو تو ساٹھ روپے کی کتاب پچیس روپے میں! کیا بتاؤں تمہیں کیسی ہے یہ کتاب۔ اشتراکی نظام روس میں عملی طور پر کیسے چل رہا ہے۔ یہ جاننا ہو تو میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔"

''دو بڑی شاندار ناولیں لے آیا ہوں نٹ ہیمسن کی ''Hunger'' اور دستاوسکی کی ''کرائم اینڈ پنشمنٹ''۔

ورجینا وولف کی Waves اور جارجس سیمینان کی ''دی شیاڈو فالس'' بھی خرید لیا۔ تم ان کی تکنیک دیکھنا چاہتی تھیں نا!''

''کرشنا ہتھی سنگھ کی آٹو بیاگرافی With no Reghets تم ایک ہی بیٹھک میں ختم کردوگی۔ یہ کتاب ایسی دلچسپ اور Readable ہے۔

اور یہ کرسٹوفر اشروڈ کی 'گڈبائی ٹو برلن'، فاکس کی 'دی ناول اینڈ دی پیپل' اور ای-ایم فارسٹر کی...... اُفوہ میرے اللہ! ایم فارسٹر کرسٹوفر اشروڈ، اپٹن سنکلیر، اسٹیفن اسپنڈر، ولیم ساردین، الیا اہرن برگ جانے کون کون سے نام اس کے کانوں سے ٹکراتے ہیں۔ نہ جانے وہ ان کے متعلق کیا کیا کہہ رہا ہوتا۔ نجمہ کی آنکھیں جمیل کے خوبصورت چہرے پر جمی ہوئی ایک تشنگی کے ساتھ اس کا حسن پی رہی ہوتیں۔ اس کے ہونٹوں میں پھر چنگاریاں سی سلگنے لگتیں۔ اس کا جی چاہتا اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں سے جمیل کے ہونٹوں کو خاموش کردے۔ ایک وحشت کے عالم میں چیخ اٹھے ''جمیل اپنے حسن پر تو رحم کرو جمیل! اُف تم تو یہ بھی نہیں جانتے تم کتنے سجیلے لگ رہے ہو۔ جمیل دیکھو تم کتنے خوبصورت نظر آرہے ہو، ادھر دیکھو میں کیسی نظر آرہی ہوں''...... بازو والے کمرے سے پلنگ کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی۔ ''کیا پھر جمیل کروٹیں بدل رہا ہے اسے بھی نیند نہیں آرہی ہے؟'' نجمہ نے جھک کر دیکھا۔ جمیل نے پھر دوسری طرف کروٹ لی۔ جمیل اس کے لئے کتنا بے چین ہو رہا ہے! اور وہ ہے کہ گلہ پر گلہ کر رہی ہے۔ وہ آتے ہی کتابوں کی باتیں شروع کردیتا تھا تو کیا۔ اسے اپنی نئی خریدی ہوئی کتابیں دکھانے میں خوشی ہوتی تھی۔ کیا اس کے بعد اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا؟ اُف نجمی تم تو غضب کرتی ہو۔ وہ اس کے بے تاب بازوؤں میں ہوتی۔ ''کتنی، کتنی حسین لگ رہی ہو تم۔ پہلے ہی تمہاری آنکھیں اتنی کالی ہیں اس پر یہ کاجل کی تحریر اور پیشانی پر یہ ٹیکہ کیسے بجتا ہے تمہیں۔ تم مجھے دیوانہ بنادوگی

نجمی!" اتنا ہو کر بھی وہ اس سے گلہ کر رہی ہے۔ آخر وہ جمیل سے کیسے امید کر سکتی تھی کہ وہ ہمیشہ اظہار محبت کرتا رہے۔ وہ خود بھی تعلیم یافتہ اور ذہین لڑکی تھی۔ جمیل سمجھتا اسے کتابوں کے متعلق بحث کرنا پسند ہے۔ سہاگ رات جمیل کا سلوک کس قدر مضحکہ خیز تھا! نجمہ کو یہ یاد کر کے ہنسی آ گئی۔ جمیل کا جسم جل رہا تھا۔ اس کے سارے بدن میں آگ سی لگی تھی۔ ایک عجیب وحشت کے عالم میں وہ بوسوں کی بارش برسا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر، رخسار پر، گردن پر، بالوں پر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ جمائے ہوئے گویا ان کا سارا رس چوس لے گا۔ لیکن چڑھتی ہوئی سانسوں کے درمیان اس کے مضطرب ہونٹوں سے کتنے غیر رومانی جملے نکل رہے تھے۔ "تم نے بی اے میں کون سے سبجیکٹ لئے تھے؟" "تمہیں کس سے زیادہ دلچسپی ہے فلسفہ، سوشیالوجی اکنامکس لٹریچر؟ تم پاکستان کی حامی ہو یا اکھنڈ ہندوستان کی؟" نجمہ کچھ جواب نہیں دے رہی تھی۔ وہ حیران ہو رہی تھی یہ کیسا آدمی ہے۔ حرکات سے اتنا Passionate معلوم ہوتا ہے لیکن باتوں سے اتنا غیر رومانی! اس وقت نجمہ کے دل میں کتنے ارمان کتنی امنگیں اٹھ رہی تھیں۔ کتنے دن اس نے اس آنے والی رات کے تصوّر میں گذارے تھے۔ اس نے جمیل کی تصویر دیکھی تھی۔ فوٹو میں وہ کتنا رومانٹک معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بادام کی سی آنکھوں سے رومانیت چھلکی پڑ رہی تھی۔ وہ حسین تراش کے ہونٹ جن کے کرنوں پر ہلکا سا خم تھا رومان کے رس میں بھیگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ ان خوبصورت رومانی ہونٹوں سے اپنے حسن کی تعریف اور جمیل کا والہانہ اظہار محبت سننے کے لئے بے تاب تھی۔ اس کی بجائے یہ خشک باتیں۔ وہ مایوس ہو گئی تھی۔ لیکن دوسرے ہی دن اسے معلوم ہو گیا کہ جمیل حقیقت میں شاعر مزاج اور رومانی ہے۔ دوسری صبح جب نجمہ نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ اس نے یونہی چوری چوری ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھنا چاہا۔ رات کو فرط شرم سے وہ اس کی صورت بالکل نہ دیکھ سکی تھی۔ آنکھیں کھلتے ہی۔ اللہ! جمیل اس پر جھکا ہوا اس کا چہرہ تک رہا تھا! اس کی آنکھوں میں شوق کی دنیا تھی۔ جب نجمہ نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ اس کی آنکھوں کی پتلیاں سبز ہیں اور پلکیں بہت لانبی نوکیلی اوپر

کو مڑی ہوئی ہیں کتنی خوبصورت تھیں وہ آنکھیں۔ خصوصاً اس لمحہ جب ان میں شوق کی دنیا تھی لیکن جمیل پیار میں ڈوبی ہوئی بے تاب آواز میں اس کی آنکھوں کی تعریف کر رہا تھا۔ کتنی خوبصورت ہیں تمہاری آنکھیں! کتنی سیاہ، رسیلی، مدبھری۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے اتنی حسین آنکھیں کبھی نہ دیکھی تھیں...... نجمہ نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لی تھیں۔ جمیل نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہا ''اوپر دیکھو، میری جان، دیکھو، میری طرف دیکھو، میں کیسا ہوں؟ میری صورت پسند آئی تمہیں؟ مجھے تو تمہاری صورت اتنی...... پھر وہ رنگین لفظوں میں شاعرانہ وارفتگی کے ساتھ اس کے حسن کی تعریف کرتا رہا۔ کبھی اس کا کوئی خاص پوز، یا خاص ادا دیکھ کر وہ بے اختیار کوئی شعر پڑھ دیتا اور نجمہ کو بے حد تعجب ہو رہا تھا کہ جمیل نے رات ایسا سلوک کیوں کیا تھا۔ چند دنوں بعد اس نے ہنستے ہوئے جمیل سے پوچھا تھا تم نے سہاگ رات کیوں ایسی باتیں کیں۔ وہ کون سا موقع تھا پوچھنے کا۔ تم نے کون سے سبجکٹس لئے تھے؟ تمہیں کس سبجکٹس سے دلچسپی ہے۔ پہلی رات جب ہمارے سینوں میں تمنائیں مچل رہی تھیں۔ یہ غیر رومانی باتیں کتنی مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھیں۔''

جمیل نے جھینپتے ہوئے جواب دیا تھا ''جس وقت میرے ہونٹوں سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔ تمہیں کیسے بتاؤں پیاری! میرے دل پر کیا گذر رہی تھی۔ میں اپنے آپ پر کتنا جبر کر کے یہ جملے کہہ رہا تھا۔ میں تمہارے حسن سے مسحور ہو گیا تھا۔ میری آنکھیں تمہارا حسن پی رہی تھیں۔ میں بے خود ہوا جا رہا تھا۔ میرا جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ تمہارے حسن کی تعریف کروں۔ تمہیں بتاؤں تم نے مجھ پر کیسا جادو کر دیا ہے۔ ایک ہی رات میں تم نے میرا دل کیسے چھین لیا ہے...... تم میرے دل میں کیسے سما گئی ہو۔ لیکن میں نے خیال کیا کہ شاید ایک بلا کی ذہین گریجویٹ لڑکی اس قسم کی باتیں پسند نہیں کرتی۔ اس سے ایسی باتیں کرنی چاہئیں جس میں دل سے زیادہ دماغ کا دخل ہو''...... تو وہ اپنے آپ کو اس لئے روک رہا تھا کہ وہ ''ذہین'' تھی! اُف! جمیل! جمیل!! کیا سہاگ کی رات بھی وہ ایک بلا کی ذہین گریجویٹ لڑکی تھی؟ جمیل کو اتنا بھی نہیں معلوم تھا کہ اس رات وہ محض عورت تھی۔ اس رات

وہ بلا کی ذہین ''لڑکی سرتاپا نسوانی فطرت میں ڈوبی دلہن بنی بیٹھی تھی۔ ایک ذہین دماغ نہیں ایک جذباتی دل لئے جس میں ہزاروں امنگیں مچل رہی تھیں؟ لیکن جمیل نے صرف اسی ایک رات ایسا کیا تھا۔ اس کے بعد وہ کتنی بے تابی اور گرم جوشی سے محبت کا اظہار کیا کرتا تھا۔ کسی شاعرانہ وارفتگی سے اس کے حسن کی تعریف کیا کرتا تھا۔ ''تم کو پتا ہو، میری جان، مجسم شعر!'' ''تم مینا ہو نجمی! ایک خوبصورت بلوریں صراحی جس میں رنگین شراب جھلک رہی ہے۔'' ''میری نجمی! تم ایک نیم وا کلی ہو۔ وہی حسن، وہی معصومیت، شرم بھی خودنمائی بھی۔'' کبھی وہ اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر تحسین آفرین نگاہوں سے دیکھتا اور پیار سے کہہ اٹھتا۔ ''چودہویں کے چاند۔'' جب چاندنی چھٹکی ہوتی وہ صحن میں پھولوں کی کیاریوں کے پاس جا بیٹھتے۔ وہ چاند کو پھر اس کی صورت کو دیکھ کر کہتا ع

''فلک کے چاند ہم نے بھی زمین پر چاند دیکھا ہے!''

ایک دن بادل گھر آئے تھے۔ کالی کالی گھٹاؤں میں چودہویں کا چاند چمک رہا تھا۔ وہ جمیل کی گود میں چاند پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ ایک سیاہ بادل کے ٹکڑے میں چاند دھیرے دھیرے چھپ گیا۔ وہ جلدی سے جمیل کی طرف پلٹ کر بولی۔

''دیکھو! چاند بادلوں میں چھپ گیا۔'' وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کتنی بے ساختگی سے بولا تھا ''نہیں تو، کہاں گیا؟ یہ دیکھو چاند میری گود میں ہے۔''

''جانی! تم ایک دیوی کی طرح حسین ہو۔ جی چاہتا ہے تمہیں کوئی بھی کام کرنے کو نہ کہوں۔ بس تم یونہی مسہری پر بیٹھی رہو۔ اور میں تمہاری پوجا کئے جاؤں۔''

ان کے کمرے کے بلب کا سوچ (Switch) برآمدے میں لگا ہوا تھا۔ ایک رات شاید کسی نے بھول کر سوئچ بجھا دیا۔ یکا یک کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ جمیل نے پوچھا تھا ''تمہیں معلوم ہے نجمی! انہوں نے کیوں روشنی گل کر دی۔''

''نہیں تو'' وہ سمجھ نہ سکی تھی۔ ''اس لئے کہ جہاں تم ہو وہاں اندھیرا نہیں ہو سکتا۔'' جمیل کے یہ بے ساختہ جملے اسے کس قدر پسند آتے تھے۔

ایک دن وہ آئینہ کے سامنے کھڑی بالوں میں پھول لگا رہی تھی۔ اس کو خبر ہی نہ ہوئی کہ جمیل چپکے سے پیچھے آ کھڑا ہوا ہے۔ ''وہ تو اپنے حسن سے آپ ہی اتنے مسحور ہیں کہ ہمارے آنے کی خبر تک نہیں۔'' وہ چونک گئی۔ جمیل پیچھے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ چہرہ فرطِ شرم سے تمتما اٹھا اور جمیل نے اس کے عکس کو آئینہ میں دیکھ کر کہا تھا ''تم تو مجسم حسن ہو نجمی!'' کتنی دفعہ وہ فرطِ شوق سے کہہ اٹھا تھا ''تمہاری آنکھیں! ان آنکھوں میں کتنی شراب جھلکتی ہے! بس پیتے ہی جاؤ۔ کیسے بتاؤں کیا ہیں تمہاری آنکھیں!''

نجمہ کو ایک ایک کر کے جمیل کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ جمیل اس کا جمیل! وہ رونے لگی۔ موٹے موٹے گرم آنسو تکیہ پوش میں جذب ہوتے رہے۔ وہ روتی رہی، اس کے دل پر جمے ہوئے غم و غصہ کے بادل برس کر چھٹ گئے۔ اب اس کا دل ہلکا ہو چکا تھا۔ اور اس میں جمیل کے لئے بے پناہ محبت امڈی آ رہی تھی۔ دور کسی گھڑی نے تین بجائے۔ تین بجے ہیں۔ اور وہ اب تک سو نہ سکی تھی۔ کیسی منحوس ہے آج کی رات۔ یہ رات جو وہ جمیل سے الگ گذار رہی ہے۔ وہ جو کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جب وہ کسی رشتہ دار کے گھر میں مہمان ہوتے اور انہیں مجبوراً رات الگ گذارنی پڑتی تو وہ دن بھر اس خیال سے کتنی بے چین رہا کرتی تھی۔ شام ہوتے ہی اس کا دل مرجھا جاتا۔ اداس کھوئی کھوئی سی رہتی۔ اپنے اپنے کمروں میں جانے سے پہلے وہ کسی نہ کسی طرح سب کی آنکھ بچا کر ملتے اور جب جمیل اسے اپنے بازوؤں سے الگ کرتے ہوئے اداس نگاہوں سے اس سے رخصت لیتا ''گڈ نائٹ ڈارلنگ'' تو اس کا دل بے اختیار بھر آتا۔ جی چاہتا جمیل سے چمٹ جائے۔ ''نہیں جمیل، میں تم سے الگ نہیں رہ سکتی۔'' رات اسے بالکل نیند نہیں آتی۔ اکیلی بستر پر پڑی وہ چپکے چپکے رویا کرتی۔ اور آج وہ خود اپنی مرضی سے...... کیسی منحوس ہے آج کی رات۔ فرشتے اس پر لعنت بھیج رہے ہوں گے۔ ہاں بھیجنے ہی کی تو بات تھی۔ اپنے شوہر سے اپنے سرتاج سے روٹھ کر...... وہ بھی اتنی ذرا سی بات پر۔ آخر اس نے کیا ہی کیا تھا۔ بہت دیر تک اپنے بھائی کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا اور اس کے پاس نہ آیا؟ اس کے بھائی اتنے عرصے کے

بعد گاؤں سے آئے۔ کسی ضروری معاملے پر اس سے بات کرنے اور صبح کی ٹرین سے چلے جانے والے تھے۔ اسی لئے تو وہ ان سے اتنی دیر تک باتیں کرتا رہا تھا۔ اتنی چھوٹی سی بات پر وہ روٹھ کر یہاں آ گئی تھی؟ وہ چادر پھینک کر اٹھ بیٹھی۔ کھلے دروازے سے جمیل کا پلنگ اچھی طرح نظر آتا تھا۔ ننھے سے نیلے بلب کی ہلکی روشنی اس کے سرہانے کی طرف سے پڑ رہی تھی۔ شاید وہ ابھی ابھی سویا تھا۔ معصوم، پُر سکون، پاکیزہ چہرہ، بادام کی سی آنکھیں بند تھیں اور رخساروں پر لانبی پلکوں کے سائے آرام کر رہے تھے۔ وہ ایک جھٹکے سے پلنگ سے اتر کر اپنے کمرے میں چلی آئی اور آہستہ سے بستر پر رینگ گئی تا کہ جمیل کی نیند میں خلل نہ پڑے ابھی تکیہ پر سر ٹیکا بھی نہ تھا پیچھے سے بازو بڑھا۔ بلینکٹ اڑھا کر، سمیٹ کر اسے کھینچ لیا۔ ایک لمحہ میں اُس کی آنکھیں جھپک گئیں۔ اور ایک تسکین بھری، میٹھی، لذیذ سی گرمی کی آغوش میں وہ سوگئی۔

●●●

اپنی نگریا!

شاہد نے قفل کھولا اور وہ دونوں آفس روم میں داخل ہوئے۔ ایک چھوٹی سی ایڈیٹر کی آفس — ایڈیٹر! فیروزی دھاری دار شرٹ اور سرمئی اُونی پتلون پہنے وہ کتنا سجیلا لگ رہا تھا۔ دفتر گھر پر ہی تھا۔ لیکن آفس روم میں جانے سے پہلے وہ ہمیشہ ڈریس کرلیا کرتا تھا۔ ''کیا ہوا اگر دفتر گھر ہی پر ہے۔ میں آفس ہی کو تو جارہا ہوں۔'' وہ ساکس چڑھاتے ہوئے ہنس کر کہتا ''ڈریس کرلوں تو ایک طرح کی پھرتی آجاتی ہے اور میں اچھی طرح کام کرسکتا ہوں۔''

وہ پتلون کی جیب میں ہاتھ رکھے، ایک پاؤں پر بوجھ ڈالے کھڑا باہر دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر کا منظر اچھی طرح دکھائی دیتا تھا۔ کھلا میدان اور سڑک کے کنارے سے شوخ سرخ پھولوں سے لدے گل مہر کے درختوں میں آگ سی لگی تھی۔ شفاف نیلے آسمان پر کہیں کہیں سفید بدلیوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ بڑی روشن صبح تھی۔ کھڑکی کے دودھیا شیشوں میں سے چھنتی ہوئی ہلکی روشنی میں اس کی سبز آنکھیں نیلی جھلک مار رہی تھیں۔ فیروزی دھاری دار شرٹ اور فیروزی آنکھیں جیسے وہ نیلی دھاریاں ان خوبصورت نیلی آنکھوں سے میچ کرنے کے لئے ڈالی گئی ہوں۔ وہ ایک جذبۂ پرستش کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ شاہد نے کھڑکی کی طرف سے آنکھیں پھیرلیں اور نسرین کی آنکھوں میں وارفتگی کی چمک دیکھ کر اچانک اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا...... وہ جب بالکل بچی تھی۔ دس گیارہ

سال کی، اور انہیں دنوں اسے کافی شعور آ گیا تھا۔ وہ ان دنوں 'پھول'، 'غنچہ' نہیں پڑھا کرتی تھی۔ بلکہ 'نیرنگِ خیال'، 'ساقی' اور 'ہمایوں'، 'مدینہ' اور 'انقلاب' نصر اللہ خاں عزیز کے سرراہ نئے' اور سالک کے 'افکار و حوادث' سے اسے بڑی دلچسپی تھی۔ ان دنوں وہ کس شدت کے ساتھ محسوس کرتی تھی کہ ایڈیٹر ہونا بھی کتنی بڑی بات ہے اسے ایڈیٹر سے — کسی شخصیت سے نہیں...... ایک طرح کی عقیدت سی ہو گئی تھی۔ ایک عجیب طرح کا ایڈمریشن! اور وہ سوچتی تھی۔ جب بڑی ہو گی تو— لیکن کیا اس کے پاس اتنے روپے ہوں گے کہ وہ خود رسالہ نکال سکے؟ یا— لیکن یہاں اچھے رسائل ہیں کہاں کہ وہ ان کے دفتر میں کام کر سکے؟...... لیکن کبھی کبھی دلی تمنائیں کیسے 'عجیب' انجانے طور پر، بر آ جاتی ہیں! وہ اب ایک خوبصورت معیاری رسالے کی آفس میں کھڑی تھی۔ آفس ہی میں نہیں ایڈیٹر کے بازوؤں میں! ان بازوؤں کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا تھا اور نسرین اپنا سر اس کے کشادہ سینے پر رکھے اس سینے کی تسکین آمیز گرمی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ شاہد نے جھک کر......۔

لیکن اوہ! ذرا ٹھہریئے۔ یہاں ایک بات بتا دینا ضروری ہے کیونکہ 'بھئی لوگوں کو بہت جلد غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ انسان ہر بات میں بہت جلد برائی سونگھنے کا عادی ہے۔ بہت سے لوگ اسے ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ نہیں، صاحب نہیں۔ یہ لڑکی ناز نسرین نہ ٹائپسٹ یا سٹینوگرافر تھی نہ اسوسیٹ ایڈیٹر، نہ سکریٹری جس سے ایڈیٹر صاحب...... بلکہ وہ ان کی بیوی تھی۔ کیوں مایوسی ہوئی؟ اور شاہد نے اسے جلدی سے بازوؤں سے الگ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''اب بس کام بہت ہے۔ ہم اسی طرح رومان میں کھوئے رہیں تو کام نہیں کر سکیں گے نازی!'' وہ پھرتی سے دوسری طرف جا کر بیٹھ گیا۔ لیکن وہ ابھی تک کچھ مدہوش سی تھی بوجھل آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ وہ میز پر انگلیاں بجانے لگا اور شریر چمکیلی نظروں سے اسے دیکھ کر بولا ''مینا کا!'' نسرین نے مصنوعی غصہ سے منہ پھلا لیا۔ ''ہاں، میں صرف مینا کا کی طرح ٹمپٹ (Tempt) کرتی ہوں نا۔ تمہاری ذرا بھی مدد

نہیں کرتی۔'' ''کرتی ہونا، نازی، سچ، تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو مجھے کتنی دشواری ہوتی، پھر وہ پیار میں ڈوبی آواز میں کہنے لگے۔''تم صحیح معنوں میں جیون ساتھی ہو، میری نازی، میری ہم ذوق، میرے ارادوں میں، میرے کام میں ساتھ دینے والی!'' ایک تشکیلی کیفیت کے زیرِ اثر وہ بادامی پپوٹے جھک آئے۔ لانبی گھنی پلکیں جھیل کے پانیوں کی سی سیر پتلیوں کو چومنے لگیں۔ ان خوبصورت بھیگی ہوئی آنکھوں کی مقناطیسی چمک سے کھنچی، میں کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔ پھر میز کے اس طرف آ کر شوخی سے خطوں کا پلندہ ان کی طرف پھینکتی ہوئی بولی۔''ابھی تو کہہ رہے تھے کام بہت کرنے ہیں۔''

''افوہ کتنے خطوط کے جواب دینے ہیں ابھی!'' وہ چونک پڑے۔''ایک دو روز خط نہ لکھیں تو کتنے جمع ہو جاتے ہیں۔'' وہ خطوں کو سرسری طور پر پھر دیکھنے لگے۔''اس ایجنسی کو مزید پرچے بھجوا دیئے تم نے؟'' انہوں نے ایک خط بتا کر پوچھا۔

''بھجوا دیئے۔'' میں نے جواب دیا۔ وہ پھر خطوط دیکھنے لگے۔

شاہد کو کام کا احساس دلا کر وہ خود کسی تصویر میں کھوگئی۔''تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو......'' شاہد کے ایک خط کے الفاظ اسے یاد آنے لگے۔ ان دنوں وہ اپنے میکے میں تھی، اور خط آیا تھا۔''نیا دور'' کا تازہ نمبر نکل گیا ہے۔ اور تم جانتی ہو ان دنوں کتنا کام ہوتا ہے۔ ڈھیروں کام سامنے پڑا ہے اور تم یہاں نہیں ہو، یہ کہنے سے میرا مطلب یہ نہیں کہ میں تم سے بھی کام لینا چاہتا تھا۔ لیکن میری نازی میری، اپنی نازی، تم یوں ہی میرے سامنے بیٹھی رہو۔ تو میں دگنا تگنا کام کر سکتا ہوں۔ صرف تمہاری موجودگی مجھ میں گویا ایک بجلی سی بھر دیتی ہے۔ میں خوشی میں سرشار رہتا ہوں اور کام ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اب میرا من اداس ہے، دل پر ایک بوجھ سا رہتا ہے، کام بہت بھاری معلوم ہوتا ہے......'' لیکن وہ یوں ہی نہیں بیٹھی رہتی تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ کام کیا کرتی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ کام کرتے۔ کبھی خطوط لکھ رہے ہوتے، مضامین پڑھ کر انتخاب کر رہے ہوتے۔ ٹائٹل پیج کے لئے ڈیزائن تجویز کر رہے ہوتے۔ رنگوں کی آمیزش پر بحث کر رہے ہوتے، پروف دیکھ رہے ہوتے، اعزازی

پرچے بھیج رہے ہوتے۔ خریداروں اور ایجنسیوں کو پرچے پیک کراکے بھجواتے، آمد و خرچ کا اندراج اور پھر حساب پھر خطوط خطوط ہر روز بیسیوں خطوط! وہ چھوٹے چھوٹے کام بھی بڑی دلچسپی سے آپ ہی کیا کرتی۔ رسیدوں کی پرانی کتاب بھرگئی تھی۔ وہ چپکے سے انڈین لسنر کی کاپیاں اٹھالائی، اندر کے پونے پونے صفحے کاٹ ڈالے اور تین کاپیوں میں منی آرڈر، وی، پی اور رجسٹریوں کی رسیدیں چپکارہی تھی۔ شاہد چپکے سے اس کے بالکل پیچھے آکھڑا ہوا۔ اس نے مڑکر نہیں دیکھا۔ یوں ہی مسکراتی رہی۔ ''ارے، یہ سب تم کیوں کرتی ہو، جانی، تھک جاؤ گی، دوسرے کام ہی کیا کم ہیں تمہارے لئے۔'' ''مجھے پسند ہیں یہ کام'' ''سچ؟'' ''ہاں'' ''شاید عورتیں میکانیکل کام بھی دلچسپی سے کرسکتی ہیں۔ اس لئے شاید، اسٹینوگرافرس اور سکریٹری زیادہ تر لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔ میں کبھی بڑا آدمی ہوجاؤں، تو تمہی کو سکریٹری بناؤں گا، بنوگی؟'' شاہد نے ہلکے سے اس کے بالوں کو تھپکتے ہوئے کہا۔ وہ خوشی سے معمور آواز میں بولی۔ ایم این رائے کی بیوی ایّن رائے کی طرح میں شارٹ ہینڈ سیکھوں گی۔ ٹائپ کرنا سیکھوں گی اور پھر......'' ''اور میری نازی'' شاہد نے اسے گھمادیا۔ پھر ایک دم سے اسے چھوڑ کر کرسی پر جابیٹھا۔ اور بے تحاشہ ہنسنے لگا۔ ''آخر کیوں؟'' نسرین نے پوچھا۔ ''تم تو ایسے یقین سے کہہ رہی ہو جیسے میں سچ مچ بڑا آدمی بن جاؤں گا۔ میں تو یونہی مذاقاً کہہ رہا تھا۔ اچھا اب آؤ، دیکھو مختلف رنگوں میں پرنٹ کراکے چند کورپیج لے آیا ہوں، دیکھو کون سی اِنک (Ink) ٹھیک بیٹھتی ہے''...... وہ یونہی ہنستے کھیلتے کام کیا کرتے۔ لیکن کبھی کبھی اتنا کام رہتا کہ وہ بالکل تھک جاتے۔ خصوصاً پرچہ نکلنے سے چند دن پہلے اور چند دن بعد تو بہت ہی زیادہ کام رہتا، وہ چھوٹے سے ایڈیٹر تھے۔ پرچہ ابھی ابھی نکلا تھا۔ ان کے دفتر میں نوکر اور کلرک اور منیجر اور ایڈیٹر (بعض سرمایہ دار ''ایڈیٹر'' تو ایڈیٹ بھی دوسروں سے کرواتے ہیں) نہیں تھے بہت سارا کام وہ خود ہی کیا کرتے۔ شاہد اور وہ۔ ''نیا دور'' کو انہوں نے محنت سے پالا پوسا، پروان چڑھایا، شاید اسی لئے انہیں ''نیا دور'' سے اس قدر محبت تھی!

آج کل، آج کل کے وعدوں سے پریشان کر کے کاتب آخر کار کتابت ختم کرتے۔ طباعت کے لئے پھر وہی وعدے۔ آخر تنگ آ کر وہ ان دنوں کورٹ جانا بھی چھوڑ دیتا اور دن بھر دونوں پریس کا چکر کاٹتے رہتے۔ کور پیج کی پرنٹنگ ایک پریس میں ہوتی تھی اور فارموں کی کتابت اور طباعت دوسرے پریس میں۔ ایک سٹی میں تھا تو دوسرا چھاؤنی میں! میلوں دور۔ ''کور پیج چھپ گئے؟'' ''نہیں'' ''کور کارڈ اور بلاک اور اشتہارات کے مضمون تو ہفتوں پہلے آپ کو دیئے گئے تھے!'' ''کورس کاٹ دیئے گئے۔'' ''صرف کاٹ رکھے ہیں؟ بلاک نہیں چھپے؟'' ''نہیں'' اور ''اشتہار؟'' ''اشتہار بھی نہیں'' اور وہ سر پکڑ وہیں بیٹھ جاتا، جب تک پورے کور تیار نہ ہو جائیں وہ وہیں بیٹھا رہے گا۔ ٹائٹل پیج کے سرے پر بلاکس چھاپے جاتے۔ پھر درمیان میں کس طرح کا گراؤنڈ باندھا جائے اور یہ کس رنگ کا ہو، اس کے بازو اور نیچے کس طرح کے لائنس ہوں، کتنی لکیریں باریک ہوں اور کتنی موٹی، یہ کس طرح سے سیٹ کی جائیں۔ فلاں فلاں عبارت کے لئے کس نمونے کے اور کتنے موٹے ٹائپس چنے جائیں اور فلاں عبارت کون سے رنگ کی اِنک میں چھپے، سب کچھ بڑے انہماک سے آپ ہی انتخاب کر کے چھپواتا تھا۔ پھر سائیکل تیزی سے چلاتا وہ چھاؤنی جا پہنچتا۔ ''کتنے فارم چھپے ہیں؟'' ''تین'' ''پرسوں بھی تین ہی چھپے تھے۔ اس دن سے کچھ نہیں کیا، آپ نے وعدہ کیا تھا آج تک دو اور فارم چھاپ دیں گے'' ''وہ دو فارم جو آپ دوسرے کاتب کے پاس لکھوالائے تھے، بالکل خراب تھے پتھر پر چڑھائے تو جملے کے جملے اڑ گئے تھے۔ عبارت بالکل پڑھی نہ جا سکتی تھی۔ آپ نے اس کے پاس کیوں لکھوایا؟ وہ اچھا کاتب نہیں ہے اور کاغذ پر گنجی بھی برابر نہیں چڑھائی تھی۔'' ''دو فارم اڑ گئے۔ پھر سے لکھوانا ہوگا انہیں'' ''آخر دو فارموں کی کتابت ختم کر دی آپ نے؟''

''ہاں ختم ہوگئی'' ''تو ان دو فارموں کی کتابت بھی آپ ہی کر دیجئے۔ کل ہی شروع کر دیجئے، میں گھر جا کر آج ہی مسودے بھجواتا ہوں۔'' ''وہ فارم اڑ گئے تو دوسرے کیوں نہ چھپوادئے،'' ''دیکھئے بہت دیر ہو رہی ہے۔'' ''کل آپ ہی کا کام کریں گے۔ اب بہت دن

جا چکا ہے۔" "آج کم سے کم ایک فارم تو چھاپ دیجئے......"

"بڑی مشکل سے ایک فارم چھپوا کے آیا ہوں، نازی، وہ آتے ہی صوفے پر گر پڑتا اور مایوسانہ لہجہ میں کہتا" دن بھر کی سائکلنگ سے تھک کر چور، پسینہ میں شرابور تھکا ہوا جسم اور تھکا ہوا دماغ لئے! ابھی آدھا کام بھی نہیں ہوا، پھر کل جانا ہوگا۔ یہ پریس والے بھی کتنا دق کرتے ہیں۔" "بستر لگادوں گی، چل کر کچھ دیر سو رہو، بہت تھک گئے ہو۔" "نہیں بستر پر سوؤں گا تو بہت دیر سو جاؤں گا۔ یہیں چند منٹ آنکھیں بند کئے پڑا رہوں گا، نیند لگ جائے تو اٹھا دینا۔ آخری دو فارمس لے آیا ہوں۔ پروف دیکھنا ہے اٹھا دوگی نا؟ کل نہ لوٹا دوں تو چھاپنے میں اور دیر کر دیں گے۔ کتنا شدید درد ہو رہا ہے سر میں۔" وہ اسے نہیں اٹھائے گی، وہ سوچتی اور آہستہ آہستہ اس کا سر دبانے لگتی۔ شاہد کو نیند سی آجاتی۔ پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ "میں بہت دیر سو تو نہیں گیا"۔ "ارے دس منٹ ہی تو ہوئے ہیں۔ تم سو جاؤ، میں کسی سے پڑھوا کر تصحیح کر دوں گی"۔ "نہیں نازی، جانے وہ کس طرح پڑھیں گے۔ کاما، ڈالس، حرف کے نقطے اور بہت ساری چیزیں مثلاً مسودے میں کتنی جگہ چھوڑ کر دوسرا حصہ شروع کیا گیا ہے، یہ سب کچھ دیکھنا چاہیے۔ تم پڑھو تو میں تصحیح کر دوں گا۔ بیگ میں سے فارم نکال لو، مسودے بھی وہیں ہیں۔"

اب انہیں رومان کے لئے پہلے کی طرح وقت نہ تھا۔ لیکن ان کی محبت اب روحانی طور پر اتنی گہری ہو گئی تھی کہ دفتر میں بیٹھے کام کرتے ہوئے بھی ہر لحہ اس محبت کا شدید احساس ہوتا۔ وہ مقابل کی کرسیوں پر بیٹھے ہوتے، ان کے درمیان ایک لانبی سی میز پڑی ہوتی، ہاتھ کام کر رہے ہیں، نگاہیں کاغذوں پر لگی ہیں۔ لیکن پھر بھی ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس میز کے اوپر سے ان کے دلوں کے درمیان، محبت کی دھارا بہہ رہی ہے، ایک دل سے دوسرے دل کو، پیہم، وہ سر اٹھا کر دیکھتی۔ شاہد کے چہرے پر پسینے کی بوندیں آجمی ہیں۔ اس کے بال پریشان ہو کر پیشانی پر آپڑے ہیں۔ وہ تھکا ہوا ہے، وہ چپکے سے اٹھ کر اندر چلی جاتی اور چائے لے آتی۔ اس کے بال ہٹا کر ایک مادرانہ شفقت سے اس کی پیشانی چوم کر

کہتی "چائے پی لو بہت تھک گئے ہو" وہ چپکے سے اس کا ہاتھ اٹھا کر آنکھوں سے لگا لیتا۔ چائے پی کر وہ تازہ دم ہو جاتے اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتے۔ نسرین کو یہ زندگی بہت پسند تھی......

"خط ایسے کوئی ضروری تو نہیں۔" شاہد نے خطوں کو پرے رکھتے ہوئے کہا "آئندہ پرچے کی ترتیب دے دیں گے"۔ "ابھی سے؟"

"ہاں، پچھلا پرچہ نکل کر کتنے دن ہو گئے۔ آج اتوار ہے کل پھر مجھے کورٹ جانا ہوگا۔ اور کاتب کو ان دنوں فرصت بھی ہے، ورنہ درسی کتابوں کا کام شروع ہو جائے تو بڑی مشکل ہوگی۔ اب بھی کافی دیر ہو گئی ہے۔ آئندہ سے ہمیں ایک پرچہ نکلنے کے پہلے ہی دوسرا مرتب کر کے کتابت کے لئے دے دینا چاہئے۔" انہوں نے کہا۔

"اچھا وہ مضامین والی فائل نکال دو، میں آئے ہوئے مضامین کی فہرست بناؤں گی۔" انہوں نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے یوں ہی ذرا سا پیچھے کو جھک کر الماری میں سے ایک فیروزی فائل نکال لی، میں نے ہاتھ بڑھا کر فائل لے لی اور فہرست بنانے لگی، وہ مضامین جو انتخاب میں لے لئے گئے تھے۔ پھر وہ مضامین جو زیر غور تھے۔ ناقابلِ اشاعت مضامین تو پہلے ہی سے الگ کر کے دوسری فائل میں ڈالے جا چکے تھے۔ فہرست تیار کر کے میں نے ان کے ہاتھ میں دے کر کہا "وہ خطوط ادھر بڑھا دو۔ میں ان کے جواب لکھ دوں۔"

خطوط کی ایسی کیا جلدی ہے۔ تم کل بھی لکھ سکتی ہو، آج مجھے چھٹی ہے، ترتیب دے دیں گے، مضامین کی فائل ادھر بڑھا دو۔ میں پہلے یہ اندازہ لگالوں، مضمون کتنے کتنے صفحوں میں آئیں گے۔ اب تو ہمیں پیپر کنٹرول آرڈر کے تحت 160 صفحوں سے بڑھنے کی اجازت نہیں۔" میں نے فائل دے دی۔

شاہد مضامین نکال کر صفحات گننے لگا۔ تب تک وہ بیٹھی کیا کرے؟

اس نے اِدھر سے اُدھر دیکھا۔ میز پر کوئی کتاب رکھی ہو تو لے کر پڑھے۔ میز کے

آخری کونے پر ننھا سا ایک روالونگ شلف رکھا تھا، دیکھیں اس میں کوئی کام کی کتاب نکل آئے، برنارڈ شا، یوری باڈیس پولیٹیکل ڈاٹ ازواٹ، جواہر لال نہرو کی گلمپس آف ورلڈ ہسٹری، ایچ ایل فیشر، ہسٹری آف یورپ کتنے دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب! تاریخ ہو کر بھی بالکل خشک نہیں معلوم ہوتی! لیکن بھئی اب پالیٹکس اور ہسٹری کون پڑھے گا۔ فرانز کافکا دی کیا سل، اس کے بہت سارے حصے تو اس نے پڑھے ہیں۔ کہیں کہیں اکتا کر چھوڑ دیا تھا۔ لن یوتانگ کی امپارٹنس آف لیونگ، لیف اِن دی اسٹارم یہ تو وہ پڑھ چکی ہے۔ تھارنٹن وائلڈر کی برج آف سان لوئی رے" یہ بھی حال ہی میں پڑھی تھی، الکسی ٹالسٹائی —— روڈ ٹو کیالواری، جان ڈاس پاساس u.s.a، افوہ! ٹریلو جیس! اب فی الحال تو اسے کوئی شارٹ اسٹوریس کی کتاب چاہئے تھی۔ شاہد کے صفحات دیکھ کر اندازہ لگانے تک ایک چھوٹا سا افسانہ پڑھ سکے وہ پیچھے کے شیلفوں میں سے کوئی کتاب لانے کے لئے اٹھی تو بیڈ کے نرے کے اوٹ میں میز پر تازہ ساؤنڈ پڑا دکھائی دیا، ٹائٹل پیج پر دیا زلنگ نیو فائنڈ، بیگم پارہ کی تصویر تھی۔ اس نے ساؤنڈ اٹھالیا اور یونہی ورق الٹ پلٹ کر تصویریں دیکھنے لگی۔

''تصویریں کیا دیکھ رہی ہو نازی، عباس کا آرٹیکل پڑھو'' جانے انہوں نے کیسے دیکھ لیا، مجھے تصویریں دیکھتے۔

شاہد احمد عباس کے مضامین کو اتنا پسند کرتا تھا ''فار ففٹی پیس آف سلور'' طرح کی چیزیں کون نہیں پسند کرے گا۔ وہ خود بھی ساؤنڈ میں احمد عباس کے مضامین بڑے شوق سے پڑھا کرتی تھی لیکن ساؤنڈ ملتے ہی اسے تصویریں دیکھنے کی بڑی بیتابی رہتی۔ ''فلم انڈیا بھی کیوں نہ خریدیں؟'' ''فلم انڈیا اب یوں ہی سا پرچہ ہو کر رہ گیا ہے۔ کبھی اس میں بھی بڑے اچھے مضامین ہوا کرتے تھے'' لیکن اس میں بہت سے آرٹ پلیٹ ہوتے ہیں، اور بڑی بڑی تصویریں۔''

''تصویریں؟ او نازی تم تو ابھی بچی ہو!'' تصویروں سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ وہ یہ

بھی غور کیے بغیر کہ ٹائٹل پیج پر کس کی تصویر ہے، عباس کے آرٹیکل پر ٹوٹ پڑتا۔ اور صبا کے۔ ''میں کہتا ہوں یہ صبا بھی عباس ہی ہوں گے، نازی، دیکھو تو اسٹائل کتنا ملتا ہے اور Saba یوں ہی Abbas کا الٹا ہے۔'' ''واقعی کیا لکھتے ہیں عباس!'' وہ ہمیشہ بمبئی کرانیکل کا آخری صفحہ اس کے سامنے پکڑ کر کہتا، نسرین عباس کا مضمون پڑھ چکی تھی۔ تصویریں دیکھ کر اس نے ساؤنڈ میز پر رکھ دیا۔ میز پر چیزیں بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔ مختلف Seals، ایک پیڈ لیٹر ہیڈ پنسلیں، فاؤنٹین پین، رسید اور بل کی چھوٹی چھوٹی کتابیں، پنچنگ مشین، چند فائلیں، گوند کی بوتل، اس نے بید کے ٹرے میں تازہ خطوط رکھے اور دوسری چیزیں بھی قرینے سے رکھنے لگی۔

''مجھے بھی چند مضامین دو۔'' میں نے سب چیزیں اپنی اپنی جگہ رکھ کے پوچھا۔

''نہیں تم اندازہ نہیں لگا سکو گی۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟''

''چپ بیٹھی رہو رانی'' انہوں نے بڑی ہی میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پیار سے کہا اور ان بلوریں نینوں میں رس بھر آیا۔ جگمگاتی سبز پتلیوں پر جھکی ہوئی وہ گھنی پلکیں! میں سفید و سبز و سیاہ کے اس خوبصورت سنگم کو دیکھتی رہی، دیکھتی رہی۔

پھر وہ ریشمیں پلکیں جھپک گئیں اور سبز کانچ کی سی پتلیاں بادام کے سے پپوٹوں میں چھپ گئیں اور نسرین کی نگاہیں ان پر سے ہٹ کر ادھر اُدھر کمرے میں بھٹکنے لگیں۔ اُفوہ کتنا ٹھنسا ہوا معلوم ہوتا تھا یہ کمرہ کتنا سارا سامان یہاں لاکر ٹھونس دیا گیا ہے۔ بید کا سیٹ بھی، کتابوں کے شیلف بھی، پہلے کتنا کشادہ معلوم ہوتا تھا یہ کمرہ۔ اس میں صرف دفتر کا سامان تھا۔ ایک چھوٹے سے دفتر کا سامان۔ دو میزیں، ایک لانبی، ایک ذرا چھوٹی۔ اور ان کی میزوں کی دونوں طرف رکھی ہوئی چار کرسیاں۔ ایک کونے میں چند ریم سفید کاغذ اور کروکڈائل کارڈ اچھی طرح ڈھکے ہوئے دوسرے دو کونوں میں دو بڑے اسٹانڈ۔ جن میں بید کے گہوارے سے لگے تھے۔ ایک میں اردو رسائل کی فائلیں رکھی تھیں، دوسرے میں

ہندوستان کے انگریزی اخباروں اور رسائل کے۔ ہندوستان کے بھی اچھے اردو رسائل کی فائلیں ان گھواروں میں رکھی تھیں۔ ''نیادور'' اتنے اعلیٰ معیار اور اچھے پروڈکشن کا رسالہ مانا جاتا تھا کہ دو تین بہت اچھے انگریزی رسائل بھی اس کے تبادلے میں آتے تھے۔ پاس ہی The Hindu پڑا تھا معمولی رسائل اور اخبارات ایک طرف رکھ دیئے گئے تھے۔ چوتھے کونے میں ایک چھوٹی سی الماری جس میں مشہور لکھنے والوں، دوسرے مضمون نگاروں، ایجنسیوں اور خریداروں کے خطوط کی فائلیں، مضامین، ناقابلِ اشاعت مضامین، پچھلے پرچوں میں شائع شدہ مضامین کی فائلیں، خریداروں کا رجسٹر، رسیدوں کی کتابیں، اکونٹ بکس، لیٹر پیڈس اور نیچے کے خانے میں ''نیادور'' کے پچھلے پرچوں کی دو دو کاپیاں رکھی تھیں۔ لانبی میز کے نیچے پٹیوں کے پاس رڈی کی ٹوکریاں تھیں۔

''دیکھو نازی میرا خیال ہے اس دفعہ نظم سے پہل نہ کی جائے۔ چھوٹتے ہی احمد علی کا مضمون دے دیا جائے کیوں؟''

اوہ! انہوں نے ترتیب شروع کر دی۔ میں نے چونک کر کہا۔ ''ہاں مضمون ہی سے شروع ہو تو اچھا ہے۔''

''پھر، ٹھہرو تمہیں کیسے معلوم ہو، فہرست کی ایک اور کاپی تمہارے لئے بنا دیتا ہوں۔''

اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے یاد ہیں سب مضامین کے نام۔ میرے خیال میں اس کے بعد فیض احمد فیض یا اختر انصاری کی نظم......''

''نہیں اختر انصاری کی یہ نظم تو ان پر مضمون کے ساتھ آئے گی اور ان کی سب نظمیں ایک ساتھ آئیں تو اچھا ہے۔ ایک یہاں، ایک وہاں ڈالی جائے تو ترتیب میں بڑی بے سلیقگی نظر آئے گی۔ فیض کی نظم ٹھیک رہے گی۔ پھر؟''

''کرشن چندر کا......''

انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ ''اوہ نازی! تم تو سب بڑے بڑے ناموں کو

شروع میں رکھنا چاہتی ہو، ترتیب میں ناموں کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہئے، مشہور لکھنے والوں کے مضامین تو سب پڑھتے ہی ہیں، خواہ وہ شروع میں چھپے ہوں یا درمیان میں یا آخر میں۔ ترتیب میں محض ناموں کا خیال نہیں رکھنا چاہئے۔" ٹھہرو میں پہلے ایک رف سا خاکہ بنالیتا ہوں۔ پھر ترمیم کرنا ہو تو غور کریں گے۔ شاہد محض یوں ہی ترتیب نہیں دیتا تھا۔ کتنا سلیقہ ہوتا تھا اس کی ترتیب میں! مشہور اہلِ قلم بھی اس کے سلیقہ اور حسنِ ترتیب کی دل کھول کر داد دیتے تھے۔ "کیا کہوں آپ کو پرچہ مرتب کرنے کا ایسا سلیقہ ہے۔" "نیا دور" کے مضامین تو بلند پایہ ہوتے ہی ہیں۔ لیکن آپ اس میں اندازِ ترتیب سے نئی جان، نئی بیداری، نیا حسن پیدا کر دیتے ہیں۔" ہاں شاہد کے اندازِ ترتیب میں ایک حسن، ایک خاص ذوق جھلکتا تھا۔ وہ کہیں ایسے مضامین ایک کے بعد دیگر رکھتا تھا جن میں بالکل تضاد ہو۔ اگر ایک افسانے میں بالکل اونچی سوسائٹی کی زندگی کی تصویر کشی کی ہو تو اس کے فوراً بعد ہل چلاتے ہوئے، پسینہ بہاتے ہوئے لیکن اپنے خون پسینے سے سینچے ہوئے کھیت کے اُگلے ہوئے اناج سے محروم، فاقہ کش کسان کی تصویر پیش کرتی ہوئی، ایک درد بھری نظم کو جگہ دے گا۔ تا کہ اس تضاد سے اثر اور زیادہ پیدا ہو، کبھی ایسے بہت سے مضامین کی ایک ساتھ ترتیب دیتا جن میں ربط اور ہم آہنگی ہو اور ان میں ایک دوسرے سے گذرتی ہوئی ایک دھارا سی بہتی چلی جائے۔ کبھی ذرا ملتے جلتے موضوعات پر الگ الگ طریقے سے لکھے گئے، یا الگ الگ نظریے پیش کرتے ہوئے مضامین یا افسانوں کی [کو] اس طرح ترتیب دیتا جیسے ایک ہی مقام سے نکل کر چاروں طرف بکھرتی ہوئی ایک پھلجھڑی سی چھوٹ جائے، کبھی ایسی ترتیب کہ غضب کا تنوع ظاہر ہو، کبھی یہ ترتیب قوس و قزح کی شکل اختیار کر لیتی۔ وہ دو۔ دو افسانوں یا نظموں کے درمیان ایک ایک ایسی نظم لا دیتا جس میں اپنے آگے اور پیچھے کے دونوں مضمونوں کا رنگ ملا ہو۔ گو وہ دو مضمون اپنی اپنی جگہ بالکل الگ ہوں۔ جیسے قوس قزح کے کنارے کمان تانے ہوئے اپنے دونوں طرف کے رنگوں کے کناروں میں مدغم ہو جاتے ہیں گو درمیان میں الگ ہی رنگ پھوٹ رہا ہوتا ہے۔

میں جانتی تھی اب وہ پھر بڑے انہماک سے نظمیں وغیرہ پڑھ کر بڑی سوچ بچار کے بعد خاکہ تیار کریں گے۔ اتنی دیر تک پھر خاموش بیٹھنا ہوگا؟ میں اندر اٹھ کر جانے والی تھی کہ انہوں نے پوچھا۔

اس دفعہ ہم نے دوسری زبانوں کی کہانیوں کے لئے کچھ نہیں کیا ہے نا؟ مالتی کا ترجمہ مکمل کرلیا ہے کیا؟

''مکمل تو کیا، آدھا بھی نہیں کیا، اتنا طویل ہے وہ افسانہ میں نے اکتا کر چھوڑ دیا۔ آئندہ نمبر کے لئے ضرور کردوں گی۔''

تو پھر اس دفعہ کون سی کہانیاں شامل کی جائیں؟ میں نے یہیں کے دو تین آدمیوں سے چند ترجمے کروائے ہیں۔ لیکن ترجمے خراب ہوئے ہیں۔ تم دیکھ کر تصحیح کردو تو میں شامل کرلوں گا۔

''میں نہیں کروں گی تصحیح، میں نے پڑھا ہے انہیں'' میں جھنجھلا گئی، جملہ جملہ بدلنا پڑے گا۔ ازسرِ نو ترجمہ کرنا ہوگا، اس سے تو بہتر ہے اوریجنل دیکھ کر میں خود ہی ترجمہ کردوں۔''

''لیکن، نازی، وہ نارویجین کہانی کا ترجمہ کردیا ہوتا چھوٹی سی ہے نا!''

''کون سی نارویجین کہانی؟''

"Knut Hamsun کی 'دی کال آف لائف'۔"

''ہاں وہ ضرور کردوں گی، کنوٹ ہامزون کو نوبل پرائز ملا تھا؟''

''ہاں......اور سنو کوئی اور بہت اچھی کہانیاں ہیں۔ تمہاری نظر میں جن کا ترجمہ ہوسکے......''

ترجمے کے لئے میں نے چند کہانیوں کا انتخاب کررکھا ہے۔ آسٹرین آتھر اسٹیفنس زویگ کا ''دی لیٹر فرم ان نون اُومن''، لیام اوفلارٹی کی ''دی ریپنگ ریس''، لیام اوفلارٹی امریکن ہے؟ میں بھول رہی ہوں......''

''نہیں آرش!''

''اور لوئی پیرانڈیلو کے مجموعے میں ''دی اینوئی'' مجھے پسند آئی۔ تم کہہ رہے تھے یہ اطالوی آتھر نئے ادیبوں میں سے نہیں ہے۔ لیکن کیا ہرج ہے مجھے یہ افسانہ اتنا اچھا لگا اسی وقت ترجمہ کرنے کا خیال ہوا۔ لیکن ہے بہت طویل۔ پہلے اس اڑیا کہانی کا ترجمہ کردوں؟ چھوٹی سی ہے اڑیسہ کی کوئی کہانی ہم نے اب تک پیش نہیں کی۔''

ہاں، ہمیں ہندوستانی زبانوں کی طرف کچھ اور توجہ دینی چاہئے۔ زیادہ تر یوروپی ادب ہی پیش کرتے رہے ہیں اب تک۔ یہاں کی دوسری زبانوں میں بھی ترقی پسند رجحانات آچلے ہیں۔ بنگالی، گجراتی، مرہٹی، پرسوں میں نے کھانڈے کر کی کہانی پڑھنے کو دی تھی۔ پسند آئی تمہیں؟ کھانڈے کر، مرہٹی ادیبوں میں بہت مشہور ہے۔''

ہاں پسند آئی تھی۔ دو الگ الگ قصے لیکن ایک مرکزی خیال، ایک ہی تار میں منسلک...... ''اور بنگالی کہانیوں میں سے کون سی ڈالیں؟''

''دس ارتھ از ناٹ یورس''؟ بودھا دیو بوس کی ''ڈسپیر؟'' وہی جو لانگ مینس مسلینی میں چھپی تھی۔ پربودھ کمار سانیال کی ''پرتیبنی'' کتنا اچھا نفسیاتی تجزیہ ہے! اور ''پنم'' پریم نند مترا کی۔ بس ایک فہرست ہی بنتی چلی جارہی ہے۔ کتنا مشکل ہے بنگالی کہانیوں میں انتخاب کرنا! سبھی اچھی ہیں۔ ان کا افسانوی ادب واقعی Mature ہے، زندگی ہوتی ہے بنگالی افسانوں میں، اور فن، پروپگنڈہ نہیں نصائح اور تقریروں کے ذریعہ نہیں۔ واقعات کی تفصیل اور کرداروں کے تجزیہ سے اپنا مقصد بیان کرتے ہیں۔ جذباتی رو میں بہہ نہیں جاتے، ایسی افراط تفریط بھی نہیں ہوتی کہ ایک ہی پہلو کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے۔ کتنا تناسب اور توازن ہوتا ہے۔ زندگی کا تناسب اور توازن......''

''یو آر اے مارول ڈارلنگ!'' میں چونک پڑی میں تو کچھ ایسے جوش میں کہے جارہی تھی، میں نے غور نہیں کیا وہ کیسی تحسین آفرین نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ہونٹ بھینچے۔ میں شرماگئی اور بات ٹال کر پوچھا ''اچھا تو کس کا ترجمہ کروں میں اس نمبر کے لئے؟''

''میں نہیں چاہتا، تم اتنا وقت ترجموں میں صرف کرو۔ تم میں تخلیقی صلاحیت ہے۔ ترجموں میں تمہارا بہت سا وقت بیکار جا رہا ہے۔

''تم افسانے تو بالکل نہیں لکھ رہی ہو آج کل؟......''

''لیکن لکھوں کس پر، میرا مشاہدہ تو اتنا محدود ہے، بچپن ہی سے اتنے سخت پردے میں رکھا تھا، ہر پھرا کے ذرا آٹوبیاگرافک افسانے ہی تو لکھ سکتی ہوں۔''

''تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے اس طرح کے افسانے لکھنا کمتری کا باعث ہے۔ دنیا کے لٹریچر میں کتنی بہترین چیزیں آٹوبیاگرافک ہی تو ہیں، واقعات کی سچائی اور جذبات و احساسات کی مہین باریکیوں کی صحیح عکاسی اس میں آسانی سے ہو سکتی ہے۔

''ہاں ٹھیک ہے لیکن میدان ہی کچھ محدود ہو جاتا ہے۔''

''ایک حد تک۔ لیکن ہم توجہ دیں تو بہت سارے موضوع مل سکتے ہیں، کیوں کیا ایک فرد کی زندگی میں اتنا مواد نہیں کہ بیسیوں افسانے بن سکیں؟''

''اور اگر واقعات ایسے چنے جائیں جن میں بہتوں کی زندگی کا عکس ہو یا اس کے اندر سے کوئی Basic Human element جھلکتا نظر آئے تو خواہ پس منظر ایک ہی فرد کی زندگی کا کیوں نہ ہو افسانہ میں اجتماعی رنگ آ جاتا ہے......''

''ارے تم نے میرے منہ سے بات چھین لی، میں اب بالکل یہی کہنے والا تھا، جب ہم بحث کر رہے ہوتے ہیں تو تم کبھی کبھی کیسے وہی بات کہہ دیتی ہو جو میں کہنا چاہتا ہوں۔''

''دل سے دل کو راہ ہوتی ہے، کی یہ ایک ''ترقی پسند'' صورت ہے۔''

ہم دونوں پر بُری طرح ہنسی کا دورہ پڑا۔

بہ مشکل ہنسی تھام کر میں نے پوچھا ''اچھا تو اس دفعہ کون سے ترجمے ہوں گے؟''

شائع شدہ ترجموں میں سے دو بہت اچھے چُن لیں گے کیوں؟ ہم نے اب تک چین کی کوئی کہانی پیش نہیں کی ہے۔ ''یڈ گر سنو'' کی ''لیونگ چینا'' کی سبھی کہانیاں اچھی ہیں اور تمنائی نے بہت اچھا ترجمہ کیا ہے۔ ان کے ''زندہ چین'' میں سے ایک لیں گے۔ اور کوئی

دوسری کہیں اور سے۔ آئندہ نمبروں کے لئے ہم شمالی ہند کے اچھے مترجموں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ افسانوں کا انتخاب تو ہم ہی کریں گے۔ ہر ملک کے منتخب شدہ افسانوں کے مجموعے جو ہیں ہمارے پاس۔''

دونوں ترجموں کا نام فہرست کے نیچے لکھ کر وہ پھر کاغذوں پر جھک گئے اور نسرین خطوط میں سے جو زیادہ ضروری تھے، انہیں نکال کر جواب لکھنے لگی۔

میں نے چھٹواں خط لکھ کر ان کی طرف بڑھایا۔ ''ذرا دستخط کر دو اس پر۔''

''کیوں''؟ تمہاری طرف سے لکھا ہے وہی پبلشر کے خط کا جواب۔''

دستخط کر کے انہوں نے میرے ہاتھ میں خط دیتے ہوئے کہا ''میں نے خاکہ بنالیا ہے پڑھ کر سناؤں؟''

''ارے اتنا جلد۔'' میں متعجب ہوگئی۔ ''تمہاری ترتیب تو......''

''دھارے کی طرح بہتی ہے، پھلجڑی کی طرح بکھر جاتی ہے، فوارے کی طرح چھوٹتی ہے، قوس قزح کے رنگوں میں بٹ جاتی ہے، کیسے کیسے شاعرانہ نام دے رکھے ہیں تم نے۔ لیکن اس دفعہ مضامین ہی کچھ ایسے ہیں کہ کسی خاص سلیقہ سے ترتیب دینا ممکن نہیں۔ میں نے تو یوں ہی ترتیب دے دی ہے سنوگی؟'' ''اچھا'' تمہارے کہنے کے مطابق میں نے پہلے احمد علی کا مضمون رکھا ہے، پھر فیض احمد فیض کی نظم پھر کرشن چندر کا افسانہ......'' وہ پڑھتے گئے۔

میں غور سے سن رہی تھی۔ ایک نظم کا نام سن کر میں نے چونک کر پوچھا۔

''یہ نظم؟ مجھے ایسے یاد پڑتا ہے۔ یہ معمولی تھی ادھر لاؤ پھر پڑھ کے دیکھوں......''

''معمولی ہے''۔

پھر بھی اتنی ساری معمولی نظمیں جو موصول ہوئی ہیں، ان میں غنیمت ہے۔''

''غنیمت؟ کیا ''نیا دور'' کا معیار غنیمت پر اتر آیا ہے؟''

''لیکن نازی، اس دفعہ اچھی نظمیں بہت کم موصول ہوئی ہیں۔''

''کم ہیں تو شائع شدہ نظموں میں سے بہت اچھی چن کے ڈالیں جیسے پہلے نمبروں میں کیا تھا'

''لیکن مطبوعہ چیزیں حتی الامکان کم...... اس دفعہ دونوں ترجمے بھی تو مطبوعہ ہیں۔'' پھر انہوں نے فہرست پڑھنی شروع کی۔ ''پھر یہ نظم''۔

''ارے یہ بھی معمولی ہے۔ایک سے دو معمولی چیزیں شامل ہوں تو مجموعی اثر بھی خراب ہو جائے گا۔ پر وہ بہت دیر تک خاموش رہے۔ آگے پڑھونا، کیوں خفا ہو گئے کیا؟

خفا کیوں ہوں گا، میری نازی، تم تو وہی کہہ رہی ہو جو میں نے بھی محسوس کیا لیکن مجبوری ہے۔'' پھر کیا ہے اس کے بعد؟''

''کہوں تو تم اور بھی متعجب ہو گی۔ یہ افسانہ بھی دوسرے درجہ کی چیز ہے لیکن اس مصنف کی بہت ساری چیزوں سے بہتر ہے۔''

دوسرے درجہ کا افسانہ؟ یہ تو اور بھی بُری بات ہے، ایک دوسرے درجہ کے افسانے کو ''نیا دور'' میں جانے دیں؟''

''اگر یہ نکال دیں تو اس نمبر میں اردو کے صرف دو ہی افسانے رہ جائیں گے وہ بھی چھوٹے۔'' ''دو ہی کیوں۔ ہم نے تو اردو کے بہت اچھے افسانوں کی اتنی لمبی فہرست بنا رکھی ہے ''نیا دور'' میں شائع کرنے کے لئے؟''

''لیکن حتی الامکان غیر مطبوعہ......''

غیر مطبوعہ، غیر مطبوعہ، آخر کیوں؟ ہم نے شائع شدہ چیزوں کے شائع کرنے کی سب ایڈیٹروں اور پبلشروں سے اجازت لے لی ہے نا اور اعلان بھی کر دیا ہے کہ ''نیا دور'' پنگون نیو رائٹنگ کی طرز پر نکالا جا رہا ہے۔ اس میں بہترین مطبوعہ چیزوں کا انتخاب بھی شامل ہوتا ہے اور سبھی مشہور اہلِ قلم نے رسالہ کی اس روش کو کس قدر پسند کیا ہے بلکہ کرشن چندر نے تو لکھا تھا ''اگر آپ اردو اور دوسری زبانوں کے ادب سے بہترین چیزیں چن کے پیش کریں تو یہ بھی بجائے خود ایک بہت بڑی خدمت ہو گی۔''

لیکن شاہد احمد صاحب نے لکھا تھا "ملک میں ایسے پرچے کی قدر ہونی مشکل ہے۔" اور یہ بہت بڑی حقیقت ہے 'نازی'۔ ہم اسے بھلا نہیں سکتے...... مطبوعہ چیزیں ہوں تو اکثر لوگ پرچہ نہیں خریدیں گے۔"

"پہلے پرچے تو بک گئے۔"

"ہاں پہلے تو بک گئے۔ پرچہ نیا تھا۔ شاندار نکلا تھا۔ اس لئے خرید لیا۔ شاید لیکن اب دیکھا کتنے خطوط آتے ہیں، آپ کے پرچے میں تو بہت سارے مضامین مطبوعہ ہوتے ہیں۔"

"ایسے خطوط تو تعریفی خطوط کے مقابلے میں کم ہیں۔"

"لیکن عوام کی ذہنیت اور ذوق کا پرتو تو انہیں میں نظر آتا ہے۔"

"لیکن انگریزی میں اس طرح کی چیزیں کس قدر مقبول ہوتی ہیں۔ پنگون نیو رائٹنگ میں تو خیر تین چار چیزیں غیر مطبوعہ بھی ہوتی ہیں لیکن آرگوسی اور ریڈرس ڈائجسٹ میں تو سبھی انتخاب ہی ہوتا ہے، پھر بھی ان کی کتنی قدر ہوتی ہے، ہمارا "نیا دور" کیوں؟"

"تم بھول رہی ہو، نازی، یہ ہندوستان ہے۔" انہوں نے ہنس کر کہا۔ کتنی تلخی تھی اس ہنسی میں! لیکن سوچو تو صرف غیر مطبوعہ چیزوں سے اتنا اعلیٰ معیار رکھنا کیسے ممکن ہے، فرض کرو سبھی مشہور ادیبوں کی معاونت ہمیں حاصل بھی ہوگئی۔ پھر بھی ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہر دفعہ وہ فسٹ ریٹ ہی لکھیں گے؟ بہت کم ادیب ہمیشہ ایک ہی سطح کے افسانے لکھتے ہیں، بیدی کی طرح ــــ آج کل کتنے ہی اچھے ادیب پہلے کے سے افسانے نہیں لکھ رہے ہیں۔

"میں مانتا ہوں پرچہ کا یہ معیار قائم رکھنا دشوار ہے۔ لیکن جن سے بہت اچھی کہانیاں انتخاب کی جا سکتی ہیں ایسی کتابیں اور رسائل تو بہت کم ہیں۔ ہندوستان میں، اور اکثروں کی نظر سے یہ گذر چکے ہوتے ہیں۔ ایسا پرچہ تو صرف ان لوگوں کے ذوق کا ہوگا جنہیں اچھی کتابیں رکھنے کا شوق ہے۔ لیکن اکثریت تو ان لوگوں کی ہے جو رسالوں میں نئی نئی چیزیں پڑھنا چاہتے ہیں انہیں پڑھنے کے بعد وہ رسالہ ان کے لئے پرانا ہو جاتا ہے......"

"تو ہم پرچے کم چھپوائیں گے۔ "نیا دور" صرف بہت اچھے ذوق والوں کے

ہاتھوں میں پہنچے۔'' کم چھپوائیں تو خرچ کیسے نکل سکے گا.....

پرچوں کی تعداد خواہ کتنی بھی کم ہو کتابت اور طباعت اور کور پیج کی پرنٹنگ کا وہی خرچ ہوگا۔ طباعت اور کتابت کے لئے روپے فارم کے حساب سے دیئے جاتے ہیں اور کور پیج کے لئے کتنے رنگ کی پرنٹنگ ہے اس حساب سے'' ہم نے پرچہ مالی فائدہ کی غرض سے تو نکالا نہیں لیکن خرچ بھی نہ نکلے تو؟ تم جانتی ہو کتنا خرچ آتا ہے' ہمیں ''نیا دور'' پر چھتیس روپے ریم سے کم کا کاغذ ہمیں کبھی ملا ہی نہیں اور آئندہ نمبر کے لئے تو پچاس روپے ریم والا چکنا، بتیس پونڈ کا کاغذ خرید کر پریس میں رکھ آیا ہوں۔''

''افوہ! کیوں خریدا اتنا مہنگا کاغذ؟ پچاس روپیہ ریم!''

''سفید کاغذ بالکل ناپید ہے ان دنوں! جو ملتا ہے وہی خریدنا پڑتا ہے، یہاں اتنی قیمت پر بھی کافی نہیں ملتا۔''

''لیکن ہم اخباری کاغذ کیوں نہ استعمال کریں؟ تم کہہ رہے تھے اس کی قیمت صرف بارہ روپیہ ہے۔''

''اخباری کاغذ استعمال کرنے کی ہمیں اجازت نہیں۔ صرف ان پرچوں کے لئے جو 1942ء سے پہلے نکلتے تھے اخباری کاغذ کا کوٹا منظور ہوا ہے۔''

''تو پھر کیا کریں؟ ''نیا دور'' کی نوعیت کو بدلنا ہوگا؟''

''ہاں'' انہوں نے دبی آواز میں جواب دیا اور فہرست کی کاپیاں بنانے لگے۔

نسرین اٹھ کر کونے والی الماری میں سے خطوط کی فائلیں نکال لائی اور جن خطوط کا جواب دے دیا تھا، انہیں چھانٹ کر کے الگ الگ فائلوں میں لگانے لگی۔ چند خطوط خریداروں کے تھے۔ یہ فائل خطوط سے بھر کر پھوٹ رہی تھی۔ اس میں تعریفی خطوط بھی تھے اور ایسے بھی جن میں مطبوعہ مضامین شامل کرنے کی شکایت ہوتی تھی۔ نسرین کو اس وقت بے حد غصہ آرہا تھا۔ اس کا جی چاہا اس طرح کے خطوط چن چن کر پھاڑ دے۔ اکثر خطوط میں ہلکے سے یہ لکھا ہوتا ''لیکن بہتر ہوگا آپ مطبوعہ مضامین نہ شامل کریں۔ ویسے گٹ اَپ تو بہت

خوبصورت ہے"...... "آپ کے رسالے میں اِدھر سے اُدھر سے لی ہوئی چیزیں ہی ہوتی ہیں آئندہ سے نئی چیزیں دینے کی کوشش کیجئے۔" کبھی کوئی وی۔پی میں ڈاک خرچ کے تین چار آنے معاف نہ کرنے پر بڑی خفگی سے لکھ دیتا۔" آپ تو محض شہرت حاصل کرنے کے لئے ایڈیٹر بن بیٹھے ہیں۔ اِدھر سے ایک مضمون لے کر ڈال دیا، ادھر سے ایک لے کر ڈال دیا۔ چند ترجمے شائع کردیئے۔ کیا یہی ایڈیٹنگ ہے؟ ایسا رسالہ کون پڑھے گا؟ گویا ایک رسالہ نکالنے سے شہرت حاصل ہو جاتی ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر بیکار رسالہ کا ایڈیٹر مشہور آدمی بن جاتا! اور تراجم کی یہاں بالکل قدر نہیں! وہ اور شاہد تھے کہ مختلف ملکوں کے افسانوں کے مجموعے پڑھ کر انتخاب کرتے، اس خیال سے کہ اردو ادب دوسری ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں سے استفادہ حاصل کر سکے۔ اردو داں مختلف ملکوں اور زبانوں کے ادب کی رفتار، رجحانات اور نئی تکنیکوں سے آگاہ ہوں۔ ان کے پاس کسی ملک کے افسانوں کے مجموعے نہ ہوتے تو شاہد محض ترجمے کی غرض سے انہیں خرید لاتا۔ اور وہ اپنا وہ وقت جس میں وہ افسانے یا مضامین لکھ سکتی تھی۔ ترجموں میں صرف کر رہی تھی۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد ان تراجم کی یہ قدر ہو رہی! واقعی ہندوستان میں پنگون نیورائٹنگ کی طرز کا پرچہ نکالنا حماقت ہی تو ہے۔ ایک اور خط میں لکھا تھا" کئی چیزیں تو میں پہلے بھی پڑھ چکا تھا۔ کیا آپ مہمانوں کی جھوٹے کھانے سے تواضع کرتے ہیں؟" جھوٹا کھانا! ایسی نعمت جو مغرب میں خزینہ کی طرح حفاظت سے رکھی جاتی یہاں جھوٹا کھانا سمجھ کر پھینکی جا رہی تھی۔ یہ صاحب خریدار نہ تھے۔ شاید کسی بک اسٹال سے لے کر پڑھا تھا۔ پھر ہر ایک نظم، افسانے کی خامیاں جی کھول کر بیان کی گئی تھیں! جوش اور احتشام حسین تک لپیٹ میں آگئے تھے۔"یہاں تک کہ "ڈمینس" جیسا بلند پایہ افسانہ بھی ان کی نگاہوں میں بچ نہ سکا تھا۔ اور اکثر خطوط میں پرچہ کے وقت پر نہ نکلنے کی شکایت تھی۔ ان کی دشواریوں میں یہ خط الگ انہیں پریشان کرتے تھے لیکن چند ذوق والے بھی تھے۔ "نیا دور" کے پچھلے سب پرچے بھیجنے کی ان کے خطوں میں درخواست ہوتی تھی۔ اس نے خطوط رکھ کے یہ فائل بند کردی۔ پبلشر کا خط اس نے

اپنے خطوں کی فائل میں رکھ دیا۔ ''ناز نسرین کا مجموعہ شائع کرنے کا خیال ہے۔ ازراہ مہربانی ان کا پتہ لکھ بھیجئے گا۔'' اس فائل میں دو تین اور ناشروں کے خط بھی تھے، اور ان میں سے ہر ایک لکھتا تھا۔ نفع کمانا ہمارا مقصد نہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ابھرنے والوں کی مدد کرسکیں۔'' شاید آئندہ رائلٹی کم دینے کے لئے پہلے ہی سے یہ حربہ استعمال کیا جارہا تھا! مضمون نگاروں کے خطوط کی فائل میں اس نے دو خط رکھے۔ اور ان کے ساتھ ملفوف نظمیں پڑھ کر ایک ناقابل اشاعت مضامین میں رکھ دی۔ دوسری زیر غور مضامین کی فائل میں۔ اور ان مضمون اور نظمیں بھیجنے والوں کے خطوط میں تو ''نیا دور'' کی اس قدر لمبی چوڑی تعریف ہوتی تھی۔ ''اچھے رسالوں کی کمی کے دنوں میں آپ نے اس قدر جلد ہندوستان کے بہترین اردو رسالوں کی صف میں جگہ لے لی ہے۔ ''ادبی دنیا''، ''ادبِ لطیف'' اور ''ساقی'' کے پایہ کا رسالہ ہے اور اس کے ظاہری حسن کا کیا کہنا، آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں...... '' وغیرہ، وغیرہ ''پھر آمدم برسر مطلب'' ایک نظم (یا مضمون یا افسانہ) بھیج رہا ہوں۔ ''نیا دور'' میں شائع کردیجئے۔ پھر احمد علی کا خط رکھنے کے لئے اس نے مشہور اہلِ قلم کے خطوط کی فائل نکالی۔ یہ فائل دیکھ کر اسے کچھ سکون سا ہوا۔ کتنے اچھے خطوط ہیں اس میں! پہلے پہلے جب ان ادیبوں کے خطوط آنے شروع ہوئے تھے تو کتنی بے پناہ خوشی ہوتی تھی انہیں! انہیں ڈاک کا کس بیتابی سے انتظار رہتا۔ پوسٹ مین کو دور سے آتا دیکھ کر شاہد گیٹ میں جا کھڑا ہوتا، اور وہیں سے آواز دیتا۔ ''ہمارا کچھ ہے پوسٹ مین؟'' ڈاکیہ اثبات میں سر ہلا دیتا۔ پھر نزدیک آکر کہتا ''آپ کی تو ہر روز اتنی ڈاک آتی ہے، وہ ان کی بے تابی دیکھ کر ہنس دیتا۔ اُوپر ہی سے لفافوں کی تحریر دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کرتے۔ ''یہ احتشام حسین کا ہے، یہ غلام عباس کا، یہ اختر اورینوی کا، یہ قاضی عبدالغفار کا، یہ فراقؔ کا...... کبھی وہ دور ہی سے اسے لفافہ دکھا کر کہتا۔ ''اگر تم پہچان لو یہ کس کا ہے تو تمہیں پہلے پڑھنے کو دوں گا۔'' اور وہ غور سے دیکھتی ''مادا موزیل لکھا ہے...... اختر رائے پوری کا ہے۔ کھلے کھلے حرفوں میں لکھا ہے، انور کا ہے۔ اور یہ تو پوسٹ مین نے بیرنگ بتایا تھا۔ سلام مچھلی شہری کا ہے، اور وہ معلوم نہیں

کرشن چندر کا ہے یا راما نند ساگر کا، دونوں کی تحریر اس قدر ملتی جلتی ہے، کرشن چندر کا ہوگا"...... "نہیں ساگر کا دیکھیں؟" اور وہ لفافہ پھاڑ کر بڑے فتح مندانہ انداز میں کہتا ساگر کا ہے؟" کبھی کبھی وہ ڈاکیے کو دور سے دیکھ لیتی، تو شاہد کو پتہ لگنے سے پہلے چپکے سے کھسک کر ڈاک لے لیتی۔ پھر اُسے آواز دے کر دور ہی سے ہاتھ اٹھا کر خطوط دکھاتی۔ "ارے، ڈاک آئی ہے کیا۔ لاؤ ادھر"— نہیں وہ اور دور بھاگ جاتی لیکن جلد ہی پکڑ لی جاتی اور ایک ہی جھپٹے میں خطوط چھن جاتے اور وہ بڑے اشتیاق سے شاہد کی سبز پتلیوں کو گھومتے دیکھتی۔ کبھی کبھی ان میں ایسی چمک آجاتی "کیوں کیا لکھا ہے؟ وہ بے تابی سے پوچھتی" احمد علی نے اسے بک اسٹالوں پر ڈھونڈا ہے۔ بیدی نے خرید کر پڑھا ہے۔ پرچہ کی کامیابی کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ یہ تو پہلا ہی پرچہ ہے، سوچو تو! سبھی نے رسالہ کے معیار اور گیٹ اَپ کی بہت تعریف کی ہے اور تمہارے مضمون......" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا، وہ سبز کانچ کی گولیاں امرت رس میں ڈوب کر جگمگا گئیں اور ان پر ریشمی جھالر جھلملا اٹھی! وہ ٹکٹکی باندھے اسے کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ اپنے چہرے پر ان محبت پاش نظروں کو محسوس کرتی۔ وہ خطوں کو بھی کچھ دیر کے لئے بھول گئی۔ شاہد نے اس کا ہاتھ لے کر اس میں خطوط تھما دیئے پھر سب ادیبوں کے خطوط انہیں باقاعدگی سے آنے لگے تھے۔ کتنے اچھے ہوتے تھے یہ خطوط۔ ان میں ان کی شخصیت کی ذرا سی جھلک دکھائی دیتی، کرشن چندر کی انسانیت پرستی، شاہد احمد صاحب کی بزرگانہ شفقت، اختر انصاری اور اشک کی دوستی، امرت رائے کی اور وامق کی دوست نوازی، تمنائی کی منکسر مزاجی، احمد ندیم قاسمی کے خطوں میں برادرانہ محبت اور خواہر نوازی، عزیز احمد اپنے خطوں میں بھی بے لاگ اور پُر اعتماد نقاد لگتے تھے...... عسکری کے خطوط گمبھیر اور وزنی ہوتے تھے۔ بیدی کے خطوط میں اسی طرح کا پُر معنی اختصار ہوتا جیسے ان کے افسانوں میں اور انور کے خطوں میں جدت، بغاوت، آگ جیسے ان کے افسانوں میں ہوتی ہے، دھرم پرکاش آنند ان معدودے چند خوش قسمت ادیبوں میں سے ایک جو بڑے عہدے پر فائز ہیں، آفس میں اپنے ماتحتوں کی

Sirring سے اکتا کر دوستوں میں بے تکلفی سے اظہار خیالات کے متمنی۔ کنہیا لال کپور کے خطوں میں بھی ہلکے مزاحیہ چٹ ہوتے چنانچہ ایک خط میں لکھا تھا...... مضمون بہت پسند آیا اور تصویروں میں...... کا فوٹو!

صرف ایک دو ادیبوں کے خطوط ذرا مربیانہ رنگ کے ہوتے۔ بڑے ادیبوں میں اپنی شہرت کے غرور کا شائبہ بھی نہ تھا۔ لیکن ذرا چھوٹے ادیبوں کو اپنے 'کچھ ہونے کا' بہت احساس ہوتا ہے۔ وہ افسانہ یا مضمون بھیجنے کا اس طرح وعدہ کرتے جیسے رسالہ پر احسان کر رہے ہوں اور بعض تو لکھتے ''نیا مضمون یا افسانہ تیار نہیں ہے، فلاں فلاں رسالے میں میرے مضامین یا افسانے چھپے ہیں۔ ان میں سے آپ لے سکتے ہیں۔'' لیکن بڑے ادیبوں نے کبھی یہ نہیں لکھا تھا کہ میرا کوئی مطبوعہ مضمون یا افسانہ لے لو، بلکہ افسانہ نہ بھیجنے پر بڑے خلوص سے لکھتے۔ ''میں بہت شرمندہ ہوں بھائی۔ افسانہ نہ بھیج سکا۔ کچھ ایسی پریشانیاں رہیں کہ مکمل نہ ہوا۔ مکمل کر لوں تو آپ ہی کو بھیجوں گا۔ آپ ہی کے لئے لکھ رہا ہوں''...... اور یکا یک مجھے ایک خیال آیا۔

ارے فہرست کی کاپی بنا ڈالی کیا۔ ذرا ٹھہرو۔ کیا ہم کچھ دیر اور انتظار نہیں کر سکتے۔ سہیل عظیم آبادی نے لکھا تھا وہ افسانہ مکمل کر کے جلد ہی بھیج دیں گے۔''

''نہیں بہت دیر ہو جائے گی۔ ہاں کتابت کے دوران میں ان کا افسانہ آ جائے تو یہ افسانے نکال کر ان کا شامل کر لوں گا۔''

''اور احتشام حسین نے بھی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔''

''لیکن نازی ہم یہ کیسے یقین کر سکتے ہیں کہ وہ لکھیں گے اور جلدی بھیجیں گے۔ بات یہ ہے کہ جو نئے لکھنے والے ہوتے ہیں وہ جلد جلد لکھتے ہیں تا کہ جلد ابھر آئیں جنہیں شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ انہیں جلدی نہیں ہوتی۔ آج کل کتنے مشہور ادیب بالکل نہیں لکھ رہے ہیں...... میں نے فہرست کی کاپی بنا ڈالی ہے۔ پھر ایک دفعہ دیکھ لو۔'' ان کی کرسی کے پیچھے جا کر میں نے فہرست دیکھی وہ اس انداز میں لکھی گئی تھی جیسے رسالے کے پہلے صفحہ میں

ہوتی ہے اور فہرست کے نیچے ہمیشہ کی طرح ایک مخصوص نشان ڈال کر Specially Written for the Penguin new Writing کا سا جملہ لکھنے کی بجائے موٹے موٹے حروف میں لکھا گیا تھا سب مضامین غیر مطبوعہ ہیں اور خاص ''نیا دور'' کے لئے بھیجے گئے ہیں، یہ بتانے کے لئے کہ کہیں پچھلے نمبروں کی طرح یہ بھی مطبوعہ نہ سمجھے جائیں گویا مطبوعہ چیزوں کا انتخاب شائع کرنا شرم کی بات تھی! ہم معمولی پرچوں میں ''خاص برائے......'' دیکھ کر کتنا ہنسا کرتے تھے! اور اب ''نیا دور'' کی فہرست کے فٹ نوٹ پر یہی مضحکہ خیز جملہ لکھ کر کس قدر کوفت ہو رہی تھی ہمیں!

''لڑکے کو آواز دو، نازی، ابھی کاتب کے پاس فہرست اور مسودے بھجوا دوں۔''
میں لڑکے کو بلا لائی۔ وہ غور سے فہرست دیکھ رہے تھے۔ ان کی خوبصورت پیشانی پر بل پڑے تھے اور چہرہ پر اداسی چھائی ہوئی تھی، میں جانتی تھی۔ کیوں اداس تھے۔ میرے شاہد! وہ اتنا اچھا ذوق رکھ کر بھی اپنے ذوق کے مطابق پرچہ مرتب نہ کر سکے تھے۔

انہوں نے لڑکے کے ہاتھ میں مسودوں کا لفافہ دیتے ہوئے کہا ''اس دفعہ پرچہ واقعی کمزور ہوگا، اچھے ادیبوں کے مضامین اور افسانے بھی اتنے اچھے نہیں ہیں اس میں! لیکن گھبراؤ نہیں، نازی، یہ ایک ہی پرچہ ایسا ہوگا۔ آگے چل کر سب اچھے ادیب ہمیں مضامین، اچھے مضامین بھیجتے رہیں گے۔''

لیکن کتنے ہی ذوق والے ''نیا دور'' کا فائل رکھ رہے ہیں، ایک پرچہ میں کمزور ہونا ہمارے لئے شرم کی بات ہے۔''

وہ لڑکے کو گیٹ سے باہر نکل کر مڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ لڑکا سائیکل پر سوار ہو کر آن کی آن میں دور نکل گیا۔

انہوں نے دروازے کی طرف سے نظریں پھیر کر مجھے دیکھا اور دبی آواز میں اداسی سے جواب دیا ''ٹھیک کہتی ہو۔''

اب وہ سبز پتلیاں کتنی اداس اور پھیکی تھیں۔

رانی

وہ ابھی ابھی مِل سے لوٹی تھی۔ تکان سے چُور۔ اس کے انگ انگ میں درد ہو رہا تھا۔ بھوک کی شدت سے اس کے پیٹ میں گویا آگ سی لگ رہی تھی۔ مِل کے احاطے میں مونگ پھلیوں کے ڈھیر دیکھ کر مارے بھوک کے، کئی دفعہ اس کا جی چاہا کہ مٹھی بھر مونگ پھلیاں ہی اٹھا کے کھالے۔ کتنے ڈھیر پڑے تھے۔ بن چھیلی مٹیالی پھلیوں کے ڈھیر ایک طرف چھیلے ہوئے گلابی دانوں کے ڈھیر ایک طرف دھوپ میں چمکتی ہوئی سوندھی سوندھی مونگ پھلیاں! وہ ہر روز ان ڈھیروں کو دیکھا کرتی تھی۔ لیکن کبھی اس کے منہ میں پانی بھر نہیں آیا تھا۔ گو اس کے ساتھ والی دوسری عورتیں للچائی ہوئی نظروں سے ڈھیروں کو دیکھا کرتی تھیں لیکن آج وہ بھوک سے بیتاب تھی۔ مٹھی بھر پھلیاں اُٹھالے تو مِل والوں کا کیا جائے گا؟ ایک دوبار وہ لینے کے لئے جھکی۔ لیکن لوگ ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ اُسے ہمت نہ ہوئی۔ اگر مِل والوں کو معلوم ہو جائے تو وہ ضرور اُسے نکال دیں گے۔ پھر وہ دوسری نوکری کہاں ڈھونڈتی پھرے۔ کئی دنوں سے رامو بھی کام پر نہیں گیا تھا۔ جب تک وہ بالکل اچھا نہ ہو جائے وہ اسے کام پر ہرگز نہ جانے دے گی۔ ایسے وقت میں اس کا کام بھی ہاتھ سے نکل جائے تو یہ مالک لوگ ذرا ذرا سی بات پر نکال دیتے ہیں۔ وہ رات بھی دو نوالے ہی کھا کر سو رہی تھی۔ اور صبح صرف ایک کٹورا چھاچھ پی کر مِل چلی گئی تھی۔ گاڑھی چھاچھ صبح صبح راّمی نے اس کے لئے بھیج دی تھی۔ کیسی اچھی ہمسائی تھی رامی! جب سے رامو بیمار پڑا تھا وہ

کچھ نہ کچھ بھیج دیا کرتی تھی۔ اس خیال سے کہ بے چاری گوری کہاں تک کرے گی۔ اسے مل میں بھی کام کرنا تھا۔ اور رامو کی تیمارداری بھی۔ وہ اکثر کچھ پکا ہوا ہی بھیجتی تھی۔ کبھی راگی کی روٹی اور چٹنی۔ اُبلے ہوئے چنے یا بٹر، گاڑھی گاڑھی چھاچھ، پرسوں اُگادی کے دن اس نے گڑ کی کھیر بھی بھیجی تھی۔ اور آج صبح صرف چھاچھ ہی۔ وہ رامو کے لئے بھی ہر روز دودھ بھیج دیا کرتی تھی۔ البتہ دودھ کے وہ پیسے لے لیا کرتی۔ ایسے دنوں میں جب دودھ روپے کا دو سیر ہو گیا تھا۔ مفت کون دیتا۔ اب تو گھاس کے ایک گٹھے کی قیمت چوگنی ہو گئی تھی۔ آج کل ''کونڈا'' بھی نہیں مل رہا ہے۔ پھر بے چاری راتی پر کیسی مصیبت آن پڑی تھی۔ چار گائیں اس کے ہاں بندھی ہوئی تھیں۔ کیسی موٹی تازی گائیں، بیماری آکر ان میں سے دو دیکھتے کے دیکھتے مر گئیں۔ ایک گابھ تھی۔ راتی کا اب صرف ایک ہی گائے پر گذارا تھا۔ مفت کہاں سے دیتی پھرتی۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ صبح صبح دودھ دوہتے ہی تازہ دودھ، بغیر پانی پلائے، گوری کے ہاں بھجوا دیتی۔ اور گوری سے پاؤ کا صرف ایک آنہ لیتی۔ اس نے رامو کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں ابھی تک راتی کے گھر سے بھی کچھ نہیں آیا تھا۔ گوری میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ خود کچھ پکا کر کھائے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا بوریا بچھا کر ایک طرف پڑ رہے۔ وہ ایک کونے میں میلا سا جگہ جگہ پھٹا ہوا بوریا بچھا کر لیٹ گئی۔ سر نیچے رکھتے ہی اس کی نیند سے بوجھل جلتی ہوئی پلکیں بند ہونے لگیں۔ آج کل اسے نیند بھی تو میسر نہیں تھی۔ اس نے ساری رات اپنے بیمار رامو کے سرہانے آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ اس کی آنکھ جھپکی ہی تھی کہ رامو کے آہستہ سے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ رامو جاگ پڑے تو اُسے کیا کھلائے گی؟ پاؤ بھر دودھ لوٹے میں ایسے ہی پڑا ہوا ہے۔ لیکن رامو تو اب دودھ نہیں پئے گا۔ صبح جب راتی کے بھیجتے ہی اُس نے دودھ گرم کر کے ایک کٹورا رامو کو دیا تھا تو صرف ایک ہی گھونٹ پی کر اس نے منہ پھیر لیا تھا۔ اور کیسے ترستے ہوئے کہا تھا ''اب دودھ مجھے اچھا نہیں لگتا گوری! منہ پھیکا پڑ گیا ہے۔ ذرا ہری مرچ، ادرک، کوتھمیر، پودینہ ڈال کے چاول کا نرم نرم گیدا پکا کے دے تو

کھاؤں۔'' گوری نے سب ہانڈیوں میں ٹٹول کے دیکھا۔ چاول کا ایک دانہ بھی نہ تھا۔ صرف ایک ہانڈی میں چھٹانک بھر راگی کا آٹا بچ رہا تھا۔ یہ ''راشن'' کنٹرول، بھی عجب آفت ہے۔ پرسوں جب یہ سن کر کہ ڈپو اسی کے محلہ میں کھل گئی ہے وہ خوشی خوشی ٹوکری لے کر چاول، راگی لینے چلی تھی۔ تو اُسے دروازے پر ہی کس بُری طرح سے دھتکارا گیا تھا ''کوپن پاس نہیں ہے۔ چلی ہے چاول لینے، جا، جا کر گھر بیٹھ رہ چاول نہیں ملیں گے...... جب کوپن ملے تو لے آئے'' تو کیا جب تک کوپن نہ ملے وہ بھوکوں مریں گے؟ اس دن وہ سویرے ہی چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد بہت سے لوگ آگئے تھے۔ مرد بھی، عورتیں بھی۔ اتنی بھیڑ جمع ہوگئی تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے، گالیاں دیتے، گرتے پڑتے، پاؤں کچلتے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈپو والوں کے پاس صرف ایک ہی جواب تھا ''جب تک کوپن نہیں لائیں گے، چاول نہیں ملیں گے۔'' وہ ہاتھ بڑھا بڑھا کر سب کو پیچھے ہٹا رہے تھے۔ لیکن بھیڑ تھی کہ آگے ہی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ انسپکٹر بھی آگئے تھے۔ اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ عورتوں کی چیخیں، کوسنے، آپس میں گالیوں کی بوچھاڑ، پھر درمیانی وقفوں میں ''سوامی، سوامی، دیا کرو سوامی!'' ''سرکار، گھر میں اناج کا ایک دانہ نہیں سرکار!'' کل سے کچھ نہیں کھایا ہے حضور!'' ''بچے بھوکے ہیں سرکار''۔ ہر ایک یہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کی آواز سب سے اونچی جائے۔ اور انسپکٹر کے کانوں تک پہنچے۔ عورتیں اپنی ٹوکریاں آگے بڑھائے دیتی تھیں۔ ''صرف چار آنے کے چاول سوامی!'' دو آنے کی راگی ہی دے دو سرکار، پرماتما بھلا کرے۔'' ڈانٹ، دھتکار اور گھرکیاں سن کر بھی ان کی ترستی ہوئی التجائیں اور سوامی، سوامی کی رٹ برابر جاری تھی۔ پھر وہ ایک دم خاموش ہو گئے تھے اور آپس میں گالیاں دینی بھی بند کر دی تھیں۔ آخر اس سے کیا فائدہ؟ پھر نہ جانے کس امید پر وہ چلچلاتی دھوپ میں کھڑے انتظار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بارہ بج گئے اور ڈپو کے مالک نے دروازہ بند کر دینے کا حکم دے دیا۔ آخری آس بھی ٹوٹ گئی۔ خیر گوری کے گھر تو کچھ چاول اور راگی بچ رہی تھی۔ اور اس کے

گھر پر تھے بھی کون؟ صرف رامو اور وہ، ان غریب بیچاروں کا کیا ہوگا۔ جن کے کئی کئی بچے تھے۔ بیچاری سدّی نے اس دن بڑھ کر انسپکٹر کے پاؤں پکڑ لئے تھے۔ رو رو کر کہہ رہی تھی "سوامی میرے پانچ بچے ہیں سوامی! تین دن سے ایک دانہ بھی منہ میں نہیں ڈالا ہے سوامی۔ دیور آنے، سوامی! تین دن سے بچے بھوکے مر رہے ہیں سوامی!" نوکروں نے ڈانٹ کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔ "ارے ہٹ عورت! اتنی دیر سے کہہ جو رہے ہیں کہ کوپن لے آ تو چاول ملیں گے۔ پھر بھی کیا بک رہی ہے؟" "کوپن کب ملے گا سوامی!" وہ گڑگڑا رہی تھی پھر وہ خاموشی سے آنکھیں پونچھتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اور گھر آ کر پانچوں بچوں کو ساتھ لے آئی۔ اُف وہ بچے! آنکھیں اندر دھنسی ہوئی۔ صرف "ایک پھٹی لنگوٹی باندھے ننگ دھڑنگ۔ پیٹ پیٹھ سے جا لگا تھا۔ اور پسلیوں کی ہڈیاں اتنی ابھر آئی تھیں کہ انہیں اچھی طرح گنا جا سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے تین دن سے نہیں تو دو ایک دن سے تو کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ مشکل سے گھسٹ گھسٹ کر چل رہے تھے اور چھوٹے بچوں کو تو ماں کھینچے لے آ رہی تھی۔ انہیں آدمیوں نے جو آگے بڑھنے کے لئے ایک دوسرے کو دھکے اور گالیاں دے رہے تھے۔ اسے بچوں کو لاتی دیکھ کر خاموشی سے جگہ دے دی۔ وہ بچوں کو لیکر سیدھے انسپکٹر کے پاس پہنچی۔ چھوٹے بچے سہمے ہوئے گم صم کھڑے تھے۔ ان میں سے جو بڑے تھے وہ پیٹ پر ہاتھ مار مار کر ہاتھ جوڑ جوڑ کر التجا کر رہے تھے۔ سدّی نے آگے بڑھ کر سب سے چھوٹے بچے کو انسپکٹر کے قدموں میں ڈال دیا۔ انسپکٹر نرم مزاج آدمی تھے۔ شاید انہیں سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کریں۔ وہ بار بار پیشانی سے پسینہ پونچھ رہے تھے۔ آخر انہوں نے رک رک کر کہا "میں .... کیا .... کیا کر سکتا ہوں۔ جب تک کوپن۔" تم ہی مائی باپ ہو سوامی ان چھوٹے بچوں پر دیا کرو۔" وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا رہی تھی۔ انسپکٹر گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ایک چھوکرے نے آگے بڑھ کر سدّی کو پیچھے دھکیل دیا۔ اور بچے کو انسپکٹر کے پاؤں سے الگ کر کے زمین پر بے دردی سے پٹک دیا۔ سدّی چھاتی پیٹ کر رونے لگی۔ کتنا دردناک نظارہ تھا۔ گورّی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ پھر رامی

اور گوری اسے دلاسا دے کر باہر لے آئے تھے۔ وہ راستہ بھر روتی آ رہی تھی۔ ''ہمارا جنم ہی ایسا ہے ماں!'' وہ اپنے آنچل سے آنسو پونچھتی جاتی۔ ''چھوٹے نصیب ماں۔ یہاں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ یہاں کا لکھا مٹتا نہیں۔'' وہ پیشانی پر انگلی مار کر کہتی۔ ''جب سے وہ پرلوک سدھارے دکھ ہی دکھ بھوگ رہی ہوں۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے ہی چلی جاتی تو اچھا تھا۔ یہ ننھے ننھے بچے کس پر چھوڑ گئے! یہ بچہ دیکھو ماں۔'' وہ منجھلے بچے کی ٹھوڑی پکڑ کر بولی''۔ ''تین دن سے تپ میں بھُن رہا ہے، اس پر پیٹ کو کچھ نہیں! بھگوان جانے ہمارے باپ دادا نے کیا کیا پُن کئے ہوں گے کہ ان بچوں پر ایسی آفت آئی۔'' پھر رامی نے اُسے سمجھا کر چپ کیا اور گھر جا کر راگی کا آدھ سیر آٹا اس کے گھر بھیج دیا۔ گوری نے بھی پاؤ بھر چاول بھجوائے اور سب سے چھوٹے بچے کو اپنے گھر اٹھا لائی تھی۔ اُسے روٹی، چٹنی جو کچھ بھی بچا تھا کھلا کر اس نے چھینکے پر سے دو کنولے بھی نکال کر دیئے۔ جو اس نے رامو کے لئے گڑ تل ڈال کر بنا رکھے تھے تو بچہ کیسا خوش ہو کر اس کی گود میں آ بیٹھا تھا۔ رامو نے بچے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا ''گوری! تجھے بھی ایک ایسا منا ہو جائے تو'' وہ شرما گئی تھی۔ ''ہاں گوری گھر میں رونق ہوگی۔ ہم اس کے لئے اور کمائیں گے۔ اگر کما نہ سکیں تو کیا۔ جب بھگوان دے گا تو وہی پالے گا۔ ہم آدھ پیٹ کھا کے اسے کھلائیں گے — کیوں؟'' — رامو کو بچوں کی اتنی خواہش تھی! شاید اب اسے بھی ایک منا...... نہیں وہ رامو کو ابھی نہیں بتائے گی۔ کچھ دن گذرنے پر بتائے گی۔ کتنا خوش ہوگا رامو — گوری کو شرم سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے شرماتے ہوئے رامو کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ وہ جلدی سے ٹوکری، ایک میلا سا کپڑا اور کوپن لے کر اٹھی۔ اسے ڈپو گئے کتنے دن ہو گئے تھے۔ کوپن مل جانے پر وہ دوسرے دن بھی گئی تھی۔ لیکن وہاں پھر یہ کہہ کر سب کو لوٹا دیا گیا تھا کہ ڈپو نئی کھلی ہے۔ ابھی ناپنے اور تولنے کی چیزیں نہیں آئی ہیں۔ البتہ چاول، اور راگی کے ''مونے'' آ گئے ہیں۔ کل ضرور سب کو اناج دے دیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ پھر نہیں گئی تھی۔ گو رامی اور محلے کی دوسری عورتیں برابر جایا کرتی تھیں۔ اب تک وہ جوں

توں گذارسکی تھی۔ لیکن آج راموں نے کتنی چاہ سے ''گیدہ'' کی فرمائش کی تھی۔ وہ ضرور آج ڈپو جاکر چاول لائے گی۔ دہلیز کے باہر قدم رکھتے ہی ایسے محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا ہے۔ اس نے جلدی سے دروازے کی چوکھٹ تھام لی۔ کچھ دیر دیوار کے سہارے کھڑے ہوکر آرام لیا اور چل پڑی۔ باہر دھوپ بہت تیز تھی۔ دھوپ کی حدت سے اس کا سر مارے درد کے پھٹا جارہا تھا۔ کنپٹیوں کی رگیں پھڑک رہی تھیں۔ پاؤں بُری طرح جل رہے تھے۔ اسے کئی دفعہ چکر آئے۔ پھر بھی وہ سنبھل سنبھل کر چلتی گئی۔ ڈپو اس کے گھر سے دور نہیں تھی۔ یہی کوئی چالیس گز کا فاصلہ ہوگا۔ لیکن بھوک اور تکان سے نڈھال گوری کو ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے وہ میلوں کا فاصلہ طے کررہی ہے۔ خدا خدا کرکے دوکان آگئی۔ اس دن کی طرح آج باہر بھیڑ نہیں کھڑی تھی۔ برآمدے میں سب قطاریں باندھے بیٹھے ہوئے تھے۔ دروازے کی ایک طرف مرد، دوسری طرف عورتیں۔ جوں ہی وہ اندر داخل ہوئی پھر اُسے زور کا چکر آیا۔ تیز دھوپ سے ایک دم اندھیرے میں آنے کے باعث اُسے کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے صرف سبز سبز دھبے ناچ رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی۔ کچھ دیر بعد اسے ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا ہے۔ ''کیوں جی اچھا نہیں کیا گوری؟''۔۔۔اس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ راتی اسے تھامے کھڑی تھی۔ ''نہیں رامی، جی تو اچھا ہے۔ پر بھجر سے کچھ نہیں کھائی تھی۔'' تو کیا بھجر سے بھوکی ہے گوری؟ کیا کروں، میرے گھر میں بھی اناج کھتم ہوگیا تھا۔ صبح سے ڈپو پھر رہی ہوں۔ صبح آئی تو چھوکرے نے یہ کہہ کر بھیج دیا، راگی کھتم ہوگئی ہے دوپہر میں آئے گی، پھر گھر آکر جو کچھ آٹا بچا تھا اُس کا ہٹ گھوٹ کر بچوں کو ایک ایک نوالہ کھلا آئی۔ آکے دیکھا تو ڈپو بند ہوچکی تھی۔ کل شام چھچی کو بھیج کے امینہ کے گھر سے لوٹا بھر کٹ منگائی تھی۔ کون امینہ؟ جانتی ہے نا، وہی گاڑی والے صابجان کی جورو۔ اماں کیسی چتری (چالاک) ہے وہ تو! گھوڑے کے لئے ہر روج کلتی ابالتی ہے پر کبھی کسی کو ایک کٹورا بھی مپھت (مفت) دے دے تو جو چاہے کسم لے لے۔ ہمارا گھر دو کھدم پر پڑا ہے۔ بچے گلی

میں کھیلتے رہتے ہیں۔ ان کے سامنے ہی کٹ ''نتھار نتھار'' کر مٹکیوں میں بھرتی ہے بچے ترستی ہوئی نجروں سے دیکھتے رہتے ہیں پر وہ کسی بچے کو بلا کر ایک کٹورا کٹ بھی نہیں دیتی! جب نہا پیٹ میں تھا۔ کیا کہوں کیسے جی پڑ گیا تھا۔ کلتی کے کٹ میں! ایک دفعہ اس کے گھر سے ایک آدھ دفعہ لوٹا کٹ منگوایا تو پیسے لیکر ہی چھوڑی۔ سوکل میں پچھی سے بولی ''کٹ لے کے ایک آنہ پھینک آ۔ کسے چاہئے اس کا مال!'' ایسی بھی کیا کنجوسی، کاہے کو اتنی حرس (حرص) اس کا مرد اپنے تانگے پر چھوکریوں کو سکول لے جاتا ہے۔ مہینے میں اُسی کے تیس روپیہ مل جاتے ہیں۔ چھ چھوکریاں جاتی ہیں اس کے تانگہ میں۔ ہر ایک سے برابر چھ چھ روپے لے لیتا ہے۔ دس بجے صبح کو اسکول لے جا کر چھوڑنا، پھر شام کو اسکول چھٹنے پر بلا لے آنا۔ پھر اس کے درمیان میں دوسری سواریاں بھی مل جاتی ہیں۔ وہ تیس روپے چھوڑ کے یہ اوپری آمد الگ۔ اچھا کھا سا کما لیتا ہے۔ اتنا مل کر بھی کاہے کو اتنی حرس؟ ایک مٹکی کٹ کو آدھے کو آدھا پانی ملا کر گھڑا بھر بنا لیتی ہے۔ گھڑا لئے محلّہ محلّہ بیچتی پھرتی ہے۔ کٹ کیا ہے پتلا پانی۔ ایک آنہ لوٹا بیچتی ہے بڑے گھروں میں گاڑھے کٹ کو پوچھتے ہیں اس کے لئے ایک الگ مٹکی اپنی بیٹی کے سر پر اٹھوا دیتی ہے۔ اتنی لکڑیاں جلا کر گاڑھا کٹ کہاں سے نکالے گی؟ اہا کیسی پکی ہے وہ بس اسی پانی ملے کٹ میں تھوڑی سی کچی کلتی پیس کر ملا دیتی ہے۔ اور دو آنہ لوٹا دیتی ہے...... تو کل میں اس کے ہاں سے کٹ منگائی تھی۔ رات بھر ذرا ذرا کے اچھا گاڑھا کٹ، اس میں املی، نمک، پیاج، کوتھی میر، ہری مرچ چُور رکھی تھی۔ گھر بھی تھوڑا بھیجنے کو تھی کہ مل سے آگئے، آتے ہی کہنے لگے ''بڑی بھوک لگی ہے، لچھمی (لکشمی) کی ماں، کھانے کو کچھ دیدے''۔ جلدی سے ہٹ کے دو بڑے گولے ایک رکابی میں اور کٹورے میں پورا کٹ سامنے رکھ دیا۔ بھوک جوروں کی لگی ہوئی تھی۔ کٹ کھانے مل جائے تو کھوب پیٹ بھر کے کھائے۔ میرے لئے بھی کچھ نہ بچا۔ میں سمجھی کہ رامو بھیا اب کچھ کچھ اچھے ہیں۔ تو نے کچھ نہ کچھ پکا لیا ہوگا۔ اس لئے صبح میں کچھ چھاچھ ہی بھیجی۔ ایسی بھی کیا سرم گوری؟ بچے باہر گلی میں کھیلتے رہتے ہیں۔ ذرا ڈیوڑھی میں کھڑی ہو کر انہیں پکار

لیتی۔ اور تجھے کیا ہونا تھا منگا لیتی! یوں تو میں بھی دوپہر کو کچھ نہ کھائی۔ پر میری بات چھوڑ، بچے والی، ایک دو وکھت پھاکے (فاقے) کرنا ہی پڑتا ہے۔ بھوکی رہنے کی زفت (عادت) پڑ گئی ہے۔ مگر تو! راموبھی تجھے بھوکا رکھا تھا"

"رامی! تیری طرف سے تو اتنا آرام ملا مجھے! کتنے دن سے گھر میں چولھا تک نہیں جلائی۔ تو جو کچھ بھیجتی بچے سے کھا کر چپ رہتی۔ اب بھی روج روج تجھے تکلیپھ دوں؟"

"کاہے کی تکلیف گوری! تیری "ایک جان" کے لئے جرا جیادہ پکا دوں تو کیا ہاتھ سوج جائیں گے؟ چل، وہاں بیٹھیں گے۔ تو کھڑے کھڑے تھک جائے گی میری جگہ وہ ہے۔" رامی دوسری قطار کی طرف اشارہ کرتے بولی "کب سے بیٹھی انتجار کر رہی ہوں۔ برابر ایک بجے سے۔ رام، رام! ڈپو کب کھلے گی؟ ابھی تک ایک چھوکرا بھی نہیں پھٹکا۔"

رامی نے گوری کو ساتھ لے جا کر اپنے پاس بٹھالیا۔

"اری یہاں کہاں لا کر گھسو رہی ہے تیری آشنی کو؟ میں بیٹھی ہوں یہاں بارہ بجے سے۔ مجھ سے پہلے لے گی چاول یہ؟ کلثوم محلہ بھر میں زبان درازی کے لئے مشہور تھی۔

"بی بی گھسے کیوں ہوتی ہو؟ تمہیں دو ایک لمحازے (منٹ) دیر ہو گئی تو کیا بڑا نکسان ہو گیا۔ بیچاری فجر سے بھوکی ہے۔ اس کا مرد گھر میں بیمار پڑا ہے۔ اگر چاول اسے جرا جلدی مل جائیں تو تمہارا کیا جائے گا؟" رامی بولی۔

"میرا کیا جائے گا؟ ذرا زبان سنبھال کر بات کر، ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ نجس کافرنی کہیں کی! میرے منہ لگتی ہے؟"

پھر وہ گوری پر جھپٹ پڑی۔ "کیوں ری؟ اگر چاول زلدی (جلدی) لینے تھے تو زلدی آتی! بڑی آئی کہیں کی زلدی لینے والی۔ چل نکل، وہاں جا کر آخری قطار میں بیٹھ رہ۔ نباب جادی آئی ہے دو بجے!"۔

گوری جو ڈپو کے قاعدوں کو نہیں جانتی تھی کچھ سمجھ نہ سکی۔ اس لئے سوالیہ نگاہوں سے رامی کی طرف دیکھا۔ "اوہ! تو نہیں جانتی گوری! یہاں کھائدہ یہ ہے جو پہلے آئے وہ

درواجے سے نجدیک بیٹھتا ہے۔ اور چاول اسے پہلے مل جاتے ہیں جو بعد میں آئے وہ پیچھے بیٹھتے ہیں''۔ رامی نے تشریح کی۔

''اگر ایسا ہے تو میں وہیں جا کر بیٹھ رہوں گی میری طرپھ سے کا ہے کو کسی کو تکلیف ہو''۔ گوری اٹھ کھڑی ہوئی... ''چل میں بھی تیرے ساتھ چلتی ہوں۔ اس بے صبری کو چاول جلد مل جائیں۔ پکا کر خوب پیٹ کائیں۔'' رامی ساڑی کی میریاں جھٹک کر کلثوم پر ایک غصہ اور نفرت کی نگاہ ڈالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی ''کیا کہتی ہے۔'' کلثوم نے غضبناک نگاہوں سے اس کا تعاقب کیا۔ لیکن رامی اور گوری جا چکی تھیں۔ ان دونوں نے جا کر آخری قطار میں پہلی جگہ لینے کی کوشش کی۔ لیکن کسی نے انھیں جگہ نہ دی۔ وہ عورتیں بھی جو گوری کے بعد آئی تھیں اپنی اپنی جگہ لے چکی تھیں۔ رامی کے ہزار کہنے پر بھی کہ وہ ان سے پہلے آئی تھیں انھوں نے جگہ نہ چھوڑی۔ چار و ناچار ان دونوں کو سب سے آخر میں بیٹھنا پڑا۔

''ڈپو کھلنے میں ابھی کتنا وکھت ہے؟'' رامی نے اس کے بازو بیٹھی ہوئی دودھ والی چنی سے دریافت کیا۔ ''چار بجے کھلتی ہے''۔ ''رام رام، چار بجے؟ اب کیا وکھت ہوگا؟''

''یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ جب میں اس سامنے والے بنگلے سے گزر رہی تھی تو دو دفعہ ٹن ٹن بجا۔ اب یہی کوئی اڑھائی گھنٹے ہوں گے۔''

''بھگوان یہ بھی کیا آفت ہے! ابھی ڈیڑھ گھنٹہ انتجار کرنا ہوگا؟ جب سے یہ راشن شروع ہوا ہے آفت ہی آگئی۔'' رامی نے سر تھام کر کہا۔

لیکن بہن کچھ بھی کہو، میں تو کہوں گی یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ نہیں تو سب امیر لوگ اناج جمع کر لیتے۔ تھوڑا بہت جو بچتا وہ بہت مہنگے داموں بکتا۔ ہم غریبوں پر تو بھوکوں مرنے کی نوبت آجاتی۔'' فاطمہ بڑے گھر میں کام پر رہ کر بہت سی باتیں سیکھ گئی تھی۔ ''ہماری چھوٹی بی صفیہ کالج میں جا کر انگریزی پڑھتی ہے۔ وہ کہتی ہے بنگال میں ایسا ہی ہوا۔ امیروں نے اپنے گھروں میں اناج کے ڈھیر لگا لیے۔ دوکان داروں نے بھی اناج چھپا کر رکھ چھوڑا تھا۔ اور صرف تھوڑا اناج بہت مہنگے داموں بیچا کرتے تھے۔ بی صفیہ کہتی تھی

وہاں چاول چار روپیہ من کا ڈیڑھ سو روپیہ من ہو گیا تھا۔ ہزاروں، لاکھوں آدمی بھوک سے مر گئے۔"

"رام رام تو کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟" رامی نے حیرت سے پوچھا۔

"اور کیا"۔ "یہ پیسے والے غریبوں پر کیا کیا ظلم کرتے ہیں۔ کچلتے ہیں پاؤں تلے، لہو چوستے ہیں ہمارا! فاطمہ نے بی صفیہ کی اشتراکی باتیں بھی حفظ کر لی تھیں۔ "یہ کنٹرول ہمارے واسطے اچھا ہی ہوا۔ گورنمنٹ اناج کے دام مقرر کر دیتی ہے۔ دوکان دار کسی صورت میں بھی سرکار کی مقرر کی ہوئی قیمت سے زیادہ نہیں لے سکتے اگر دوکان داروں پر چھوڑ دیا جائے تو ایک کے دس دام لیں۔" فاطمہ بھوئیں چڑھا چڑھا کر اپنی معلومات سے سب کو مرعوب کر رہی تھی۔ اور دیکھو اناج سب کو برابر برابر دیا جاتا ہے۔ امیر لوگ پیسے زیادہ بھی دینا چاہیں تب بھی انہیں اس سے زیادہ نہیں مل سکتا۔ اس کنٹرول کے قاعدہ میں ایک طرح سے امیر غریب سب برابر ہو گئے ہیں۔

"کہاں برابر ہوئے؟ یہیں دیکھ لے کتنا فرکھ (فرق) کرتے ہیں۔ ہم تین چار گھنٹے سے بیٹھے انتجار کر رہے ہیں۔ کوئی ایک سوٹ بوٹ والا منہ میں سگریٹ دبائے، اپنے نوکر کو ساتھ لے آپہنچتا ہے تو ہم پڑے سڑا کریں، فوراً اس کے لئے چاول ناپ دیئے جاتے ہیں۔ ہم ذرا سا منہ کھولیں تو دوکان والے اتنی گالیاں سناتے ہیں۔ پر پیسے والوں سے ایسے بات کرتے ہیں جیسے منہ میں شکر رکھی ہے اور بھلا کنٹرول کے کھائدوں کا لحاج رکھتے ہیں یہ امیر لوگ؟ ان کے لئے تین حصوں میں دو حصے موٹے چاول اور ایک حصہ باریک چاول ہیں۔ بڑے بڑے ہافیسر جو ہیں اوپر کچھ لکھا کے سارے کا سارا باریک چاول لے جاتے ہیں۔ روپیہ سب کچھ کر سکتا ہے روپیہ، ہاں!" چنی چٹکی اڑا کر بولی۔ "کیا میں یہ سب نہیں جانتی؟ تو ایک بڑے گھر میں کام کرتی ہے تو کیا۔ میں ایسے کتنے بڑے گھروں میں دودھ دیتی ہوں۔" "تو کیا تو لیتی باریک چاول؟" اپنی تقریر کا سلسلہ ٹوٹ جانے پر فاطمہ جھلا اٹھی۔ اس نے بی صفیہ کی کتنی باتیں یاد رکھی تھیں، وہ ہر موقع پر انہیں دہرایا کرتی تھی۔ اب

چنی کے یکا یک بیچ میں بول اٹھنے پر وہ سب اس کے دماغ سے نکل گئیں۔ اپنے حلقہ میں فاطمہ کی ہر بات گویا فتویٰ ہوتی تھی۔ بغیر کسی پوچھ گوچھ [گچھ] کے سب اسے مان لیتے۔ اب یہاں کون نکلی یہ اس کی بات پر اعتراض کرنے والی؟ فاطمہ چنی پر جھپٹ پڑی۔ ''اتنے روپے جو ہیں نواب زادی کے پاس!''

''میں اپنی بات نہیں کر رہی ہوں۔ اچھا باریک چاول کا جانے دیجئے۔ بھلا یہ تو بتا جب راشن والے آئے تھے تو تیرے گھر پر جس سختی سے انہوں نے سب کچھ دیکھا۔ تیری بی عفیہ کے گھر پر بھی اتنی ہی سختی سے دیکھا؟'' — فاطمہ لاجواب ہو کر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتی رہی۔ ''کیوں راتی کیسے دیکھا انہوں نے ہمارے گھروں پر؟''

یہ پوچھتی ہے چنی؟ دیورے کتنا ستایا انہوں نے۔ کونہ کونہ چھان مارا۔ ہانڈیاں کھول کر دیکھیں۔ ٹوکرے تھیلیاں الٹ پلٹ کر دیکھے۔ بوریئے تک بھی جھٹک کر دیکھے۔ سارا سامان تتر بتر کر دیا۔''

''اور میرے گھر میں۔''

چنی نے اپنا قصہ شروع کیا۔

''کچھ نہیں، رنگی کو پیاز املی لانے ذرا دوکان بھیجی تھی۔ خیر وہ مرد بیچارے ایک طرف کھڑے تھے وہ عورت جو تھی گھر کے اندر آ کر دیکھنے والی، وہ تو بلا تھی، بلا، شنی، پشاشی، ایسا میرے سر پڑ گئی۔ ''کہاں ہے اور ایک بچہ؟ تو نے جھوٹ موٹ کے چھ لکھوائے ہیں۔ یہاں صرف پانچ ہی تو ہیں۔'' وہ ایسے ڈانٹ رہی تھی جیسے میں اُس کی کوئی نوکرانی ہوں۔ میں کتنا بولی۔ ''اماں، بچی ذرا دوکان گئی ہے'' ''ہونہہ! دوکان گئی ہے! جھوٹی کہیں کی۔ تجھے معلوم نہیں تھا آج ہم آئیں گے۔ کیوں نہیں گھر پر رکھا اسے؟ جھوٹ لکھوا کے بہانہ بنا رہی ہے۔'' ہم غریب سہی پر جھوٹ نہ بولیں گے، وہ بار بار مجھے جھوٹی کہہ رہی تھی تو گالیاں میرے منہ سے نکلی پڑ رہی تھیں۔ پھر بھی صبر کر کے چپ ہو رہی۔ ہم غریب کیا کر سکتے ہیں۔ ہم بھی زور کریں تو الٹا ہمیں کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ میں عاجزی سے بولی ''نہیں ماں، سچ

مچ دوکان پر پیاز لینے گئی ہے۔ ابھی آئے گی تم خود آنکھوں سے دیکھ لو"۔ "اس کے آنے تک کھڑی رہوں میں واہ!"۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر غرور سے بولی۔ سیتی کا دوکان ہمارے گھر سے کتنا دور ہے، تو جانتی ہے نا، بس دو قدم، وہاں سے آنے میں کتنی دیر لگے گی۔ ان پانچ لہذوں (منٹوں) میں اس نے وہ دھوم مچائی "کیا مجھے اور دوسرے گھر نہیں دیکھنے ہیں؟ تیرے ہی گھر پر رات بھر پڑی رہوں؟" خیر رنگی آئی، اور یہ بلا ٹلی......"

"اور کنٹرول کرنے کو کر دیا۔" تیسری قطار میں بیٹھی ہوئی مریم بول اٹھی — لیکن اتنا خیال نہیں کہ کوپن جلدی بانٹ دیں۔ پیسے والوں کا کیا ان کے پاس تھوڑا بہت اناج تو ضرور بچ رہا ہوگا وہ مہینہ آدھ مہینہ بھر کا سودا ایک ہی وقت لے لیتے ہیں۔ لیکن ہم غریب پائی پائی کا سودا لینے والے، ہمارے پاس کہاں سے بچ رہے؟ انہیں اتنا بھی خیال نہیں کہ کوپن جلدی نہ دیں تو ہم بھوکوں مریں گے۔ یا اللہ! دو تین دن غریبوں پر کیا آفت ٹوٹ پڑی! سنتے ہیں فلاں محلہ میں، جب راشن افسروں کی گلی میں آیا تو سب عورتیں جھاڑنیں لے کر گھروں سے نکل پڑیں اور اسے گھیر لیا۔ کہتے ہیں اُسے پکڑ کر مارا بھی لیکن نہ جانے یہ کہاں تک سچ ہے۔ اماں! کتنی ڈھیٹ ہوں گی اس محلہ کی عورتیں۔ ہم تو بھیگی بلیاں بن کر دبک رہیں۔"

"ہمارے محلے والے کیا کم ہیں؟" چتی نے کہا "دیکھا نہیں جب پہلے دوسرے دن انہیں چاول نہیں ملے۔ انہیں دھتکار کر لوٹا دیا گیا، تو رات ہی رات جا کر ڈپو کا قفل توڑ کے تین چار "مونٹے" چرا لائے۔"

"ارے سچ کیا؟" گوری نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، کیسی گڑبڑ مچ گئی۔ پولیس والے آ گئے۔ انسپکٹر آدھی رات کو آ پہنچے" فاطمہ بولی۔

اور ایک بات کہوں۔ جب راشن والے ہمارے گھر دیکھ گئے تو میں سامنے والے بنگلے میں دودھ کے پیسے مانگنے گئی۔ اس رات، سچ کہتی ہوں رامی، میرے پاس ایک چھٹی

پائی بھی نہیں تھی۔ وہاں گئی تو عجب ہی تماشا دیکھا۔ راشن والے وہاں تھے۔ لیکن گھر کے لوگ سب اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ صرف دو ایک کھڑے راشن والوں سے بات کر رہے تھے۔ ''تو آپ کے گھر پر چودہ آدمی ہیں؟'' ''ہاں'' — بس اتنا ہی۔ نہ آدمی بلوا کر دیکھے گئے نہ اس عورت نے خود کمروں میں جا کر دیکھا۔ وہ گھر کی مالکن سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ ''آپ کو کل ہی کوپن مل جائے گا......'' اور اس گھر میں، میں جب سے دیکھ رہی ہوں صرف سات ہی آدمی رہا کرتے ہیں۔ لیکن مزے سے چودہ آدمیوں کے چاول مل جائیں گے۔ بس پھر کیا۔ میری ایک بچی باہر گئی تھی تو اتنی دھوم مچائی اس نے، ایک اور بات کہوں۔ اس گھر میں پہلے سے کئی پلّے دھان تھے۔ جھوٹ نہیں بولتی، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک چھوٹی کوٹھری میں مُوٹے پر مُوٹے رکھے تھے۔ سچ کہتی ہوں، مُوٹے چھت پر جا لگے تھے۔ اس دن، بھولے سے ہوگا۔ کوٹھری کھلی پڑی تھی۔ اس عورت نے جھانک کر دیکھا۔ وہ بھی یوں ہی، ورنہ ایسے ہی چلی جاتی۔ مالکن سے پوچھنے لگی ''کئی پلّے ہوں گے؟'' کوئی دو پلّے ہوں گے۔ لیکن یہ سب دھان کے مُوٹے ہیں۔ اس حساب سے صرف ایک پلّہ چاول ہوئے۔ اور چاول ہمارے پاس کوئی دس سیر ہوں گے'' مالکن نے جواب دیا۔ پر میں جانتی ہوں اندر چاول کے تین مُوٹے تھے۔ ڈیڑھ پلّے سے کم نہ ہوں گے۔'' عورت نے پھر کوئی پوچھ گوچھ [گچھ] نہیں کی۔ باہر جا کے کہہ دیا دو پلّے دھان ہیں۔'' دوسرے دن میں دودھ دینے گئی تو باتوں باتوں میں مالکن سے پوچھا ''مائی، کوپن مل گیا تمہیں؟'' ''ہاں مل گیا'' لیکن تم تو ابھی ڈپو سے چاول نہیں منگواؤ گی۔'' ''کیوں، کیوں نہ منگاؤں؟'' — راشن والوں نے لکھ لیا ہے نا کہ دو پلّے دھان جمع ہیں۔ وہ دھان تمہارے حساب سے کاٹ لئے گئے ہوں گے۔'' ''نہیں کوپن میں تو کاٹے نہیں گئے ہیں کل سے ہمیں برابر چودہ آدمیوں کا اناج مل جائے گا۔'' میں نے پوچھا۔ ''مائی! تمہیں ضرورت سے زیادہ چاول ملتے ہیں نا۔ مجھے بھی اپنے کوپن میں سے کچھ دے دو۔ میرے دودھ کے حساب میں پیسے توڑ لو۔ کیا کریں مائی! ہم غریب محنت مزدوری کرنے والے دن

میں پاؤ بھر چاول سے پیٹ نہیں بھرتا۔ اور ہم چاول کہاں سے کھائیں مائی! تمہارے کوپن سے چاول کے بدلے بھی کچھ راگی ہی لے لوں گی۔ غریبوں کا پیٹ بڑا ہوتا ہے۔ مائی! ہمارے بچے بھی بہت کھاتے ہیں۔ کھانے کو نہیں ملتا پر کھاتے بہت ہیں...... دوگی مائی؟'' ارے چتی یہ نہ پوچھ! یہ کنٹرول کا معاملہ ہے۔ تجھے دیں گے تو ہم مفت میں پکڑے جائیں گے''۔۔۔ کیوں امیر غریب برابر ہوئے نا؟ چتی نے فاطمہ پر طنز کی۔

''پرسوں تو بہن میرا پیٹ جل گیا دیکھ کر۔ ابھی سب کو اناج نہیں ملا تھا کہ بارہ بج گئے۔ ڈپو بند کرنے کا وقت تھا۔ نوکر باہر آ کر دروازہ بند کرنے لگے۔ سب ایسا ترس رہے تھے۔ اتنا گڑگڑا رہے تھے۔ 'سوامی! پانچ لبھدے؟ ٹھہرو سوامی! مٹھی بھر اناج تو دے دو سرکار۔ اب گھر میں پکانے کے لئے کچھ نہیں ہے بچے بھوکے مر رہے ہیں۔'' ہم تین گھنٹے سے بیٹھے انتجار کر رہے ہیں سرکار! خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ سوامی!'' نوکر انہیں اس طرح باہر ہانک رہے تھے جیسے جانوروں کا گلہ ہو۔ ''نہیں دیں گے چلو۔ دیر سے کاہے کو آئے؟'' ''ہم نو بجے آئے سرکار دیر سے نہیں۔'' ''نہیں ملے گا چلو!'' اور جب دو آدمی سائیکل پر اپنے نوکروں کو ساتھ لئے آئے۔ تو پھر سے ڈپو کھول کر ان کے لئے چاول ناپ دیئے گئے۔ ڈپو کھلی دیکھ کر سب اندر ٹوٹ پڑے۔ آس کے مارے کہ جب پھر قفل کھلا ہوا ہے تو انہیں بھی مل جائے گا۔ لیکن نوکروں نے گالیاں دے کر پھر انہیں نکال باہر کیا۔ اور دروازہ بند کر دیا۔ سب ایسا ترس رہے تھے میں تبھی تبھی چاول لیکر باہر نکلی تھی۔ کھڑی دیکھا کی۔ میرا تو پیٹ جل گیا دیکھ کر۔'' مریم بولی گوری خاموشی سے سب کی باتیں سن رہی تھی۔ بھوک اور تکان سے اس پر نیم بیہوشی سی طاری ہو رہی تھی۔ اسے عورتوں کے چہرے دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔

''چار بجنے والے ہیں۔ اب کھل ہی جائے گی''...... یہ سن کر گوری اپنی غنودگی سے چونک پڑی۔ ایک سوٹ میں ملبوس آدمی اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر اپنے نوکر سے

کہہ رہا تھا۔ گوری نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ بیٹھی ہوئی عورتوں اور مردوں کی قطاروں کے بیچ میں دروازے کے پاس چند متوسط الحال عورتیں اور مرد اپنے نوکروں کو ساتھ لئے کھڑے تھے۔ نوکر بڑے بڑے ٹین اور تھیلے اٹھائے ہوئے تھے۔

''اس ماہ کے چاول ابھی نہیں لئے تم نے؟''

''ابھی نہیں، دوکاندار نے مجھ سے کہا تھا کہ بہترین باریک چاول آج آئیں گے۔ اس لئے اب لینے آیا ہوں۔''

ارے یہ بات مجھے معلوم ہوتی تو میں بھی آج ہی لیتا۔ میں نے پہلی کو ہی چاول لے لئے۔ اس وقت صرف موٹے چاول تھے یہاں۔''

''تو کیا مضائقہ ہے۔ آج بھی کچھ چاول لے لونا۔ بہت اچھے ہیں۔ کل دوکاندار نے نمونہ بتایا تھا۔''

''نہیں میں تو پورے مہینے کے لے چکا ہوں۔ آج شکر کے لئے آیا ہوں۔''

''اور ہاں، بہن یہ ڈپو والے ناپنے تولنے میں کتنی کمی کرتے ہیں۔ پرسوں چھوکرے کو بھیج کر پنیر شکر منگوائی تھی۔ گھر پر ناپ کر دیکھا تو برابر سیر بھر کم آئی۔ ناپنے سے اندازہ لگ جاتا ہے؟ شکر تول کی ایک سیر ناپ کی ایک پاؤ ہوتی ہے۔ برابر ایک سیر ناپ کی ایک پاؤ ہوتی ہے۔ برابر ایک پاؤ کم آئی۔ اس لئے آج میں ہی نکل آئی۔ دیکھوں گی کہ دوکان والا کم تولتا ہے۔ یا وہ چھوکرا ہی سیر بھر شکر مار بیٹھا تھا۔'' ایک عورت کہہ رہی تھی ''نہیں اس میں تمہارے چھوکرے کا کوئی قصور نہیں یہ ڈپو والے ہی ناپنے کے پاؤ سیر، اور تولنے کے ''بٹ'' چھوٹے رکھتے ہیں، میرے ہاں بھی شکر کم آئی۔

''ارے پھر بھی یہاں غنیمت ہے۔ بنگلور میں سنتے ہیں، ڈپو والے شکر میں سوجی ملا کر بیچتے ہیں۔'' ایک دوسری عورت بھی ان دونوں کی گفتگو میں شامل ہوئی۔

''یہ سب باتیں گورنمنٹ کو معلوم کرانا چاہئے۔ پھر پریس کس کام کے لئے ہے؟''

''بنگلور کے اخبار اس طرف توجہ دے رہے ہیں۔ میں نے یہ سوجی والی بات اخبار

ہی میں پڑھی تھی۔"

"جنگ کے پہلے ہم ہمیشہ روپے کے چھ سیر والے چاول کھاتے تھے، یہ موٹے چاول، میرے اللہ، بالکل کھائے نہیں جاتے۔ "چھڑبین" کے پکائیں تو کچھ غنیمت ہے۔ ایسے ہی بغیر پالیش کے کھائیں تو منہ میں لینے نہیں ہوتا۔ جیسے گھاس چبا رہے ہوں۔ پرسوں ہماری ماما چھٹی لے کر چلی گئی تھی۔ چھڑے ہوئے چاول ختم ہو گئے تھے۔ ہمارے گھر میں تو کسی کو "مسل" پکڑنا بھی نہیں آتا۔ مجبوراً ایسے ہی چاول پکائے اس دن۔ میں تو دن بھر بھوکی رہی۔"

ہاں اب تو مل میں بھی پالش نہیں کرا سکتے۔ کیا مصیبت ہے۔ گھر پر ہی چھڑ لیں تو دو ایک نوالے کھا سکتے ہیں"...... بھئی یہ لکڑی پر بھی کیا کنٹرول ہوا ہے۔ ہفتہ بھر کے لئے ایک روپے کی!" ایک اور صاحب کہہ رہے تھے۔ نہانا بھی میسر نہیں۔ مجھے ٹھنڈے پانی سے نہانے کی عادت نہیں۔ چار دن ہوئے نہا کے۔ ایسی بے چینی ہے۔"

"بھلے آدمی! تم نے بھی کنٹرول کا خوب اثر لیا۔ زیادہ کیوں نہیں منگوا لیتے۔ ہمارا نوکر دو تین جگہ سے ایک ایک روپے کی لکڑی جمع کر لیتا ہے۔ اچھی سرو کی لکڑی روپیہ کی سوا تین من ملتی ہے۔ خراب لکڑی سوا چار من۔ پھر کیا مزے سے دس بارہ من جمع ہو گئے۔ دو تین جگہ ہی کیا وہ ایک ہی جگہ پر ہفتہ میں دو تین [بار] جاتا ہے پھر بھی اسے لکڑی مل ہی جاتی ہے۔ کبھی کبھی دو ایک روپیہ کی لے آتا ہے۔ بھئی کنٹرول پر اتنی سختی سے عمل کرو تو بس خوب کام چلا۔ کل تمہارے نوکر کو ہمارے چھوکرے کے ساتھ بھیج دو۔ جتنی چاہئیں [چاہیے] لکڑیاں دلوا دوں گا۔

"شکریہ۔ بہت شکریہ............"

لوگوں کے ہجوم میں ہلچل سی پیدا ہوئی۔ ڈپو کے مالک مع اپنے عملے کے آ پہنچے تھے۔ قفل کھولتے ہوئے انہوں نے بیچ میں کھڑے ہوئے لوگوں سے ہنس کر کہا" آج

بہت ہی اچھے باریک چاول آئے ہیں لے لیجئے۔ ورنہ پھر پندرہ دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔ پھر ان لوگوں کے نوکروں کو اندر بلوا کر چاول تلوانے لگے۔ وہ لوگ جو تین چار گھنٹے سے بیٹھے انتظار کر رہے تھے منہ دیکھتے رہ گئے۔ کلثوم کی گز بھر لمبی زبان بھی بند تھی۔ ان لوگوں کے لئے پلّے پلّے چاول اور ٹین ٹین بھر شکر ناپتے ناپتے ایک گھنٹہ گذر گیا۔ قطاروں میں بے چینی پھیل گئی تھی۔ سب پہلو بدل کر پھر سے سنبھل کر بیٹھ رہے تھے۔ آخر قطاروں کی باری آئی۔ ایک ایک مرد اور عورت دروازے کے دائیں طرف سے اور بائیں طرف سے آگے بڑھتے تھے اور اپنی تھیلیوں، ٹوکروں، ٹینوں اور کپڑوں میں دو سیر، تین سیر، چار سیر چاول اور راگی لے لے کر دوسرے دروازے سے تیزی سے نکل کر جلدی جلدی قدم بڑھائے اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ کچھ تو اپنے میلے میلے تولئے اور لنگیاں ہی لیتے آئے تھے۔ اس کی ''پوٹلیاں'' باندھ کر کندھے پر لٹکائے، بغل میں دابے یا ہاتھ میں پکڑے بھاگے جا رہے تھے۔ انتظار ہی میں ان کا کتنا وقت جا چکا تھا۔ گھر میں بچے بھوکے تڑپ رہے ہوں گے۔ اب وہ بھاگ کر ہی چند منٹ تو بچانا چاہتے تھے۔

گورٓی پر اونگھ سی طاری تھی۔ جب آخری قطار کی باری آئی تو رامٓی نے اسے آواز دی۔ ''گورٓی!'' وہ چونک پڑی۔ دیکھا اب پانچ چھ آدمی ہی باقی تھے۔ ایک ہی جگہ اتنی دیر تک بیٹھے رہنے سے اس کے پاؤں سن ہو گئے تھے اور پیٹھ اکڑ کر تختہ سی ہو گئی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے اپنے پاؤں اوپر اٹھائے اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے پاؤں ہیں ہی نہیں۔ دو ایک مرتبہ جھٹکا دیا۔ تو جیسے تلوؤں میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ وہ پاؤں تھام کر پہلو بدلی ہی تھی کہ ریڑھ کی ہڈی میں ایک ناقابل برداشت ٹیس اٹھی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل ہی گئی تھی، لیکن وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر چپ ہو رہی۔

اب وہ پانچ چھ آدمی بھی اناج لے چکے تھے۔ ''اٹھ گورٓی تو ہی پہلے لے لے۔'' رامٓی بولی۔ گورٓی بہ مشکل اٹھی۔ اس کے کولھوں میں بہت درد ہو رہا تھا۔ کمر میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس میں کھڑے ہونے کی سکت بھی نہ تھی۔ دروازے تک پہنچتے ہی

اسے چکر آ گیا۔ اس نے بڑھ کر دروازے کی چوکھٹ تھام لی۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چھوکرے کے ہاتھ میں کوپن اور پیسے دے دیئے۔ ٹوکری نیچے رکھ کر اس نے وہ میلا سا کپڑا پھیلا دیا اور کمزور آواز میں بولی "ایک سیر چاول، چار سیر راگی۔" "ذرا زور سے بول۔" لڑکے نے ڈانٹ بتائی۔

"ایک سیر چاول، چار سیر راگی، کیا کان نہیں ہیں تیرے؟" رامی نے گوری کی حمایت کی۔ ایک لڑکے نے جلدی جلدی ایک سیر چاول ناپ کے کپڑے میں ڈال دیئے۔ لال لال موٹے چاول۔ گوری نے کپڑا چاروں طرف سے سمیٹ کے اس میں گانٹھ باندھی۔ اور ٹوکری اٹھائی ہی تھی کہ ایک صاحب شیروانی پہنے اپنے نوکر کو لئے اندر داخل ہوئے۔

"دو ہفتہ کے باریک چاول ذرا جلدی نپوا دیجئے۔" وہ کوپن دیتے ہوئے بولے "مہربانی سے جلدی کیجئے۔ ہم آج سینما جا رہے ہیں۔ بیگم کب سے تیار ہو بیٹھی ہیں۔ تانگہ لینے نکلا تھا کہ راستہ میں مسٹر یوسف مل گئے۔ انہوں نے کہا" آج ڈپو میں بہت اچھے چاول آئے ہیں۔ بند ہونے سے پہلے جلدی جا کر لے لو ورنہ ختم ہو جائیں گے۔ میں اسے لے کر یہاں چلا آیا۔ ذرا جلدی کیجئے۔ ساڑھے چھ ہو رہے ہیں۔"

"ہاں ابھی نپوائے دیتا ہوں۔ ارے ماڈیا وہ باریک چاول والا موٹا کھول!— آپ نے بہت اچھا کیا کہ آج ہی آ گئے۔ ورنہ کل دوپہر تک سب ختم ہو جاتے۔"

"رحیم تو جلدی جا کے تانگہ لے آ۔ تانگہ گھر پر چھوڑ کے پھر یہاں آنا۔" پھر وہ دوکان کے مالک کی طرف مخاطب ہوئے۔ "ذرا تکلیف کر کے اپنے ہی نوکروں سے......"

ارے اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ سندا تو اُن کے تھیلے کا منہ کھول کے پکڑ لے۔ ماڈیا ایک پچاس سیر چاول ناپ دے جلدی!"

"سرکار! پہلے اسے ایک چار سیر راگی ناپ دیجئے۔ اس کا سوامی گھر میں بیمار پڑا ہے۔" رامی نے التجا کی۔

"چپ رہ! جب دیں تب لے۔ ڈپو بند کرنے کا وقت کبھی کا ہو گیا تم لوگوں کو بھیج کر دروازہ بند کر دیتے تو ٹھیک تھا۔ ہم رحم کر کے ابھی تک سپلائی کر رہے ہیں۔ الٹا ہمیں پر حکم چلاتی ہے۔ دیکھتی نہیں ان صاحب کو جلدی چاہئے۔" سنیما جانا اس کے راموکی بیماری سے زیادہ اہم ہے! راموا اس کا راموکتنی دیر سے جاگ کر اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ صبح سے بھوکا، بھگوان! گوری کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

"لے اب ٹوکری پکڑ"— اس نے چونک کر ٹوکری آگے بڑھائی۔ چار سیر راگی ناپ کر ڈال دی گئی۔ راگی نے بھی جلدی سے اپنی چیزیں تلوالیں۔ اپنی ٹوکری کمر پر رکھ کے اس نے گوری کے ہاتھ سے بھی راگی کی ٹوکری چھین لی۔ "لا ادھر میں اٹھائے لیتی ہوں۔" اور وہ گوری کی ٹوکری سر پر رکھتی ہوئی بولی "چل" میں تجھے گھر تک پہنچا آؤں گی۔ گوری نے ایک ہاتھ میں چاول کی پوٹلی پکڑ رکھی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے راگی کا بازو تھام کر چلنے لگی۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ پاؤں من من بھر ہو رہے تھے۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

گھر آ گیا۔ راگی نے بھی اندر آ کر ٹوکری اتاری۔ گوری آتے ہی راموکے پاس گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ انتظار کر کے پھر سو گیا ہوگا۔ وہ اس کے سوتے میں ہی چلی آئی تھی نا۔ نہ جانے اس نے گوری کو گھر پر نہ دیکھ کر کیا خیال کیا ہوگا۔ سوچا ہوگا پھر مل چلی گئی ہے، پھر گوری نے دودھ کا لوٹا کھول کر دیکھا۔ دودھ کا لوٹا خالی دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔ راموں نے آخر دودھ تو پیا ہے۔

اُس نے آدھ پاؤ چاول جلدی جلدی چنے اور انہیں دھو کر چولھے پر رکھا۔ اُپلے اور اِدھر اُدھر سے لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور سوکھے پتے جمع کر چولھا جلانے لگی۔

"کیا پکا رہی ہے گوری؟" راگی نے پوچھا۔

"گیدہ، راگا!" "اُٹھ میں پکائے دیتی ہوں تو ذرا ستا لے۔"

"نہیں راگی! جب میں اپنے ہاتھ سے پکاتی ہوں تو وہ بہت چاہ سے کھاتے ہیں۔"

گوری نے شرما کر آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہے تو تُو ہی پکا لے۔'' رامی زیرِ لب مسکرا کر گوری کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''بھگوان یہ پیرت (پریت) کی جوڑی سلامت رکھے۔ تیری پوت بنگڑی، ہمیشہ بندھی رہے۔ تم دونوں کو خوس دیکھ کر ہماری آنکھوں میں ٹھنڈک پڑتی ہے'' ....

''رامی! تیری بچی کو ذرا دوکان بھیج کر ہری مرچ، کوتھی میر، پودینہ منگا کر بھیج دے وہ اپنے پلّو کی گانٹھ کھول کر ایک آنہ دیتے ہوئے بولی۔

''اچھا ابھی بھجوا دیتی ہوں۔'' رامی چلی گئی۔

گیدہ پک گیا۔ گوری پسینہ پسینہ ہوگئی تھی۔ دن بھر کی تکان اور چولھے کی گرمی! آج اُسے کتنی تکلیف پہنچی تھی۔ اُس نے عمر بھر ایسی تکلیف نہ اٹھائی ہوگی۔ گیدے کی ہانڈی اتارتے ہوئے اس نے رامو کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ رامو چپ چاپ آنکھیں کھولے اسے پکاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے مٹی کے کٹورے میں تھوڑا سا گیدہ نکالا اور رامو کے پاس لیجا کر رکھ دیا۔ رامو گیدے کی سوندھی سوندھی خوشبو سونگھ کر اٹھ بیٹھا۔ نوالہ منہ میں رکھتے ہی رامو کی باچھیں کھل گئیں۔ ''کیسا مجے دار پکا ہے گوری! سچ اہا۔ تیج تیج۔ سوندھا سوندھا'' وہ مزے لے لے کر کھانے لگا۔ گوری ایک کٹورے میں پانی لے آئی۔ ''تو بھی بیٹھ جا گوری'' رامو نے پیار سے کہا۔ گوری کہہ دیتی ''نہیں پہلے تم کھالو، تو کھاؤں''۔ لیکن آج اُسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ ایک مٹی کے برتن میں گیدہ لئے وہ بھی رامو کے پاس آبیٹھی۔ گیدہ کھا کر رامو کے جسم میں طاقت عود کر آتی تھی۔ اس نے محبت بھری نگاہیں گوری کے چہرہ پر جمادیں اور اس کی کلائی پکڑ کر بولا ''میرا کتنا کھیال رکھتی ہے...... کیسی اچھی ہے میری رانی! رامو کی وہ نگاہ اس کی دن بھر سہی ہوئی تکلیف کا گویا صلہ تھی۔ گوری ایک لمحہ کے لئے اپنی ساری تکلیف بھول گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دن بھر فاقہ کی ہوئی تکان سے چُور غریب مزدورن نہیں ہے بلکہ سچ مچ کی رانی ہے رانی!

●●●

شکست

باہر سرد ہوا چل رہی تھی اور ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑ رہی تھی۔ بوڑھا اپنی جھونپڑی میں بیٹھا ٹھٹھر رہا تھا۔ اُس کے من پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ گہری اُداسی! جھونپڑی کی نمی اس اداسی میں اضافہ کر رہی تھی۔ سیلی چھت، گیلی گیلی دیواریں، مٹی کے فرش کی نمی اور تنہائی! کبھی ایسی ہی سرد شامیں کیسے مزے میں گذر جاتی تھیں۔ وہ دونوں آنگن میں بیٹھے آگ تاپا کرتے تھے۔ پھر وہ اندر آ کر کمبل اوڑھے لیٹ جاتا۔ اس کی بیوی چولھے پر پانی چڑھا کر اس کے پائنتی آ بیٹھتی۔ اور اس کے سردی سے اکڑے ہوئے پاؤں آہستہ آہستہ دباتی۔ وہ بہت آرام محسوس کرتا۔ اس کے پاؤں گرم ہونے لگتے۔ اینٹھن کم ہو جاتی۔ میٹھا میٹھا سا درد رہتا۔ وہ بہت دیر تک بیٹھی پاؤں دباتی رہتی۔ ''اب چھوڑ بھی مجھے تو آرام ہو گیا۔ اب تیرے پاؤں دبا دوں۔'' وہ اُٹھ بیٹھتا۔ وہ لپک کر اس کے ہاتھ پکڑ لیتی۔ ''ارے کیا غضب کرتے ہو۔ گنہگار بناتے ہو مجھے۔'' اور جلدی سے چولھے کی طرف کھسک جاتی۔ پتلا رالہ تیار کر کے دو مٹی کے پیالوں میں لے آتی اور وہ دونوں اپنی بیٹیوں، نواسے، نواسیوں کی باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ رالہ پینے لگتے۔ ٹھنڈ میں یہ گرم گرم رالہ پیتے ہوئے انہیں بہت لطف آتا تھا۔ گھونٹ حلق سے اترتے ہی سینہ میں خون گرم ہو جاتا۔ رگ رگ میں گرمی سرایت کر جاتی۔ پھر وہ ہنڈی برتن دھو دھا کر قرینے سے ''اٹھالے'' پر جوڑ دیتی۔ اور آپ کمبل اوڑھ کر پڑھ رہتی۔ وہ کتنی پھرتی سے کام کرتی۔ کیسی چھریری چست بدن کی تھی۔

تین بڑی بڑی بیٹیوں کی ماں جوان لگتی تھی۔ اس کی عمر بھی کون سی گئی تھی۔ دو بیس سے کچھ کم ہی۔ بیٹیاں گیارہ برس میں بیاہ دی گئیں۔ اس لئے اتنی جلد نواسوں نواسیوں والی ہوگئی۔ اسے اپنے سہاگ کا بہت خیال تھا۔ اس کے سامنے ہمیشہ بن سنور کر رہنا پسند کرتی تھی۔ بوڑھے کی آنکھوں میں اس کی تصویر پھر گئی۔ ہاتھوں میں چاندی کی پہونچیاں، ہری ریشم کی چوڑیاں، گلے میں ہنسلی، ناک میں تین نگینوں کی نازک سی "چاندنی"۔ اس پتلی ناک پر کیسی بھلی لگتی تھی۔ یہ "چاندنی" اس نے آخری دنوں بہت چاہ سے بنوائی تھی۔ ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہنے رہتی تھی۔ باریک سوسی کا لہنگا چھینٹ کی سفید میدان والی دامنی اور ہلکے رنگ کی چولی۔ دلہن سی لگتی تھی۔ بیگم اسے رم جھم رم جھم دلہن کہا کرتی تھیں۔ "کیوں فخرو میاں تمہاری رم جھم رم جھم دلہن بہت دنوں سے نہیں آئی۔ تمہاری گھر والی یہاں آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے فخرو میاں جیسے کوئی چھوکری پاؤں میں پازیب پہنے چھم چھم کرتی چلی آرہی ہے۔ سچ فخرو میاں مجھے تو یقین نہیں آتا کہ وہ اتنی بڑی بیٹیوں کی ماں ہے۔" بیگم اچھے دل کی عورت تھیں لیکن پھر بھی جب کبھی خان صاحب کے گھر کا خیال آتا، اسے نفرت محسوس ہوتی۔ اس گھر میں اس کی عزت پر حرف آیا تھا۔ وہ چھ سال ان کے ہاں کام کرتا رہا۔ وہ آفس کا نوکر تھا۔ انہیں کیا حق تھا کہ گھر کا کام لیں۔ لیکن وہ کبھی گھر کا کام بھی کرتا۔ انہوں نے اسے نہیں پہچانا۔ اسے جھوٹا کہا۔ وہ غریب سہی لیکن اپنی بات کا پکا تھا۔ اتنے بار کہنے پر بھی وہ اسے جھوٹا مانیں۔ اس کا دل جل اٹھا تھا، پھر اسے گالی دی، یہ تو حد تھی، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی طرف سے اسے رزق ملتا تھا۔ ان کا نمک کھایا تھا۔ لیکن اس کے صلے میں کیا وہ دابتا نہیں تھا۔ دن بھر تو کام پر جُتا رہتا تھا۔ ان کا کوئی احسان تو اُس پر نہیں تھا پھر انہیں کیا حق تھا کہ اسے گالی دیں؟ صرف اس بنا پر کہ وہ غریب تھا۔ بے بس تھا۔ اور وہ کچھ مالدار ہونے کی حیثیت سے اس سے اونچے تھے۔ انہیں گالی دینے کا حق حاصل ہوگیا تھا۔ وہ اسے نیچ کیوں سمجھتے تھے؟ "نسلِ حرام" کیسی گالی! اس کے رگوں میں شریفوں کا خون تھا۔ وہ اتنی ذلت سہہ کر وہاں نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اسی وقت تنخواہ لئے وہاں سے چلا آیا۔ پھر

وہ کبھی ان کے گھر نہیں گیا۔ گو بیگم نے کئی دفعہ بلوا بھیجا تھا۔ ہاں وہ ان کی بیٹی ثریا کے ہاں کبھی کبھی جاتا تھا۔ ثریا بیٹی اسے بہت عزیز تھی، ان دنوں وہ اسے کندھوں پر بٹھائے پارک لے جایا کرتا تھا۔ یا بازار کی سیر کرا لاتا۔ بچی بھی اس سے لگ گئی تھی۔ ''چاچا، چاچا'' کہتی گود میں آ بیٹھتی اور اس کی...... چھدری داڑھی کے بال نوچنے لگتی۔ کیسی ننھی سی تھی اس وقت۔ اب وہ خود دو ننھے بچوں کی ماں بن گئی ہے۔ اب بھی وہ اس سے بہت اچھا سلوک کرتی تھی۔ ہنس کر بڑے اخلاق سے اس سے باتیں کرتی تھی۔ جب وہ اپنا دکھڑا بیان کرتا تو بچی ہمدردی سے سنتی تھی۔ اس لئے کبھی کبھی وہ دو گھڑی اس کے ہاں بیٹھ آتا۔ ثریا بیٹی اسے پہچانتی تھی۔ اسے انسان سمجھتی تھی۔ خان صاحب کے گھر میں ہی اسے چائے کی لت پڑی تھی۔ یہ منحوس لت جس نے اس کی بیوی کی تو جان لے کر چھوڑی تھی۔ وہ خان صاحب کے گھر میں کبھی کھانا نہ کھاتا تھا۔ اس کی تنخواہ ''خشک'' تھی۔ لیکن عیدوں میں اور کسی دن بیگم اصرار کرتیں ''یہیں کھا لو فخرو میاں''۔ تو وہ کئی بہانے بتا دیتا۔ اس کے کام کے لئے روپے مل جاتے تھے۔ وہ ان کے گھر کھانا بھی کیوں کھائے۔ اپنے گھر کی ''آش انبیل'' غیروں کے گھر کے پلاؤ سے بہتر ہے۔ البتہ ان کی خاطر سے اس نے دو ایک دفعہ چائے پی لی تھی۔ ''دھوپ میں پھر پھرا کے آئے ہو چائے تو پی کر جاؤ'' بیگم کہتیں۔ چائے کی ایسی ''طلب'' ہو گئی تھی کہ وہ گھر پر بھی چائے بنا کر پیتا۔ تین تین چار چار بار پیتا اور اسے بھی پلاتا۔ اسے شکر کی بیماری ہو گئی تھی۔ وہ سوکھتی چلی گئی تھی۔ بیماری کے دنوں میں بھی اس کی خدمت کیا کرتی تھی۔ وہ روکتا پھر بھی نہ مانتی۔ ''تمہاری خدمت سے میرا جی نہیں بھرا۔'' وہ کہتی ''ذرا آرام کر نیک بخت میں یہ کام کرلوں گا۔ ایسی تکلیف میں کاہے کو اتنا کام کرتی ہے، میں کردوں گا'' وہ اس کے ہاتھ پکڑ لیتی۔ ''ارے بس تم جا کر چپ بیٹھ رہو۔ تب ہی مجھے چین رہتا ہے۔ تمہارے دم سے سب کچھ ہے۔ وہ آنچل پھیلا کر دعا کرتی ''اللہ پاک مجھے تمہاری آنکھوں کے سامنے ہی اٹھا لے''۔ وہ ایسی ہی چلی گئی۔ اللہ نے اس کی دعا سن لی۔ وہ تو چین سے سو گئی۔ وہی تکلیفیں اٹھانے کے لئے تنہا رہ گیا ہے۔ اس وقت اس کی کتنی ضرورت

تھی اسے۔ وہ اتنا بوڑھا ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ بیٹیاں تو اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ وہ تھکا ماندہ گھر لوٹتا تھا تو وہ ہر طرح اس کی خدمت کرتی تھی۔ دلجوئی کرتی تھی لیکن اب جبکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ تھکا ہوا لوٹتا تھا۔ درد سے اس کا انگ انگ ٹوٹتا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دکھ درد میں کام آنے والی کہاں تھی؟ بوڑھا گھٹنے جوڑے آگے کو جھک کر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُبل آتے اور دو تین بوندیں ٹپ ٹپ گر کر فرش کی مٹی میں جذب ہو جاتیں۔ ہوا اور بھی زوروں سے چلنے لگی تھی۔ سرد جھونکے جھونپڑی میں گھس آتے۔ ان کی خنکی اس کی ہڈیوں میں اتر جاتی۔ ہڈیوں میں ٹیسیں اٹھتیں اور وہ کپکپا اٹھتا۔ آنسو پونچھ کر وہ اٹھا۔ چولھے میں دو اوپلے رکھے۔ اوپر سے سوکھی ٹہنیاں اور دیا سلائی جلا کر پکڑی۔ ٹہنیاں آہستہ آہستہ سلگنے لگیں۔ اور وہ ہتھیلیاں پھیلا کر آگ تاپنے لگا۔ ایک دم ہوا زور سے چلی اور رُک گئی۔ دھواں دھار مینہ برسنے لگا۔ ایک طرف چھت ٹپکتی تھی۔ پھوس کی چھت تھی۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ ایسی ہوا میں اُڑ نہیں گئی۔ بوڑھا برتن، تھیلے، ہانڈیاں، بوریے وغیرہ نکال کر سوکھی جگہ رکھنے لگا۔ باہر سے کوئی دوڑ کر آیا اور دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ وہ برتن چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا، اور دروازے کی طرف مڑ کر دیکھنے لگا۔ کون ہوگا اتنی برسات میں؟

"دروازہ کھولو بھکرو دادا۔ میں ہوں جورا!"

بوڑھے نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ آنے والے نے سر پر سے پھوس کا ایک گٹھا اتار کر نیچے رکھا۔ "کل بڑی تائی کہہ رہی تھیں دادا تمہاری چھت ٹپکتی ہے۔ پرسوں جوز ور کی آندھی آئی تھی۔ اس میں ہماری ایک طرف کی چھت صاف اڑ گئی۔ کیا کریں دادا۔ آج کل چارہ بھی اتنا مہنگا ہے۔ خیر ہوئی دو روز سے صرف بوندا باندی ہو کر چھوٹ گئی۔ زور کی برسات ہوتی تو کیا حالت ہوتی۔ آج میں نے کچھ کمایا تو آتے آتے بازار سے پھوس بھی لیتا آیا۔ آ کر چھت جمائی۔ کچھ پھوس بچ رہا تو سوچا دادا کے گھر دے آؤں۔" وہ اپنی قمیص کا دامن جھٹک جھٹک کر سکھا رہا تھا۔

''آؤ یہاں سکھالو اور آگ بھی تاپ لو۔''

بوڑھے نے کچھ ہٹ کر چولھے کے سامنے اس کے لئے جگہ بناتے ہوئے کہا۔ چولھے میں اِدھر اُدھر چھوٹے چھوٹے شعلے اٹھ رہے تھے۔ سب شعلے لپک کر مل گئے اور آگ بھڑک اٹھی۔ نوجوان بوڑھے کے بازو آ بیٹھا اور آگ تاپنے لگا۔ اتنی برسات میں کیوں آئے بیٹا؟ کل صبح لے آتے۔'' ''نہیں دادا ایسے زور کی برسات پڑ رہی تھی، ساری جھونپڑی بھیگ جاتی تو تم رات کیسے گذارتے؟ یہ سوچ کر چلا آیا۔ اور جلدی ہی آتا پر کیا کروں ہماری چھت ''چھانا'' تھا۔ ایک طرف کی پوری چھت اڑ گئی تھی دادا۔ شام سے چڑھ بیٹھا ہوں۔ اب کہیں ختم ہوا چھانا۔ ختم ہوتے ہی پھوس لے کر یہاں چلا آیا۔ کیا ہوا دادا میں زیادہ تو نہیں بھیگا۔ کونسی دور سے آیا ہوں۔ یہیں پڑا ہے ہمارا گھر دو قدم پر!''

''پھر بھی بیٹا۔ تمہیں خیال رکھنا چاہئے ایک تھیلا ہی اوڑھ آتے۔ ابھی جان جوان لڑکے ہو۔ ہمارا کیا اب رہے اب گئے۔''

''میرا بھی اس دنیا سے جی بیزار ہو گیا ہے دادا۔''

''نہ، نہ ایسا کیوں کہتے ہو بیٹا۔ اللہ تمہاری حیاتی بڑی کرے۔''

''کیا کروں دادا، گھر والی تو بستر پکڑ کر رہ گئی۔ جب سے یہ بچی ہوئی ہے۔ وہ اٹھنے بھی نہیں پائی۔ ایسی اولاد ہونے سے نہ ہونا بہتر۔ ماں کی جان لینے پیدا ہوئی۔ بڑی جان سلامت رہے تو کئی بچیاں ہو سکتی ہیں۔ اور بچی بھی کیسی مریل، سدا کی روگی۔''

''بیچ میں پوچھنا ہی بھول گیا۔ کیسی ہے، بہو۔''

''ویسی کی ویسی ہی ہے دادا مجھ سے تو اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔'' ''غفلت نہ کر بیٹا! بہو کی کچھ دوا دارو کر، جب گھر والی نہ رہے تو گھر کی رونق بھی گئی۔ اسی کے دم سے سب کچھ ہے بیٹا۔

''ہاں دادا، روز یہی چنتا لگی رہتی ہے۔ میرا تو سکھ چین اڑ گیا۔ کیا کروں کھانے پینے تک کی تکلیف تھی۔ کبھی سارا دن بھوکے رہ جاتے۔ دوا کے لئے پیسے کہاں سے آتے

دادا؟ لیکن آج میں نے بہت کمایا ہے دادا۔ ایک دو مہینے ایسی ہی کمائی رہی تو بس اس کا پورا علاج کرا دوں گا۔ تمہاری دعا سے اچھی ہو جائے تو...... دعا کرو دادا۔"

"ضرور بیٹا، بوڑھے نے رومال کی گانٹھ کھول کر دو آنے نکالے۔" یہ لے" جورا کسی دھیان میں محو تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر ہاتھ بڑھا کر لے لیا۔ پھر اس نے مٹھی کھول کر دیکھی "ارے یہ کیا دادا؟" "کچھ نہیں بیٹا، بچی کو مٹھائی کھلا دے میری طرف سے، آج کل پھوس اتنا مہنگا ہے تو تو اتنا بہت اٹھا لایا ہے۔"

"نہیں دادا یہ اپنے پاس ہی رکھو۔ ہمیں بھی کبھی کسی چیز کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ ایسے وقت میں تمہارے ہاں سے مانگ لے جائیں گے۔ تم قیمت چکانے لگو تو تمہارے پاس سے کچھ مانگنے کو ہمارا جی کیسے ہوگا؟ پڑوس والے ایک دوسرے کے کام نہ آئے تو — ہاں دادا میں تو باتوں میں بیٹھ گیا۔ کہاں ٹپکتی ہے چھت؟ میں ابھی چھا دیتا ہوں۔" وہ اٹھنے لگا۔

"ارے بیٹھ بیٹا جورا۔" بوڑھے نے کہا۔

"تو کیا چھائے گا چھت، میں چھاؤں تو دیکھنا ایک برس تک ہلے گی بھی نہیں۔" یہ نہیں کہ بوڑھا چھت چھانے میں ماہر تھا۔ اس نے یوں ہی یہ بات کہہ دی وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے کسی پر بار ہو۔ وہ حتی الامکان اپنا کام آپ ہی کر لیا کرتا تھا۔ جب اس کے ہاتھ سے کوئی کام ہو سکے تو وہ خواہ مخواہ کسی کا احسان کیوں اٹھائے۔ اگر وہ دوسروں پر بھروسہ کرتا رہے اور اپنا کام انہیں کرنے دے تو وہ بہت جلد محتاج ہو جائے گا۔ اور وہ آخری دم تک کسی کا محتاج ہونا نہیں چاہتا تھا۔

"نہیں دادا بہت مضبوط چھا سکتا ہوں دیکھو گے۔" وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ "ارے بیٹھ بیٹا تجھ سے بہت ضروری بات پوچھنی ہے۔ اب تو بارش بھی تھم گئی۔ اب چھانے کی کیا ضرورت۔ کل چھا لیں گے۔" جورا بیٹھ گیا۔ "کیا بات ہے دادا۔"

ابھی تو کہہ رہا تھا نا آج تو نے بہت کمایا ہے۔ تیری تائی تو کہتی تھی تو بہت دنوں سے بیکار ہے۔ اب کیا کام ہاتھ لگا۔"

محلہ میں لکڑی کی ڈپو کھلی ہے۔ دادا تمہیں معلوم نہیں اب تک؟ ارے ڈپو کیا کھلی ہم گریبوں کے نصیب کھل گئے۔ خوب پیسے ملتے ہیں۔ ڈپو کھلے تین چار دن ہوئے اب سارے محلے کے جوان وہیں ٹوٹ پڑتے ہیں۔ کتنوں نے اس کا فائدہ دیکھ کر اپنی نوکریاں چھوڑ دیں اور وہیں جانے لگے اور سب کو کام ملتا ہے دادا۔ یہ نہیں کہ ایک کو کام ملے اور دوسرا منہ دیکھتا رہ جائے کتنے بھی آدمی جائیں سب کو کام مل جاتا ہے۔"

"کہیں اگر پیسے زیادہ ملتے ہوں تو محنت بھی زیادہ ہوگی نا؟ ڈپو کی منوں لکڑیاں پھاڑنا ہوں گی جب جا کر ڈپو کا مالک پیسے دے گا؟"

"نہیں دادا پیسے زیادہ ملتے ہیں اور کام کم ہوتا ہے۔ پہلے ایک گاڑی لکڑی چیریں تب جا کے کہیں ایک روپیہ ہاتھ آتا تھا۔ لیکن اب ایک روپے کی لکڑی پر تین آنے دیئے جاتے ہیں۔ اگر باریک چیریں تین آنہ اور موٹی چیریں تو ڈھائی آنہ۔ اور پھر گھر تک اٹھالے جانے کی مزدوری الگ۔ ایک روپیہ کی لکڑی پر دو آنے کے حساب سے خوب ملتا ہے۔ ہم ڈپو کے لئے لکڑی نہیں پھاڑتے دادا۔ اس کے لئے علیٰحدہ مزدور ہیں۔ پر ڈپو سے چری ہوئی لکڑیاں کون لیتا ہے دادا۔ اتنی مہنگی پڑتی ہے۔ روپے میں صرف سوا دو من کندے روپے میں، سرو کی لکڑی ہو تو سوا تین من۔ معمولی لکڑی ہو تو ساڑھے چار من ملتے ہیں۔ اس لئے سب کندے ہی خریدتے ہیں۔"

ایسا ہے تو کل تمہارے ساتھ چلوں گا بیٹا۔ کتنے دنوں سے کام کے لئے مارا مارا پھر رہا ہوں۔"

"تم چلو گے دادا، اتنی سخت محنت کا کام کر سکو گے؟"

"کوشش کروں گا بیٹا۔ میں بوڑھا ہوں تو کیا "گھٹ مٹ" ہوں۔ سدا محنت کرتا رہا۔ اسی لئے تو بدن ڈھیلا نہیں پڑا۔ میں پہلے بھی کام کر چکا ہوں بیٹا۔ کون سا کٹھن کام ہے جو میں نے نہیں کیا۔ لکڑیاں پھاڑیں، ٹیشن میں قلی بن کر کام کیا، جب خان صاحب کے ہاں تھا کڑی دھوپ میں میلوں پھرنا پڑتا تھا۔ کبھی میں بھی سکھ چین سے رہا کرتا تھا۔"

بوڑھے نے ایک سرد آہ بھری۔ ''گائیں بھینسیں تھیں دودھ پر گذر ہو جاتا تھا۔ سیروں دودھ دیتی تھیں۔ گھر والی گھر کے لئے بھی دودھ رکھ لیتی، چھاچھ دہی بناتی۔ مکھن نکالتی، بال بچے زیادہ ہو گئے تو نوکری کرنی پڑی لیکن خان صاحب کے گھر سے نکلا تو پھر نوکری نہیں کی۔ گھر والی کہتی، ایسے محنت کا کام کیوں کرتے ہو، کہیں نوکری کرلو کتنے ہی آدمی آکر کہتے فلاں گھر میں نوکر کی ضرورت ہے، پر میں نہیں گیا۔ پھر کسی کی غلامی کروں یہ نہیں ہو سکتا۔''

''بڑے ہمت والے ہو دادا تم۔ اتنے بڑھاپے میں بھی آپ ہی کما کر کھاتے ہو۔ تائی ماں کہتی ہیں تمہاری تین بیٹیاں ہیں۔ کوئی بیٹا نہیں دادا؟''

''کوئی بیٹا ہوا ہی نہیں، میرے نصیب! تینوں کے تینوں بیٹیاں، ان میں سے ایک تو مر گئی۔ ایک ہوسلی کو دی گئی ہے۔ دوسری یہیں رہتی ہے منڈی محلہ میں۔''

''تب تو بیٹی کے ہاں کیوں نہیں جاتے دادا؟ یہ تمہارے کمانے کے دن ہیں؟''

بوڑھے نے سر ہلایا ''میں جیتے جی کبھی کسی پر بار بن کر نہیں رہوں گا۔ میرے بیٹا بھی ہوتا تو اس کی کمائی پر پڑ رہنا میں مناسب نہ سمجھتا۔ بیٹی کے ہاں پڑ رہوں، داماد کے ٹکڑوں پر۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ جب تک ان ہاتھوں میں دم ہے خود کما کر کھاؤں گا...... اللہ! ایسی موت دے کہ آخری دم میں بھی کسی کا محتاج بن کر بستر میں نہ پڑ رہوں۔ بس بیٹھے بیٹھے موت آجائے۔ ہر دم یہی دعا ہے بیٹا۔''

ہاں دادا، ایشور ہر کسی کو ایسی موت نصیب کرے''۔ جورا بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اٹھتے ہوئے کہا ''بہت دیر ہو گئی جاتا ہوں دادا۔ گھر والی راہ دیکھ رہی ہوگی۔''

''اچھا بیٹا۔''

آگ تاپ کر بوڑھے کا جسم اب گرم ہو چکا تھا۔ اُس کی اداسی دور ہو چکی تھی۔ اُٹھ کر اپنی کلہاڑی ڈھونڈنے لگا۔ اب وہ خوش تھا کیونکہ وہ کل کام پر جائے گا۔ بہت دنوں سے بیکار تھا۔

اس کی جمع کی ہوئی پونجی سے بھی اسے خرچ کرنا پڑا تھا۔ وہ ان دنوں دن میں صرف

ایک مرتبہ کھاتا تھا۔ ایک گولاہٹ یا چاول کی ایک روٹی اور چٹنی، پھر بھی اس کی پونجی آہستہ آہستہ کم ہوتی آرہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے آج ایک پیسہ کل ایک پیسہ بچا کر یہ پونجی جمع کی تھی کہ اس کے آخری دنوں میں کام آئے۔

جب اس کے ہاتھ پاؤں میں طاقت نہ رہے اور کمانے کے قابل نہ رہے تو وہ بیٹی کو یہ روپیہ دے گا اور اس کے گھر رہے گا۔ بیٹی جو کچھ پکائے گی اُسے بھی کھلا دے گی۔ وہ اپنے بوڑھے باپ کی خوشی سے خدمت کرے گی۔ اُسے خوشی سے کھلائے گی لیکن اس پر اس کے خرچ کا بار کیوں پڑے اور یہ روپیوں کی پوٹلی اس کے ہاتھ دیدے گا۔ بس اسے اور کتنے دن جینا ہے۔ باقی عمر کے لئے یہ پونجی کافی ہوگی۔ اس نے اپنی تجہیز و تکفین کے لئے بھی بیس روپے الگ کر رکھے تھے۔ اسی پونجی میں سے بہت سا روپیہ خرچ ہوگیا تھا۔ اب جب وہ خوش تھا کہ اگر جورا کے کہنے کے مطابق اتنا مل جاتا ہے تو وہ کھاپی کر بہت کچھ بچا سکے گا۔ کلہاڑی ایک کونہ میں تھیلیوں کے نیچے پڑی مل گئی۔ اس نے کلہاڑی پاس ہی رکھ کر بوریا بچھایا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ رہا۔

صبح اٹھ کر کلہاڑی خوب گھس گھس کر تیز کی۔ اور جورا کے گھر کی طرف چل پڑا۔ جورا بھی ابھی ابھی ناشتہ کر کے کلہاڑی لئے باہر نکل رہا تھا۔ ''چلیں گے دادا؟'' وہ باہر آتے ہوئے بولا۔ دونوں خاموش چلتے رہے۔ ڈپو دور نہ تھی۔ جلد ہی مل گئی۔ ''ابابا کتنے لوگ ہیں بیٹا''۔ بوڑھے کی آنکھیں تعجب سے کھل گئیں۔

''تو کیا عورتیں بھی آتی ہیں؟'' ہاں اور ان کا بہت لحاظ رکھا جاتا ہے۔ پہلے ان کے لئے لکڑی تول دی جاتی ہے۔ ان کا نمبر بعد کا ہو تو بھی — پر عورتیں بہت کم آتی ہیں۔ پرسوں کی بات ہے کہ ایک عورت بھی آگئی۔ دوکاندار نے اُسے روک کر کہا ''ذرا ٹھہرو پہلے ان مائی کو دے دوں۔ عورتوں کا کام پہلے چکا دینا چاہیے۔'' اس آدمی نے چڑ کر کہا ''اچھا ایسا ہے تو ہمیشہ میں اپنی جورو کو ہی بھیجا کروں گا۔'' ایسا قہقہہ پڑا۔

اب وہ ڈپو کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ دوکان کے سامنے بیچ میں لوگ قطار

باندھے کھڑے تھے۔ اپنے اپنے نمبروں کے مطابق دائیں طرف لکڑی تولنے کی بڑی ترازو تھی اور ڈپو کے نوکر تول رہے تھے۔ دوسری طرف لکڑی اٹھالے جانے والوں اور چیرنے والوں کی ٹولی کھڑی تھی۔ وہ دونوں جا کر اس میں شامل ہو گئے۔ جب کسی کا نمبر پکارا جاتا وہ آگے بڑھ کر کوپن اور نمبر دیتا۔ اس کے لئے لکڑی تول دی جاتی۔ غریب ہو تو آپ ہی اٹھالے جاتا۔ غریب خریدتا بھی کتنی کوئی آٹھ آنے کی۔ بڑے آدمیوں کے نوکر بھی آتے تھے، تلوا کر آپ ہی اٹھالے جاتے اور کچھ مزدوروں کے سر پر ڈھلوا دیتے۔ وہی آتے تو سب لکڑی مزدوروں سے اٹھوا کر پہنچا دیتے اور بوڑھا ان سے لکڑی اٹھالے گیا۔ ایک دفعہ وہ بہت تھک گیا تو جورانے اس کے لئے تین آنے پر ڈپو کی گاڑی بات کی۔ یہ ایک چھوٹی سی گاڑی تھی جس میں چند من لکڑی ڈال کر ایک آدمی کھینچ سکتا تھا۔ ایسا ہی اُس نے پہلے دن تین روپیہ کمائے۔ اتنے دن بیکار رہنے کے بعد ایک دم تین روپے ہاتھ لگیں۔ وہ بہت خوش ہو گیا اور اس نے سوچا کہ ضرور اپنی بیٹی کے ہاں جا کر نواسے اور نواسیوں کو دیکھ آؤں گا۔ اور ثریا بیٹی کے ہاں بھی جاؤں گا۔ وہ سن کر بہت خوش ہو گی۔ اس کی بیکاری کا حال سن کر کتنا افسوس کرتی تھی۔

دوسرے روز اس نے چار آنے کے موتی چور لڈو لئے اور بیٹی کے ہاں گیا۔ بیٹی نے بوریا بچھا کر اُسے بٹھایا اور شکایت بھرے لہجے میں کہنے لگی "تم تو آتے ہی نہیں بابا۔"

"آتا تو ہوں بیٹی۔ پرسوں سے ذرا طبیعت خراب تھی۔"

"طبیعت خراب تھی۔ یہاں کیوں نہیں چلے آتے بابا۔ وہاں تمہیں دیکھنے والا کون ہے؟ خدا نہ کرے کہیں بیمار ہو جاؤ تو! کوئی کیا کہے، کیسی بیٹی ہے۔ بڑھاپے میں باپ کو یوں چھوڑ رکھا ہے۔"

وہ دونوں نواسوں کو گود میں بٹھائے لڈو کھلا رہا ہے۔ اس کی بیٹی کپڑا بچھا کر کھانا نکالنے گئی۔ "میں کھانا گھر پر کھا آیا ہوں۔"

"جاؤ بابا تم تو ہمارے گھر کھاتے بھی نہیں ہمیشہ کچھ نہ کچھ بہانا بناتے ہو۔ دیکھو آج

تمہاری خاطر مچھلی پکائی ہے۔ کل ہمارے پڑوس والے تالاب میں مچھلیاں پکڑنے جا رہے تھے۔ میں ان سے بولی ''تم بھی جا کر دو ایک مچھلیاں پکڑ لاؤ۔ بابا بڑی چاہ سے کھاتے ہیں۔ ابھی سالن پک کر تیار ہوا ہے۔ بچے کو تمہارے گھر بھیجنے ہی والی تھی تم ہی آ گئے۔ آؤ بابا کھالو۔'' وہ سالن کا کٹورا دسترخوان پر رکھتے ہوئے بولی۔

وہ آج انکار نہ کر سکا۔ وہ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا تھا۔ ''میں گھر پر کھا آیا ہوں۔ پیٹ اتنا بھر گیا ہے کہ اب اور کھانے کی جگہ نہیں۔'' کبھی یہ کہہ کر ٹال جاتا۔ ''مجھے سگٹے کی مچھلی کا سالن پسند نہیں بیٹا۔ کبھی کریلا پکائے تو دیکھو ضرور کھاؤں گا۔'' وہ کریلا پکا کر بھیجتی تو کوئی اور بہانا۔ ایک وقت کا کھانا کبھی کھالے تو کیا ہوا۔ لیکن وہ بھی غریب تھے۔ ایک وقت کا ایک آدمی کا کھانا کیا مفت میں آ جاتا ہے۔ اگر بیٹا ہو تو بات الگ تھی۔ ''جنوائی'' کے ہاں کھانے کو وہ شرم کی بات سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ بہانہ بنا دیتا۔ بہت ہوا تو کبھی آپ ہی مچھلیاں پکڑ لاتا۔ ''لے پکا دے بٹیا، تو مچھلی کا سالن بڑا مزیدار پکاتی ہے۔'' اور جب پک چکتا تو ضرور وہاں کھالیتا۔ ''دیکھو بٹیا میں نہیں کھا رہا ہوں کیا تیرے گھر۔'' کبھی بیٹی اس کے انکار سے بہت رنجیدہ ہو جاتی تو دو ایک نوالے نام کو کھالیتا۔ لیکن جاتے وقت بچوں کے ہاتھ میں دو چار آنے رکھ دیتا۔ یا بیٹی کے لئے سات آٹھ آنے والی سستی چھینٹ کی چولی کے لئے پونہ گز لے آتا۔ اس سے اس کے دل کو اطمینان ہو جاتا کہ اس نے معاوضہ ادا کر دیا ہے۔

''آج یہیں ٹھہر جاؤ بابا، کل چلے جانا۔'' بیٹی نے جوٹھے برتن اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''بس پانچ منٹ بیٹھ کر چلے جاتے ہو۔ دو ایک دن ٹھہرتے بھی نہیں۔'' داماد نے بھی اصرار کیا ہے۔ بوڑھا لوٹا لئے باہر صحن میں ہاتھ دھو رہا تھا۔ ''نہ بیٹا اور کبھی آؤں گا۔ آج مجھے ثریا بٹی کے ہاں بھی جانا ہے۔ اس نے کندھے پر سے رومال نکال کر منہ پونچھا۔ اور بچوں کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے ہوئے کہا ''پھر جلدی ہی آ جاؤں گا بٹیا۔'' بچوں کے ہاتھ میں چپکے سے دو دو آنہ رکھ دیئے اور انہیں اتار کر باہر چلا گیا۔

باہر دھوپ بہت سخت ہو چلی تھی۔ اور ثریا کا گھر بہت دور تھا۔ اس نے سوچا گھر جا کر کچھ آرام کرے۔ پھر وہاں جائے۔ لیکن یہ تین روپے آخر اس کے کب تک کام آئیں گے۔ چار آنے تو ابھی ابھی خرچ ہو گئے۔ وہ آج بھی شام میں ڈپو جا کر کچھ کمائے گا۔ ابھی ثریا بٹی کے ہاں جائے تو بہتر ہے۔ ساڑھے دس تھے اور ابھی سے اتنی گرمی پڑ رہی تھی۔ رات کو زوروں کی بارش ہوتی اور دن میں بلا کی حرارت رہتی۔ ثریا کا گھر بہت دور تھا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے بارہ بج گئے۔ وہ پیچھے کے دروازے سے سیدھا دالان میں چلا آیا ''ثریا بٹی جیتی رہو''۔ وہ رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

''بہت دنوں بعد آئے فخرو چاچا؟''

''ہاں بٹی کیا کروں۔ فرصت ہی نہ تھی کتنے دنوں سے کام کے لئے مارا مارا پھر رہا تھا۔''

''بڑی ہمت والے ہو چاچا۔ اب تک اپنے ہاتھوں سے کما کر کھاتے ہو'' ثریا کا ڈیڑھ سالہ بچہ آنگن میں کھیل رہا تھا۔ بوڑھے نے اسے گود میں اٹھانا چاہا۔ بچہ دوڑ کر رومال کھولنے لگا۔ مٹھائی دیکھ کر بچہ اس کی گود میں آ بیٹھا۔ کبھی تم بھی ایسے ہی میری گود میں آ بیٹھتی تھیں بٹیا۔ میری گود کی کھلائی ہوئی بٹیا۔ اب اللہ کے کرم سے خود بال بچے والی ہو گئی ہو۔'' اس نے نہایت پیار اور شفقت سے ثریا کی طرف دیکھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا ''تم تو مجھے اپنی بیٹیوں سے زیادہ عزیز ہو بٹیا''۔ اور حقیقت میں وہ ثریا کو اپنی بیٹیوں سے بھی زیادہ چاہتا تھا لیکن وہ بولتا بولتا رک گیا۔ اگر وہ اسے خوشامد سمجھ لے تو؟ پیسوں والوں کی تو ہر کوئی خوشامد کرتا ہی ہے۔ ایسے کیوں معلوم ہو کہ وہ دل کی بات کہہ رہا ہے۔ اس نے دل کی بات دل ہی میں رہنے دی۔ ثریا اپنے بچے کو لڈو کھلاتے دیکھتی رہی۔ کتنا عجیب ہے اس کا فخرو چاچا! دوسرے کوئی غریب آتے ہیں کچھ نہ کچھ مانگ کر ہی لے جاتے ہیں۔ کچھ مانگنے کی بجائے خود ہی مٹھائی لا کر بچے کو کھلاتا ہے۔ اس نے آج تک اس سے کبھی پیسے نہ مانگے تھے۔ وہ خود ہی رحم کھا کر دو چار آنے دینے لگتی تو کہتا ''نہیں بٹیا اللہ کا دیا گھر پر بہت ہے۔ میں ایک ہی جان تو ہوں پالنے کے لئے گھر میں اور کون ہیں بس جو کچھ کماتا ہوں اس پر گذر ہو جاتا

ہے، زیادہ پیسے ہوں خواہ مخواہ فضول خرچی کرنے کو جی چاہتا ہے۔ رکھو بیٹا۔ کبھی ایسی ہی ضرورت پڑ جائے تو اپنی بیٹی سے پوچھنے میں کیا شرم!'' لیکن وہ ضرورت پڑنے پر بھی نہ پوچھتا تھا۔ ان دنوں اسے کوئی کام نہ چل رہا تھا۔ وہ آتا تو اپنا دکھڑا روتا۔ لیکن کچھ نہ مانگتا۔ اس کے چہرے پر ایک ایسی خاموش بے بسی رہتی کہ اُسے رحم آجاتا۔ اور وہ جبر کر کے دو چار آنے دے دیتی۔ وہ مجبور ہو کر لے لیتا۔ لیکن اس کے بشرے سے ثریا پہچان لیتی کہ پیسے یونہی لینا پسند نہیں۔ وہ کوئی نہ کوئی کام تلاش کرتا رہتا۔ کہ اس کے صلے میں کر دے۔ ''ننھے کی گاڑی کہاں ہے ذرا بٹھا کر پھرا لاؤں۔'' خط وط ڈالنا ہے بٹیا۔ پوسٹ آفس راستے ہی میں پڑتی ہے، ڈال جاؤں گا۔'' اور ثریا کو معلوم تھا کہ کوئی پوسٹ آفس اس کے گھر کو جاتے ہوئے نہیں ملتی۔ خط ڈالنے یہاں سے ایک میل جانا ہوگا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ وہ ان دو چار آنوں کا معاوضہ چکا دینا چاہتا ہے۔ ''میں یہ پکا دوں گا بٹیا۔ میں نے بڑی بیگم کو پکاتے ہوئے کئی دفعہ دیکھا ہے۔ بہت اچھا پکا سکتا ہوں بٹیا۔'' یا کبھی سب کمروں کے فرش ہی دھو دیتا۔ ''بڑی دُھول جم رہی ہے بٹیا۔ یہ کون کام کرتی ہے۔ تمہارے ہاں پاکی کا ذرا لحاظ نہیں''...... اس کی امی کہتی تھیں کہ ان دنوں بھی جب وہ ان کے ہاں نوکری پر تھا کبھی ایک پائی بھی نہ مانگا کرتا تھا۔ ''ہم نے کیسے دیانت دار نوکر کو کھو دیا۔'' امی ہمیشہ افسوس کیا کرتی تھیں۔ فخر الدین بڑا غیور تھا۔ انہوں نے ایک دن گالی دی تو تبھی نکل کر چلا گیا۔ وہ اسے سمجھتے ہی نہ تھے۔ دوسرے نوکر ہر وقت انہیں پھسلاتے، ان کی خوشامد کرتے رہتے۔ ان کے پاؤں تلے بچھے جاتے۔ مکار! اسی لئے ان کے دل پر چڑھ گئے تھے۔ مگر فخر الدین اپنا کام کر دیتا تھا اور بس۔ کوئی بات کہنی ہو تو مختصر۔ بردبار لہجہ میں کہتا۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ مغرور ہے۔ میں نے آج تک غریبوں میں اتنی غیرت نہیں دیکھی۔ اپنی تنخواہ کے اوپر ایک پائی بھی نہ مانگا کبھی۔'' اتنا غیور، اتنا خوددار واقعی وہ اس دنیا کے لئے نادر ہی ہے۔ اس دنیا میں جہاں افلاس نے انسانوں کو ذلت کی آخری حدوں تک گرا دیا ہے۔ چند ٹکوں کے لئے وہ کتنے مکر و فریب سے کام لیتے ہیں۔ کتنا جھوٹ بولتے ہیں بٹیا یہ کہہ کر پیسے مانگتا ہے کہ

ماں کی لاش پڑی ہے تجہیز و تکفین کے لئے ایک پیسہ نہیں۔ ایک ماہ بعد دیکھو تو ماں آ کر کنکیاں مانگ رہی ہے۔ جھوٹا پٹا میری موت کی کھبر اڑایا ماں کیا تم سے یہی کہا اس نے؟ ایک عورت نے تو اپنے شوہر کی موت کی خبر اڑا دی تھی۔ کیا سہاگ کا بھی پاس نہیں انہیں۔ اُف کتنے گر گئے ہیں یہ لوگ اور مانگتے وقت کتنا ذلیل ہو کر گڑگڑاتے ہیں۔ اسے نفرت محسوس ہوتی تھی۔ کچھ دینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اور وہ لمبی چوڑی دعائیں۔ ''اللہ تمہارے کمایاں میں برکت دے۔ مائی تیرا (سواگ) سہاگ بستا رہے۔ مائی تیرا پیٹ ٹھنڈا رہے۔'' وہ بوڑھی جو اس کی بہنوں کو اسکول میں کھانا دے آیا کرتی تھی۔ جب کبھی اس کے گھر آتی ہے کتنی باتیں بگھارا کرتی ہے۔

''چھوٹی بی میرا تو ایسا جان پڑ گیا تھا تمہارے میں بس ہر لحظہ جی چاہتا جا کر چھوٹی بی کو دیکھ آؤں۔ کیا کروں فرصت ہی نہیں ملتی۔ مجھے چین ہی نہ پڑتا۔ اس لئے آج نکل آئی۔ گھر تین میل پر ہے میرا۔ اتنا دور مجھ سے چلا نہیں جا سکتا۔ پھر تمہیں جو دیکھنا تھا۔ ننھے کی طبیعت خراب ہے۔ ہائے ہائے بچہ تو سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ کون رانڈ کی نظر لگی شہزادے کو۔ میں صدقے جاؤں۔ کیوں تھا انگریز کے تیوں..... تمہاری اماں بڑی دل والی ہے۔ کیا کہوں، اللہ ان کا پیٹ ٹھنڈا رکھے۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ دیتی تھیں۔'' ہونہہ تو اب آئیں مطلب کی طرف اور اشارہ بھی کہ تمہاری ماں دیتی تھیں۔ تم بھی دو۔ پھر جاتے وقت تو آنے کا مطلب پورا ظاہر ہو جاتا۔ ''بچوں کا صدقہ ایک دو آنہ دو چھوٹی بی۔ کیا کروں پان کی ایسی بُری لت لگ گئی ہے کہ ایک گھنٹہ نہ کھاؤں تو بے کلی رہتی ہے..... دیکھو بی دامنی پھٹ کے چندیاں ہو گئی ہے۔ کوئی پھٹی پرانی ساڑھی ہو تو دیکھ رکھو۔''

''بٹیا دولھا میاں آئے نہیں ہافس سے؟''

''نہیں چاچا۔''

''تم دونوں کو ساتھ بیٹھے دیکھنے کو جی بہت چاہتا ہے۔ بٹیا۔ تم دونوں کو ساتھ دیکھتا ہوں تو بس جی خوش ہو جاتا ہے۔ دولھا بھی تمہارے جوڑ کا ملا بٹیا۔''

وہ شرما گئی اور بات ٹال کر پوچھنے لگی۔ ''ہاں چاچا! تم کہہ رہے تھے کوئی کام ملا۔ کیا کام ملا؟''

''کوئی قائم کام تو نہیں بٹیا۔ ہمارے محلہ میں لکڑی کی ڈپو کھلی ہے۔ پس وہیں جاتا ہوں۔ کوئی بابو لکڑی اپنے گھر اٹھوا کر لے جانا چاہے تو اٹھا لے جاتا ہوں اور چیر کر دے دیتا ہوں۔ اس طرح روپے کی لکڑی پر پانچ آنہ ملتے ہیں۔ کل تو میں نے ایک ہی دن میں تین روپے کما لئے بٹیا'' — بوڑھے کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں لیکن اس چمک کی طرف ثریا کا دھیان نہ گیا۔ اُسے ایک دھکا سا لگا۔ لکڑیاں چیرتا ہے! لکڑیاں چیرتا ہے؟ اس کی آنکھوں میں ایک لکڑیاں چیرنے والے لڑکے کی تصویر پھر گئی۔ اس دن وہ باورچی خانہ میں جاتے جاتے ٹھٹھک گئی تھی۔ آنگن میں ایک لڑکا ان کی لکڑیاں چیر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑی دیکھتی رہی۔ اُف کلہاڑی کی ایک ایک ضرب پر وہ کانپ جاتی تھی۔ جب لڑکا کلہاڑی اٹھا کر کندے پر زور سے دے مارتا۔ اس کا چہرہ شدت کرب سے اینٹھ جاتا۔ اور سینہ سے ایسی آواز نکلتی جیسے دم اکھڑا جا رہا ہو۔ وہ اس کے درد کا تصور کر کے کانپ جاتی۔ اس نے نوکر کے کہنے پر لکڑیاں بہت باریک چیریں تھیں۔ روپے پر اڑھائی آنے بات ہوئی تھی۔ جاتے وقت لڑکے نے پوچھا تھا'' لکڑیاں بہت باریک چیرا ہوں ماں دو آنے زیادہ دے دو۔'' اس کا دل بے اختیار چاہا تھا کہ دو آنے دے دے، یہ دو آنے بھی اس کی تکلیف کے لئے کم ہیں۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اس کا کرب اس کی تکلیف دیکھی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے صرف ایک آنہ دیا تھا۔ اور اس پر اسے فخر ہو رہا تھا کہ اس نے ایک آنہ بھی بچا لیا۔ اور ایک آنہ زیادہ دے کر اپنی رحم دلی کا ثبوت بھی دیا تھا۔ اس نے دو آنے کیوں نہیں دیئے۔ آخر اس کے کرب کے سامنے دو آنے کی کیا حیثیت تھی۔ اس نے اس کرب کا اپنی آنکھوں سے مظاہرہ کیا تھا۔ لیکن وہ دو آنے نہ دے سکی۔ آخر یہ کیا چیز ہے جو ہمارے رحم کے جذبے کو بھی کچل دیتی ہے؟ ہم اس بے حسی کے عادی ہو چکے ہیں۔ غریبوں کو پسینہ بہاتے دیکھ کر بھی، تکلیف اٹھاتے دیکھ کر بھی ہم میں ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا بھی ہے تو ہم

جان بوجھ کر ہمارے دلوں کو پتھر بنا لیتے ہیں تاکہ ہمیں ان کی مزدوری چکاتے وقت زیادہ نہ دینا پڑے۔ آخر کیوں ہوتا ہے۔ ثریا کی آنکھوں میں وہی منظر پھر رہا تھا۔ وہ کلہاڑی اٹھا کر پوری قوت سے مارتے وقت کرب کی حالت میں چہرے کا بگڑ جانا، اور سینہ سے ایسی آواز کا نکلنا! کیسا دردناک نظارہ تھا جیسے کوئی جانکنی کی حالت میں مبتلا ہو۔ اور وہ لڑکا تو بہت جوان تھا۔ کوئی اٹھارہ بیس برس کا۔ چوڑے سینے، اور مضبوط بازوؤں والا۔ جب اس کی یہ حالت تھی تو اس بوڑھے پر لکڑیاں چیرتے وقت کیا گذرتی ہوگی۔ وہ اس تصور سے کانپ گئی۔

چاچا! لکڑیاں چیرتے ہو چاچا!'' وہ رقت سے بول اٹھی۔ اس کی خوبصورت پلکیں تھرتھرا اٹھیں۔ ثریا بڑی زود حس لڑکی تھی۔

''کیا کروں۔ دوسرا کوئی کام نہیں ملا۔ اس پیٹ کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے بٹیا۔''

''لیکن اب تمہارے کمانے کے دن ہیں چاچا؟'' تم کہتے ہو اس شہر میں تمہارے کئی رشتہ دار ہیں بیٹی بھی ہے۔ ان کے ہاں کیوں نہیں چلے جاتے۔ تم کہتے ہو جیتے جی بیٹی کے گھر نہیں پڑ رہوں گا۔ کیوں کیا تمہاری بیٹی تمہیں بار سمجھتی ہے؟ اپنے باپ کو؟ تم نے اسے پالا پوسا بڑا کیا۔ بیاہ کر کے دیا۔ اب اس نے احسان بھول کر بڑھاپے میں باپ کو یوں چھوڑ رکھا ہے۔''

''نہیں نہیں بٹیا میری بیٹی ایسی نہیں۔ غریب سہی پر وہ دل والی ہے۔ ہمیشہ کہتی ہے، اب یہاں آ کر رہ جاؤ بابا! جو کچھ گھر میں پکتا ہے تمہیں بھی کھلاؤں گی۔ گویا تمہاری ایک جان سے ہم پر بار پڑ جائے گا؟ وہاں تمہیں دیکھنے والا کون؟ خدا نہ کرے کہیں بیمار ہو جاؤ تو! جب جاتا ہوں یہی کہتی ہے۔''

''پھر تو تمہارا داماد بُرا مانتا ہے؟ ہاں شاید وہ تو غیر ہوا نا۔''

''نہیں بٹیا۔ بڑا اچھا بچہ ہے وہ۔ میری بچی پر جان چھڑکتا ہے۔ بڑا پیرت (پریت) کا جوڑا ہے۔ کیا ان کا، بالکل تم جیسا، دل سے پیار کرتا ہے میری بیٹی کو۔ شہزادی کی طرح رکھا ہے اُسے یہ شادی جلدا جلدی میں ہوئی تھی بٹیا۔ اس کے مرنے کے دنوں میں

وہ کہتی تھی ''میں تو دو دن کی مہمان ہوں۔ اس بچی کی شادی بھی میرے آنکھوں کے سامنے ہو جائے یہی ایک ارمان ہے، وہ شادی تو دیکھ سکی لیکن وہ اس بچی کا سکھ نہ دیکھ سکی۔ رہتی تو کتنی خوش ہوتی بٹیا۔ بڑی بیٹی کا دکھ دیکھ کر اس کی آنکھوں کا پانی نہ سوکھتا تھا۔ یہ جلدا جلدی کی شادی ہی اچھی نکلی۔ بڑی بیٹی کی شادی بہت سوچ بچار کر کے کی تھی۔ تین چار سال تک بات چلتی رہی۔ میرے بھائی کے بیٹے کو ہی دیا کہ بچی کہیں باہر نہ جائے۔ اپنوں ہی میں رہے گی لیکن اس کے نصیب۔ چھوکرا ایسا خراب نکلا۔ وہ گھل گھل کر مر گئی، ایک ننھی بچی کو چھوڑ کر۔ چہلم بھی نہ ہوا تھا کہ اس کے مرد نے دوسری شادی کر لی۔ بچی تین برس کی تھی بٹیا۔'' بوڑھے کی آواز میں رقت آ گئی۔ بچی کو لا کر میرے پاس چھوڑ گیا۔ لو تمہاری بچی کو تم ہی پالو۔ خیر اچھا ہی ہوا۔ بچی میندر ماں (سوتیلی ماں) کے کاٹ سے تو بچ گئی۔ میں تب اکیلا تھا بٹیا۔ بچی کو پالا پوسا۔ بیاہ کر کے دیا۔ پیسے والے لوگ ہیں اس کی [کے] سسرال والے۔ پر بچی کو سکھ نہیں۔ ساس ہمیشہ کاٹ کرتی ہے۔ پیسہ ہو کر بھی بچی کو سکھ نہیں۔ پر میری چھوٹی بیٹی بڑے سکھ سے ہے بٹیا۔ اللہ جیتا رکھے اسے میرے جنوائی نے بڑے سکھ سے رکھا ہے۔ اور جب بیوی پر میا (محبت) ہو تو بیوی کے باپ کا بھی خیال ہے اسے۔ بیٹی کہتی ہے کہ وہ بھی ہمیشہ کہتا رہتا ہے ''بابا کو یہیں بلا لیں گے اتنے بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اب کمانے کے دن ہیں ان کے؟ عمر بھر محنت کی۔ اب ایک طرف بیٹھ کر سکھ و چین کی زندگی گذارنے کے دن ہیں۔ آخر انہوں نے تمہیں اتنا دکھ اٹھا کر پالا ہے۔ اب تو تمہارا یہ فرض ہے کہ انہیں بڑھاپے میں سکھ دو۔ پر میری ہی غیرت نہیں قبولتی۔ بٹیا کسی کے گھر پر رہوں۔ جب تک ان ہاتھوں میں طاقت ہے خود کما کر کھاؤں گا—'''' جب تم سے بالکل کام نہ ہو سکے تو؟—''

''اس وقت کے لئے بٹیا میں نے کچھ جمع کر رکھا ہے۔ بس بیٹی کے ہاتھ دے دوں گا اور اس کے گھر جا رہوں گا۔ باقی عمر وہاں گوشے میں بیٹھ، اللہ کی یاد میں گذار دوں گا۔ کافی روپیہ ہے۔ ''موت مٹی'' کے لئے بھی الگ بیس روپے رکھے ہیں۔ پھر بھی اتنا بچتا ہے کہ باقی عمر میرا خرچ چل سکے۔ آخر میں اب جیوں گا ہی کتنے دن۔''

بوڑھا یہ سب کچھ سادگی سے بول رہا تھا۔ اسے اپنی خودداری کا احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ غریبوں میں خودداری کا ہونا بڑی بات ہے۔ تاہم اسے اس بات کا غرور نہ تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی۔ خودداری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتی تھیں۔

اب جاتا ہوں بٹیا پھر کبھی آؤں گا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا، ثریا اس کی آنکھوں کو دیکھتی رہی۔ ''جیتی رہو بٹیا۔ وہ چلا گیا۔ لیکن ثریا اب بھی گویا اس کی آنکھوں کی چمک کو دیکھ رہی تھی۔ ان اندر کو دھنستی ہوئی بے نور آنکھوں میں بھی خودداری سے کیسی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ خدا کرے یہ چمک یونہی قائم رہے۔ وہ اپنے بلند ارادے پر قائم رہ سکے۔ اس دنیا میں تو انسان کے نیک ارادے بھی پنپ نہیں سکتے۔ ناموافق حالات اسے مجبور کر دیتے ہیں۔ بے بس کر دیتے ہیں۔ پرسوں جب ان کے شوہر نے اپنے وکیل دوست کا قصہ سنایا تو اسے کتنا صدمہ ہوا تھا۔ ان وکیل صاحب نے عہد کر لیا تھا کہ وہ جھوٹے مقدمات کبھی نہ لیں گے۔ کچھ دیر تک یونہی ان کی پریکٹس چلتی رہی۔ چند کیس آ جاتے تھے۔ لیکن آخر مؤکل ہی تو وکیل کے پاس آتے ہیں۔ وکیل مؤکلوں کو ڈھونڈتا نہیں پھرتا۔ مؤکل زیادہ تر مجرم ہی کی پارٹی ہوتی تھی۔ وہ ان کا کیس لینے سے انکار کرتے گئے۔ مؤکلوں کی تعداد بہت کم ہونے لگی۔ ان کی پریکٹس صفر کے برابر ہو کر رہ گئی۔ قرضہ بھی ہو گیا۔ وہ بہت پریشان رہا کرتے تھے۔ دوستوں نے انھیں ابھارا کہ آخر وکیل ہو کر اس کا امتیاز کیوں کرو۔ صرف حق والوں کے مقدمے جیت لئے تو کون سے بڑے لائر بن گئے۔ قابلیت تو جب ظاہر ہو گی کہ واقعات کو جھوٹا ثابت کرو۔ پھر وہ جھوٹے کیس لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ پہلے پہل تو وہ بہت ملول رہا کرتے تھے۔ اس احساس سے کہ وہ غلط راستے پر چل رہے ہیں لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کے عادی ہو گئے۔ اور اب مجرموں کے جرم کو چھپانے میں بڑے ماہر ہیں...... اُسے یہ سن کر کتنا افسوس ہوا تھا۔ یہ دنیا تو نیک ارادوں کو بھی پنپنے نہیں دیتی۔ لیکن وکیل صاحب نے بہت جلد ہار مان لی تھی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ پہلے مقدمے جیت کر کافی شہرت

حاصل کر لیتے اور لوگوں پر یہ ظاہر کر دیتے کہ وہ صرف حق والوں کے مقدمے لیتے ہیں۔ تو ایسے ہی موکل ان کے پاس آتے۔ انہوں نے بہت جلد ہار مان لی۔ لیکن یہ بوڑھا اس قدر غریب، اس قدر کمزور ہو کر بھی کیسا جان توڑ مقابلہ کر رہا تھا۔ ان دنوں جب کئی مہینوں سے بیکار رہا تھا، اس نے فاقے پر فاقے کئے تھے اور اب لکڑیاں چیر کر گذر کر رہا تھا۔ اسے اتنی تکلیف اٹھانی منظور تھی لیکن کسی کے گھر جانا منظور نہ تھا۔ کتنی غیرت، کیسی خودداری! بوڑھے کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ اس چمک میں گویا انسانیت کی فتح تھی۔ دروازے میں کھڑی بہت دیر تک بوڑھے کو جاتے دیکھتی رہی۔ وہ گلی میں مڑ گیا تو وہ اندر چلی آئی۔

وہ ہر روز ڈپو جاتا رہا۔ لکڑیاں وہ پہلے بھی چیرا کرتا تھا۔ اس لئے اُسے ایسے انداز سے ضرب لگانا معلوم تھا کہ لکڑی جلد چر جائے۔ اور اسے زیادہ تکلیف بھی نہ ہو لیکن پھر بھی لکڑی چیرنا لکڑی چیرنا ہی تھا۔ وہ اب اپنی طاقت کھو چکا تھا۔ آہستہ آہستہ کچھ وقفہ کے بعد وہ دم لے کر چیرا کرتا تھا۔ پھر بھی اسے شدت کی تکلیف ہوتی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی چھاتی خالی ہوئی جا رہی ہے۔ کوئی اس کے بازوؤں کا گوشت اندر سے کھینچ کر نکال رہا ہے۔ گھر آتا تو کندھے اور بازو بری طرح درد کر رہے ہوتے لیکن جب وہ منہ ہاتھ دھو کر روٹی کھانے بیٹھتا تو اسے ایک عجیب تسکین، عجیب لذت محسوس ہوتی۔ اپنے ہاتھ کی کمائی ہوئی روٹی کھاتے ہوئے وہ صرف دو گھروں کو جاتا۔ ایک ایک گھر میں چار روپے کی لکڑی تو چیرنی پڑتی تھی۔ خواہ مخواہ کیوں حرص کر کے تکلیف اٹھائے۔

پھر گرمی پڑ گئی اور لکڑیاں سوکھ گئیں۔ اب تک وہ ہمیشہ سرو کی لکڑیاں چیرا کرتا تھا کیونکہ وہ آسانی سے چیری جا سکتی تھیں۔ لیکن اب سرو کی لکڑیاں دوسری لکڑیوں سے کئی گنا سخت ہوتی ہیں۔

دوپہر کا وقت، کڑی دھوپ میں کھڑے، ایک دن وہ کسی گھر میں لکڑیاں چیر رہا تھا۔ سرو کی سوکھی ہوئی سخت لکڑیاں۔ لکڑیاں بہت گانٹھ دار تھیں۔ ایک ایک گانٹھ پھاڑتے اتنا

وقت لگتا چیرنے میں پہلے ایک روپیہ کی لکڑی چیر لیا کرتا تھا۔ سخت سے سخت ضرب لگانے پر بھی کلہاڑی اندر دھنستی نہ تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ پسینہ میں شرابور۔ وہ اپنی پوری قوت لگا کر کلہاڑی مارتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے دم بھی اکھڑ جائے گا۔ پیاس سے اس کا حلق سوکھ رہا تھا۔ شدّتِ کرب سے اس کے سینے سے آواز نکل جاتی۔ لیکن ایک گانٹھ ایسی سخت تھی کہ پھوٹتی ہی نہ تھی۔ اس لئے کلہاڑی مضبوط پکڑ کر اوپر اٹھائی اور گانٹھ دے ماری۔ سینے میں ناقابل برداشت درد اٹھا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اور وہ سینہ تھام کر بیٹھ گیا۔

مالکۂ مکان ادھر آنکلی۔ اور اُسے چپ بیٹھا دیکھ کر کڑک کر بولی ''کیوں بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ چار روپے کی تو لکڑی ہے۔ اتنی لکڑی پھاڑنے کے لئے بیچ میں آرام بھی چاہئے۔ جلد جلد چیر۔ آج شام ہمارے ہاں دعوت ہے۔ بہت لکڑی کی ضرورت ہوگی۔''

''میں نہیں چیر سکتا ماں۔ لکڑیاں بہت سخت اور گانٹھ دار ہیں۔ آدھی لکڑیاں چیری ہیں۔ اس کی مزدوری دے دو۔'' ''چیرنے ہاتھ نہیں ہوتا تو پھر آیا ہی کیوں۔'' وہ غصہ سے دو آنے پھینکتی ہوئی بولی۔ ''دو ہی آنے ماں! میں آدھی لکڑی چیرا ہوں۔ اور آج کل سبھی روپیہ پر چار آنے دیتے ہیں۔ اتنی سخت لکڑی کوئی چار آنے سے کم نہیں چیرتا۔ اس حساب سے آٹھ آنے ہوئے۔'' ''ہونہہ! یہ بھی بہت ہوئے، تجھے تو کچھ بھی نہیں دینا چاہئے تھا تو نے دوہرا کام لگایا۔ اب پھر آدمی ڈھونڈنا ہے۔ ایک پائی زیادہ نہ دونگی۔'' وہ پلٹ کر چلی گئی۔ وہ بہت دیر تک دیکھتا رہا کہ شاید پیسے لانے گئی ہے لیکن وہ نہ آئی۔ وہ آہستہ سے چھاتی تھامے اٹھ کھڑا ہوا۔ اُف اتنی محنت کے بعد دو آنے! آخر دولت ایسے لوگوں کو کیوں دی جاتی ہے جو انصاف کرنا نہیں جانتے۔ وہ بہت دیر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان دو آنوں کو دیکھتا رہا۔ جیسے اس کی آنکھوں کو یقین نہیں آرہا ہو۔ وہ پھر انہیں مٹھی میں دبا کر خاموشی سے چلا آیا۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ شام کو اتفاقاً جورا آگیا تو اس نے دیکھا بوڑھے کو سخت بخار چڑھا ہوا ہے۔

''اوہ تمہیں تو بخار چڑھا ہوا ہے دادا۔ کہو گاڑی لے آؤں، بیٹی کے گھر جاؤ گے؟ وہ

نہایت ہمدردی سے پوچھنے لگا۔

میرے حال پر چھوڑ دو بیٹا۔ بس اتنے دن جی لیا۔ بیٹیوں اور نواسیوں کو پالا پوسا۔ ان کی شادیاں دیکھ لیں۔ بس اب اور کیا دیکھنا ہے چین سے مرجاؤں تو......"

ایسا نہ کہو دادا۔ میں ابھی کسی اچھے حکیم کا انتظام کرتا ہوں۔ کہو تمہاری بیٹی کو کہلا بھیجوں؟"

نہ بیٹا! اسے معلوم نہ کراؤ۔ پریشان ہو جائے گی اور مجھے ہوا بھی کیا ہے۔ بس لکڑی ذرا سخت تھی۔ چھاتی میں درد ہو گیا اور اسی سے بخار آ گیا بس دو ایک دن میں اچھا ہو جاؤں گا۔ وہ اپنے جنجال میں پریشان ہے۔ گھر گرہستی چھوڑ کر کیوں آئے۔"

ایک ماہ تک وہ بستر سے نہ اُٹھ سکا۔ جب پوری صحت ہو چکی تو جورا نے اس کی دواؤں اور حکیم صاحب کی فیس کا حساب ادا کیا اور بٹوا واپس کر دیا۔ یہ بٹوا جس میں اس کی پونجی تھی۔ اس نے جورا کے حوالے کیا تھا کہ فیس اور دواؤں کے لئے اس میں پیسے لے لے۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے بٹوہ کھولا۔ صرف پانچ روپے بچ رہے تھے۔ اسے ایک دھکا سا لگا۔ کتنے روپے خرچ ہو چکے تھے۔ یہ بٹوہ پھر سے بھرنے کے لئے اسے کتنے دن درکار ہوں گے۔ وہ گھبرا گیا۔ وہ پھر کل ہی سے ڈپو جانا شروع کر دے گا۔ اب وہ تو لکڑیاں چیر ہی نہیں سکتا لیکن دو ایک گھر کو لکڑی اٹھا لے جا سکتا ہے۔ دو روپے کی لکڑیاں وہ ایک بار اٹھا سکے گا۔ زیادہ ہو تو تین آنے پر ڈپو کی گاڑی بات کرے گا۔

دوسری صبح وہ پھر ڈپو گیا۔ اب نقشہ بدل چکا تھا۔ پہلے محلے کے چند جوان ہی لکڑیاں چیرنے والوں کی ٹولی میں شامل تھے۔ اب جانے کہاں سے اتنے آدمی آ گئے تھے کہ بس ایک بھیڑ بن گئی تھی۔ پہلے لکڑیاں تلوا کر بابو لوگ خود قلیوں کو ڈھونڈا کرتے تھے۔ لیکن اب لکڑی تُلتے ہی مزدور خود ٹوٹے پڑتے تھے۔ ایک آدمی کو تین چار مزدور گھیر لیتے تھے۔ میں اٹھالوں گا سوامی۔" کہاں ہے صاحب، گھر؟" خریدنے والوں کی بھیڑ میں مزدور گھس جاتے تھے۔ وہ اتنی بھیڑ میں کیسے گھس سکے گا۔ لیکن دوسرے گھس گھس کر گاہکوں کو اچک

لیتے تھے۔ وہ دور ہی سے کسی گاہک پر نظر جما رکھتا کہ اس کی لکڑیاں تلتے ہی جا کر اٹھا لے گا۔ لیکن آن کی آن میں کوئی گھس کر اُٹھا لیتا۔ اور وہ منہ تکتا رہ جاتا۔ آخر بہت کوشش سے بچ بچا کر وہ اندر کچھ دور تک گھسا۔ لیکن اتنی بھیڑ۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔ ہر طرف سے اس کے جسم پر بوجھ پڑ رہا تھا۔ وہ سنبھل نہ سکا۔ طویل بیماری کے باعث وہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ بے ہوشی سی طاری ہو گئی تھی۔ پھر جانے کیا ہوا جب اس کی آنکھیں کھلیں تو وہ اپنے گھر میں تھا۔ محلہ کے لوگ اسے اٹھا لائے تھے۔ اس کا انگ انگ درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ دوسرے روز سے اسے ہمت نہ پڑی کہ بھیڑ میں گھسے۔ وہ یوں ہی کچھ دور کھڑا انتظار کرتا رہتا کہ کوئی اسے دیکھ کر خود آ جائے۔ کبھی گاہک لکڑی لینے سے پیشتر اس کے پاس سے گذرتا تو کہتا لکڑیاں تلوا کر مجھے بلاؤ صاحب۔ میں لے جاؤں گا، لیکن تلواتے ہی وہاں کوئی اور آ کر اٹھا لے جاتا۔ وہ ہر روز شام کو مایوس لوٹتا تھا۔ اس نے ان دنوں ایک پائی بھی نہ کمائی۔ اس نے بہت کفایت کی۔ پھر بھی پانچ روپے اس کا کب تک ساتھ دیتے۔ وہ دن دن بھر بھوکا رہنے لگا۔ طویل بیماری اور بیماری چھوٹتے ہی فاقے۔ وہ بے حد کمزور ہو گیا تھا۔ اگر گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا بھی ''لکڑیاں لے آؤں صاحب''۔ وہ مڑ کر دیکھتے اور اس پر ایک بے پروائی سے ایک اچٹتی نگاہ ڈالتے، چل دیتے۔ ان کی نظریں کہتی تھیں ''ہوں کیا ہو سکے گا اس ڈھانچے سے۔ کیا وہ لکڑیاں اٹھا سکے گا۔ چیرنا تو ایک طرف؟'' وہ تندرست آدمیوں کو کام دیتے تھے۔ وہ بھوکا تھا۔ اس لئے کام کر کے کچھ کمانے آیا تھا۔ لیکن اسے کام نہیں ملتا۔ اس لئے کہ وہ بھوکا تھا، کمزور تھا۔

اُسے خیال آیا کہ وہ ثریا بٹیا کے ہاں کیوں نہ جائے۔ اس کا چھوٹا موٹا کام کر دے تو وہ چار آٹھ آنے دیدے گی۔ ایسے ہی کچھ دن کھا پی کر طاقت عود کر آئے گی۔ اور کام کرنے کے قابل ہو سکے گا۔ لیکن وہ اب اتنی دور کیسے جا سکے گا۔ ڈپو جاتے ہوئے ہی اُسے کئی بار چکر آ جاتی تھی۔ ثریا کا گھر تو نظر آباد میں تھا۔ لیکن اسے جانا ہی پڑے گا۔ وہ آہستہ آہستہ

جانے لگا۔ راستے میں بیٹھ بیٹھ کر کچھ ستا لے گا۔ وہ ہمت باندھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دو تین گھر پار کیے۔ چوتھے گھر کے سامنے ایک لڑکا کھڑا اپنی گاڑی کے بیل باندھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا کہاں جا رہے ہو مکھرو دادا؟"

"نظر آباد"

"اتنی دور دادا کیسے چل سکو گے؟ تم تو بیمار معلوم ہوتے ہو۔ آؤ میں بھی اُدھر چل رہا ہوں آؤ۔ گاڑی میں بیٹھ جاؤ"۔ اس نے تشکر آمیز نگاہوں سے لڑکے کو دیکھا اور چڑھ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ثریا کی گلی کا موڑ آیا "بس یہاں ٹھہرا دو بیٹا"۔ یہاں سے دو قدم ہی چلنا ہے۔ تم اپنی راہ جاؤ۔" وہ اتر پڑا۔

ثریا بچے کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بہت جلدی میں ہے۔ گھر ویران رہ گیا تھا۔ بوڑھا حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ فرنیچر سامان کچھ نہیں تھا۔ "کیوں بٹیا گھر بدل رہی ہو؟"۔ "نہیں دادا ہم بنگلور جا رہے ہیں۔ ان کا تبادلہ ہو گیا۔" وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ تبادلہ بھی نہیں پروموشن بھی یعنی اب جو کام کرتے تھے اس سے بڑا کام ملا۔ سامان واماں لدوا کر اسٹیشن پر بھیج دیا گیا ہے۔ وہ بھی سامان کے ساتھ گئے ہیں۔ پہلے ہی ٹکٹ لے رکھیں گے۔ آج کل اسٹیشن پر بہت بھیڑ لگی رہتی ہے چاچا۔ ٹکٹ ملنا بہت مشکل ہے۔ ہمارے لیے نوکر تانگہ لانے گیا ہے۔ تمہیں دیکھنے کو جی چاہتا تھا چاچا۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔ کہو کیا حال ہے اچھے ہو۔ بہت دنوں بعد آئے ہو۔" بوڑھے نے ایک سرد آہ کھینچی "کیا کہوں بٹیا۔ ایک مہینہ تو بستر پر پڑا رہا۔ ایسا بیمار پڑا۔ اور اب جو اٹھا ہوں تو ہاتھ میں کام کرنے کی طاقت نہیں۔"

"کیوں کیا ہوا چاچا تمہیں۔ کیا بیمار تھے؟"

"کچھ نہیں بٹیا بس ایک دن ذرا سخت گانٹھ دار لکڑیاں چیریں تو چھاتی میں درد ہو گیا اور بخار ایک مہینہ تک نہ چھوٹا۔ بڑھاپے میں کیا ہے بیٹا ایک ذرا سا حیلہ ہی بس ہے۔"

"میں نہ کہا کرتی تھی چاچا، ایسا کٹھن کام نہ کرو۔ تم سنتے ہی نہیں۔ بس اپنی کئے

جاتے ہو۔ اب تو سبق ملا؟ میں کہتی ہوں بس بیٹی کے گھر جار ہو تم نے اس وقت کے لئے پونجی تو جمع کی ہے!''

''وہ پونجی تو ساری ختم ہو گئی بیٹا......''

''کیسے چاچا؟'' ''یہی دوا دارو میں۔'' ''علاج میں اتنے روپے خرچ ہو گئے؟ کتنے تھے تمہارے پاس؟'' ''تین بیس سے کچھ کم۔'' ''اتنے روپے علاج میں؟'' ''نہیں بٹیا کچھ تو میری بیکاری میں صرف ہو گئے تھے۔ علاج پر بیس پچیس خرچ ہوئے۔ حکیم صاحب کی فیس اور دوا کے ملا کر۔ اور اس سے پہلے میں نے اپنے نواسے داماد کو بیس روپے کی سونے کی انگوٹھی خرید کر دی تھی—''

''سونے کی انگوٹھی کی تمہارے داماد کو کیا ایسی ضرورت تھی۔ بڑی حماقت کی تم نے چاچا۔ یہ تو تمہارا ہی قصور ہے۔''

''میری بھولی بٹیا۔ تم دنیا کے طور کیا جانو، میرے دامادوں نے، سوائے میرے چھوٹے داماد کے اللہ اسے بستا رکھے۔ سب نے مجھے ایسا ستایا ہے، ایسا ستایا ہے۔ بس کہنے لگوں تو ایک رام کہانی ہو جائے۔ میرے ہی کیا سبھی دامادوں کا یہی حال ہے۔ جب ایک دفعہ بیٹی کو اٹھا کے دے دیا، تو بس ہمارا کیا ہے۔ داماد جو بھی کریں سہنا پڑتا ہے۔'' بوڑھے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''پہلی بیٹی کا مرد تو ویسا نکلا، اس کی مصیبت کی ماری بچی میرے ہاتھ پلی۔ اُسے بھی سکھ چین نہیں۔ ابلیس کی اولاد، تین برس کی بچی کو میرے پاس چھوڑ گیا۔ پھر پلٹ کر نہیں دیکھا۔ بچی کی یاد بھی نہ آتی تھی بے رحم کو۔ اس نے بچی کو دیکھا تک نہیں۔ قریب بارہ برس ہونے کو آئے۔ اس کی شادی پر بھی نہ آیا۔ پرسوں بچی آئی تو رو کر کہنے لگی ایسے سخت دل باپ کے لئے بھی اس بچی کے دل میں جگہ ہے۔ کتنا ہی ستائے آخر باپ ہی تو ہے۔ اللہ باپ کی میا مہر (محبت) دل میں ڈال ہی دیتا ہے۔ رو کر کہنے لگی ''نانا! بابا کو دیکھے قریب بارہ سال ہونے آئے۔ مجھے لے جا کر ایک دفعہ ان سے ملاؤ۔ بارہ برس پورے ہو جائیں تو ہم ایک دوسرے کو مرتے دم تک نہیں دیکھ سکتے۔''

''کیوں نہیں دیکھ سکتے؟''

''تم ایسی باتوں کو ہنسی میں اڑا دو گی بٹیا...... لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ قریب کے رشتہ دار کسی وجہ سے بارہ برس تک ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں تو بارہ برس گذر جانے پر انہیں ایک دوسرے کی صورت بھی دیکھ پائیں تو دونوں میں سے ایک ضرور مر جائے گا۔ اس لئے رو کر کہہ رہی تھی بچی ''بابا سے ملا دو بارہ برس ہونے آئے۔ وہ کیوں آئے گا اسے دیکھنے؟ بچی کو بلا لے جانا تھا۔ اس کا باپ دوسری شادی کر کے اب بنگلور میں ہے۔ دریچے، دروازوں اور دیواروں پر رنگ کرنے کا کام کرتا ہے۔ اور بچی کا گاؤں بیچ میں پڑتا ہے۔ میسور اور بنگلور کے بیچ میں ہے۔ اس کی شادی ملوتی میں کی ہے۔ بچی کو لے جانا تھا۔ اس لئے گیا نہیں تو کاہے کو جاتا میں اس کے گھر۔ ایک ہی دن وہاں ٹھہرا مگر ایک ہی دن میں نواسے جنوائی کے لچھن معلوم ہو گئے۔ وہ ناحق بچی پر جھپٹ رہا تھا۔ ''کیسی بے وارثی چھوکری آئی میرے نصیب میں۔ دوسرے دامادوں کو دیکھا۔ کیا خاطر داریاں کی جاتی ہیں ان کی دلہن والوں کے گھروں میں دعوتیں دی جاتی ہیں۔ تحفے دیئے جاتے ہیں۔ تیرا تو کوئی ہے ہی نہیں۔ ہے تو تیرا کنجوس بوڑھا نانا، کبھی ایک دفعہ بھی بلایا ہے مجھے۔ کبھی کوئی تحفہ دیا ہے۔ ابھی تک کمائے جاتا ہے حریص بڈھا۔ خوب پیسے جوڑ کر رکھتا ہوگا۔ دل نہیں ہوتا کہ داماد کو ایک تحفہ ہی دے دے۔ بخیل کہیں کا۔ اور تجھے جہیز بھی کتنا دیا؟ بس دو کوڑی کا۔ بول کتنا جہیز ساتھ لائی مہارانی کی بچی؟' اور یہ کہہ کر بٹیا، اس نے مٹی بھینچ کر انگوٹھا نکال کر بچی کے سر پر ایک ایسا دھول مارا کہ بچی درد سے تڑپ اٹھی۔ میں بازو کی کوٹھری میں بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بچی چپ چاپ بیٹھی رو رہی تھی۔ اس نے آواز تک نہیں نکالی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ پانی گرتا رہا۔ اس کی آنکھوں کا پانی سوکھتا ہی نہیں۔ ساس بھی ہمیشہ کاٹ کرتی ہے۔ طعنے دیتی ہے کہ زیادہ جہیز نہ لائی۔ میری نواسی بٹیا۔ کیا کہوں کیسی ہے۔ ایسے نرم دل والی، ایسے صبر والی، پھر صورت میں ایسی پیاری ہے۔ بس پری کے تیوں۔ ایسی بچی سے یہ سلوک کرتے ہیں۔ دل نہیں دیکھتے۔ روپ نہیں دیکھتے بس پیسے پر نظر ہے۔'' ''اپنے نانا سے نہیں کہے گی

کہ مجھے کوئی اچھا تحفہ دے۔" وہ پوچھ رہا تھا بچی نے روتے ہوئے کہا "انہیں ستاؤ نہیں۔ وہ بہت غریب ہیں۔ بڑے دل والے ہیں میرے نانا۔ اگر ان کے پاس پیسے ہوتے تو ضرور تمہیں کچھ دیتے............اتنا ہونے پر بھی بچی نے مجھے جھگڑے کے متعلق ایک بات نہ بتائی۔ لیکن میں خود سن اور دیکھ چکا تھا۔ میری وجہ سے میری بچی پر اتنا ظلم توڑا جائے، میں یہ کیسے دیکھ سکتا تھا۔ اس لئے آتے وقت داماد سے کہا "اب کی رمضان ضرور میسور آنا میرے ہاں۔" "کیا دو گے؟" وہ اکڑ کر بولا "میں ٹھیک سے نہیں بول سکتا" میں بولا "کوئی کاشمیری رومال یا شال، .....ہونہہ۔ کاشمیری رومال۔" وہ حقارت سے بولا۔ میں تو اس سے جُوٹھا ہاتھ بھی نہیں پونچھوں گا۔ کاشمیری رومال۔ بڑے گھر کو بیٹی دینا تھا تو بڑے گھروں کے آداب کا بھی خیال رکھتے۔ ذرا پیسے والے تھے بٹیا وہ۔ اس بنا پر اپنے آپ کو وہ بہت بڑا سمجھتے تھے۔" میں تو کم از کم سونے کی انگوٹھی لے کر رہوں گا۔" میں کیا کر سکتا بٹیا۔ بچی کا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ وہ آیا تو بیس روپے کی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنائی...... پونجی ختم ہو گئی بٹیا۔ اب کیا منہ لیکر بیٹی کے گھر جاؤں۔ نہ بٹیا میں جاؤں گا نہیں۔ اب بھی کوشش کروں گا۔ اب بھی ڈپو جا رہا ہوں بٹیا۔ لیکن تم میرا حال دیکھ رہی ہو۔ اتنے کمزور کو کون کام دے گا۔ ایک پائی بھی نہیں کمائی۔ فاقے گذار رہا ہوں بٹیا۔ خیال آیا جا کے ثریا بٹیا کا کوئی چھوٹا موٹا کام کر دوں تو بٹیا کچھ دے گی!"

"کام کرنا ہی ہے کیا چاچا۔" وہ اپنی پرس ڈھونڈنے لگی۔ پرس تو اس نے ٹرنک میں بند کر دی تھی اور سب سامان اسٹیشن کو پہنچ چکا تھا۔ اس غیور بوڑھے کی ایسی مصیبت کے وقت بھی مدد نہ کر سکے گی۔ اسے بہت رنج ہو رہا تھا۔ اس کا شوہر بھی اب اسٹیشن سے نہیں لوٹے گا۔ ورنہ اسی سے کچھ مانگ کر دیتی۔ اچانک اسے ایک خیال آیا۔

"چلو چاچا ہمارے ساتھ چلو۔" وہ خوش ہو کر بول اٹھی۔ اس سے پہلے بھی اسے کئی دفعہ خیال آیا تھا کہ بوڑھے کو اپنے ہاں رکھ لے۔ لیکن اس کے ہاں پہلے ہی سے دو تین نوکر تھے۔ اس کا شوہر کیا سمجھے گا کہ اتنا آرام رہ کر بھی ایک اور خادم چاہتی ہے۔ وہ اس کی کوئی

بات نہ ٹالتا تھا لیکن زیادہ فرمائش کرنا یا کوئی کام اس کی اجازت کے بغیر کرنا ثریا کو پسند نہ تھا۔ لیکن وہ اس کی اجازت کا انتظار نہ کر سکتی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ وہ اس کے [کی] خاطر چاچا کو ضرور نوکر رکھ لیں گے۔ آخر وہ بھی اتنا رحم دل تھا۔ "چلو گے چاچا میں تمہیں زیادہ کام نہ دوں گی۔ بس بچوں کو کھلا لو۔ سودا سلف لے آؤ۔ کیوں چلو گے چاچا؟"

بوڑھا کچھ دیر تک سر جھکائے رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر اس نے سر اٹھا کر دبی آواز میں آہستہ آہستہ کہا "نہیں بٹیا میں نہیں آسکتا۔ میں یہ جگہ چھوڑ نہیں سکتا۔ ساری عمر یہیں گذری ہے۔ میرے باپ دادا اسی گاؤں میں رہے میں بھی یہیں پیدا ہوا۔ یہیں پل کر بڑا ہوا...... یہ گھر ہمارے بابا کا ہے۔ اس کے گھر میں میں نے "اس" کے ساتھ بیس برس گذارے۔ وہ یہیں سو رہی ہے، میرے ماں باپ بھی یہیں دفن ہیں۔ میں گاؤں چھوڑ نہیں جا سکتا۔ بٹیا! مرنے کے دنوں میں پرائی بستی کیوں جاؤں۔ کہیں پردیس میں مر گیا تو اپنے وطن کی مٹی تک نصیب نہ ہوگی۔ میں یہیں کوشش کر کے کماؤں گا بٹیا۔ کچھ ملا نہیں تو فاقہ کرتے کرتے جان آپ ہی نکل جائے گی۔ اب جینے کی کسے آرزو ہے۔"

وہ اسے مجبور نہ کر سکی۔

"تانگہ پر باندھنے کے لئے پردے دے دو بی۔ وقت بہت ہو چکا ہے۔" ملازم تانگہ لے کر آ گیا تھا۔ اس نے ننھے بچے کی پھالیوں تولیاں اٹھا لیں "لے یہ بستر بھی باندھ لے۔" ثریا نے اپنے چھوٹے تین ماہا بچے کو گود میں لے لیا۔ نوکر نے چھوٹے بچے کا بستر باندھ کر اٹھا لیا اور بڑے بچے کو بھی گود میں اٹھا لیا۔ میں جاتی ہوں، چاچا۔ اللہ میاں تمہاری مصیبت دور کرے۔" وہ دعا دینے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔ "خوش رہو بٹیا"۔ وہ ننھے بچے کو گود میں لے کر تانگہ میں بیٹھ گئی۔ تانگہ چل پڑا۔ بوڑھے کو جاتے ہوئے وہ دیر تک دیکھتی رہی۔ اس کے من پر ایک عجیب اداسی چھا رہی تھی۔

بوڑھا مایوس ہو چکا تھا۔ لیکن اب وہ بھی ڈپو جا رہا تھا۔ وہ ہر روز مایوس لوٹتا۔ کوئی

اسے پوچھتا تک نہیں تھا۔ بھوک کی شدت سے نڈھال، اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اب دم نکل ہی جائے گا لیکن موت نہیں آتی تھی۔ مصیبت کے وقت موت بھی نہیں آتی۔ وہ صبح آٹھ بجے ہی ڈپو چلا جاتا تھا۔ اُسے کام ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔ پھر بھی وہ ڈپو کے بند ہونے تک وہیں رہتا۔ بارہ بجے ملازم ڈپو بند کرنے لگے۔ دوسرے سب مزدور اپنے اپنے گھروں کو یا کسی کے گھر لکڑیاں چیرنے جا چکے تھے لیکن وہ نہ جانے کیوں ابھی تک کھڑا رہا۔ کام ملنے کی امید تو کبھی کی مٹ چکی تھی۔ پھر بھی وہ کھڑا رہا۔ آخر گھر جا کر کیا کرے گا۔ ''اوہ ڈپو بند کر دی آپ نے؟ اگر مہربانی فرما کر آج ہی لکڑی دے سکیں تو پھر کل مجھے فرصت نہیں۔ اور آج کل ہمارا نوکر بیمار ہے۔'' کوئی سائیکل پر ابھی ابھی آیا تھا۔ دوکاندار نے پھر ڈپو کھول کر لکڑی تلوا دی۔ لکڑی تلوا کر بابو نے اِدھر اُدھر دیکھا وہاں کوئی نہ تھا اور پھر اس کے پاس جھجکتا ہوا آیا ''کیا تم لکڑی اٹھانے والے ہو؟'' ''ہاں بابو جی'' ''لے چلو گے؟'' ''گھر یہیں ہے ہمارا''۔ ''اچھا بابو جی''۔ ''کیا لوگے''۔ ''وہی معمول کا بابو جی۔ روپے پر دو آنے۔'' ''اچھا اٹھالو'' ایک اور مزدور دور سے بھاگا آ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی کسی کے گھر لکڑیاں چیر کر آ رہا تھا۔ وہ آتے ہی چلایا ''میں لے چلوں گا بابو جی''۔

''نہیں، میں نے بوڑھے میاں سے بات کر لی ہے۔'' بابو جی نے جواب دیا۔ بوڑھے نے موقع ہاتھ سے جاتے دیکھ کر جلدی سے لکڑیاں اٹھالیں۔ ''ہونہہ! اس کے ہاتھ سے کیا ہو سکے گا؟'' لڑکے نے حقارت سے کہا ''میں آن کی آن میں پہنچا دوں گا آپ کے گھر۔ اور اسی وقت چیر کر بھی دے دوں گا۔''

''کیوں بوڑھے میاں تم نہیں چیرو گے؟'' بابو نے پوچھا ''نہیں بابو۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ پہلے چیرا کرتا تھا بابو جی۔ پر اب فاقے کر کے کمزور ہو گیا ہوں کل سے کچھ نہیں کھایا ہے بابو کیسے چیر سکوں۔''

دیکھا بابو جی میں نہ کہتا تھا اس سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن بابو کو اس پر ترس آ گیا تھا۔ ''نہیں بوڑھے میاں کو اٹھالانے دے تو بھی ساتھ چل کر لکڑیاں چیر دے۔ یوں دونوں کو

کچھ مل جائے گا۔"

"مفت کیوں آؤں بابو جی۔ اتنی دور صرف چیرنے کے دس بارہ آنوں کے لئے۔" لڑکا چلنے لگا۔ "ادھر آ"۔ بابو نے اُسے پکارا۔ اُس کے گھر لکڑیوں کی بہت ضرورت تھی۔ اس کی بیوی نے کہا تھا کہ رات کا کھانا پکانے کو بالکل لکڑیاں نہیں ہیں۔ اب وہ چیرنے کے لئے کسی اور کو کہاں ڈھونڈتا پھرے؟ "ادھر آ۔" لڑکا مڑا۔ "ایسی باریک چیروں گا بابو جی کہ بی بی جی بھی خوش ہو جائیں۔" لڑکے نے بابو جی کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کے گھر میں کوئی نوکر نہ ہوگا۔ بی بی جی ہی پکاتی ہوں گی۔ بس کھانا منٹوں میں پک جائے گا۔ مجھ سے باریک کوئی نہیں چیر سکتا۔ بابو جی!" بوڑھا ابھی تک لکڑیاں اٹھائے کھڑا تھا۔ بوجھ اٹھا کر جلدی جلدی چلتے جائیں تو اتنا درد محسوس نہیں ہوتا لیکن جب اٹھا لے کر ایک ہی جگہ کھڑے ہوں تو وزن زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ اس نے جوش میں آ کر دو روپے کی لکڑیاں ایک ہی وقت میں اٹھالی تھیں۔ بوجھ سے اس کے کندھے میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ بابو کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ اُسے سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کرے۔ "اچھا لو روپے کی لڑکی ڈیڑھ آنے میں لئے چلتا ہوں بابو جی۔" چھ پائی نے بابو جی سے فیصلہ کر ہی ڈالا۔ روپے پر چھ پائی تو چار روپے پر دو آنے کی کمی ہوئی۔ دو آنے ایک کلرک کے لئے بہت کچھ تھے۔

"اچھا رکھ دو میاں۔ یہ لے جائے گا۔" بابو نے کہا۔ "اس نے خاموشی سے لکڑیاں اتار رکھ دیں۔ ساری مایوسی اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ لڑکے نے لکڑیاں اٹھالیں۔ وہ دونوں چل پڑے۔ وہ بہت دیر تک دونوں کو جاتے دیکھتا رہا۔ ان کے اوجھل ہونے پر بھی یونہی کھڑا رہا۔ اپنے گرد و پیش سے بے خبر! سورج برابر سر پر آ گیا تھا۔ دھوپ کی شدت سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے آخری آس بھی ٹوٹ چکی ہو۔ جیسے اس کی شمعِ امید کی لَو بجھنے سے پہلے آخری دفعہ تیز ہو کر لپکی تھی پھر بجھ گئی۔ درد سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ کنپٹیوں کی رگیں پھڑک رہی تھیں۔ اور وہ سر جھکائے سوچتا رہا۔ یکا یک وہ پھٹ پڑا۔ وہ ایسے رو رہا تھا جیسے برسوں کی

لاڈ سے پالی ہوئی بیٹی کی نعش پر آنسو بہا رہا ہو۔ پھر وہ آنسو پونچھ کر اٹھا آہستہ آہستہ چلنے لگا...... دور اسے گھر نظر آرہا تھا۔ وہ گھر پر نظریں جمائے چلا جارہا تھا۔ وہ خود نہیں چل رہا تھا۔ کوئی نامعلوم طاقت اُسے بڑھائے لئے جارہی تھی۔ وہ دروازے پر پہنچ کر رُک گیا۔ بہت دیر تک کھڑا رہا۔ دہلیز کے سامنے کا پتھر بہت گرم ہو چکا تھا۔ پاؤں جل اُٹھتے۔ وہ کبھی اس پاؤں پر، کبھی اس پاؤں پر بوجھ ڈالتا۔ اس کا دل خون ہو رہا تھا۔ کش مکشِ احساسات کی شدت سے سینے میں آگ سی لگی تھی۔ اس کا سر زور سے چکرایا۔ قریب تھا کہ گر پڑے لیکن اس نے بڑھ کر دروازے کی چوکھٹ تھام لی۔ اس کا کانپتا ہوا ہاتھ اوپر اٹھا پھر رُک گیا۔ پھر بڑھا۔ پھر رُکا۔ پھر بڑھا، آہستہ آہستہ، اور اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اپنی بیٹی کا دروازہ!

●●●

میگھ ملہار

''میگھ ملہار'' کے چار مختلف حصوں کی مثال چار دھاروں کی ہے جن کا بہاؤ ایک ہی سمت میں ہے جو کہیں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ چار حصے چار ایسے دوائر سے مماثل ہیں جو محیط اور پھیلاؤ رکھنے کے باوجود ایک ہی مرکز سے منسلک ہیں۔ ہندو، یونانی اور ایرانی دیولاماؤں میں بعض نکات کی مشابہت کی بنا پر ایک ہی موضوع یعنی فن کی سحر کاری اور فن کار کی حیات جاوداں کو فوکس میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ممتاز شیریں کی اپنی تنقید کی روشنی میں ممکن ہے افسانہ یہ تأثر قائم کرتا ہو لیکن کھلے ذہن سے افسانے کا مطالعہ کیا جائے تو اتفاق کرنا ممکن نہیں رہتا۔

— نذیر احمد

کفارہ

ایک کاغذ بالکل سادہ اور سپید میرے آگے بڑھایا گیا۔ میری کور ہوتی ہوئی آنکھیں جو تاریک خلا میں بھٹک بھٹک کر تھک رہی تھیں، اس مکمل سپیدی پر جم کر رہ گئیں۔

اچانک میری نظر کے آگے اس سپیدی پر کالا رنگ انڈیل دیا گیا، گہرا، قطرہ بہ قطرہ گرتا اور پھیلتا ہوا۔ پھر یہ کالا رنگ خشک ہو کر سفید کاغذ پر ایک چوڑی پٹی کی شکل میں محیط ہو گیا۔

مشیت کے ہاتھوں نے لکھا اور نقطوں کی لکیر کی طرف اشارہ کیا۔ جبر و قہر کی آواز آئی:

"اس پر دستخط کر دو۔"

سیاہی کی گنجان چوڑی پٹی کے نیچے میں نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے دستخط کر دیے۔

میں نے اپنی موت کے فرمان پر دستخط کر دیے تھے۔

موت دریچے سے لگی ہوئی مجھ سے ذرا سا دور کھڑی تھی اور مجھے اپنے عشوہ و انداز سے للچا رہی تھی۔ وہ ہیجان خیز اور شہوت انگیز تھی بھری بھری گدرائی ہوئی رانیں، کولھوں کی گولائیاں جلد سے چپکے ہوئے اسکرٹ سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر ریوے لان یا ہیلنا روبنسٹائن کا میک اَپ چڑھا ہوا تھا۔ دہکتے ہوئے سرخ ہوس ناک ہونٹوں پر حقارت اور سفاکی کا تبسم لیے وہ کہہ رہی تھی "یہ زندہ نہیں رہے گی۔"

"نہیں، نہیں ڈاکٹر سپاتا کورن ایسا مت کہو۔" سفید براق فرشتۂ رحمت نے چیخ کر

کہا۔ اس نے تیزی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تاکہ میں اس کی چیخ نہ سننے پاؤں، وہ سرگوشی میں ملتجیانہ انداز سے کہے جارہی تھی "نہیں ڈاکٹر اسے بچالو، ہم سب کو اس سے بڑا لگاؤ پیدا ہوگیا ہے۔ کیسی پیاری موٹی سی ہے... اس نے تکلیف سہنے میں کس خاموش طاقت اور قوت برداشت کا مظاہرہ کیا ہے۔ تین دن یہ درد کی اذیت میں مبتلا رہی اور مسکراتی رہی۔ ایک چیخ، ایک کراہنے کی آواز تک اس کے ہونٹوں سے نہیں نکلی۔"

گہرے پنسل سے کھنچی ہوئی مصنوعی ابروؤں کی کمانیں تن گئیں۔ درشت آواز نے کہا "تم لڑکیاں کتنی جذباتی بن سکتی ہو۔ علاج میں جانبداری یا تعلق سے کام نہیں لیا جاتا، سمجھیں! ضابطہ کی پابندی میں جذباتیت کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ امراض کا علاج ایک سائنس ہے۔ تمھیں ہر مریض پر مکمل بے تعلقی سے خالی از جذبات ہوکر توجہ دینی چاہیے۔ اس مریضہ میں یا کسی اور مریضہ میں تمھارے لیے کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ اس مریضہ کا معاملہ زیادہ خطرناک اور پیچیدہ ہے۔ زندگی کی امید بہت کم ہے۔" کوئی جاتے جاتے یہ الفاظ سن کر رک گیا جیسے اسے سخت تکلیف ہوئی ہو اور مڑ کر تلخ لہجے میں پوچھا "کیا انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے؟ یہ مریض تمھارے لیے صرف ایک 'کیس' ہے؟ خدا کا شکر ہے ڈاکٹر سپاناکورن کہ یہ کیس، تمھارے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر اسپنگر اس مریض کو بچانے کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑیں گے اور ہر قیمت پر اس کی زندگی بچانے کی کوشش کریں گے۔ میرے لیے یہ زندگی بہت قیمتی ہے۔ بہت عزیز۔"

اور وہ جو موت تھی، اس نے بے پروائی سے اپنے کندھے سکوڑ کر بات سنی ان سنی کر دی۔ "زیادہ سے زیادہ دس فیصد امکان ہے اس کے زندہ بچنے کا"۔ اس نے حرف آخر کے طور پر اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ کلیٹمنسٹرا کے ہاتھ تھے جن کے ناخنوں سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

جواب کی سفاکی سے مجروح ہوکر پیار میری طرف اس طرح بڑھا جیسے وہ مجھے اپنی آغوش میں لے کر موت کے آگے سپر بن جائے گا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور موت کا انتظار کرتی رہی... میری زندگی سبکدوش ہو کر گردو باد مرگ کا انتظار کرتی رہی۔

چنانچہ مجھے مرنا تھا۔ ایک بے معنی اور بے مصرف زندگی ناگہاں اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی۔ میں نے زندگی میں کوئی معرکہ سر نہیں کیا۔ کسی چیز کی تخلیق نہیں کی، کوئی ایسا کام نہیں کیا جو میری اب تک کی زندگی کا کوئی جواز بن سکتا۔ لیکن اب ایک نئی زندگی کی تخلیق شاید میری زندگی کا جواز بن جائے۔

میں نے آنکھیں کھولیں اور محبت کے چہرے پر نگاہ کی اس لمحہ مجھ پر منکشف ہوا کہ مجھے کتنا چاہا گیا ہے۔ میری کتنی قدر کی گئی ہے۔ میری زندگی بے کار اور بے مصرف ہوتے ہوئے بھی ان کے لیے بہت اہم اور قیمتی تھی جو مجھ سے محبت کرتے تھے۔ اس لمحہ، جب موت کا سرد ہاتھ مجھ پر منڈلا رہا تھا، یہ خیال بڑا اطمینان دہ تھا۔

محبت کا چہرہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اس چہرے پر... اندرونی کرب، اضطراب، اور پریشانی کے نشانات مرتسم تھے۔ درد کو چھپانے کی کوشش میں ایک ایک نس پر نا قابل برداشت بار پڑ رہا تھا اور محبت کے چہرے کو دیکھتے وقت موت کا عرفان میرے، بہت قریب تھا۔

کیا موت گناہ کی قیمت اور کرب جرم کا کفارہ تھی؟ میں تو گناہ سے نا آشنا تھی، یا کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے گناہ کی جھلک دیکھ لی ہو۔ خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو؟ اور پھر گناہ کو چھوٹا بڑا قرار دینے کا پیمانہ کس کے پاس ہے؟

محبت کے چہرے کو دیکھتے ہوئے موت کا عرفان میرے، بہت قریب تھا۔

محبت نے مجھے موت سے بچانے کے لیے اپنا بازو بڑھا رکھا تھا۔ اندر گڑی ہوئی نشتر کی سوئی لال لال قطرے چوس رہی تھی۔ سیال سرخی بتدریج بڑھ رہی تھی اور جب سرنج بھر گئی تو سوئی نکال لی گئی۔

...سوئی میرے ہاتھ کی باریک رگ کو ٹٹولتی رہی۔ بے شمار مرتبہ سوئی میری کلائی میں داخل ہوئی اور کہنی کے نیچے نیلی رگوں کے پھیلے ہوئے جال میں سرگرداں رہی۔ میرے

پلنگ کے پاس لگے ہوئے وحشت ناک سلنڈروں سے گلوکوس کا محلول سوئی کے ذریعے میرے جسم میں داخل ہوتا رہا۔

پھر کسی خطرناک دوا کا محلول قطرہ بہ قطرہ، آہستہ آہستہ میری رگ میں اترتا رہا۔

اور جب میں تھکن سے خستہ ہو کر، آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹی ہوئی تھی تو میں نے ایک خوف زدہ کرنے والی آواز کو سرزنش کرتے ہوئے سنا:

''یہ بہت خطرناک اور بہت طاقتور عرق ہے۔ اسے بدن میں بہت آہستہ جانا چاہیے۔ اگر بہاؤ تیز ہو گیا یا زیادہ مقدار بدن میں چلی گئی تو شدید انقباض پیدا ہو جانے اور اندرونی حصے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خطرہ ہے۔ ذرا سی لاپروائی مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ ساری رات مستقل نگہداشت کی ضرورت ہے۔''

ساری رات نگہداشت کی جاتی رہی اور لحہ بہ لحہ میری تکلیف اور درد کا اندراج ہوتا رہا۔

وہ دوسری رات تھی۔ خوفناک اور ڈراؤنی۔

اور یہ تیسری رات....

اب میری رگوں میں گرم انسانی خون ٹپک رہا تھا۔ بلڈ بینک کے یخ خانوں سے لیا ہوا خون نہیں بلکہ محبت کے بازو سے نکلا ہوا تازہ اور زندہ خون... جیسے جیسے یہ خون میرے جسم میں داخل ہو رہا تھا میرا بدن اپنی کھوئی ہوئی حرارت دوبارہ حاصل کر رہا تھا اور مجھ میں زندگی واپس آ رہی تھی۔ زندگی میرے پاس مسکراتی ہوئی، محبت کی مضطرب اور بے چین نظروں کو ڈھارس بندھاتی ہوئی کھڑی تھی۔

ایک ممنون طمانیت کے ساتھ دو نرم، محبت بھرے ہاتھوں نے میرے ہاتھوں کو تھپتھپایا۔ ایک ہاتھ نے بڑھ کر شفقت کے ساتھ میرے ماتھے سے بالوں کو پیچھے ہٹایا۔ ''تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

''تم ٹھیک ہو جاؤ گی'' زندگی کے فرشتے کے ہونٹوں سے ایک مہربان مسکراہٹ کی شعاعیں پھوٹیں۔ ''تم طاقت ور ہو تم میں بحرانی کیفیتوں کے شدائد برداشت کرنے کی

طاقت ہے، خطرے کو بڑھانے والی چیزیں تو خوف اور لاعلمی ہوتی ہیں۔ اس پورے وقفے میں تم نے بڑی بہادری سے کام لیا ہے اور ہم سے پورا پورا تعاون کیا ہے۔ تمھیں صورت حال کا صحیح شعور ہے اور اس صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے جو ارادے کی قوت چاہیے وہ بھی تم میں موجود ہے اور تم یقیناً اس پر قابو پا جاؤ گی۔"

میں نے پرسکون اور راضی بہ رضا مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور کہا "ہاں، ڈاکٹر اسپنگلر۔"

اور پھر میں نے محبت کے چہرے کو کھلے ہوئے وسیع دروازوں میں غائب ہوتے ہوئے دیکھا جو اس کے پیچھے بند ہو گئے۔ یہ آرفیوس کا چہرہ تھا جو روشنی کی دنیا میں غائب ہو گیا۔

ایک ان دیکھی جبری طاقت مجھے تاریکی کی ابدیت میں کھینچ لے گئی۔

پھر بھی یہ موت نہیں تھی جو میرے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ یہ زندگی کا فرشتہ تھا۔ اس کے سفید دانت ایک دلآویز اور مسحور کن مسکراہٹ میں ایک ثانیہ کے لیے چمکے اور پھر ایک سفید نقاب میں روپوش ہو گئے۔ سنہرے بالوں والا سر ایک سفید ٹوپ میں چھپ گیا اور نیلی آنکھیں جو شفقت سے جگمگاتی تھیں اب سنجیدہ اور متفکر ہو گئی تھیں۔

سفید لبادے اور سفید ٹوپ میں ڈھکے ہوئے کئی ایک خاموش سایوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ میں نے اپنی زندگی خدا کے ہاتھوں میں دے دی۔

ریڑھ کی ہڈی کے دہانے پر اعصابی مرکز میں اترتی ہوئی سوئی کے ساتھ موت مجھ میں داخل ہوئی اور یکے بعد دیگرے میرے سارے عضلات، میرا پورا بدن بے حس، سرد اور بے جان ہوتا گیا۔

میں نے ساکت اور بے جان پیکر کو میز پر سفید چادروں میں لپٹا ہوا چھوڑ دیا۔

میں نے اپنے آپ کو آزاد محسوس کیا۔ ایک دم آزاد اور بے قید، جیسے میں اپنے جسم کے زنداں سے رہا ہو کر ایک بے حد و بے کراں وسعت میں داخل ہو گئی تھی۔

میرے چاروں طرف وسیع زمین پھیلی ہوئی تھی، بنجر اور ویران زمین، دفعتاً میرے

پیروں کے نیچے زمین کانپنے لگی۔ زمین کانپتی لرزتی رہی اور اس طرح تشنج میں مبتلا رہی جیسے دردِزہ سے گزر رہی ہو۔ زمین نے اپنے اندر سے بیش بہا خزانے کا دفینہ باہر اگل دیا لیکن زمین کے بطن سے کوئی زندگی نمودار نہیں ہوئی۔

زمین کو ایک صاف، لمبے شگاف میں چاک کیا گیا۔ زمین کا بطن ایک کھلا ہوا خوں ریز کچا زخم تھا جس سے لہو ڈھل ڈھل کر نکل رہا تھا اور جذب ہو رہا تھا۔

''اسکرین ٹیڑھی ہوگئی ہے۔'' ایک دبی ہوئی سرگوشی نے جلدی سے کہا۔

''اسکرین ٹھیک کرو۔ ریڑھ کی ہڈی میں دیا ہوا بیہوشی کا انجکشن ذہن کو مکمل طور پر ماؤف نہیں کر دیتا چند ایک حصے جزوی طور پر زندہ اور ہوشیار رہتے ہیں۔''

زمین سے خون مسلسل بہہ رہا تھا، لیکن زمین کے بطن سے کوئی زندگی نمودار نہیں ہوئی... زمین کا بطن مضبوطی کے ساتھ بند کر دیا گیا۔ اس پر تمام زندگی کا راستہ بند کر دیا گیا۔

ساری زندگی اجاڑ اور بنجر تھی۔ ایک ویران خرابہ میرے چاروں طرف تنہائی اور سنسان ویرانی تھی۔ میں اس ویران خرابے کی وسعتوں میں بچھڑی ہوئی بے مقصد... گھومتی رہی۔

اچانک نہ جانے کہاں سے پہاڑوں کا ایک سلسلہ آیا۔ ان کی آنکھوں کو خیرہ کرنے والی برف پوش چوٹیاں نیلے آسمان کے پس منظر میں سمندر کی منجمد لہریں معلوم ہو رہی تھیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں سارے عناصر کے مقابلے میں امیدوں کی طرح سربلند کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان خوف کی تاریک اور گہری کھائیاں تھیں۔ میں امید و بیم کے درمیان، ایک گہری کھائی کے کنارے، مشیت کی دیوار کو مضبوطی سے تھامے کھڑی تھی۔ اور پہاڑ مل کر ایک ناقابل اندازہ اونچی اور ناقابل گزار دیوار میں تبدیل ہو گئے تھے۔ کیا یہ دیوار موت اور زندگی کے درمیان خط فاصل قائم کرنے والی دیوار تھی؟

ناقابل یقین طور پر، معجزانہ طور پر میں نے یہ دیوار پار کر لی اور اپنے آپ کو دیوار کی دوسری طرف پایا اور یہاں پھیلی ہوئی کھلی زمین کے بجائے بھول بھلیوں کی طرح کے راستے تھے۔ میں ان راستوں میں گم ہو گئی۔ بھول بھلیاں پیچ در پیچ کھلتی گئیں اور غلام گردشوں، صحن

خانوں اور اونچے اونچے ستونوں میں پھیل گئیں۔

اب میں انھیں پہچان سکتی تھی۔ وہ طویل کٹہرا جس کے سرے پر کئی سروں والے ناگ اپنے حسین پھن اٹھائے گویا جھوم رہے تھے۔ یہ سنگ بست راستے، یہ صحن خانے، یہ اونچے ستون 'اینگ کور' کے تھے۔

میں اپسراؤں کی قطاروں کے درمیان چلتی گئی۔ ان اپسراؤں کے سنوارے ہوئے لمبے لمبے بال، مرصع کندنی زیور اور نازک حسین بدن اپنے ہوش ربا خموں کے ساتھ رقص کے انداز میں جھکے ہوئے دیواروں پر ابدی نقوش میں مرتسم تھے۔

اس کے جمال کے کھلتے ہوئے گلاب کی کشش سے کھنچ کر۔

اس کے آموں سے لدے ہوئے درخت کی طرح حسین جسم کے پھلوں کی طرف۔

جس کسی نے نظر اٹھائی، پھر اس کی نظر اس نظارہ سے پلٹ کر واپس نہ آئی۔

باغ میں بہتے ہوئے چشمے کے سکون کی طرح، پونم کی چاندرات کی طرح،

وہ سرمستی اور رعنائی کا پیکر بن کر جاگ اٹھی ہے۔

ایک ایک گوشے سے ہر اپسرا زندہ ہو کر نیچے اتر آئی اور سب مل کر رقص میں شامل ہوگئیں۔

آسمانی جل پریاں ناچتے ناچتے ایک بے حدود بے کراں فضا میں پہنچ گئیں۔

ان کے ملکوتی جسموں کی تابناکی میں روحانی عظمت کے چراغ روشن تھے۔

یہ آسمانی اپسرائیں صرف درباری ناچنے والیاں تھیں، ناچ فن کارانہ اور مخصوص کھمیر وضع کا تھا۔ ساری اپسرائیں اسی طرح ناچ رہی تھیں جس طرح صدیوں پہلے سوریہ ورمن کے دربار میں انھوں نے ناچا ہوگا۔ نازک ہاتھ، مختلف زاویے بناتی ہوئی مخروطی انگلیاں، بل کھاتے ہوئے اعضا کا لوچ، نرم و نازک ہتھیلیاں جو جڑ کر کھلتے ہوئے کنول بن رہی تھیں... جو اپسرا ناچتی ہوئی گزرتی اس کی طرف جان لیوا ہیرے کی انگلی اٹھتی، جو شیوا نے بدصورت اور ناقص الخلقت بونے کو بخش دی تھی۔ اور تمام اپسرائیں ایک ایک کر

کے مردہ ہو کر گرتی گئیں۔

ننھی دبلی پتلی اور نازک جل پریاں برف کی طرح حسین، پر وقار، سرو قد اور راج ہنسوں جیسی Ballerinas میں بدل گئیں۔ جو جھیل کے سحر سے آزاد ہو کر چاندنی رات میں چائے کووسکی کی مسحور کن موسیقی پر ناچ رہی تھیں۔

راج ہنسوں کی شہزادی سب سے الگ ہو کر اکیلی اپنا آخری رقص کرتی رہی۔ فضا میں اس کی آواز ابھری۔ وہ اپنی موت کا نغمہ گا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی حرکات مضمحل ہوتی گئیں اور وہ فرش پر گر پڑی۔ اس کے نازک بدن میں ایک آخری تھرتھراہٹ پیدا ہوئی اور اسی حسن و تمکنت کے ساتھ وہ موت کی آغوش میں سو گئی۔

موت میں بھی ایک وقار اور حسن ہوتا ہے۔

نہیں، نہیں، موت تو بدصورت اور مضحک تھی۔ میں نے اصلی اور حکایاتی جنگوں کے مناظر سے منقوش دیواروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے سوچا۔ خوں ریزی کے مناظر، موت اور تباہی کے مناظر — اور یہ جہنم تھا، اوی سی، کبھی نہ بجھنے والی آگ سے بھرا ہوا الاؤ جو انسانی جسموں کے ایندھن پر جل رہا تھا۔ شعلوں کی تیز زبانیں گناہگاروں کے تعاقب میں لپک رہی تھیں۔

نٹ راجا دیوانہ وار اپنا وحشیانہ موت کا ناچ ناچتا رہا اور پھر اپنی ایک ٹانگ رقص کے انداز میں فضا میں معلق کیے ہوئے دوسری ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا پیر انسان کی گردن پر تھا اور انسانی زندگی اس کے پیر کے نیچے دم توڑ رہی تھی۔

ہندوستانی نٹ راجا، شیوا کے زیادہ شفیق کمبوڈین پیکر میں ڈھل گیا۔ اس کے موٹے ہونٹوں پر ایک مہربان بلکہ حوس ناک تبسم تھا۔ اس کے سر پر بالوں کی جٹائیں بل کھاتے ہوئے سانپوں کی طرح لپٹی ہوئی تھیں، جن پر نصف چاند کا ہالہ سجا ہوا تھا۔ شیوا تخریب کا دیوتا تھا اور اسی لیے تخلیق کا بھی دیوتا تھا کیوں کہ موت ہی کی کوکھ سے زندگی نکلتی ہے۔

اور وشنو نے اپنے ساتھ سینکڑوں دیوتاؤں اور راکششوں کو لے کر دودھ کے

ساگروں کو آبِ حیات کے لیے متھ ڈالا۔

کلدانی تصویروں کی گیلری سے گزرتی ہوئی میں اوپر چڑھنے لگی، مرکزی برج کی عبادت گاہ کی طرف بڑھنے لگی۔ اینگ کور کا مندر درجہ بہ درجہ بلند ہوتے ہوئے اتنا حسین اور متناسب لگتا تھا، جیسے پتھر میں موسیقی منجمد ہوگئی ہو۔ چار گوشوں کے چار برجوں کی منزلیں۔ مصری اہرام کے سے تکون بناتے، مرکزی برج کے کنول نما سر بفلک مینار کیلاش یا میرو کے پہاڑ کا اسم تھا۔ کیلاش، جو دیویوں، دیوتاؤں کا مسکن اور ساری کائنات کا مرکز تھا۔

لیکن اوپر راستہ تنگ اور تاریک تھا۔ سیڑھیاں اونچی اور چکنی تھیں۔ عبادت گاہ سے ایک شبیہ اگر بتیاں تھامے ہوئے جو طاق میں جلائی جاتی ہیں، نیچے اتر رہی تھیں۔ زعفرانی رنگ کی عبا میں ملبوس جو رومی چوغے کی طرح ڈھیلی ڈھالی تھی۔ اس نے مندر کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک اور شہ نشین پر بدھ کے مجسموں کی قطار بنی ہوئی تھی۔ یہ منظر بنگ کوک کے مشہور سنگ مرمر کے مندر کے جانے پہچانے مناظر میں تبدیل ہوگیا۔ بدھ کے سنہری مجسموں کی قطاریں، بیٹھے ہوئے، مراقبہ میں مستغرق، لیٹے ہوئے، استادہ ہاتھ اٹھا کر سمندروں کو پرسکون کرتے ہوئے۔

دنیاؤں کی لاعلمی سے بہت اوپر،

موسموں کے تغیر و تبدل کے سایوں سے بہت آگے، بدھ کا آئین چمک رہا ہے، اس طرح جیسے چاند موسم خزاں کے آسمان پر چمک کر کائنات کو اپنی محبت کی کرنوں سے پوتر بنا کر آغوش میں لے لیتا ہے۔

جسم ایک بدرو ہے ہر طرح کی غلاظت اور گندگی کا گھر۔

جاننے والے کے لیے زندگی ایک ننھے سے دیے کی لرزتی ہوئی لو ہے، جو ہوا کے ایک جھونکے میں بجھ جاتی ہے۔

وہ مقدس اور تمثیلی درخت سامنے تھا جس کے گھنے سائے تلے بدھ کو روشنی ملی تھی۔

میں نے درخت کی طرف دیکھا۔ وہاں روشنی نہیں تھی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ عظیم الشان کھمیر تہذیب کے ان شاندار کھنڈرات میں تنہا بھٹکتی ہوئی، بڑھتی ہوئی تاریکی سے میں خوفزدہ ہونے لگی۔ راستے سکڑ کر دوبارہ ایک بھول بھلیاں میں بدل گئے۔ ہوا رک گئی تھی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔

''آکسیجن کی جالی ٹھیک کرو۔ سانس لینے میں دقت ہو رہی ہے۔'' کہیں قریب کسی نے تیزی سے سرگوشی میں کہا۔ ''آکسیجن... آکسیجن۔''

ہوا میں تازگی تھی۔ میرے اردگرد روشنی تھی، میرے اوپر کھلتی ہوئی محرابیں شاندار تھیں، ستون سفید، مرمر کے بنے ہوئے۔ سنگ مرمر تقدس اور پاکیزگی کی ایک ملکوتی فضا کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ یہاں نہ کندہ کی ہوئی شکلیں تھیں، نہ مجسمے اور نہ تصویریں، لیکن پھر بھی اس سادگی اور پاکیزگی کا ایک اپنا تحیر خیز حسن اور جمال تھا۔ یہاں مورتیاں نہیں تھیں، خارجی علامات نہیں تھے کوئی 'واسطہ حسن قبول' نہ تھا لیکن ایک غیر مرئی برتر و بالا وجود جاری و ساری تھا۔ اپنے خالق سے ایک خالص اور بالراست تعلق کا احساس تھا۔

سفید بیضوی گنبد، مرمر کے ستون، پھیلی ہوئی محرابیں اور شفاف فانوس۔ یہ یقیناً بادشاہی مسجد تھی ان جانی، اجنبی راہوں پر بھٹک کر، میں گھر لوٹ آئی تھی۔ مرکزی قبے کے نیچے میں سجدے میں گر گئی اور خشوع وخضوع سے نماز پڑھنے لگی۔ میرا سارا وجود ایک عجیب اور انوکھی مسرت سے لبریز تھا۔ بالآخر مجھے سکون مل گیا۔

میں نے اٹھ کر اپنے اردگرد سراسیمہ ہو کر نظر ڈالی۔ میں کہاں تھی؟ ایسا معلوم ہو رہا تھا زمان ومکاں جہت اور پیمانے سے محروم ہو کر اپنا مفہوم کھو بیٹھے تھے اور میں گویا زماں و مکاں سے گزر کر ابدیت میں داخل ہو رہی تھی۔

یا اس کے برعکس ابدیت سے نکل کر 'اب' اور 'موجود' کی دنیا میں واپس آ رہی تھی؟ تمام وقت ازلی اور ابدی 'حال' ہے۔ جن راستوں سے ہم نہیں گزرے، وہاں کے قدموں کی چاپ، بازگشت بن کر یادوں میں گونجتی ہے۔

یہ نہ اینگ کور کے سرمئی ستون تھے اور نہ بادشاہی مسجد کے سنگ مرمر کے ستون بلکہ

معمولی عام قسم کے گول ستون تھے جن پر سفید اور خاکستری روغن چڑھا ہوا تھا۔

سنگ مرمر کی سیال، شفاف سپیدی صرف اسپتال کی دیواروں میں چنی ہوئی چمک دار ٹائلز میں تھی۔ ہاں یہ بنگ کوک کا سیونتھ ڈے اڈونٹسٹ سینی ٹے ریم ہاسپٹل تھا۔

میں، گویا، ابدیت کی لامتناہی وسعت کے دھندلکوں سے کھینچ کر قریبی اور متعین زماں ومکاں میں واپس لائی گئی تھی۔

اسپتال کی لفٹ نیچے آئی اور اس سے کوئی باہر نکلا۔ زعفرانی عبا نہیں، سفید لباس پہنے ہوئے۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ عیسائی مشن کی عورت تھی جو روزانہ مریضوں کے پڑھنے کے لیے اپنے مشن کا لٹریچر لاتی تھی۔ اس نے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ کاغذ پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا...

"خدا کی بادشاہت قریب ہے۔
مسیح موعود کا نزول قریب ہے۔"

آرمیگڈان کی بین الاقوامی جنگ، دنیا کی تمام قوموں کے درمیان زبردست ٹکراؤ، اور تقریباً پوری دنیا کے تہس نہس ہونے کے بعد زخموں سے نڈھال زمین کو سکون اور امن نصیب ہوگا۔

مسیح موعود کی آمد قریب ہے

مسیح کا نورانی شعاعوں میں زمین پر نزول ہوگا... یہ الفاظ ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئے اور میرے ذہن میں دوسری کتابوں کے الفاظ رینگنے لگے جن میں... مسیح کی دوبارہ آمد، ان کی حکومت میں امن اور خوشحالی، یوم حساب کی نزدیکی، مردوں کا زندہ ہو اٹھنا، روز جزا کا آخری انصاف۔ جی اٹھے ہوئے مردوں کا ایک لامتناہی اندھیرے سے نکل کر حیران و سراسیمہ الوہی نور کی خیرہ کن روشنی کے سامنے جمع ہونا... سب مذکور تھا۔

مجھے شہادت کی آرزو نہیں،
مجھے آخری دید کی تمنا نہیں،

مجھے صرف نفس مطمئنہ بخش دے۔

میرے سامنے پھیلا ہوا خلا، ایک سماوی روشنی سے معمور ہو گیا۔ طمانیت کا احساس میرے وجود میں پھیل گیا۔

روشنی کے ایک دھارے میں میری ننھی 'ریشمیں' میرے سامنے آئی، نومولود بچے کی شکل میں نہیں بلکہ میرے تصور کی 'ریشمیں' کے پیکر میں۔ گھنگریالے بالوں والی گڑیا گلابی جھالروں کے فراک میں سر جھکا کر اپنے خوبصورت بالوں کے گھونگر ہلاتی ہوئی۔ ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ لیے ہوئے... محبت سے بے قابو ہو کر میں نے اس کی طرف اپنی باہیں پھیلا دیں۔ لیکن میری ننھی 'ریشمیں' گریز پا نکلی۔ وہ روشنی کے تخت پر سوار ہو کر آسمانوں میں غائب ہو گئی۔ میری باہیں خالی کی خالی رہ گئیں۔

ساری ویرانی اور بنجر پن، ساری تنہائی میرے اپنے اندر تھی۔ سارا درد اور کرب پھر جاگ اٹھا۔ یہ درد اذیت دہ تھا۔ لاشعور کی وسعتوں میں آزادانہ گھومتا ہوا ذہن تکلیف دہ آگہی کے ایک نوکیلے نقطہ پر مرکوز کر دیا گیا۔ روح اپنی لاحاصل تلاش کے سفر سے لوٹ کر دوبارہ اپنے زنداں میں داخل ہو گئی، جو میرا جسم تھا۔

میں نے آہستہ آنکھیں کھولیں۔ روشنی میری کمزور آنکھوں کو تکلیف دے رہی تھی۔ 'روشنی' آپریشن کی میز پر پڑتی ہوئی خیرہ کن، بے رحم اور آنکھوں کو اندھا بنانے والی روشنی تھی۔ 'طمانیت' مارفیا یا کوئی اور خواب آور دوا تھی جو میرے درد کی شدت کو کم کرنے کے لیے دی گئی تھی لیکن کوئی مارفیا اس درد کو مٹا نہیں سکتا تھا جو میرے اپنے اندر موجود تھا، میرے وجود کی گہرائی میں زندہ تھا۔

میرے نفس نے آزاد ہو کر عالمگیر ویرانی اور تنہائی کا جو تصور دیکھا تھا وہ دراصل میرے اپنے شدید اندرونی احساس کا اظہار تھا۔ جیسے جیسے، آہستہ آہستہ میرے حواس مجتمع ہوتے گئے، ویرانی اور اجاڑ پن کا کائناتی احساس سمٹ کر ایک شدید ذاتی المیے میں ڈھل گیا۔

جیسے ہی دروازہ کھلا... آپریشن تھیٹر کے باہر اذیت دہ انتظار کا اعصابی تشنج ختم ہوا اور

وہ اندر داخل ہوئے لیکن ڈاکٹر نے مصافحتی انداز میں ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور الگ لے گیا۔ میں ڈاکٹر کی سرگوشیانہ لہجے میں گفتگو سن سکتی تھی "مجھے افسوس ہے، بے حد افسوس بچہ کو بچا نہیں سکا۔ ہم نے دل کے مساج کا طریقہ بھی آزمایا مگر بے کار... آخری لمحہ تک ہم نے اس کے دل کی دھڑکن پر کان لگائے رکھے۔ وہ زندہ تھا۔ موت پیدائش کے فوراً بعد ہوئی۔ ایک طرح سے پیدائش اور موت دونوں ایک ساتھ ہی واقع ہوئیں۔"

صمیم دل سے مانگی ہوئی آخری دعا نے شاید یہ ننھی زندگی ایک دوسری، زیادہ 'قیمتی' زندگی کے بدلے میں بھینٹ دے دی تھی۔

کیا دل کی گہرائیوں سے مانگی ہوئی وہ دعا قبول ہوئی تھی؟ ان کی کربناک اور مضطرب آنکھیں میری طرف پلٹیں۔

ڈاکٹر نے جلدی سے انھیں اطمینان دلانے کی کوشش کی "اب یہ ٹھیک ہیں، آہستہ آہستہ ہوش آرہا ہے۔ جلد ہی انھیں ان کے اسپیشل وارڈ میں منتقل کر دیا جائے گا اور آپ ان سے بات کر سکیں گے۔ اس ابتلا سے وہ بڑی ہمت سے گزریں۔ بڑا پیچیدہ اور خطرناک کیس تھا۔ لیکن اب خطرے کی سرحد پار ہو گئی ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سیزیرین آپریشن بذاتہ خطرناک نہیں ہوتا گو کہ بڑا آپریشن ہے کیوں کہ شگاف براہ راست پیٹ کے اندر اترتا ہے۔ لیکن آج کل سلفا ڈرگس اور اینٹی بایوٹکس کے اس دور میں سمیّت پھیلنے اور موت کے خطرات بالکل دور ہو گئے ہیں۔ آپ کی بیوی خطرے سے باہر ہیں۔ ابھی ان کی حالت بہت نازک ہے اور انتہائی حفاظت اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔ بچہ کی موت کے بارے میں انھیں ابھی نہ بتایا جائے تو بہتر ہوگا۔"

میرے دل پر ایک سردی کی تہہ سی چڑھ گئی۔ میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ میرے سینے میں جو نئی محبت کا شعلہ بھڑکا تھا وہ سرد ہو گیا۔

موت مجھے چھوتے ہوئے گزر گئی لیکن جاتے جاتے وہ تاوان میں اس ننھی سی زندگی کو لے گئی جو میرے اندر متحرک تھی۔ وہ ننھا وجود جو اپنی نشو ونما کی ساری منزلوں میں،

میرے تخیل میں اتنا واضح طور پر موجود تھا، اس کی تقدیر میں صرف ایک لحہ کی زندگی تھی۔
میں نے زندگی کو نہیں، موت کو جنم دینے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔
میں ندامت اور غم کے احساس میں ڈوب گئی۔ میری آنکھیں خشک تھیں۔ آنسوؤں کے پاس بھی اس درد کا علاج نہیں تھا۔
میں تنہا تھی، اپنے کرب اور غم کے ساتھ، بالکل تنہا۔
میں اس ساری قیامت سے موت کے لیے گزری تھی یا پیدائش کے لیے؟
پیدائش ہوئی یقیناً لیکن...
یہ پیدائش میرے لیے نبوت کی طرح سخت اور تلخ اذیت بن گئی۔
یہ بہت بڑا کفارہ تھا۔
اس کفارے کے لیے مجھے کیوں منتخب کیا گیا؟

●●●

آندھی میں چراغ

کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

اس نے آہستہ سے پوچھا ''کون؟'' اور اپنے پتی کی آواز سن کر اس نے چٹخنی کھول دی۔ وہ اندر آ گیا اور اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ کتنا تھکا ہوا تھا وہ۔ اس کے سینے میں تر بالوں کے گچھے سے بن رہے تھے۔ جتنا جلدی اس کے تھکے ہوئے بوجھل، بھاری پاؤں اور پھولا ہوا پیٹ اسے لے جا سکتے تھے، وہ اندر گئی اور گھڑے میں سے پانی نکال کر لے آئی۔ وہ پانی ڈالتی جا رہی تھی اور وہ ہاتھ منہ دھو رہا تھا۔ پسینے میں ڈوبے ہوئے گرم چہرے پر پانی کی ٹھنڈک اسے ایسی بھلی لگ رہی تھی کہ وہ چلو میں پانی بھر بھر کر منہ پر اچھالنے لگا۔ ٹھنڈے پانی کے لمس سے اسے فرحت محسوس ہوئی اور وہ محبت اور تشکر کی نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھتے ہوئے چارپائی پر جا بیٹھا اور وہ اسے کھانا دینے کے لیے تختہ بچھانے لگی۔

''رہنے دو نیلا میں کچھ دیر بعد کھاؤں گا۔ یہاں بیٹھو کچھ دیر۔''

''نہیں، پہلے کھا لو، بعد میں باتیں ہوں گی۔'' اس نے کچھ شرماتے ہوئے جواب دیا۔ وہ تختے پر بیٹھ گیا۔ کھانا پروس کر وہ پھر رسوئی میں گئی۔ اچانک اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں ایک تڑپا دینے والی ٹیس اٹھی۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ درمیانی دروازہ کھلا تھا۔ اننت نے اسے دیکھ لیا۔ وہ کھانا چھوڑ کر اور جلدی سے ہاتھ

دھوکر رسوئی کی طرف بھاگا "کیا ہوا نیلا، نیلا کیا ہوا تمھیں؟" وہ اس پر جھک گیا۔
"نہیں تو، کچھ بھی نہیں، یونہی چکر آ گیا تھا۔ ایسے دنوں چکر آ ہی جایا کرتے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔" لیکن انت نے اس کے چہرے کو دیکھ کر جان لیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کی تسلی کے لیے وہ کہہ رہی تھی۔ "کوئی بات نہیں، تم جا کر کھانا کھاؤ۔"
"مجھے بھوک نہیں نیلا!" وہ بھی جھوٹ بول رہا تھا۔
نیلا کو پھر درد اٹھا۔ اس نے اپنے چہرے کو دونوں گھٹنوں میں چھپالیا تاکہ انت اس کے چہرے پر کرب کے آثار نہ دیکھ لے۔ لیکن انت نے نیلا کو نہایت احتیاط اور نرمی سے بازوؤں پر اٹھالیا۔ اور اندر چارپائی پر لٹا دیا۔ پاس کی کھڑکی کے نیچے کے پٹ بند کر کے اس نے بوسیدہ کمبل نہایت احتیاط اور نرمی سے اڑھا دیا۔ نیلا نے پھر کہا... "اب مجھے آرام ہے۔ تم جاؤ کھانا کھالو۔"
"مجھے بھوک نہیں ہے نیلا۔" وہ نیلا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چارپائی پر بیٹھا رہا۔ وہ اپنی بیوی کو تکے جا رہا تھا۔ پریشان، دکھ بھری نظروں سے۔ نیلا بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں پرستش تھی اور محبت تھی۔
ان کے جسموں میں کوئی کشش نہ تھی۔ انت کا سوکھا مارا جسم ایک بوسیدہ سی ڈھیلی ڈھالی قمیص اور دھوتی میں چھپا ہوا تھا۔ اور نیلا کا پیٹ ہمیشہ پھولا رہتا تھا۔ وہ موٹی موٹی میل خورے رنگوں کی ساریاں پہنے رہتی تاکہ چولھے کے پاس کام کرنے سے جو میل بیٹھ جاتا ہے وہ دکھائی نہ دے۔ وہ کنگھی چوٹی کیے بغیر دن بھر کام میں مصروف رہتی تھی۔ وہ خوبصورت نہ تھے۔ نوجوانی میں جو کچھ ذرا سی کشش بھی ان میں تھی، وہ بھی مفلسی نے چھین لی تھی۔ انت کا سانولا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ اس کے گال اندر دھنس گئے تھے۔ نیلا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد کالے حلقے نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کی عمر صرف ستائیس سال تھی لیکن وہ ادھیڑ دکھائی دینے لگی تھی۔ نہ جانے وہ کیا چیز تھی جس نے ان کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب کر دیا تھا۔ یہ کشش ظاہری حسن اور جسمانی

کشش سے کہیں زیادہ گہری تھی۔

ماں باپ اور مذہب نے ایک دن ان کا سمبندھ کر دیا اور وہ ایک دوسرے کے ہو گئے۔ نیلا جانتی تھی پتی کی پرستش کرنی چاہیے، اس کی خدمت کرنی چاہیے اور وہ اس کی پرستش کرنے لگی، خدمت کرنے لگی۔ اننت جانتا تھا کہ ایک کمزوری چیز اس کے سپرد کی گئی ہے اس کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کرے۔ اس کا ہر طرح خیال رکھے۔ اس کے لیے کمائے، اسے سہارا دے اور اسے چاہے۔ یہ کمزوری چیز جو ساری زندگی اس کا ساتھ دے گی، اس کا گھر سنبھالے گی، اس کے بچوں کی ماں ہوگی، اس طرح ان کے دل مل گئے۔ وہ ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے۔ اور برسوں کی رفاقت نے ان کی محبت کو گہرا کر دیا تھا۔ برسوں کے ساتھ نے اور ان ننھے ننھے بچوں نے ان کے درمیان دلوں کے اس ملاپ کو مضبوط کر دیا تھا۔

بچے جواب تک باہر کھیل رہے تھے، ناچتے کودتے اندر آ گئے۔ ''ماں بھوک لگ رہی ہے، ہاں!'' اس نے اٹھنا چاہا۔ اننت نے اسے زبردستی لٹا دیا۔ ''نہیں تم سو جاؤ، میں ان سب کو کھانا دے لوں گا۔'' بچوں کو حریص نگاہوں سے کھانے کو تکتے اور بڑے بڑے نوالے بنا کر کھاتے دیکھ کر اور اننت کو بے ڈھنگے پن سے پروستے دیکھ کر اسے ہنسی آ گئی۔ لیکن وہ زور سے نہ ہنس سکی۔ اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں پھر اچانک وہی درد اٹھ رہا تھا۔ اس نے منھ موڑ لیا۔ لیکن اننت نے اس کی آنکھوں کا کرب دیکھ لیا تھا۔ وہ بچوں کو چھوڑ کر اس کے پاس آ گیا۔

''نیلا کیا تکلیف ہے تمھیں؟'' اس نے بے قرار لہجے میں پوچھا۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ... کہ مجھے... مجھے درد شروع ہو گئے ہیں۔'' اس نے رُک رُک کر جواب دیا۔

''نیلا تم نے مجھے بتایا بھی نہیں کہ تمھیں....''

''نہیں، ابھی آٹھواں مہینہ ہی تو ہے، جانے کیوں ابھی سے....''

''میں تمھیں ہسپتال لے جاؤں گا، نیلا۔'' وہ اپنا بوسیدہ کوٹ پہن کر تانگہ لانے چلا گیا۔ بچوں نے بھی ماں کو پریشان دیکھ کر جلدی جلدی کھانا کھالیا اور سب چارپائی کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ ''تمھالا جی اچھا نہیں ماں؟ کیوں چھولہی ہو ماں؟ بکھال ہے''۔ ''ماں دلد (درد) ہے''۔ ''کہاں؟ میں چوم لوں تو اچھا ہو جائے گا نا۔'' اور سب سے چھوٹا بچہ اسے چومنے لگا۔ اس کے پیٹ کو اس کے ہاتھوں اور بازوؤں کو، اس کے پیروں کو۔ اس کے سینے میں مسرت جاگ اٹھی۔ کتنا پیار کرتے ہیں اسے۔ اس نے ننھے کو اٹھا کر خوب چوما اور پہلو میں لٹا لیا۔ آخر اس نے زندگی میں کیا سکھ پایا تھا۔ مفلسی، بھوک، مصیبتیں، لمحہ بھر چین آرام نصیب نہیں۔ لیکن بچوں کی یہ محبت، شوہر کی یہ رفاقت، یہی تو اس کی زندگی کا سرمایہ تھا۔

تانگہ آ گیا تھا۔ اننت بچوں کو چمکار کر ہمسائے کے ہاں چھوڑ آیا۔ ''دیکھو میں کل صبح تمھیں لے جاؤں گا۔ اور تم ایک ننھا سا گڈا دیکھو گے۔ تمھارا ننھا بھائی۔ گڈے کا سا۔'' اس نے نیلا کو اپنے بازوؤں پر اٹھانا چاہا۔ لیکن وہ خود تیزی سے اٹھ کر تانگہ میں جا بیٹھی....

میٹرنٹی وارڈس اوپر تھے اور سیڑھیاں بہت اونچائی تک چلی گئی تھیں۔ نیلا کے قدم ڈگمگا گئے۔

''میرا سہارا لو نیلا۔'' اننت نے کہا۔ پھر خود ہی اسے اپنے بازو سے تھام کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں۔ چار پانچ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد پھر وہی تڑپا دینے والی ٹیس اٹھی اور اس نے اپنے چہرے کا کرب چھپانے کے لیے اپنا سر اننت کے کندھے پر ڈال دیا۔

وہ لیبر وارڈ میں پڑی انتظار کرتی رہی۔ اب دو دو منٹوں کے وقفے سے درد اٹھ رہا تھا۔ پیٹ میں، ریڑھ کی ہڈی کے زیریں حصے میں، کولہوں میں، اور ہر دفعہ یہ درد شدید تر ہوتا جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پڑتی تھیں۔ وہ اپنے نچلے ہونٹ کو زور سے کاٹ لیتی۔ چیخوں اور کراہوں کو روکنے کے لیے وہ نہیں چاہتی تھی کہ اننت اس کی چیخوں کو سنے۔ وہ جان لے گا کہ اسے بے انتہا تکلیف ہو رہی ہے اور....

اور امنت بند دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ اس پر ایک دیوانگی سی طاری تھی۔ وہ بے تاب ہو کر ٹہلنے لگا۔ پھر بنچ پر آکر بیٹھ جاتا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں گھورتا پھر غور سے سننے لگتا۔ ارے اندر سے تو کوئی آواز بھی نہیں آ رہی... لیبر وارڈ تو ہمیشہ چیخوں سے گونجتا رہتا ہے۔ کہیں... اتنی کمزور تھی وہ۔ کیا اس سخت آزمائش سے بچ نکلے گی؟ اور ایک ناقابل بیان درد نے اس کے دل کو جکڑ لیا۔ سر جھکا کر اس نے اپنے دل کی گہرائیوں سے ایک چھوٹی سی دعا مانگی۔ پھر اس نے اپنے آپ سے کہا... اگر نیلا اس دفعہ بچ جائے تو وہ کبھی اسے بچہ نہ ہونے دے گا۔ اس نے پھر دروازے سے کان لگا کر سنا۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی... لیکن نیلا ہمیشہ یونہی صبر سے اس زندگی اور موت کی کش مکش کو طے کر جاتی ہے۔ کسی بچے کے وقت اس نے کبھی اس کی چیخیں نہ سنی تھیں۔ یہ سوچ کر اسے کچھ تسلی ہوئی اور وہ بنچ پر جا بیٹھا اور پھر وہی انتظار، اذیت ناک انتظار، جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔ ان چند لمحوں کی اذیت میں زندگی بھر کی تکلیفوں کا نچوڑ تھا۔ اور اس کی بے قرار نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اب کھلے گا... اب کھلے گا....

...اور اندر نیلا بے ہوش پڑی تھی۔ بچہ بہت چھوٹا تھا۔ اس لیے جلدی پیدائش ہو گئی۔ اس کے نحیف سینے میں رمق بھر جان ہی باقی تھی۔ آنول کاٹنے ہی میں وہ ہچکی لے کر خاموش ہو گیا۔ نیلا کو اب ہوش آ گیا تھا۔ اس نے بچے کے متعلق پوچھا بھی نہیں۔ اس کی کسی چھپی ہوئی حس نے یہ جان لیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ یہ بھی نہیں پوچھا بچہ ہے یا بچی۔ نرس نے اسے آہستہ سے بتایا بچہ مر چکا ہے اور اسے تسلی دی۔ ''آٹھ مہینے کے بچے کبھی زندہ نہیں رہتے۔ اگر اب نہیں تو بعد میں مر ہی جاتا۔'' نیلا نے کوئی جواب نہیں دیا اور جب نرس نے بچے کو اٹھا کر دکھایا تو ایک نظر دیکھا۔ نازک نقش زرد چہرہ لکڑی کی طرح سوکھا جسم۔ اس نے آنکھیں پھیر لیں۔ دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر ربر کی شیٹ پر ڈھلک گئے۔ اور محبت اور ماستا کی وہ گرم گرم دھارا جو نئے سرے سے امڈ کر اس کے سینے میں بہہ آئی تھی، سرد ہو کر منجمد ہو گئی۔

دروازہ کھلا۔ نرس باہر آئی۔ اننت اٹھ کھڑا ہوا اور پاگلوں کی طرح نرس کو گھورنے لگا۔ اس سے کچھ پوچھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اور نرس نے بتایا بچہ مر چکا ہے۔ بچہ کا خیال اسے بالکل نہیں آیا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں یہی خیال پھڑ پھڑا رہا تھا، کاش نیلا بچ گئی ہو۔ اور اسی پاگلوں کے سے انداز میں اس نے نرس سے پوچھا "اور میری بیوی؟" اس نے شاید یہ نہیں سنا۔ وہ کہہ رہی تھی "آٹھ مہینے کے بچے نہیں جیتے۔ اب نہیں تو کبھی نہ کبھی مر ہی جاتا۔ اس کی اتنی فکر نہ کرو...." اور وہ واقعی پاگل ہو گیا۔ وہ نرس کو جھنجھوڑ کر چیخا "اور میری بیوی؟" اور جواب کا انتظار کیے بغیر دروازے میں گھسنے لگا۔ نرس نے اسے ڈانٹا "کہاں جا رہے ہو۔ تم ابھی اندر نہیں جا سکتے۔ کافی لے آؤ، اپنی بیوی کے لیے۔" بیوی کے لیے کافی! فرط مسرت سے اسکی چیخ نکل گئی۔ پھر اسے گرد و پیش کا خیال آیا۔ وہ جلدی باہر نکل آیا اور قریب کے ہوٹل سے کافی لے آیا۔

وہ نڈھال پڑی تھی۔ اس نے کافی اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا "نیلا کیسی ہے طبیعت تمھاری؟"

"اچھی ہوں۔ صرف کمزوری ہے۔ جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا ہے۔ ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ لیکن اس دفعہ کمزوری کی وجہ سے تکلیف زیادہ ہے۔"

دوسری صبح کو بھی نیلا یونہی نڈھال پڑی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلدی کی چھوٹ تھی۔ جیسے اس کے جسم سے سارا خون چوس لیا گیا ہو۔ اس نے اس پر جھک کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کتنا سرد تھا وہ ہاتھ۔ اس نے آہستہ سے پکارا "نیلا!" نیلا نے آنکھیں کھولیں اور بمشکل سر موڑا۔ اسی لمحے نرس اور لیڈی ڈاکٹر وارڈ میں آ گئیں۔ وہ نیلا کا ہاتھ چھوڑ کر الگ جا کھڑا ہوا۔ نرس نے نیلا کے انگوٹھے میں سوئی چبھو کر خون نکالا۔ بہت دبانے پر خون کا ایک ننھا سا قطرہ بمشکل نکلا اور اس نے اس قطرے کو کاغذ پر چپکا کر لال دھاریوں والے کاغذ کے ساتھ لگا کر دیکھا۔ ڈاکٹر نے پوچھا کتنا ہیموگلوبن؟ "پندرہ فی صدی۔" اس نے جواب دیا۔

''پندرہ فی صدی؟'' ڈاکٹر کے منھ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے اننت کو باہر بلایا۔
''تم جانتے ہو تمھاری بیوی کی کیا حالت ہے۔ اس کے جسم میں قطرہ بھر بھی خون نہیں۔ جانتے ہو اس کے خون میں کتنا ہیموگلوبن ہے۔ پندرہ فی صدی! تم مرد، خود غرض مرد، تم کیا جانو اس پر کیا گزرتی ہے۔ تمھیں اپنی پڑی رہتی ہے ہمیشہ۔ شادی کر لینا اور پھر ہر سال ایک بچہ دے دینا، بس یہی معلوم ہے تم لوگوں کو۔ کچھ اپنی بیوی کا بھی خیال کیا؟ حمل کے دنوں میں اسے دودھ اور پھل دیے ہوتے۔ ٹانک پلائے ہوتے۔ لوریکسٹریکٹ انجکشن دلوائے ہوتے۔ ستر بہتر فی صدی ہیموگلوبن بھی ہو تو اس حالت میں عورتیں ٹانک پیتی ہیں، انجکشن لیتی ہیں۔ زچہ اور خون میں پندرہ فی صدی ہیموگلوبن۔'' اور پھر اس نے دانت پیس کر کہا ''اور تم لوگ صرف یہ خوب جانتے ہو کہ جب وہ موت کے منھ میں پہنچ جائے تو اسے ہسپتال میں لا کر پٹک دیا جائے۔'' وہ نیلا کو نہیں چاہتا؟ نیلا کا خیال نہیں رکھتا؟ ڈاکٹر کا ہر جملہ ہتھوڑے کی ضرب بن کر اس کے دل پر پڑ رہا تھا... پھل اور دودھ اور ٹانک۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو کیا وہ ان چیزوں کا ڈھیر نہ لگا دیتا نیلا کے لیے۔ اور اب نیلا کے جسم میں قطرہ برابر خون نہیں، نیلا موت کے منھ میں ہے.... پھر ڈاکٹر کی آواز کچھ دھیمی پڑ گئی۔ ''سنو، اسے بہت سے لوریکسٹریکٹ انجکشن دینے پڑیں گے اور ہر انجکشن کی قیمت اڑھائی سے تین روپے ہے۔ کیا تم ادا کر سکو گے ان کی قیمت؟'' اس سے اس کا جی چاہا کہ ڈاکٹر کے پاؤں پکڑ لے اور کہے ''میں کسی طرح ادا کر دوں گا ڈاکٹر! بس تم میری بیوی کو بچا لو۔''

اور ہسپتال کا بل چکانے کے لیے اس نے قرض لیا۔ دفتر کو بس میں جانا چھوڑ دیا۔ سستے سگریٹ بھی پینے ترک کر دیے۔ ان چند ٹکوں سے وہ نیلا کے لیے پھل خرید لے جاتا۔ نارنگیاں اور سیب، لیکن چھوٹے سے چھوٹا سیب بھی چار آنے میں آتا تھا.... اور نیلا کو دن میں تین چار بار انجکشن دیے جاتے۔

لیکن وہ یونہی نڈھال پڑی رہی۔ اس کے چہرے کا رنگ سفید سے سفید تر ہوتا جا رہا تھا۔ خون کی کمی کی وجہ سے اس کے ہاتھ پاؤں اتنے سرد ہو گئے تھے کہ ان میں گرمی قائم

رکھنے کے لیے ہمیشہ ربر کے ساکس سے چڑھائے جاتے، اور گرم پانی کی تھیلیاں اس کے پاؤں کے نیچے رکھی رہتیں اور وہ اس کے پلنگ کے قریب بیٹھا گھنٹوں اسے تکا کرتا اور نیلا کی نگاہوں کا کرب اس کی آنکھوں میں منتقل ہو جاتا۔ لیکن وہ اس کرب کو نیلا پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا ''تم اچھی ہو جاؤ گی نیلا..ضرور...اور میں تمھیں قیمتی ٹانک لا دوں گا۔ اور پھل اور دودھ، تم تندرست ہو جاؤ گی، سچ نیلا میں روپے جمع کر رہا ہوں...''۔ نیلا مسکراہٹ سے اسے تک رہی تھی اور اچانک معلوم ہو جاتا کہ اس کی آنکھوں میں امید کی چمک کبھی کی بجھ گئی ہے۔ اداس مسکراہٹ صرف اس کی تسلی کے لیے ہے۔ اور اس کا دل خون ہو جاتا۔ جب کبھی وہ بچوں کو لے آتا اور وہ ماں کے پلنگ کے گرد کھڑے اسے حیران نگاہوں سے دیکھا کرتے تو وہ بچوں کو عجیب سے انداز سے تکتی، جیسے انھیں چھوڑ کر کہیں جا رہی ہو۔

اور ایک رات وہ مسلسل کراہتی رہی۔ اس کا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ رگوں میں دیے ہوئے ان بیسیوں انجکشنوں کا درد کمزوری کی وجہ سے شدید ہو رہا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلاتی تو درد کے مارے بلبلا اٹھتی۔ اور اننت نے نرسوں کی منت کی کہ آج رات اسے یہیں سو جانے کی اجازت مل جائے۔ وہ یہیں کہیں کونے میں پڑا رہے گا۔ لیکن انھوں نے جھڑک کر اسے نکال دیا۔ رات کے نو بجے کے بعد کوئی بھی یہاں نہیں رہ سکتا۔ لیکن نیلا نے دیکھا تھا کہ بازو کے اسپیشل وارڈ والی لڑکی کا شوہر رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ تک اس کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ اور یہی نرسیں خاموشی سے بند دروازے کا قفل کھول دیتی تھیں اور جب وہ لڑکی بھی اس کے شوہر کو دور تک پہنچا کر خوشی سے جھومتی ہوئی واپس آئی تو نرسیں اسے اندر چھوڑنے کے لیے دروازے کے پاس ہی، جو نیلا کے کمرے کے سامنے تھا، کھڑی رہتیں اور ہنس ہنس کر اسے چھیڑتیں ''بڑی محبت ہے تم دونوں میں....'' غریبوں کی محبت کو تو کوئی نہیں پہچانتا۔ پہچانے بھی تو پروا نہیں کرتا۔ اس نے ایک آہ بھر کر کروٹ لی اور درد سے تڑپ کر کراہی۔ وہ رات بھر کراہتی رہی۔ کوئی اس کے پاس نہیں آیا۔ کبھی کبھی

چڑچڑاتی ہوئی نرس آ کر اس سے کہتی، ''اتنے زور سے کراہتی ہے۔ دوسرے مریضوں کی نیند خراب نہیں ہوتی؟'' اور وہ اسے نیند کا انجکشن دے کر چلی جاتی۔ اس رات اسے نیند کے کئی انجکشن دیے گئے۔ لیکن اسے نیند نہ آئی....

صبح کو وہ بالکل خاموش تھی۔ اب اس میں کراہنے کی بھی سکت نہ تھی۔ اننت آیا تو اسے خاموش دیکھ کر سمجھا کہ اب اسے تکلیف نہیں ہے۔ لیکن شام کو لیڈی ڈاکٹر نے نیلا کا معائنہ کر کے مایوسی سے سر ہلایا۔ اور اننت کو باہر بلا کر کہا ''اب ایک ہی امید ہے۔''

''وہ کیا ہے؟'' وہ پاگلوں کی طرح چلایا۔

''اس کے جسم میں انسانی خون داخل کرنا چاہیے۔''

''تو میرے خون کا معائنہ کیجیے۔''

اور اس کے خون کا معائنہ کیا گیا۔ ''یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اسے بہت سے خون کی ضرورت ہے۔ ہر روز تھوڑا تھوڑا خون اس کے جسم میں داخل کیا جائے گا۔ کیا تم اتنا خون دے سکتے ہو؟'' ڈاکٹر نے سوچا تھا کہ یہ سوکھا سا انسان! اس کے جسم میں بھی کیا خون ہوگا۔ وہ اپنی بیوی کے لیے، جس کے بچنے کی امید بہت کم ہے، شاید خون نہ دے سکے۔ لیکن اننت نے ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہا ہو، تم اتنے خون کی پوچھ رہی ہو، میری بیوی کو اگر میرا خون بچا سکتا ہے تو تم میرے جسم کا سارا خون نچوڑ سکتی ہو۔

گرم گرم خون نکالا گیا بائیس سی سی۔ اور اننت کا یہ خون جس کی ایک ایک بوند میں محبت کی گرمی تھی، نیلا کے جسم میں منتقل کیا گیا۔ اس کی ساری رگوں میں ہلکی سی گرمی دوڑ گئی۔ اور اس کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔ اننت خوشی سے پاگل ہو گیا۔ اس نے نیلا کا ہاتھ، جو اب کچھ گرم سا تھا، اپنے ہاتھ میں لے کر کہا... ''نیلا اب تو تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے، تمھارے جسم میں انسانی خون داخل کیا جائے تو تم جلد اچھی ہو جاؤ گی۔''

''انسانی خون؟ لیکن کون دے گا۔ اور میری طرف سے کسی دوسرے کو....''

اننت نے ایک نکھری ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''اب جو انجکشن تمھیں دیا گیا

ہے، وہ انسانی خون ہی کا تھا... مگر۔''

''لیکن، لیکن، کون....'' اور پھر وہ جان گئی اور اس نے محبت بھری نگاہوں سے، جن میں اب چمک بھی آ گئی تھی، اپنے شوہر کو دیکھا۔ پھر ان نگاہوں میں گلہ بیدار ہوا اور وہ کہنے لگی... لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے، اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ چہرہ نیلا پڑتا گیا۔ اننت اس پر جھک گیا ''نیلا، نیلا۔'' وہ چلایا... وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے کان قریب لا کر سنا، وہ کہہ رہی تھی ''بچے، میرے بچے، میں انھیں دیکھنا چاہتی ہوں۔'' وہ سرپٹ بھاگا اور بچوں کو لے آیا۔ نیلا نے سب بچوں پر باری باری نگاہیں جما کر دیکھا، چھوٹے کو اٹھانا چاہا۔ لیکن اٹھتے ہوئے ہاتھ بے بسی سے گر گئے۔ اس نے بڑی دقت سے کچھ دیر اپنی نظروں کو اننت پر جمائے رکھا۔ لبوں پر پھر وہی اداس مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ اننت پلنگ کی پٹی پر سر پٹک پٹک کر چلانے لگا ''نیلا، نیلا۔'' بچے حیرانی سے ماں کو تک رہے تھے۔ وہ چھوٹے بچوں کو سمیٹ کر کرسی پر گر پڑا۔ بڑے بچے بھی باپ کی کرسی کے پاس کھڑے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہے، موت کا راز ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ نرسیں اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر کے اس پر سفید چادر ڈال رہی تھیں۔ سفید چادر اور اتنا ہی سفید چہرہ، کالے بکھرے ہوئے بال۔ وہ سکتے کے عالم میں بیٹھا گھورتا رہا۔ لیڈی ڈاکٹر بولی ''تم اس کی ارتھی کا انتظام کرو۔ صبح اسے لے جا سکتے ہو۔ اس وقت تک نعش نیچے ایک کمرے میں رکھی جائے گی... اور بل بھی تم کل چکا سکتے ہو۔ مجھے افسوس ہے تمھاری بیوی....'' لیکن وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا، جیسے اس کے تمام حواس شل ہو گئے تھے۔ لیکن چند اور تیز آواز نے اسے چونکا دیا۔ نعش لے جانے والی نیچی ذات کی عورتیں اسٹریچر لیے جا رہی تھیں ''جب تک ہمیں پہلے ہی ایک ایک روپیہ نہ دے دیا جائے ہم نہیں لے جائیں گے۔ اور نرسیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں ''ہم خود لے جا سکتے تھے لیکن توبہ اس کا چہرہ کتنا سفید ہے، مجھے تو ڈر لگتا ہے۔'' وہ نیلا کی یہ توہین برداشت نہ کر سکا۔ غصے کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا ''شکر ہے

میں اونچی ذات کا ہندو نہیں ہوں۔'' وہ نیلا کی طرف بڑھا۔ نرس نے جلدی سے اسٹریچر بڑھایا۔ اس نے اپنا ہونٹ کاٹ کر کہا ''نہیں اس کی ضرورت نہیں، صرف مجھے وہ نیچے والا کمرہ بتادو تو مہربانی ہوگی۔''

اور اس نے اپنے بازوؤں پر نیلا کی نعش کو اٹھالیا۔ اور وہ نیلا کو لیے اسی زینے پر سے اتر رہا تھا جن پر سات دن پہلے اسے سہارا دے کر اوپر پہنچایا تھا، اس جسم کو لیے جسے موت نے سخت اور بھاری کر دیا تھا۔ اس جسم کو جو اسے محبوب تھا، کبھی اس کی تمناؤں کا مرکز تھا۔ جس نے بارہ سال تک اس کا ساتھ دیا تھا اور اس کے قریب رہا تھا۔ اور اب اس کے بعد ہمیشہ کے لیے اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ اس کی زندگی سے الگ ہو جائے گا۔ اس جسم کو اس نے کئی بار اس طرح اپنے بازوؤں پر اٹھالیا تھا جب نیلا پھول کی طرح ہلکی تھی۔ جب وہ کمسن لڑکی نئی نئی بیاہی آئی تھی اور اس کی ماں اس سے دن بھر کام کراتی تھی اور جب وہ ماں کی نظریں بچا کر دوسرے کمرے میں ملتے تو وہ اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر گھماتا اور پلنگ پر ڈال دیتا اور جب وہ بیمار بیمار کمزور رہا کرتی تھی تو وہ اسی طرح اسے اٹھا کر پلنگ پر لٹایا کرتا تھا۔

اور اب وہ آخری بار اس محبوب جسم کو اپنے بازوؤں پر اٹھا کر لے جا رہا تھا۔ نیچے، نیچے اور نیچے۔

●●●

آزادی کی صبح / بھارت ناٹیہ

اندھیرا، اندھیرا، گھور اندھیرا، وسیع، بے کراں سناٹا، بھیانک ویرانی، یہ کیا ہو رہا ہے، یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس کی آنکھوں کو اس کے ارد گرد کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی ہے۔ یقیناً اسے اٹھا کر کہیں تنہا پھینک دیا گیا ہے۔ کسی خوفناک جنگل میں۔ درندے چیخ رہے ہیں، بھوت خونیں ناچ ناچ رہے ہیں....

ڈراؤنی خوفناک تاریک رات کالے کالے ڈراؤنے بادل جمع ہو رہے ہیں۔ آسمان پر چھا رہے ہیں، دل ہلا دینے والی گرج اور اندھیرا، اندھیرا، چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا۔

اور طوفان، آندھی، چنگھاڑتی ہوئی ہوائیں۔ خنکی بھری تیز برفیلی ہوائیں۔

اس کا جسم سر سے پاؤں تک کپکپانے لگا، لرزنے لگا، اور درد کی ٹیسیں سارے جسم میں، پیٹ میں ناقابل برداشت تکلیف جیسے کوئی دو چیزیں آپس میں گتھ گئی تھیں ایک دوسرے کو چیرے پھاڑے دے رہی تھیں، اور اس کے اپنے اندرونی اعضا کو کوئی چیر رہا تھا، پھاڑ رہا تھا، درد کی شدت سے وہ بے ہوش ہو گئی۔

زمانہ بیت گیا جب وہ اپنے گاؤں میں اپنے ماں باپ کے گھر ہنسی خوشی رہا کرتی تھی، گاؤں کی پاکیزہ فضا اور کھلی ہوا میں سانس لیتی ہوئی، ایک پھول کی طرح تر و تازہ،

ایک پنچھی کی طرح آزاد۔ اس کے گاؤں میں پاکیزہ شفاف نہریں تھیں، ان پاکیزہ نہروں سے سیراب، سرسبز و شاداب کھیتوں میں ہر چیز افراط سے پیدا ہوتی تھی۔ زرخیز دھرتی سونا اگلتی تھی۔ ہر طرف خوشحالی تھی۔ اس کے گھر میں من برستا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے گھر سے دھواں بھی سونے کا نکلا کرتا تھا۔

وہ سندر تھی، بے انتہا سندر۔ اس کی رنگت میں ہمالہ کی برفانی چوٹیوں کی سپیدی، کشمیر کے کھیتوں کی زعفران، بنگال کی سانولاہٹ، اور دکن کی ملاحت تھی۔ اس کی چاندسی پیشانی کے اوپر گھور کالے چھریری دار بالوں کے بیچوں بیچ اس کی مانگ میں گنگا اور جمنا کے پانی کی چاندی جھلملاتی تھی، اس کی ہنسی میں گویا کشمیر کے جھرنوں اور آبشاروں کا ترنم اور موسیقی تھی۔ وہ بولتی تھی تو منھ سے موتی گرتے تھے۔ اس کے خوبصورت بیضوی چہرے کی نازک نوکدار ٹھوڑی نے اس کے چہرے پر بردباری، پاکیزگی اور معصومیت پیدا کر دی تھی۔ تقدیس، پاکیزگی، معصومیت، دیویوں کا سا حسن!

بڑے ناز و نعم میں وہ پل کر بڑی ہوئی۔ اسے سات پردوں میں رکھ کر پالا گیا۔ کہیں اس کی سندرتا کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ لیکن حسن و جوانی، وہ بھی دولت میں پلی ہوئی حسن و جوانی کہیں چھپ سکتی ہے۔ اس کے حسن اور دولت پر بہتوں کی نظر لگی تھی۔ اسے اغیار کی نظروں سے بچانا ناممکن ہو گیا۔ گاؤں کے نوجوان ہی نہیں، مرد دور دور سے آ کر اسے تاک تاک جاتے۔ ہر ایک کی یہی تمنا ہوتی کہ وہ اس کے ہاتھ لگ جائے۔

اور ایک دن جب صبح سویرے وہ اکیلی کھیتوں کی طرف نکل گئی تھی اور پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ، خراماں خراماں، ہنس کی چال چلتی جا رہی تھی، اسے دور کھیتوں کے پار پہاڑیوں کے درمیان کوئی سوار آتا نظر آیا۔ وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اور غور سے اسے آتا دیکھنے لگی۔ وہ پگڈنڈی کے بیچوں کو طے کرتا، گھوڑا اڑاتا ادھر ہی آ رہا تھا۔ اجنبی سوار اس کے قریب آ گیا۔ وہ اپنے سفید شاندار گھوڑے سے اتر پڑا۔ اور وہ اس کے پر جلال حسن سے مبہوت ہو کر وہیں کھڑی رہ گئی۔ سرخی اور گندم ملا ہوا سفید رنگ، بلند ناک، موٹی موٹی

چمکدار کالی آنکھیں، ان بڑی بڑی کالی آنکھوں میں بہادری اور دلیری کی چمک تھی، چہرے پر ایک زبردست فاتح کی شان اور غرور، اور شاندار لباس۔ اجنبی کے لب کھلے "راج کماری...."۔ اجنبی کو اپنے نام سے مخاطب کرتے دیکھ کر اس کی حیران نظریں پرجلال تاتاری حسن پر پھر جم کر رہ گئیں۔ میں نے دور دور تمہاری شہرت سنی ہے، میں بہت دور سے آیا ہوں۔ تمھیں حاصل کرنے، تمھیں اپنانے...."

اور اپنے مضبوط بازوؤں کی طاقت سے اس نے اسے اپنا لیا۔ محبت سے اس کے دل پر، اس پر فتح پالی۔ وہ اس اجنبی سے مرعوب بھی تھی، محبت بھی کرتی تھی۔ اجنبی کی زبان دوسری تھی۔ انھیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں دقت ہوتی تھی اور دونوں نے مل کر ایک تجویز کی۔ اپنی اپنی بولیوں کو ملا کر ایک الگ بولی بنالی۔ ایک ایسی پیاری بولی جس میں گویا ہندی کی رسیلی مٹھاس بھی تھی، اور فارسی کی نزاکت بھری شیرینی بھی، سنسکرت کی گمبھیرتا بھری موسیقی اور عربی کا وقار اور جلال بھی۔ وہ برابر ملتے رہے۔ پردیسی اس کے لیے کئی تحفے لے آتا۔ دوپٹے ایسے باریک اور نفیس کہ انھیں تہہ کر کے انگوٹھی میں سے گزارا جا سکتا تھا۔ انوکھے، خوبصورت، قیمتی جواہرات سے مزین زیورات۔ سر سے پاؤں تک خوبصورت زیوروں میں آراستہ کر کے جب پردیسی نے اس کی مانگ میں جھومر لٹکایا تو اس کی پیشانی 'تاج' کے حسن سے جگمگا اٹھی۔ ان زیوروں سے اس کے حسن میں چار چاند لگ گئے۔ اسے اس پردیسی نے کچھ اس طرح اپنا لیا تھا کہ اس کی شخصیت اس کی اپنی شخصیت میں تحلیل ہو گئی، اس کی شخصیت کا ایک جزو بن گئی تھی۔ اس پردیسی نے اسے وہ محبت دی کہ وہ محسوس کرنے لگی... وہ اس کی ہو گئی ہے۔

اور اچانک کہیں سے ایک اور اجنبی آ گیا۔ بالکل ہی اجنبی۔ کہتے ہیں کہ سات سمندر پار سے وہ اس کے حسن اور دولت کی شہرت سن کر آ گیا تھا۔ لیکن وہ تھا بہت عیار۔ اس نے بتایا نہیں کہ وہ اسے حاصل کرنے آیا ہے۔ آہستہ آہستہ اس نے لڑکی کے باپ سے اور اس پردیسی سے بھی دوستی گانٹھنی شروع کی۔ انھیں بتایا کہ ان کے ملکوں کی بعض چیزیں اسے

بہت پسند ہیں۔ اس کے اپنے ملک میں یہ چیزیں نہیں مل سکتیں۔ وہ انھیں اپنے ملک لے جائے گا اور اس کے بدلے میں اپنے دیس سے ایسی چیزیں لائے گا جو یہاں کبھی نہیں بن سکیں گی۔ اور اس بہانے وہ اکثر گاؤں آتا جاتا رہتا۔ پھر یہ کہہ کر کہ یہ گاؤں اسے بہت ہی پسند آ گیا ہے، وہ وہیں آ کر رہنے لگا۔ اس کے حسن سے زیادہ اس کی دولت کو دیکھ کر اس کی آنکھیں لال ہوتیں۔ اور آہستہ آہستہ بہلا پھسلا کر اور قوت بازو اور محبت سے نہیں اپنی دماغی قوت اور عیارانہ چالوں نے اسے اپنے ماں باپ سے بھی چھین لیا، اس پردیسی سے بھی چھین لیا... اس شادی پر وہ بالکل رضامند نہ تھی۔ دراز قد، بہت زیادہ سرخ و سفید رنگ اور ٹھاٹ باٹ کے باوجود یہ اجنبی اسے بالکل پسند نہ آیا تھا۔ مجبوری کی شادی!

شادی کے بعد وہ بڑی محبت جتاتا تھا۔ اس کے پاس پیار کے نئے انداز تھے، نئی باتیں تھیں۔ وہ ہمیشہ کہتا، وہ اسے بہت زیادہ چاہتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے، اس کا خیال رکھ کر کرتا ہے، اس کی بہبودی کے لیے۔ اور وہ اسے بتاتا وہ گنوارن ہے، تہذیب سے نا آشنا۔ اس کے پاس بے نظیر حسن ہے، گن ہیں، نئی تہذیب سے اس حسن کو چار چاند لگ جائیں گے۔ اس کے گنوں کی روشنی بڑھ جائے گی اور اس نے آہستہ آہستہ اسے نئی تہذیب سکھانی شروع کی، نئی تعلیم دینی شروع کی۔ وہ اسے اپنی زبان میں پڑھاتا تھا۔ وہ زبان کس قدر اجنبی اور نامانوس تھی، اس کی اپنی زبان سے بہت بدلی ہوئی اور اس زبان سے بھی بہت مختلف جو اس نے اور پردیسی نے اپنی اپنی بولیوں کو ملا کر بنائی تھی۔ اجنبی نے ایسی نئی نئی چیزیں اس کے لیے لا دیں جنھیں اس نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ اس کے اردگرد ایک نئی فضا بن گئی۔ اس کی آنکھیں جو گھر میں مٹی کے تیل کے دیے دیکھنے کی عادی تھیں، بجلی کی روشنی دیکھ کر مسحور ہو گئیں۔ وہ بیل گاڑیوں میں سفر کرنے کی عادی تھی، اندھیری رات میں آہستہ آہستہ ہچکولے کھاتے، جھولا جھولتے ہوئے سفر کرنے میں کتنا لطف آتا تھا۔ یا بہت ہوا تو کبھی گھوڑا گاڑی۔ اب اسے ایک دھنواں اڑاتی انجن سے پٹریوں پر چلنے والی نہایت تیز رفتار گاڑی میں سفر کرنا پڑتا۔ اس نئی فضا میں وہ مسحور اور مبہوت ہو گئی اور ایک سپردگی کے عالم

میں وہ اجنبی کے ساتھ رہی لیکن پھر بھی وہ پسند نہ آیا تھا۔ پھر اسے اچانک معلوم ہوا اس کا مال غائب ہو رہا ہے۔ اس کے زیورات میں سے جواہر غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے ماں باپ کے دیے ہوئے زیورات، پردیسی کے لائے ہوئے خوبصورت زیور، اس کی پیشانی کے بے نظیر جھومر کے جواہرات تک اس نے نکال لیے تو اس سے نہ رہا گیا۔ وہ آخر پوچھ بیٹھی۔ وہ یہ سب کیا کر رہا ہے۔ اس کا مال، اس کا زیور... جواب ملا، اسے نئی بنانے میں، نئی تہذیب سے آشنا کرنے میں اس کی تعلیم میں کیا کم خرچ لگ رہا ہے۔ اتنا سارا خرچ کہاں سے نکلے گا۔ لیکن اس پر تو دراصل بہت تھوڑا خرچ آتا تھا۔ کہتے ہیں کہ بہت سا مال، سارے جواہرات اس نے اپنے ملک کو بھیج دیے۔ اپنے رشتہ داروں میں بانٹ دیے۔ اس کے گھر میں کبھی مَن برستا تھا۔ سونے کا دھواں نکلا کرتا تھا، لیکن اب وہ کھانے کپڑے کو ترس رہی تھی۔

یہ تو وہ جان گئی تھی کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ لیکن اس کی تو ایک ساتھی کی حیثیت بھی نہیں تھی، وہ اسے محکوم رکھنا چاہتا تھا۔ اسے غلام بنا کر رکھا گیا تھا۔ اور اس محکومی کے خلاف اس کی روح چیخ اٹھی۔ سینے میں بغاوت سلگتی رہی۔ لیکن وہ کچھ کرتی نہیں تھی۔

ایک تو وہ بیوی تھی، اور پھر اس کا اصول ہی یہ تھا کہ ظلم کا جواب صبر سے دینا چاہیے۔ صبر کے سامنے ظلم خود بخود بے دست و پا ہو جائے گا۔ تکلیف سہنا چاہیے بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو تکلیف دینا چاہیے تاکہ اسے دیکھ کر ظلم بھی رحم بن جائے۔ اور اس لیے وہ کئی کئی دن تک کھانا چھوڑ دیتی۔ ایک ہی جگہ کہیں گوشے میں بیٹھی رہتی یا سارا دن، اٹوائی کھٹوائی لیے پلنگ پر پڑی رہتی۔ گھر کا کوئی کام کاج کرنے سے انکار کر دیتی۔ بہت ہوا تو کبھی چیخ چیخ کر احتجاج کرتی۔ اور اپنے ناخنوں سے اسے نوچنے کھرچنے لگتی۔ نازک مخروطی انگلیوں کے ناخن اسے کیا گزند پہنچا سکتے تھے۔ لیکن وہ اس میں بغاوت بالکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا، جب بغاوت ابھرتی نظر آتی اسے بند کوٹھڑی میں قید کر دیتا۔ مار پیٹ سے بھی باز نہ آتا۔ جتنا زیادہ اس کا ظلم بڑھتا گیا، اس کی بغاوت بھی بڑھتی گئی۔ اور یہ نئی جسمانی تکلیف

یہ پیٹ میں ناقابل برداشت ٹیسیں، یہ درد بھی اسی کا دیا ہوا تھا۔ وہ کل رات چیخ اٹھی تھی۔ "مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو، یہاں سے چلے جاؤ، یہاں سے نکل جاؤ۔" یعنی میں اب تمھارے ساتھ نہ رہوں گی، نہیں۔ تم یہاں سے نکل جاؤ، مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔" اتنی بغاوت اتنی سینہ زوری! رات بھر وہ درد کی شدت میں ہی چیختی رہی۔ "یہاں سے چلے جاؤ، مجھے چھوڑ دو۔" اور اس نے وعدہ کرلیا کہ وہ چلا جائے گا۔ لیکن لوگ کہتے ہیں...وہ بھلا اس کے کہنے پر چلا جائے گا۔ گھر پر اس کے احباب اس کو بلا رہے ہیں، خصوصاً اس کا ایک رشتہ کا بھائی جس کی بات وہ بہت سنتا تھا، وہ بھی اس بات پر زور دے رہا ہے کہ اب وہ اس لڑکی کو چھوڑ کر چلا آئے۔

اپنے ماں باپ اور اس پردیسی کی جدائی کے بعد اس اجنبی کے ساتھ اس کی زندگی اس دکھ سے بھری تھی کہ اس کے لیے یہ عرصہ ایک صدی معلوم ہوتا تھا، ایک صدی سے بھی زیادہ....

اسے کچھ کچھ ہوش آرہا تھا، آوازیں آہستہ آہستہ سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن آنکھوں کے سامنے ابھی دھندسی چھائی ہوئی تھی۔ پھر اس کے کانوں نے صاف سنا گھڑی گھنٹے بجا رہی تھی۔ گھڑی یہاں کہاں؟ وہ جنگل میں پھینک نہیں دی گئی تھی؟...لیکن اس کے آنکھوں کے سامنے دھند دور ہوتی گئی اور اس نے اپنے گرد وپیش کو پہچان لیا۔ ٹن ٹن ٹن ٹن... بارہ؟ آدھی رات۔ اور اچانک اس کی نظر دور اندھیرے میں گم ہوتی ہوئی پرچھائیں پر پڑی۔ کوئی جارہا تھا۔ اس کی آنکھوں نے چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی کو چیرنے کی کوشش کی۔ کون؟ اجنبی؟ ہاں وہ اسے چھوڑ کر جارہا تھا۔ اس دل میں نفرت کی آگ پھر بھڑکی۔ جا بھی رہا ہے تو کس وقت۔ اس کی اس حالت میں، اس کی خبر لیے بغیر۔ وہ اس قدر درد سہہ رہی ہے۔ موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اور وہ جارہا ہے۔ لیکن اس کے جانے کے لیے وہ کب سے دست بدعا تھی۔ وہ آخر چلا گیا۔ جانے دو آخر چھٹکارا ملا۔ اس نے دل میں

اطمینان اور مسرت محسوس کی۔ ساتھ ہی اسے محسوس ہوا کہ اس کے جسم کے درد میں بھی کمی ہو گئی ہے اور بے خبری میں اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ کئی ہاتھوں نے اسے پکڑ کر پھر لٹا دیا۔ لیکن وہ دیکھ چکی تھی۔ اُف! اس کی آنکھوں نے کیا دیکھا۔ خون خون، ہر طرف خون... اور دو بچے خون میں لتھڑے ہوئے، خون میں نہائے ہوئے دو توام۔ اوہ! اسی لیے تو اسے یہ نا قابل برداشت تکلیف ہوتی رہی تھی اور پیدائش کے وقت بھی.... لیکن اسے اب آرام تھا۔ اس کے گرد گرم بلینکٹ اچھی طرح لپیٹ دی گئی تھی۔ نقاہت سے نڈھال جسم پر اس کی آرام دہ گرمی سے غنودگی سی چھا گئی۔ اور وہ کسی سوچ میں غرق ہو گئی۔ توام بچے؟ اس کے [کو] ایک بچہ کیوں نہ ہوا۔ اور پھر اس کے دل میں اجنبی کے لیے نفرت امڈ آئی۔ یہ بھی اسی کی لائی ہوئی مصیبت تھی پھوٹ کے بیج سے یہ دونوں بچے ایک نہ ہو سکتے تھے....

دونوں بچے اس کے پاس لائے گئے۔ اور جب اس نے انھیں اپنے دونوں پہلوؤں پر الگ الگ لٹایا تو اچانک اسے ایک خیال آیا اور وہ مسرور ہو گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ بچے توام ہوئے ہیں تو اس طرح کے سیامی توام نہیں ہوئے جن کے جسم لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور وہ حیران ہوئی کہ اسے بچوں کو دیکھتے ہی پہلے یہ خیال کیوں نہ آیا کہ خدا کرے یہ لگے ہوئے سیامی توام نہ ہوں۔ اس طرح کے توام ہوتے تو زندگی بھر مصیبت کا سامنا تھا۔ دونوں کے جسم، دونوں کے ذہن، دونوں کی روح، دونوں کی شخصیتیں الگ الگ، پھر بھی ان کے جسم ایک طرف ملے ہوئے۔ نہ وہ آزادی سے چل پھر سکتے، نہ آزادی سے کوئی الگ الگ کام کر سکتے، ایک بیمار ہوتا تو دوسرے کو اس کے بیمار جسم کا بوجھ اٹھانا پڑتا یا اس کی بیماری بھی اس میں سرایت کر جاتی۔ ان میں سے کسی ایک کو غصہ چڑھ جاتا، اور وہ زیادتی پر تل جاتا تو دوسرا اس سے آزاد ہو کر بھاگ نہیں سکتا تھا۔ دونوں محبت سے رہتے، ایک دوسرے کے دکھ سکھ ساتھ بیتتے تو الگ بات تھی لیکن ایک دوسرے میں نفرت پیدا ہو جاتی تو دونوں کے لیے زندگی نا قابل برداشت بن جاتی دونوں کمزور رہتے اور چھوٹے کے لیے تو بہت مصیبت کا سامنا تھا۔ اپنی آزادی اپنی طاقت حاصل کرنے کے لیے اور چھوٹے

کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے اپنی طاقت سے کام لے کر بڑا چھوٹے کو کچل سکتا تھا یا آہستہ آہستہ اسے کمزور تر بنا کر اپنے راستے سے ہٹا سکتا تھا۔ چھوٹے کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔ اب ان دونوں کی الگ الگ آزاد ہستیاں ہیں اور یہ دونوں آزادی سے پھلیں گے پھولیں گے۔ اس نے دونوں کو غور سے دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ چھوٹا شکل و صورت، بناوٹ، انداز سب میں اس پردیسی سے بہت مشابہ تھا جو بہت عرصہ پہلے اس صبح کو گھوڑا اڑاتے ہوئے اس کے پاس آیا تھا، اور جس سے اسے محبت سی ہو گئی تھی۔ نہیں اس کے جسم کے پھٹنے سے روح کے دو ٹکڑے نہیں ہوئے تھے۔ اس کا خون ان دونوں کی شریانوں میں بہہ رہا تھا، اس کی ایک ہی روح ان دونوں میں تھی۔ صرف اس کی شخصیت بٹ گئی تھی، اور پردیسی کی شخصیت جو اس میں حلول کر گئی تھی اب الگ ہو کر مجسم ہو گئی تھی۔ اور بڑے ہو کر ان کی الگ الگ شخصیتیں، الگ الگ صلاحیتیں آزادی سے ابھریں گی... وہ دونوں کو اپنا دودھ پلائے گی، اپنی گود میں کھلائے گی۔ وہ دونوں اسی کے جسم، اسی کے خون سے بنے ہیں اور دودھ کی گرم گرم دھاروں کے ساتھ محبت کی دھاریں بھی ان دو ننھے توام بچوں کے منہ میں جاتی رہیں۔ جب وہ سیر ہو گئے تو انھیں الگ الگ بستروں پر لٹا دیا گیا۔ اور دونوں ننھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا جیسے کڑی نظروں سے۔ کہہ رہا ہو "تمھیں کیا حق تھا اپنا وجود بنانے کا۔ مجھی میں رہتے، اتنے سے تو ہو۔" اور چھوٹے کی نظروں نے گویا جواب دیا۔ "کیا پڑی تھی کہ میں بالکل الگ ہو کر بھی تم میں رہوں۔ اپنی آزادی کھو دوں۔ ہم اب الگ الگ اور آزاد ہیں۔ لیکن ہم میں ایک گہرا ناطہ ہے۔ اور ہم ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست رہ سکتے ہیں۔ *

---

* ماتا کی نظریں افق کی طرف گئیں۔ اجنبی تو افق کے اس پار کبھی کا چلا گیا ہوگا۔ اندھیرا چھوٹ رہا تھا۔ اور آسمان پر ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اوشا، صبح صادق.... دونوں بچے صبح کی روشنی میں اور تازہ ہوا میں اپنے اپنے بچھونوں پر آزادی سے خوب ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ماتا مسکرائیں۔ آزادی کی صبح طلوع ہو رہی تھی.... (رسالہ 'ماہ نو' میں شائع اس افسانہ کا اختتامی اقتباس یہ تھا جس میں مصنفہ نے افسانہ کے عنوان 'آزادی کی صبح' کا جواز پیش کیا تھا)

آزاد نگارستان

(تمہیدی نوٹ: نہیں معلوم اوپر سے کس نے پھینکا۔ لیکن ہوا کے جھونکے نے اسے ہمارے فلیٹ میں لاگرایا۔ میں کہنے والی تھی کہ ایک گلابی دوپہر، یہ واقعہ رونما ہوا لیکن پھر تو بات شاعرانہ بن جاتی اور یہاں بالکل بے محل۔ غرض... یہ تھا کسی انگریزی اخبار کا ایک پھٹا ہوا ٹکڑا۔ اخبار کے نام یا مقام کا کوئی پتہ نہ چلا، یونہی بے خیالی میں، میں نے اسے اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ تحریر دلچسپ معلوم ہوئی۔ کسی پارلیمان کے گیلری رپورٹر کا کالم معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس ٹکڑے میں یہ کالم کہیں درمیان سے شروع ہوتا ہے۔ شاید پہلے دو ایک پیراگراف غائب ہوں۔

اس کا ترجمہ حاضر ہے لیکن میں نے چند ایک انگریزی ترکیبوں کو بوجوہ ویسے ہی رہنے دیا ہے۔ عنوان میں نے دیا ہے جو مرزا فرحت اللہ بیگ کے ایک مضمون 'دادا جان اور آزاد نگارستان' سے مستعار ہے، مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون میں 'نگارستان' لفظ 'نگر' (Nigger) بمعنی 'کالا لوگ' سے بنایا گیا ہے۔ چنانچہ جب یہ ملک آزاد ہوا اور دادا جان اس کی پہلی پارلیمان میں بہ حیثیت ممبر پہنچے تو انھوں نے وہاں جو گل کھلائے، مرزا صاحب کا مضمون اس کی داستان ہے۔ نگارستان کو میں نے اس کے حقیقی معنوں ہی میں رہنے دیا ہے۔)

...ملک کے ادیبوں کے نمائندے نے (اس ملک میں غالباً پارلیمان کے انتخاب کے لیے پیشہ ورانہ نیابت Functional Representation کا دستور رائج ہے) پارلیمان کے حالیہ اجلاس نے وزیرِ امورِ ثقافت سے یہ سوال کیا:

کیا عزت مآب وزیرِ امورِ ثقافت یہ جواب دینے میں مسرت محسوس کریں گے کہ:

(الف) کیا یہ صحیح ہے کہ ایک نیا محکمہ کنٹرولر آف اسٹوریس کے نام سے قائم ہوا ہے۔

(ب) اگر ہوا ہے تو اس کی کیا ضرورت ہے؟ اور پھر پارلیمان سے مشورہ طلب کیے بغیر اتنی جلد قائم کرنے میں کیا مصلحت کارفرما ہے؟

(ج) اس پر کیا صرف آئے گا؟ شروع میں اور پھر ہر سال۔

(د) پچھلے میزانیہ کے اجلاس میں رقم وزارتِ امورِ ثقافت کے لیے منظور ہوئی تھی۔ اس میں کیا کوئی بچت کی امید ہے۔ اگر نہیں تو کیا اس نئے محکمہ کے لیے رقم کی منظوری وزارتِ خزانہ سے حاصل کرلی گئی ہے؟

وزیرِ امورِ ثقافت کا یہ تحریری جواب میز پر رکھا گیا تھا۔

(الف) صحیح ہے۔

(ب) حکومت کے شعبہ طباعت... کے ایک پروف ریڈر کی غلطی سے پانچ من سے زیادہ کاغذ کے فرموں پر کنٹرولر آف اسٹورس (Controller of Stores) کی بجائے کنٹرولر آف اسٹوریس (Controller of Stories) چھپ گیا ہے۔ یعنی ایک غیر ضروری 'i' شامل ہوگئی ہے، سو حکومت نے یہ مناسب سمجھا کہ ان طبع شدہ فرموں کو جائز استعمال میں لایا جائے، لہٰذا کنٹرولر آف اسٹوریس کے ماتحت ایک محکمہ کا قیام عمل پذیر ہوا ہے۔

(ج) کوئی صرف نہیں آئے گا۔

(د) سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ادیبوں کے نمائندے نے پھر ضمنی سوال پوچھا:

"کیا عزت مآب وزیر اس مجلس کو آگاہ فرمائیں گے کہ کنٹرولر آف اسٹورلیس کے تقرر کے سلسلہ میں پبلک سروس کمیشن سے رجوع کیا گیا ہے؟ اور اس کے میمو، ڈی او یا سرکلر کا حوالہ....."

جملہ ختم ہونے سے پیشتر ہی جناب وزیر نے فرمایا۔

"جواب نفی میں ہے۔"

ادیبوں کے نمائندے صاحب پھر اٹھنے کے لیے پر تول ہی رہے تھے کہ ایک اور آنریبل ممبر اٹھ کھڑے ہوئے، اور یوں گویا ہوئے:

"کنٹرولر کی تنخواہ کیا ہوگی؟ اس شعبہ کا پورا تخمینہ کیا ہے؟ یہ روپیہ کس مد میں لیا جارہا ہے؟ میری درخواست ہے کہ آڈیٹر جنرل کے ریمارکس کی نقل اس وقت سامنے میز پر رکھی جائے۔"

سوال جواب کا گھنٹہ ختم ہوتے ہی (اب یہ ختم ہو ہی رہا تھا) میں ایک تحریک التوا پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اس اہم، فوری مسئلہ کی....

صدر مجلس نے آرڈر، آرڈر پکارتے ہوئے آنریبل ممبر کو یہ تنبیہ کی کہ ایک ساتھ، ایک سانس میں اتنے زیادہ ضمنی سوالات نہیں پوچھے جاسکتے اور پھر مسلسل تقریر کی اجازت تو کسی صورت میں نہیں دی جاسکتی۔ آنریبل ممبر اس مجلس کے قوانین قائمہ سے ناواقف نظر آتے ہیں، کیوں کہ ان کی رو سے....

سوال کرنے والے ممبر صاحب کا یہ منشا نظر آتا تھا کہ وزیر صاحب کو سوالوں میں الجھایا جائے کہ جناب صدر نے (جنھیں مجلس کے قوانین قائمہ ازبر ہیں، جس کا ثبوت وہ اس اجلاس میں کئی بار دے چکے ہیں) بیچ ہی میں آنریبل ممبر کو بیچ میں لے لیا۔ لیکن جناب صدر کے جملہ ختم کرنے سے پہلے ہی تجربہ کار وزیر امور ثقافت خلاف معمول مسکراتے ہوئے اٹھے اور ایک نگاہ غلط انداز (بمعنی تشکر آمیز) جناب صدر کی طرف ڈالتے ہوئے بولے:

"جناب صدر کی اجازت سے آنریبل ممبر کے جواب میں۔

ایک، مسئلہ زیرِ غور ہے۔ دو، نوٹس چاہتا ہوں۔ تین، فی الحال سوال پیدا نہیں ہوتا۔ چار، مفادِ عامہ کے حق میں نہیں ہے۔"

جوابات ایک ساتھ، ایک سانس میں اس تیزی سے دیے گئے کہ سوال کرنے والے صاحب بوکھلا گئے۔ پھر بھی جلدی سے ساری ہمت جمع کر کے ایک سوال کر ہی ڈالا:

"کیا عزت مآب اس کی تشریح کریں گے۔ یہ حکومت کی نئی کفایت کی پالیسی کے عین مطابق ہے؟

"جواب اثبات میں ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ہم ان چھپے ہوئے کاغذات کو کام میں لا رہے ہیں۔ آج کل کاغذ کی کمیابی اور گرانی کا جس کسی کو بھی اندازہ ہے وہ ہمارے اس اقدام کو تحسین کی نظر سے دیکھے گا۔ دوسرے میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آغاز میں محکمہ پر کوئی مزید خرچ نہ آئے گا۔ کیوں کہ کنٹرولر آف اسٹوریس کے معاملات کی نگرانی بھی کنٹرولر آف اسٹورس ہی کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس کے لیے انھیں کوئی افزود الاؤنس نہیں دیا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے یہ حکومت کی نئی کفایت کی پالیسی کے عین مطابق ہے۔ باوجودیکہ حکومت کے ایک شعبہ کی توسیع عمل میں آئی ہے۔"

"میں تحریک التوا پیش نہیں کروں گا۔ اگر اسی موقع پر ہم اس محکمہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل کر سکیں۔"

وزیرِ ثقافت نے فرمایا:

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آنریبل ممبر نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے اور موقع بھی اچھا نکل آیا ہے جس سے سب فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ حکومت کو اس کا شدید احساس ہے کہ ہماری قومی زندگی میں ادب کی بہت اہمیت ہے، چونکہ ہماری حکومت، عوامی حکومت ہے۔ لہٰذا عوام کی فلاح و بہبودی کی خاطر حکومت ہر اس چیز پر نگرانی رکھنا چاہتی ہے جو عوام پر اثر انداز ہو۔ حال ہی میں یہ بات حکومت کے نوٹس میں لائی گئی ہے کہ ہمارے افسانہ نگار اپنے اس فن کی طرف بے توجہی

برت رہے ہیں۔ حکومت نے یہ ملاحظہ کیا ہے، اور حکومت کی یہ سوجھی بوجھی، پختہ رائے ہے کہ غذا اور پانی کے بعد افسانے ہی ایسی اشیاء ہیں جن کی اہمیت جتانے کی اور خاص کر، اس ایوان میں، چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آج ایک بچہ مدرسے میں اپنی استانی سے کہانی کی فرمائش کر رہا ہے، گھر آ کر اماں، ابا سے یہی فرمائش جاری ہے۔ پڑھنے والوں کا رسالوں کے ایڈیٹروں سے اچھی کہانیوں کے لیے تقاضا ہے، نتیجے میں ایڈیٹر حضرات کا افسانہ نگاروں سے اصرار ہوتا ہے۔ پھر ریڈیو کی نشریات میں فیچر کہانیوں کا حصہ جزو برتر ہے۔ اور... غرض آزادی کے بعد ہمارے ہاں کہانیوں کی ڈیمانڈ، سپلائی سے کئی گنا زیادہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آج کل کہانیوں کا معیار جس تیزی سے نیچے کی طرف جا رہا ہے، اس کا اعادہ اس ایوان میں تحصیل لاحاصل ہے۔ میں اس موقع پر صرف ماہنامہ 'نظارہ' کے تازہ سالگرہ نمبر کے مضمون کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس میں ہماری کہانیوں کے موجودہ معیار پستی پر از حد تاسف کا اظہار کیا گیا ہے اور خدشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر یہی بے ڈھنگی رفتار رہی تو وہ دن دور نہیں جب ہمارا شمار اسفل السافلین میں ہوگا۔ بہر حال صورتِ حال ہی ناگفتہ بہ ہے حکومت اس صورتِ حال کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی۔ حکومت نے اب تہیہ کر لیا ہے کہ اب گھٹیا افسانے قطعی نہیں لکھے جائیں گے۔

اب ادیبوں کے نمائندے نے بات کاٹی:

"کیا ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ گھٹیا افسانوں سے عزت مآب وزیر کی کیا مراد ہے؟ کیا وہ اس سلسلے میں کوئی مثالیں پیش کر سکتے ہیں؟"

"نہیں۔ کسی خاص افسانے کی مثال تو میں فی الحال پیش نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ اس میں شبہ پیدا ہونے کی گنجائش ہے کہ میں اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کا اظہار کر رہا ہوں، اس بارے میں میں صرف یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ برے افسانے وہ ہیں جو اچھے نہیں ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس جواب سے آنریبل ممبر کی تشفی ہو گئی ہوگی۔"

اس ممبر نے پھر سوال کیا:

''کیا میں یہ معلوم کرسکتا ہوں کہ یہ محکمہ کام کس طرح کرے گا؟''

جناب وزیر نے تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا:

''کام فوراً شروع ہو جائے گا۔ سب سے پہلے پانچ افراد پر مشتمل مختلف وزارتوں سے لی گئی ایک مشاورتی کمیٹی بنائی جائے گی جس کا کام کنٹرولر آف اسٹوریس کی ہر ممکنہ امداد کرنا ہے، یہ کمیٹی عارضی طور پر ایک چیف اسٹوری آفیسر تین ڈپٹی چیف اسٹوری آفیسر، چار سٹوری آفیسر (جن کی تعداد آئندہ بڑھائی جائے گی) کا فوری تقرر عمل میں لائے گی (اسسٹنٹ سٹوری آفیسرز کے تقرر کا مسئلہ ہنوز زیر غور ہے) اور اس تقرر کی تصدیق کے سارے نام پبلک سروس کمیشن کے سامنے بھیجے جائیں گے تاکہ پبلک میں خواہ مخواہ واویلا نہ مچے اور ہاں، تین ڈپٹی چیف اسٹوری آفیسرز میں سے صرف ایک مرکز میں رہے گا، اور باقی دونوں شمالی اور جنوبی ریجنل آفس کے چارج میں ہوں گے فی الحال ریجنل آفس کے پورے سٹ اَپ کا فیصلہ زیر غور ہے۔''

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ملک کے افسانہ نگاروں سے کیا کام لیا جائے گا؟''

''ہر افسانہ نگار کو ایک فارم بھرنا ہوگا۔ دس روپے کی ٹریژری رسید حاصل کرنا ہوگی۔ پھر رسید اور فارم سنٹرل ڈپارٹمنٹ آف اسٹوریس کو بھیجنے ہوں گے۔ اس کے بعد ایک اجازت نامہ ملے گا جس کی رو سے افسانہ نگار اپنے کو ایک رجسٹرڈ افسانہ نگار کہہ سکے گا۔ اور اس کے بعد جب بھی افسانہ نگار کا وجدان اسے تخلیق کی طرف مائل کرے اور کوئی مختصر یا طویل مختصر افسانہ اس کے ذہن میں مرتب ہو، اس کا ایک ملخص یا خاکہ بنا کر فوراً سنٹرل اسٹوری ڈپارٹمنٹ کو بھیجنا ہوگا، تاکہ افسانہ لکھنے سے پہلے ڈپارٹمنٹ کی اجازت حاصل کی جائے....

''اس محکمہ کی ایک ٹیکنیکل برانچ بھی ہوگی، جس میں پانچ ڈائریکٹوریٹ ہوں گے، ایک پلاٹ کے لیے ایک کردار کے لیے، ایک فضا کے لیے اور ایک منتہی کے لیے، ایک اور برانچ اخلاقیات کا ذمہ لے گی جس کے ماتحت فی الحال ایک ہی ڈائریکٹوریٹ ہوگا۔ اس

میں سے ہر سیکشن افسانہ کو علیحدہ علیحدہ پرکھے گا۔ اور افسانے میں ترمیم و تنسیخ کرنے اور اسے بہتر بنانے کے لیے اپنے مشورے پیش کرے گا۔ افسانے میں یہاں ناول اور ڈرامہ بھی شامل ہوتا ہے کیوں کہ یہ بھی کہانیاں ہی ہوتی ہیں۔ داستان کا اب غالباً رواج نہیں رہا ورنہ وہ بھی اس کے تحت آتیں۔ اس چھان پھٹک کے بعد افسانہ نگار کو ایک رسید عطا کی جائے گی، جو ادیب اجازت نامہ اور سرٹیفکیٹ کے بغیر لکھنے کی کوشش کرے گا۔ اسے پانچ سو روپیہ جرمانہ دینا پڑے گا۔ ساتھ ہی اسے قید کی بھی سزا دی جائے گی، جو اٹھارہ مہینوں سے زیادہ نہیں ہوگی۔ حکومت ایسے اقدامات سے ہمیشہ گریز کرتی ہے۔ حکومت کی منشا صرف اپنے قومی کلچر کو ترقی دینا ہے اور ہمیں پوری پوری توقع ہے کہ اس سے افسانہ نویسی کی دنیا میں انقلاب آجائے گا۔

"چلتے چلتے میں پارلیمنٹ کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم ایک ایسے قومی افسانے کا ہفتہ بھی منا رہے ہیں، جس میں 'بہتر افسانے لکھو' کی تحریک سارے ملک میں پھیلائی جائے گی، ہم ادیبوں کی عزت افزائی کرنا چاہتے ہیں، پہلے یہ تجویز تھی کہ اس ہفتہ کا آغاز وزیر اعظم کے ایک افسانے سے کیا جائے یا میں خود ہی پیش قدمی کروں اب متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ یہ اعزاز ملک کے کسی نامور افسانہ نگار کو بخشنا چاہیے جو معیاری باتصویر رسالوں میں (افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی اشاعت کا فرض بھی حکومت پر عائد ہے) اپنی تصویروں کے ذریعہ ملک میں خاصہ روشناس ہو چکا ہو۔"

ایک طرف سے آواز آئی:

"افسانہ نگار کا نام بتایا جائے اور مزید یہ کہ انھوں نے کیا کیا لکھا ہے۔"

وزیر امور ثقافت اس دخل در معقولات پر کچھ برہم سے ہوئے۔ لیکن اس کو درخور اعتنا نہ سمجھ کر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے:

"نہیں اس افسانہ نگار نے اب تک کچھ نہیں لکھا ہے لیکن اسے اپنی تصویروں کے ذریعہ ایک نامور افسانہ نگار کی حیثیت سے پبلک کے سامنے کئی بار لایا گیا ہے۔ اس ہفتہ کا

آغاز وہ اپنے پہلے افسانے سے کرے گا۔"

اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے وزیر صاحب نے فرمایا:

"یہ ساری کوششیں اس سلسلے میں ہیں کہ ملک میں ادب کا معیار بلند ہو۔ اور اچھی چیزیں لکھی جائیں۔ ہم نتائج کا انتظار کریں گے اور آخر میں میں سارے افسانہ نگاروں کو جن میں ناول نگار اور ڈرامہ نگار بھی شامل ہیں، یہ تنبیہ کروں گا کہ اگر انھوں نے اچھے افسانے نہ لکھے تو انھیں اپنا قلم توڑ دینا پڑے گا۔ قبل اس کے کہ حکومت اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے کے لیے مجبور ہو، ریجنل اسٹوری آفیسرز کی رپورٹوں سے ہمیں اندازہ ہوتا رہے گا کہ صورت حال کیا ہے اور کیسے افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ اگر حالات بہتر نہ ہوئے اور ادیبوں نے اچھی کہانیاں نہ لکھیں تو مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ ہم خود کہانیاں لکھ کر مثال پیش کریں گے۔ اکثر ملکوں میں 'مہا متھ سودا' یا پودے لگاؤ اسکیم کی کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ وزیروں نے پہلے پودے....

یہاں سے اخبار کا ٹکڑا پھر پھٹ گیا ہے۔

●●●

دیپک راگ

- فوکس ٹروٹ
- کیاس نووا
- جوار بھاٹا
- نغمے کی موت
- وجدان کی پرواز... بیاترچے
- اوتھیلو

فوکس ٹروٹ

عزیز نے دیکھا جارج تنہا بیٹھا ہے۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم ادھر اُٹھ گئے۔ جارج سینڈرس امریکن تھا۔ شاید امریکنوں میں اتنا احساسِ برتری نہیں ہوتا۔ فیکٹری میں جتنے یوروپین تھے ہندوستانیوں کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ امریکن کچھ کھلنڈرے اور ملنسار سے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کے ہندوستانی دوست تھے۔ وہ کافی بے تکلف دوست ہوتے ہیں۔ کم از کم جارج تو اس سے بے تکلف تھا۔ اور اپنی پرائیویٹ زندگی کی باتیں بھی بلا جھجک کہہ جاتا تھا۔ شاید جارج سے اُس کی دوستی اس لئے ہوگئی تھی کہ وہ ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے اور ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ اور ان کی جان پہچان اسی وقت دوستی میں تبدیل ہوگئی تھی جب جارج کو ایک اچھے مکان کی تلاش ہوئی تھی، اور عزیز نے اپنے گھر کے قریب مدلیار کا وہ خوبصورت اور شاندار بنگلہ جس پر شیش محل کا گمان ہوتا تھا، اڑھائی سو روپئے ماہوار پر چکا کر اُسے دلوایا تھا۔ جبھی معلوم ہوا تھا کہ جارج تنہا رہتا ہے اور....

اور وہ جارج کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ''شام بخیر۔'' اُس نے ٹوپی اُتار لی۔ ''شام بخیر۔'' جارج نے اُسے پاس بیٹھنے کے لئے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آج موسم کتنا خراب ہے۔ شام ہے، پھر بھی اس بلا کی گرمی، توبہ!'' ''پھر یہ تو بنگلور ہے جو خوشگوار آب وہوا کے لئے مشہور ہے۔'' عزیز نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں تو سوچتا ہوں، یہ تین مہینے کم از کم مارچ اپریل میں ہماری نائٹ ڈیوٹی ہو جائے تو کیا اچھا ہو''۔

جارج نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا اور عزیز کو پیش کیا۔ دیا سلائی جلا کر عزیز کے لئے پکڑی پھر اپنا سگریٹ سلگا کر کش لیتے ہوئے کہا'' آج کیسے جلد نکل آئے کام ختم ہو گیا کیا؟''

''ہاں، میں چاہتا تھا گھر چلا جاؤں۔ بچہ بیمار ہے۔ لیکن گھر جانے کے لئے بس کا انتظار کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے کیسے ممکن ہے.....

''میں تمہیں اپنی کار میں گھر پہنچا دیتا، لیکن اب میں سیدھا گھر نہیں جا رہا ہوں، بلکہ کہیں اور........ پھر اُس نے بڑی ہی بے شرم مُسکراہٹ لبوں پر لئے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا'' کسی لڑکی کو پکڑنے'' تمہاری وہ بھورے بالوں والی دوست نظر نہیں آتی آج کل''۔ کون انجلا؟'' جارج نے ایک قہقہہ لگایا'' بھئی دوستی کی بھی ایک ہی کہی۔ انجلا، ایڈنا، ڈورس، فلیمنا، ان میں سے کوئی بھی میری دوست نہیں۔ یوں ہی چند دن ان کے ساتھ.......اور پھر وہی بے شرم مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ اور اس نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا'' کم از کم ہر ہفتہ ایک نئی لڑکی نہ ملے تو مجھے چین نہ آئے''۔

عزیز خاموش رہا۔ جارج کے یہ سب باتیں بلا جھجک کہہ جانے پر خود اُسے کچھ بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کہے۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے سامنے کی طرف تکنے لگا۔ جہاں ہوائی جہاز پر پھیلائے، بڑی شان اور عظمت سے قطار باندھے کھڑے تھے۔ اور سامنے وسیع میدان تھا۔ پھر بہت دُور پر درختوں کے وہ جھنڈ جنہوں نے خوبصورت شہر بنگلور کو فیکٹری والوں کی نظروں سے چھپا لیا تھا۔ اور شہر سے میلوں دُور ہوائی جہازوں کی یہ فیکٹری تنہا کھڑی تھی........ کچھ دیر بعد اُس نے نگاہیں پھیر کر جارج کی طرف دیکھا۔ اور حیران رہ گیا۔ جارج خاموشی سے نیچی نگاہیں کئے زمین کو تکے جا رہا تھا۔ اُس کا سگریٹ آدھے سے زیادہ جل کر راکھ ہو چلا تھا۔ لیکن اُس نے نہ راکھ

جھاڑی تھی، نہ کش لیا تھا۔ اور اُس کے چہرے پر مایوسی اور اُداسی چھائی ہوئی تھی۔

''جارج''۔ اُس نے آہستہ سے پکارا۔

جارج نے یونہی اُوپر دیکھا۔

''ابھی تم دل لگی کی باتیں کر رہے تھے اور اب دفعتاً......'' کچھ نہیں عزیز، سوچ رہا تھا اب کے کرسمس میں وطن جا سکوں گا یا نہیں۔ وطن سے دُور کرسمس گزارنی پڑے تو کتنی جانکاہ اذیت ہوتی ہے تمہیں نہیں معلوم...... کرسمس، امریکہ......'' وہ جذباتی ہوا جا رہا تھا۔ اسکی آواز میں رقت آ چلی تھی۔

''تم ضرور جاؤ گے''۔

''اور میں سوچ رہا ہوں''۔ اُس نے عزیز کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا: میں یہاں سے دُلہن لے جاؤں تو ماں خوش ہو کر خیر مقدم کرے گی؟''

عزیز کی حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ ''یہاں سے کیوں؟... کوئی امریکن لڑکی ہو گی؟''

جارج نے سر ہلایا ''نہیں، ایک اینگلو انڈین لڑکی سے مجھے محبت ہو گئی ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

کچھ دیر تک حیرت افزا خموشی طاری رہی۔ عزیز سوچنے لگا۔ جارج اور شادی؟ پھر اینگلو انڈین لڑکی سے؟ اس کی نظروں کے سامنے وہ سینکڑوں اینگلو انڈین لڑکیاں آ گئیں جو چھاؤنی کے سینما ہاؤس کے گرد، کمرشیل اسٹریٹ میں، اور چھاؤنی میں ہر جگہ سرخ بندروں کے سے ٹامیوں کے ساتھ پھرتی دکھائی دیتی تھیں۔ کندھے سے کندھا بھڑائے، ٹامیوں کے ہاتھ ان کی کمر کے گرد ہوتے اور وہ کسی کی پروا کیے بغیر قہقہے لگاتی ہوئی نکل جاتیں۔ کچھ زیادہ عمر کی بدصورت لڑکیاں، سینما ہاؤس کے باہر کھڑی ہر آتے ہوئے ٹامی کو دیکھ کر مسکراتیں۔ اور جب وہ ان کی مسکراہٹ کا جواب نہ دیتا تو خود ہی اس کے پاس جا کر ایک ادا سے بال جھٹک کر، گردن میں خم پیدا کر کے، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے شیریں لہجے میں کہتیں ''اوہ! میں تم سے کہیں مل چکی ہوں۔ یاد ہے فلاں؟...''۔ اور جب وہ

انھیں پہچاننے کی کوشش کیے بغیر، کچھ گھبراہٹ سی محسوس کرتا نکل جاتا، تو وہ ہٹ کر ایک اور دور سے آتے ہوئے ٹامی کو اپنے لپ اسٹک سے لیپے ہوئے ہونٹوں کی مسکراہٹ کا نشانہ بنا لیتیں۔ جب وہ بھی پاس سے یونہی گزر جاتا تو ایک اور... یہاں تک کہ ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ پھیکی پڑ جاتی۔ اس مسکراہٹ میں اب دعوت نہ ہوتی، التجا ہوتی، کہ مجھے کم از کم یہ پکچر تو دکھا دو۔ یہاں تک کہ کوئی جنسی بھوک کا مارا ان کی طرف متوجہ ہو جاتا اور انھیں اندر لے چلتا۔ پھر رکشوں میں ٹامیوں کے پہلوؤں میں، ان کے گود میں بیٹھی ہوئی اور رکشے والا ایک کی بجائے دو کا بوجھ اٹھائے ہانپتا ہوا رکشا گھسیٹے لیے جاتا۔ اور پیچھے وہ دونوں بر سر بازار بیہودگیوں میں مصروف سینکڑوں لڑکیاں، خوبصورت، ابھی جوانی میں قدم رکھتی ہوئی، تازہ، کھلتی ہوئی کلیوں کی سی لڑکیاں اُدھیڑ عمر کے بدصورت ٹامیوں کے ساتھ، اور خوبصورت گلاب کے سے نوجوان ٹامیوں کے ساتھ بھدی سن والی، بدصورت لڑکیاں، ان گڑھوں کو، اور جھریوں کو اور جھائیوں کو، جو اس طرح کی زندگی نے ان کے چہروں پر پیدا کر دیے تھے پوڈر اور غازے کی موٹی موٹی تہوں میں اور اپنی بدصورتی کو شوخ رنگ کے بھڑکیلے، نئی تراش کی فراکوں میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی، خوبصورت جوڑے، بدصورت جوڑے، بے جوڑ جوڑے گورے ٹامیوں کے ساتھ کالی، سانولی، انڈین کرسچن لڑکیاں خوب خوب پوڈر تھوپے، لبوں پر لپ اسٹک لیپے، بوب اور پرم کیے ہوئے اور نئی نئی وضع سے بنائے ہوئے بال، ایک مخصوص لہجے میں انگریزی بولتی ہوئی اور ہندوستانیوں کو تحقیر سے دیکھتی ہوئی، اپنے آپ کو اینگلو انڈین ثابت کرنے کی کوشش میں، اور اینگلو انڈین لڑکیاں اپنے آپ کو یوروپین ثابت کرنے کی کوشش میں۔ یہ لڑکیاں جو اپنے بھیانک مستقبل کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہی تھیں ان کا مستقبل تو ابھی سے ظاہر تھا، جنگ ختم ہونے والی تھی اور یہ ٹامی چلے جائیں گے اور وہ اس وسیع دنیا میں بے یار و مددگار پھینک دی جائیں گی، ذلت اور گندگی کے گڑھے میں، بعض عمر بھر کے لیے گھناؤنی بیماریاں لیے، بعض بار بار کے ابورشنوں سے صحت کھو کر جوانی کھو کر۔ اور اب انھیں کوئی 'آفر' نہیں آئے گا۔ کسی

شریف اور خوشحال آدمی کا۔ وہ پہلے محبوب جنھیں وہ چھوڑ چکی تھیں اب پھر انھیں واپس نہیں لیں گے۔ یہ ٹامی جانے والے تھے اور آہستہ آہستہ ان سے کنارہ کشی کر رہے تھے۔ انھیں دھتکار کر چھوڑ رہے تھے کوئی واقعی ان سے شادی کرنے کو تیار بھی تھا۔ تو نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ شادی کر کے انھیں اپنے وطن لے جاتا تو وہاں کی نسلوں کا خالص خون، اس خون سے جس میں ہندوستانی خون ملا ہوا تھا، حل کرنا پاک ہو جاتا... اس لیے وہ سب انکار کر رہے تھے۔ اپنے وعدے توڑ رہے تھے... تو کیا جارج اس اینگلو انڈین لڑکی سے شادی کرے گا؟ دفعتاً جارج اس کی نظروں میں ان ہزاروں ٹامیوں سے اونچا اٹھ گیا۔ وہ کتنا ہی عیاش سہی، اس کا یہ عزم! کون جانے یہ صرف ایک عارضی کیفیت تھی۔ ممکن ہے اس لڑکی نے اسے پاگل بنا رکھا ہو۔ یا اس میں کوئی خاص بات ہو۔ جو ان دوسری لڑکیوں میں اس نے نہ پائی ہو۔ اس لیے ایک خاص جادو کے زیر اثر اس نے یہ محسوس کیا ہو کہ وہ اس سے ضرور شادی کرلے گا۔ اس نے اس کا امتحان لینے کے لیے پوچھا:

''تو کرسمس سے پہلے تمھاری شادی ہو رہی ہے؟''

''ہاں، اور کرسمس کے لیئے میں امریکہ جانا چاہتا ہوں۔ اگر جانا نہ بھی ہو سکا تو بہر حال شادی تو کرلوں گا، ہماری انگیجمنٹ ہو چکی ہے......'' اس آخری انکشاف اور جارج کے سنجیدہ لہجے نے مزید شک کے لئے جگہ نہ چھوڑی۔

جارج ابھی آیا، کہتا ہوا اُٹھ کر چلا گیا۔ کچھ مرمت شدہ ہوائی جہاز آزمائش کے لئے شہر کی طرف اُڑے جا رہے تھے۔ جارج ادھر جا رہا تھا عزیز اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ لیکن محبت؟ کیا جارج محبت کر سکتا ہے؟ جارج جو بیسیوں لڑکیوں کو پکڑ لاتا تھا کئی راتوں کو اس نے اس کے گھر سے گزرتے دیکھا تھا کہ جارج ایک لڑکی کے ساتھ ہے اور وہ گھر تو جیسے شیشوں کا بنا ہوا تھا۔ سارا اندرونی منظر راہ چلتوں کو دعوت نظارہ دیتا تھا۔ گلاس، اور ارغوانی شراب اور رنگ برنگ کے نیم عریاں، ملبوسوں میں لڑکیاں۔ ہر وقت کوئی نئی لڑکی! اور وہ دونوں شراب میں مست۔ راستہ سے گزرنے والے ہی شرم سے

آنکھیں پھیر لیتے تھے۔ جارج اور محبت، یہ کیسے ممکن ہے؟ اسے زبیری یاد آ گیا۔ زبیری جو کبھی اس طرح کے مغالطے میں مبتلا نہیں ہوتا تھا۔ اب بھی مبتلا نہیں ہوتا اور ان عورتوں اور لڑکیوں کو بھی دھوکے میں نہیں رکھتا تھا۔ وہ ان سے پہلے ہی کہہ دیتا یہ محبت نہیں ہے۔ زبیری جو ہر عورت کو دیکھ کر کہہ سکتا تھا، وہ گرے گی یا نہیں، اور اس کا دعویٰ تھا کہ ہر عورت کمزور ہوتی ہے"۔ کوئی بھی عورت ہو، دس دن تک آہستہ آہستہ میدان صاف کرلو۔ بس گیارھویں دن وہ گر جائے گی۔ زبیری ہر طرح کی لڑکیوں کو پھانسنے میں ماہر تھا۔ ہندو، مسلمان، کرسچن، اینگلو انڈین، کنواری، شادی شدہ، بیوہ، بالکل کم سن، جوان، ادھیڑ، ہر طرح کی۔ اور اسے تعجب ہوتا اس کالے، پست قد، موٹے سے آدمی پر، جس کا پیٹ عیاشی کی زیادتی سے پھول گیا تھا، اتنی عورتیں کیسے قبول کر لیتی ہیں۔ زبیری کہتا ہے کہ بس وہ ایک دفعہ گھور کر دیکھ لے تو کوئی بھی عورت ہو، بے اختیار اُس کی طرف کھنچ آتی ہے آخر کیا بات ہے زبیری میں؟ شاید سیکس اپیل۔ ہم مردوں کو بھی تو bitch قسم کی عورتوں میں زیادہ کشش محسوس ہوتی ہے، خواہ وہ کریہہ المنظر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کراہت میں جنسی اپیل ہوتی ہے۔ یہ کراہت ہمارے کریہہ حیوانی جذبات کو بھڑکا دیتی ہے۔ اس کے برخلاف حُسن ہمیں مرعوب کر دیتا ہے۔ ملکوتی، پاکیزہ، معصوم حُسن محبت اور پرستش کے جذبات کو بیدار کرتا ہے۔ اور یہ بات بھی تو ہے کہ ایسے مردوں اور عورتوں تک رسائی بڑی آسانی سے ممکن ہے اور پھر ان کا کار آزمودہ اور تجربہ کار ہونا بھی... ہاں یہی تو ہوگا زبیری کا راز۔ کبھی کبھی زبیری اُسے ایک ہیرو نظر آنے لگتا۔ زبیری اپنے کارناموں کو یوں مزے لے لے کر، اُنہیں ایسا لذیذ بنا کر سناتا کہ کبھی کبھی عزیز کو اس کی رنگین اور کامیاب زندگی پر رشک آنے لگتا۔ خود اس کے قدم ڈگمگاتے نظر آتے لیکن عزیز مضبوط کردار کا مالک تھا۔ اور اس کی قبول صورت بیوی اور ننھے ننھے بچے۔ وہ اُنہیں ڈگمگانے نہ دیتا لیکن کبھی کبھی اُسے یہ خیال آ ہی جاتا کہ اگر اُسے کوئی چودہ پندرہ سالہ تازہ شوخ اور طرار لڑکی مل جائے تو شاید وہ اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکے۔ اور زبیری اُسے ہر وقت دعوت گناہ دیتا۔ عزیز میں خود تمہارے لئے

سارا میدان صاف کئے دیتا ہوں۔ کیا میں اپنے دوست کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتا۔ تم نے اس مست آنکھوں اور گٹھے ہوئے بدن والی لڑکی کو دیکھا ہے نا؟ جس کے ساتھ ان دنوں میں...... کہو تو تمہارے لئے کوشش..... اور عزیز کے دل میں ایک زلزلہ بپا ہو جاتا، اور کشمکش...... پھر اس کے ہونٹ آہستہ سے کہہ اُٹھتے "نہیں....."۔ اور زبیری اُسے ٹھو کے دیتا اس پر طعنوں کی بوچھار کرتا۔ "عزیز تم بزدل ہو۔ گناہ رنگین کی طرف کس کی طبیعت مائل نہیں ہوتی۔ بات یہ ہے کہ تم میں جرات گناہ نہیں، تم بزدل ہو..." پھر عزیز کے ذہن میں ممتاز کے الفاظ تیر گئے۔ "بزدلی نفسانی خواہشات کا مقابلہ نہ کر کے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دینا بزدلی ہے، انہیں زیر کر کے ان پر فتح پا جانا، ہمت کا کام ہے۔" ممتاز جو اس کا نہایت عزیز دوست تھا۔ ممتاز جسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا اس دنیا میں کبھی کبھی فرشتے بھی پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ اُس کے خوبصورت بیضوی سلونے چہرے پر ہمیشہ، تازگی، پاکیزگی اور معصومیت کی کرنیں سی پھوٹا کرتیں۔ اور اس کی بڑی بڑی خوبصورت سبز سبز آنکھوں میں معصومیت اور پاکیزگی کا رس چھلکا کرتا۔ ممتاز میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی پاکیزگی کو دوسروں میں بھی منتقل کر سکتا تھا۔ ممتاز کی موجودگی میں ساری محفل پر، ماحول پر ایک پاکیزگی سی چھائی ہوتی۔ وہ اس قدر خوش گفتار تھا کہ جب وہ باتیں کرتا تو سب محویت کے عالم میں بیٹھے سنتے۔ اگر کوئی اس سے بحث کرتا تو وہ ممتاز کے دلائل، اس کی تیقن بھری آواز، اس کے گمبھیر انداز کے سامنے اس کی آواز مدھم پڑ جاتی۔ عزیز اُسے اکثر زبیری کے قصے اور اُس کی دعوت گناہ اور اُسکے طعنوں کے متعلق اسے بتایا کرتا اور ممتاز ہنس کر کہتا۔ بزدلی؟ ایسے لوگ یونہی کہا کرتے ہیں۔ کیونکہ ایک پاکیزہ زندگی ان کے تصور سے باہر ہے۔ وہ پاک دامنی کو یا تو بزدلی سمجھتے ہیں یا ریاکاری۔ وہ سمجھتے ہیں ایسے لوگوں کو گناہ کی طرف قدم بڑھانے کی جرأت نہیں یا وہ صرف لوگوں کے ڈر سے اپنے آپ کو یوں ظاہر کرتے ہیں گو ان کے اندر گندے جذبات کھولتے رہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ایسے لوگ نہیں ہیں اور میں ان لوگوں کو جن سے خواہشات سے بالکل مغلوب اور مجبور ہونے پر کسی کمزور لمحے میں

گناہ سرزد ہوجاتا ہے، ایسے لوگوں سے بہتر سمجھتا ہوں جن کا باطن نہایت گندہ ہوتا ہے۔
لیکن مجھے یقین ہے کہ انسان مذہب کے ڈر سے نہیں، خدا کے ڈر سے نہیں، سماج کے
ڈر سے نہیں اپنے آپ کے لئے پاک رہ سکتا ہے..."

اور بحث کئی اور پہلوؤں پر مڑ جاتی ......اور یہ لوگ فخر کرتے پھرتے ہیں کہ ان
کے جذبات بہت تیز ہیں۔ ان میں قوت بہت زیادہ ہے لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایسے
آدمیوں میں، پاک زندگی بسر کرنے والوں سے، اگر وہ صحت مند بھی ہوں، زیادہ قوت
potency ہو۔ ان میں اتنی انرجی جمع رہتی ہو۔ یہ اسے بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ ہاں،
البتہ ان کی فطرت inflamable جذبہ ہوجاتی ہے۔ اور ان کے جذبات بہت جلد
مشتعل ہوجاتے ہیں، ان کی قوت ختم ہوجاتی ہے، اس وقت بھی وہ باز نہیں رہ سکتے کیونکہ وہ
گناہ کی زندگی کے اس قدر عادی ہو چکے ہوتے ہیں اور انہیں خارجی سہاروں کی ضرورت
ہوتی ہے۔ دوائیں، گولیاں، معجونیں، توبہ کس قدر نفرت انگیز!..."

ویسے تو اُس نے بہتوں کو ایسی باتوں میں "اخلاقی قصہ سناتے دیکھا تھا۔ لیکن ممتاز
کی بات ہی اور تھی ۔ وہ خود پاک تھا۔ اس لئے اُس کی باتیں دل کی گہرائیوں میں اُتر
جاتیں۔ اس کی باتوں میں بلا کا اثر تھا۔ ممتاز کی آواز اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی
تھی۔ "اور عزیز تم سمجھتے ہو کہ ایسے آدمیوں کو سچی مسرت ملتی ہے، ایک عارضی لذت، سطحی
مسرت اور سچی، دلی مسرت میں بہت فرق ہے۔ اور پھر وہ کبھی مطمئن نہیں ہوتے، ایک
گناہ سے دوسرے گناہ کی طرف بڑھے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کی پیاس کبھی نہیں بجھتی۔
تشنگی بڑھتی ہی جاتی ہے اور یہ تشنگی اُن کی روح پر چھا جاتی ہے...." اور ممتاز کی اس بات کی
سچائی کا اسے اس وقت کتنی شدت سے احساس ہوا تھا جب فرید ایک دن اپنے روزروز کے
فاتحانہ کارنامے سناتا سناتا ایک دم، اچانک کھو سا گیا تھا۔ "لیکن عزیز کتنی عارضی ہوتی ہے
یہ لذت، یہ کیف اور پھر...."

فرید اس کے گہرے دوستوں میں نہ تھا۔ لیکن تھا بے تکلف اور وہ زبیری کی طرح

چالاک بھی نہ تھا۔ زبیری تو لوگوں کے سامنے اتنا معصوم بن جاتا تھا۔ اتنا معصوم، سب سے بڑھ چڑھ کر اپنا اخلاقی قصہ سناتا۔ لیکن فرید سب کو اپنے قصے سنا دیا کرتا۔ بلکہ وہ اپنے کارنامے سنانے میں بڑا فخر محسوس کرتا تھا۔ وہ کافی خوش شکل تھا اور اُسے اپنی کامیابی پر ناز تھا۔ فرید کی بیوی بہت حسین تھی اور بہت کم سن۔ عزیز کو کبھی کبھی تعجب ہوتا کہ اتنی حسین اور الٹرا موڈرن قسم کی لڑکی اس کی بیوی ہونے کے باوجود وہ کیوں اتنا عیاش بن گیا ہے۔ شادی سے پہلے اس کے دو تین ''افیرز'' ضرور ہو گئے تھے۔ لیکن شادی ہوتے ہی وہ اپنی بیوی پر وارفتہ ہو گیا تھا۔ اور وہ دونوں کچھ اس طرح ایک دوسرے سے چمٹ گئے تھے کہ ایک دن بھی ایک دوسرے سے جدا نہ رہ سکتے تھے۔ میاں بیوی دونوں اپنے اپنے دوستوں اور سہیلیوں سے اپنی ایک دوسرے سے وارفتگی کی داستانیں سنایا کرتے کہ اُن کا سا ''مثالی جوڑا'' کوئی نہیں؟ لیکن جب عزیز ممتاز کو ان کے متعلق بتایا کرتا تو ممتاز کو یقین نہیں آتا تھا۔ وہ ہنس کر کہتا ''سچی محبت کچھ اور ہی ہوتی ہے عزیز۔ ہمیشہ ایک دوسرے سے چمٹے رہنا ہی محبت نہیں۔ وہ بہت جلد ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے....''

فرید کی بیوی اب بھی حسین تھی۔ لیکن اب وہ بالکل بیکار ہو چکی تھی اور اس میں اب وہ رس اور مٹھاس باقی نہ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا سارا رس چوس لیا گیا ہو۔ اور اب وہ غازے میں لپی پتی چینی کی جوان گڑیا معلوم ہوتی تھی۔ فرید اب ہر روز اپنی کار لئے نئے نئے شکاروں کی تلاش میں نکل جاتا۔ اور عزیز کو تعجب ہوتا، بلاناغہ اُسے ہر روز کوئی نہ کوئی عورت مل جاتی ہے۔ پہلے پہل عزیز کو اُس کی باتوں کا یقین نہ آتا تھا۔ آزمانے کے لئے وہ بھی اس کے ساتھ ہو جاتا اور اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا کہ ہر روز بلاناغہ کوئی نہ کوئی لڑکی یا عورت اس کی کار میں آبیٹھتی ہے۔ کسی بھی قوم کی، ہندو، مسلمان، کرسچن، اینگلو انڈین، انگریز، امریکن، اطالوی، اور ایک دن وہ دم بخود رہ گیا تھا۔ جب ایک نہایت حسین انگریز عورت یوں ہی، ذرا سی دیر میں اُس کی کار میں آبیٹھی تھی۔ وہ نہایت حسین تھی، جسم کسا ہوا اور متناسب، جوانی کے رس سے بھری ہوئی تھی۔ شاید ابھی ابھی وہ کوئی تیز شراب پی کر

آئی تھی اس میں آگ سی لگی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔ اور مخمور بہکی ہوئی آنکھیں جیسے کسی کی تلاش ہی میں تھیں ۔ اور فرید اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورتا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں حیوانیت اُمڈ آئی تھی ۔ دونوں کی آنکھوں نے ایک دوسرے کا پیغام پڑھ لیا اور وہ کھنچی چلی آئی ۔ پھر بعد میں عزیز کو معلوم ہوا کہ وہ انگریز عورت شادی شدہ تھی اور اُس کا شوہر ایک بہت بڑا عہدے دار تھا... اور یہ فرید اُسے ہمیشہ جنس کے میدان میں اپنے ''تجربات'' سنایا کرتا تھا۔ اور اپنی کامرانیوں اور فتح یابیوں کی داستانیں سناتے سناتے وہ ایک دن کھوسا گیا تھا۔ ''ہاں عزیز، سینکڑوں لڑکیاں میری زندگی میں آئی ہیں۔ نہایت حسین و جمیل لڑکیاں بھی، لیکن ان میں سے کسی نے بھی میرے دل پر نقش نہیں چھوڑا، اپنی یاد مرتسم نہیں کی کسی کے لئے بھی، ایک لمحے کے لئے بھی تو میرے دل میں محبت کا پاکیزہ جذبہ نہیں اُمڈا۔ صرف ایک آگ ہوتی ہے، ایک عارضی لذت، کچھ دیر سرشاری سی اور پھر اچانک ایک خلا سا، میری بیوی ہی ایک لڑکی ہے جس سے مجھے واقعی کچھ محبت تھی اور ان دنوں میں ایک الگ ہی قسم کی مسرت محسوس کرتا تھا۔ اب محبت میرے سینے میں مر چکی ہے میں ایک ایسا خلا محسوس کرنے لگا ہوں، اور یہ اب کبھی نہیں پُر ہو سکے گا— کبھی نہیں....''

ہاں ممتاز کتنا ٹھیک کہتا تھا۔ ''کوئی گناہ بجائے خود اتنا خراب نہیں جتنا اپنے اثر کی وجہ سے۔ ان لوگوں کو ایک طرح کی روحانی بے چینی ضرور ہی رہتی ہوگی۔ اور یہ احساس کی تلخی اور روحانی بے چینی اس عارضی مسرت پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اور جو لوگ حساس ہوتے ہیں، جن کا ضمیر بیدار ہوتا ہے، انھیں تو گناہ کے بعد ناقابل برداشت روحانی اذیت ہوتی ہے۔ جب میں متین کو، تم جانتے ہو نا متین کو، جب اسے دیکھتا ہوں تو اس قدر رنج ہوتا ہے۔ غریب، اس سے صرف ایک دفعہ لغزش ہوگئی تھی، وہ بھی بڑی شدید ترغیب کی وجہ سے۔ اس بات کو اب پندرہ سال سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ لیکن اب تک اسے اس گناہ کے تلخ احساس، اس روحانی کرب سے نجات نہیں مل سکی ہے۔ اس کی زندگی کتنی ٹریجک بن گئی ہے۔ اب وہ پینتیس برس سے زیادہ کا ہو چکا ہے۔ وہ تنہائی سے تنگ آچکا ہے۔ اسے ایک

ساتھی کی ضرورت بری طرح محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن وہ شادی کرنے پر کسی طرح رضامند نہیں، ہمیشہ وہی کہتا ہے۔ اس قدر تلخی کے ساتھ میرا دامن آلودہ ہو چکا ہے، میں اس کے قابل نہیں۔ میں ناپاک ہوں، تم کتنے خوش قسمت ہو ممتاز کہ تم پاک ہو، تمہارا ضمیر صاف ہے۔" بارہا میں نے اسے سمجھایا ہے "متین، تم اپنے آپ کو ناپاک سمجھتے ہو، لیکن تم واقعی پاک دامن لوگوں سے بھی زیادہ پاک ہو۔ میں تم کو اپنے آپ سے اونچا سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ میری بات اور ہے، مجھ سے کوئی لغزش ہوئی ہی نہیں، میرے پاؤں سیدھے راستے سے نہیں بھٹکے۔ لیکن تم بھٹک کر بھی سیدھی راہ پر واپس آ گئے ہو۔ گناہ کی لذت چکھ کر بھی اس کی خطرناک ترغیب سے بچ کر چلے آ رہے ہو۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے متین۔ اور پھر تمھارے اس شدید پچھتاوے کی تھوڑی سی مقدار بھی تمھارے اس گناہ کو دھو دینے کے لیے کافی تھی۔ اور تم مسلسل پندرہ سال سے توبہ کرتے آ رہے ہو۔ تم واقعی پاک ہو۔ یہ احساس دل سے نکال دو۔ اور جلدی کہیں شادی کر لو۔ تمھیں ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔" ایک دن وہ خوشی خوشی آ کر کہنے لگا "ممتاز میں شادی کر رہا ہوں۔" میں خوش ہو گیا، پوچھا "سچ؟" کہنے لگا "ہاں، ایک لڑکی ہے۔ کہتے ہیں کافی زیادہ سن کی ہے۔ بدصورت ہے، غریب کو کوئی آفر نہیں آتا۔ کہو ممتاز، ایسی لڑکی سے جس سے کوئی شادی کرنے کو رضامند نہ ہو، میں شادی کر لوں تو یہ ایک بھلا کام ہو گا نا۔ لڑکی کا بھی ایک ٹھکانہ ہو گا۔ اور میں ہوں بھی ایسی ہی لڑکی کا مستحق۔ لڑکی پڑھی لکھی ہے۔ یہی بس ہے میرے لیے....." چند دن بعد آیا تو پوچھا "تم نے پیام بھیج دیا؟ بات پکی ہو گئی؟" وہ اُداس ہو گیا۔ کہا "نہیں۔" میں نے پوچھا "کیوں، کیا انھوں نے انکار کر دیا؟ تم سا بر انھیں کہاں ملے گا برسرکار کے اتنی اچھی تنخواہ، اور وہ بھی جب لڑکی کو کوئی نہ پوچھتا ہو۔" اس کے لبوں پر پھر وہی تلخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "نہیں، میں نے ہی ارادہ ترک کر دیا۔ اس وقت میں نے تم سے کہا تھا میں ایسی ہی لڑکی کا مستحق ہوں۔ لیکن اب سوچتا ہوں، کیا میں ایسی لڑکی کا بھی مستحق ہوں۔ وہ بدصورت سہی، زیادہ عمر والی سہی، لیکن پاک دامن تو ہو گی۔ اور میرا دامن آلودہ ہو چکا ہے۔ میں اس

آلودہ دامن سے اس کا دامن کیسے باندھ سکتا ہوں؟'' ممکن ہے اور لوگ متین کے سے حساس نہ ہوں اور گناہ کے عادی ہو جانے سے ان کے ضمیر کی آواز بالکل مدھم بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن کبھی نہ کبھی تو ان کا ضمیر جاگ اٹھتا ہوگا۔ زندگی کے اعلیٰ اقدار سے محروم اس سستی سی زندگی کی وجہ انھیں کم از کم غیر شعوری طور پر ایک روحانی خلا سا، بیزاری، تشنگی سی محسوس ہوتی ہوگی۔ ان کا ضمیر بالکل ہی مر چکا ہو، اور تمھارے زبیری کی طرح انھوں نے جنسی حظ ہی کو زندگی کا ماحصل سمجھ لیا ہو تو الگ بات ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کی زندگی تو جانوروں کی زندگی ہے۔

عزیز پتھر کی اس بنچ کے بازو پر کہنی ٹیکے ہتھیلی میں سر لیے بیٹھا رہا۔ جارج ابھی تک نہیں لوٹا تھا اور بس نکلنے میں ابھی دیر تھی۔ اس کے سر میں ہلکا سا درد ہونے لگا تھا۔ اس نے انگلیوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی بند آنکھوں کے سامنے اب بھی ممتاز کا خوبصورت سلونا چہرہ تھا۔ اور بحث کے سلسلے کی کڑی پھر مل گئی۔

''اور ایسے آدمی کی عزت کو بھی دھکا لگتا ہے۔ سوسائٹی اسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی خواہ کوئی بڑا آدمی ہی کیوں نہ ہو جب لوگوں پر اس کی یہ کمزوری ظاہر ہو جاتی ہے تو ان کی نظروں میں اس کی وقعت جاتی رہتی ہے... مجھے خود ایک دفعہ ایسا احساس ہوا تھا۔ ایک بڑے آرٹسٹ کو میں نے ایک عام، معمولی، بلکہ سستی سی لڑکی کے ساتھ دیکھا تو مجھے اچانک احساس ہوا اس کی وقعت میرے دل میں گھٹ گئی ہے۔ اس آرٹسٹ کی میں بہت قدر کرتا تھا۔ اس سے مجھے عقیدت تھی۔ لیکن اس لمحے اچانک یہ جذبہ احترام، یہ وقعت گھٹ گئی۔ مجھے خود تعجب ہوتا ہے ایسا کیوں ہوا؟ کیوں کہ میں اس بات کا قائل ہوں کہ کوئی شخص اس کی صرف اس ایک کمزوری کی وجہ سے مطعون نہیں ٹھہر سکتا۔ ممکن ہے اس میں بہت سی ایسی خوبیاں ہوں جن کی بنا پر وہ اوروں سے بدرجہا اچھا ہو معلوم نہیں کیوں سوسائٹی اور گناہوں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ لیکن اس کی جنسی گناہ کا پلہ بہت بھاری ہوتا ہے... اور پھر وہ ایک آرٹسٹ تھا اور میرا یہ نظریہ ہے کہ آرٹسٹ کی ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے ہی قدر کرنی

چاہیے۔ اس کی اخلاقی کمزوریوں کو نظر انداز کر کے۔ پھر بھی جانے کیوں مجھ پر فوری ردعمل یہ ہوا۔ اور اس کے بعد میرے دل میں اُس کی وہ وقعت نہ رہی۔"

ممتاز بہت اچھا ڈبیٹر تھا۔ وہ بحث کو قدم بہ قدم آگے بڑھا کے لے جاتا۔

"اور اس کا برا اثر گناہ کے مرتکب ہونے والے پر ہی نہیں اور کتنوں پر پڑتا ہے۔ اگر نتیجہ صرف اس تک، ایک ہستی تک محدود رہتا تو یہ اتنی بری بات نہ تھی۔ لیکن کتنی ہستیاں اُس کی لپیٹ میں آجاتی ہیں۔ وہ شادی شدہ ہے تو اس کی بیوی پر یہ کتنا بڑا ظلم ہوگا۔ اور اکثر عیاش آدمیوں کو گھر کا، اور بیوی بچوں کا، جنھیں زندگی بھر سہارا دینے کی ذمہ داری ان پر ہے، بالکل خیال نہیں رہتا۔ پھر ان کے رشتہ داروں، خصوصاً ماں باپ پر، اگر وہ غیرت مند ہوں تو بیٹے یا بیٹی کے رویہ کا ان پر کیا اثر پڑتا ہوگا۔ پھر وہ لڑکیاں جن کے ساتھ یہ... ممکن ہے ان میں کوئی معصوم لڑکی بھی ہو، اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ اگر یہ بات ہو بھی کہ ان میں بہت ساری لڑکیاں خود بھی بداطوار ہوتی ہیں، اور انھیں خود ہی ایسے تجربوں کی تلاش ہوتی ہوگی، تو یہی ہوتا ہے نا کہ بڑھتی ہوئی بدعنوانیاں اور بڑھتی رہیں گی۔ گندگی بڑھتی رہے گی۔ سوسائٹی کی اخلاقی حالت گرتی ہی جائے گی... فرد کی انفرادی آزادی کو ہم اس وقت تک مان سکتے ہیں اور اس کا حق سمجھتے ہیں جب تک کہ وہ سماج سے ٹکر نہ کھائے۔ اگر یہ آزادی دوسروں کے لیے مضر ثابت ہو سکتی ہے تو اس کے آگے بند لگا کر اسے روکنا ہی پڑتا ہے۔"

اور بحث کے دوران میں کسی گوشے سے یہ آواز اٹھی... "لیکن ہمارے جذبات تو حیوانی ہوتے ہیں۔ فطرت کے بہاؤ کو کیسے روکا جا سکتا ہے۔ ہمارے اندر جذبات بھڑک اٹھیں اور ہم انھیں اپنے آپ پر نہایت جبر کر کے روکے رکھیں تو کیا یہ ڈھونگ نہ ہوگا، ریاکاری نہ ہوگی؟ اور ان جذبات کو کیوں گھونٹ گھونٹ کر رکھا جائے۔ فطرت کیوں نہ اپنی راہ آپ اختیار کرے۔"

ممتاز اس کی طرف آہستہ سے مڑا اور نہایت سنجیدہ، ٹھنڈے لہجہ میں کہنے لگا "تم کہتے ہو کہ ہمارے جذبات حیوانی ہوتے ہیں... ٹھیک ہے۔ لیکن انسان حیوان کیوں نہیں

ہے؟ حیوان سے اونچا کیوں ہے؟ بلکہ فرشتوں سے بھی اونچا کیوں ہے؟ اس لیے کہ فرشتوں کی فطرت میں صرف نیکی ہے۔ انسان نیکی اور بدی کا امتزاج ہے۔ وہ فرشتوں سے بھی اونچا اٹھ جاتا ہے جب ان سفلی جذبات کے ہوتے ہوئے بھی وہ ان پر قابو پا جاتا ہے۔ غلط راہ کی شدید ترغیب سے بچ کر سیدھی راہ اختیار کر سکتا ہے۔ ہم اس حیوانی قوت کو دوسری رَو میں موڑ سکتے ہیں۔ ان جذبات کو اونچا کر سکتے ہیں۔ سبلیمیشن (sublimation) بھی کوئی چیز ہے۔ آخر زندگی میں اعلیٰ قدریں بھی ہیں۔ اور میں تو یہ نہیں سمجھتا کہ ہمیں ہمیشہ اپنے آپ کو ریاکار محسوس کرنے کی، اور اُبلتے ہوئے فطری جذبات کو گھونٹتے رہنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب ہم جذبات کو قابو میں رکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں، جذبات کچھ اس طرح سدھائے جا سکتے ہیں کہ وہ ہر موقع پر اُبل نہ آئیں۔ اور یہ سدھائے ہوئے جذبات اور بلند کیے ہوئے جذبات ہماری فطرت ثانی بن جاتے ہیں۔ ہم انھیں اس حد تک sublimate کر سکتے ہیں کہ گندے اور بیہودہ خیالات تک نہ آنے پائیں۔ مجھے اس پر یقین ہے کہ انسان اپنے خیالوں کی حد تک بھی پاک رہ سکتا ہے۔''

اس بات پر تو عزیز بھی متحیر ہو گیا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ایسے خیالات بھی نہ آئیں؟ اور پھر اسے شک گزرا۔ کیا ممتاز اس حد تک پاک ہے، ایک دن اس نے آہستہ سے پوچھ ہی لیا'' کیا تمھیں ایسے خیالات بھی نہیں آتے؟'' ممتاز نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ ممکن ہے وہ ایسا ہی ہو، وہ ممتاز کو برسوں سے جانتا تھا۔ کالج کے زمانہ میں بھی وہ بہت پاکیزہ طبیعت مانا جاتا تھا۔ وہ اور لڑکوں سے بالکل الگ تھا۔ ایسی بیہودہ باتوں میں حصہ تک نہیں لیتا تھا۔ محبت کو بھی وہ بے وقوفی سمجھتا تھا۔ اس کی ساری دلچسپی کتابوں پر مرکوز تھی۔ اسے کتابوں سے عشق تھا۔ کالج کے بعد بھی اس کا اور ممتاز کا ہمیشہ ساتھ رہا تھا۔ اور اسے اچھی طرح معلوم تھا ممتاز سے کبھی کوئی لغزش نہیں ہوتی ہے۔ ممتاز خوبصورت تھا، متمول تھا، اسے آسانی سے کامیابی ہو سکتی تھی ان باتوں میں۔ لیکن وہ اس کی طرف پھٹکتا بھی نہ تھا۔ پھر اس کی شادی ہو گئی۔ اور خدا جانے یہ اس کی خوش قسمتی تھی یا اس کی پاکیزگی کا صلہ کہ اسے اپنی پسند کی لڑکی

ملی تھی، صورت شکل میں، مزاج میں، ذوق میں، ہر بات میں، اس نے جو آئیڈیل اپنے دل میں قائم کر رکھا تھا یہ لڑکی ویسی ہی تھی۔ اور اس کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار تھی۔ اس کی بیوی، اس کی بیوی ہی نہیں محبوبہ تھی، اور صرف محبوبہ ہی نہیں اس کی بہترین رفیق بھی۔ اسے اپنی بیوی سے بے اندازہ محبت تھی۔ نہایت گہری، غیر معمولی محبت... پھر عزیز نے ممتاز کو دیکھا، اس کی پاکیزگی کے نور سے چمکتی ہوئی آنکھوں کو، اس کی پاکیزہ مسکراہٹ کو، تو وہ اپنے شک پر خود ہی شرمندہ ہو گیا اور چیخ اٹھا ''او ممتاز، تم سینٹ ہو، تم فرشتہ ہو۔''

ہاں، ایسا ہی تھا ممتاز! کتنا تفاوت تھا اس کے دو دوستوں میں، زبیری ایک شیطان تھا اور ممتاز ایک فرشتہ۔ اور عزیز کو یہ سوچ کر دل ہی دل میں ہنسی آئی۔ ''اور میں ان دونوں کے درمیان انسان ہوں۔'' وہ کل ضرور ممتاز سے ملنے جائے گا، بہت دن ہو گئے اس سے مل کر اسے اس جارج کی باتیں بتائے گا۔ دیکھیں وہ کیا کہتا ہے۔ اس انوکھے جارج کے بارے میں، جو پرلے درجے کا عیاش ہے لیکن جسے یہ غلط فہمی ہے کہ اسے واقعی ایک لڑکی سے محبت ہے، جو ایک اینگلو انڈین لڑکی سے شادی کر رہا ہے۔

شاید جارج کی عمر بڑی تھی۔ اس کا نام ذہن میں آتے ہی وہ سامنے موجود تھا اور پوچھ رہا تھا ''اب مجھے جانا چاہیے۔ ابھی کتنی دیر ہے تمھاری بس کے نکلنے میں؟''

''بس دس منٹ۔''

یہ سن کر جارج بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں پھر حیوانی چمک پیدا ہو گئی۔ وہ مسکرایا ''آج تو کوئی ہندوستانی لڑکی ہو گی۔'' عزیز کا زرد چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور مارے شرم اور غیرت کے اس کا سر جھک گیا۔ اور جارج کہتا گیا ''اب میں اکثر ہندوستانی لڑکیاں ہی لے جایا کرتا ہوں، یہ اینگلو انڈین لڑکیاں! ان کا دماغ آسمان پر چڑھا ہوتا ہے۔ جانے اپنے کو کیا سمجھتی ہیں۔ آدھی یوروپین ہی تو ہیں، پچاس سے کم میں کسی طرح رضامند نہیں ہوتیں۔ ہر دفعہ پچاس روپے۔ اور پھر تم جانتے ہو، میں ایک ہفتہ سے زیادہ... لیکن اب تو ہندوستانی لڑکیاں اچھی پڑ رہی ہیں....'' عزیز کا چہرہ زرد سے سرخ، سرخ سے نیلا، نیلے سے اودا ہوا جا

رہا تھا۔ جارج کہتا رہا... ''اور یہ ہندوستانی لڑکیاں پانچ پانچ روپیوں میں مل جاتی ہیں۔'' پھر اس نے عزیز پر جھک کر آہستہ سے کہا ''اور ہندوستانی لڑکیاں گرم ہوتی ہیں۔'' لیکن عزیز کا خون کھول اٹھا تھا۔ اس کے دماغ پر جارج کا یہ جملہ بجلی بن کر گرا تھا۔ ''ہندوستانی لڑکیاں پانچ پانچ روپیوں میں مل جاتی ہیں۔'' اسے اس لمحے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی ایسی لڑکی اسے تنہا مل جائے تو اس کا گلا گھونٹ ڈالے گا۔ ان ڈیک آئی کی یا دوسری ہندوستانی لڑکیوں میں سے کوئی ایک، جو آج کل غازے اور لپ اسٹک سے لپی، جارجٹ کی، ٹشو کی مہین زریں بارڈروں والی ساریوں میں، چست کپڑوں میں اپنے بھدے پن کو اور نمایاں کرتی ہوئی ٹامیوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پھرتی رہتی ہیں جن میں سے کئی ایک کو اس نے ان برمی لیڈی ڈاکٹروں کے دواخانے میں جو جنگ کے دوران میں برما سے بھاگ آئی تھیں اور اپنا ذاتی دواخانہ کھول کر ایک خاص 'ٹریٹمنٹ' کے ذریعہ سینکڑوں روپے کما رہی تھیں۔ ان برمی ڈاکٹروں سے کھسر پھسر کرتے دیکھا تھا۔ کوئی ایسی لڑکی اسے تنہا مل جائے تو اس کا گلا گھونٹ ڈالے.... ہندوستان کو اب سیتاؤں اور ساوتریوں کا ملک سمجھنا تو خوش فہمی تھی لیکن یہ لڑکیاں غیر ملکیوں کے سامنے بھی اتنی ذلیل کیوں ہو جاتی ہیں؟

وہ چونکا۔ سامنے ڈرائیور اپنی بسوں کو گیٹ کے سامنے لا کر کھڑا کرنے کے لیے اسٹارٹ کر رہے تھے اور فیکٹری کے اندر سے ورکرز، انجینئروں وغیرہ کا انبوہ کثیر نکل کر بسوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا پھر اسے یاد آیا کہ وہ جارج کو اس کی انگیجمنٹ پر مبارکباد دینا بھی بھول گیا۔ اس نے بنچ پر سے ٹوپی اٹھالی اور کہا ''تمھاری شادی کی خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی، دلی مبارک باد۔''

جارج نے ہنس کر کہا ''شکریہ۔''

دونوں نے ایک دوسرے سے رخصت لی۔ عزیز جانے لگا۔ پھر اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے مڑ کر پوچھا:

''جارج! تمھاری دوست، میرا مطلب ہے وہ لڑکی جس سے تم شادی کر رہے ہو وہ

سنہرے بالوں والی لڑکی ہے کیا؟''

''ہاں ڈوروتھی کے بال سنہرے ہیں۔ لیکن کئی ایک سنہرے بالوں والی لڑکیوں کو تم نے میرے ساتھ دیکھا ہوگا۔ میں کیسے جانوں تم نے ڈوروتھی کس کو سمجھا ہے۔''

''میرا مطلب اس لڑکی سے ہے، جس کے بال سنہرے تھے، آنکھیں نیلی، وہ ہلکے سبز رنگ کا نیچے گلے کا ریشمی فراک پہنے ہوئے تھی۔ ابھی گزشتہ ہفتہ کی رات، کوئی ساڑھے گیارہ بجے میں تمھارے گھر پر سے گزرا تھا۔ میں نے اسے تمھارے ساتھ دیکھا تھا۔ پھر دوسری صبح جب وہ تم سے رخصت لے رہی تھی، میں نے اسے اچھی طرح دیکھا تھا۔ بے حد حسین لڑکی تھی وہ اس لیے میں نے پوچھا...''

لیکن جارج ایسے پلٹا جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو۔ ''کیا پوچھا تم نے؟ وہ لڑکی جس کے ساتھ میں نے ہفتہ کی رات گزاری تھی ڈوروتھی ہے؟ ڈوروتھی؟'' پھر اس کی آواز دھیمی ہوگئی۔ اور عزیز نے تعجب سے دیکھا اس کی ہر وقت حیوانیت سے چمکتی ہوئی آنکھوں میں اس لمحہ عجیب پاکیزہ چمک آگئی ہے۔ ''نہیں وہ آئرین تھی۔ ڈوروتھی کو میں نے چھوا تک نہیں ہے۔ شادی سے پہلے میں اسے ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔ اس کی معصومیت کی میں قدر کرتا ہوں۔ اس کا جسم میرے لیے مقدس ہے۔ ڈوروتھی سے مجھے محبت ہے۔''

●●●

کیاس نووا

ان کے گرد رنگ اور حسن کی موجیں لہریں مار رہی تھیں کیوں کہ اب وہ سٹی کے حدود پار کر کے چھاؤنی میں داخل ہو گئے تھے۔ حسن سے زیادہ رنگوں کی، کبھی کبھار ہی کوئی حسین صورت نظر آیا کرتی تھی۔ لیکن رنگ! فراکوں کے رنگ، بالوں کے رنگ، آنکھوں کے رنگ، لپ اسٹک اور روژ کے مختلف شیڈ... ابھی تین لڑکیاں سائیکل پر سوار سن سے گزر گئیں۔ اور سنہری اور بھنی براؤن اور سرخ رنگ کے بال ہوا میں لہرائے، نیلی، سبز اور شربتی آنکھیں چمکیں، اور کاسنی، قرمزی اور گلابی رنگ سے رنگے ہوئے لب و رخسار، پھر رکشوں میں، کاروں میں، پیدل چلتی ہوئی اور سائیکلوں پر رنگوں کی موجیں اٹھتیں اور بکھر جاتیں۔

زبیری کی بے تاب نظریں بھٹکتی رہیں، تیرتی رہیں۔ اور پھر عزیز نے دیکھا وہ ایک جگہ مرکوز ہو کر رہ گئی ہیں۔

''دیکھ تو یار کیا مال ہے۔'' زبیری اسی طرح نظریں جمائے چیخا اور عزیز نے دیکھا ایک عورت ان کے سامنے جا رہی تھی۔ اس کا صرف پچھلا حصہ نظر آتا تھا۔ لیکن یہ تو ظاہر تھا کہ وہ ادھیڑ عمر کی تھی۔ مہین جالی میں سے کہیں کہیں سفید بالوں کے نقرئی تار صاف نظر آ رہے تھے۔

''توبہ تو بھی کتنا بدذوق ہے۔ تجھے تو عورت چاہیے اور بس۔ یہ بھی نہیں دیکھتا کہ کیسی ہے۔ پرسوں ایک کالی کلوٹی معمولی صورت کی لڑکی کو کھڑکی میں کھڑے دیکھا تو اسے

بھی آنکھ ماردی۔ اوراب....."

"بدذوق بالکل نہیں ہوں، لیکن میں صرف حسن ہی نہیں چاہتا۔ اور بھی بہت سی باتیں، اگر یہ باتیں ہوں تو میں حسن کی بھی پروانہیں کرتا۔ اوراس لڑکی کی جوانی بھرپور تھی۔ اوراس میں خالص نمک تھا۔ نمک، سفید، سرخ وسفید، مکھن کی سی، سیبوں کی سی۔ مکھن اور پھل چکھتے چکھتے اُکتا گیا ہوں۔ اب ذرا منھ کا مزہ بدلنا چاہتا تھا۔ اوراس کالی سی لڑکی میں خوب نمک تھا۔"

"اچھا جانے دے وہ تو جوان تھی، یہ عورت تو بالکل ادھیڑ ہے اوراسے دیکھ کرتو مچلا جارہا ہے۔"

"لیکن دیکھ تو یار مال کیسا ہے، جسم کیسا بھرپور ہے۔ تجھے تو تجربہ ہی نہیں ان باتوں میں۔ تو کیا جانے اس عمر میں عورت کیا ہوتی ہے۔ مجھے لڑکیوں سے بھی زیادہ اس عمر کی عورتوں کا شکار کرنے میں لطف آتا ہے۔ ایک تو خوب تجربہ کار ہوتی ہیں۔ پھر بڑی بھوکی ہوتی ہیں۔ اس عمر میں جنسی حس بڑی تیز ہوتی ہے۔ بجھنے سے پہلے اس طرح بھڑک اٹھتی ہے جس طرح شمع کی لَو بجھنے سے پہلے بھڑک اٹھے۔ وہ جوانی کی آخری منزل میں ہوتی ہیں نا۔ اس کی تلچھٹ تک پی جانا چاہتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اس منزل سے گزر جائیں، پوراپورا حظ اٹھالینا چاہتی ہیں۔ بڑی آسانی سے ہاتھ آجاتی ہیں۔ بلکہ وہ تو اپنی ساری جنسی بھوک لیے انتظار ہی میں ہوتی ہیں۔ بس ایک جملہ کہہ دو" آپ تو بالکل جوان نظر آتی ہیں۔" یہی ان کی دکھتی رگ ہوتی ہے۔ آنکھیں چمک اٹھیں گی۔ اور بس راستہ صاف ہے۔ اس جملے سے میں نے ایسی عورتوں کو بھی جگا دیا ہے جنھیں یہ احساس تھا کہ زندگی ان میں مٹ چکی ہے۔ ان میں زندگی کا رس نہیں ہے اور زندگی کا رس دینے پر وہ تازیست میری ممنون رہیں گی..... یہ سامنے والی عورت کی بات تو کیا۔ ایسی عورتیں تو حرافائیں ہوتی ہیں، اب تک پہچانا نہیں کس چیز نے میری نظر کھینچ لی تھی۔ دیکھا بھی تو نے کس طرح اس نے اسکرٹ کے اوپر والے حصے کا رنگ سارے اسکرٹ سے الگ رکھا ہے۔ یہاں شیڈ گہرا دیا

ہے اور کس طرح اس شیڈ کے کنارے گولائیاں سی بناتے ہوئے چلے گئے ہیں۔ اس سے پیچھے قوسیں کتنی نمایاں معلوم ہو رہی ہیں۔ اور پھر کس انداز سے چل رہی ہے یہ ڈول ڈول جاتے ہیں۔"

"ارے سچ تو۔" عزیز ہنسا۔ اب وہ اس عورت کے قریب آ گئے تھے اور ایک لمحے میں اس کے پاس سے نکل گئے۔ دونوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بڑی بدصورت تھی۔ اور چہرے پر کچھ کچھ جھریاں بھی نمودار ہو چلی تھیں۔ جنھیں اُس نے اسنو، پاؤڈر اور روژ کی تہوں میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔ دونوں نے قہقہہ لگایا۔

"بدصورت ہے۔ اس لیے دیکھا کیسا ہتھیار استعمال کیا تھا۔"

میٹنی شو شاید ابھی ختم ہوئی تھی۔ اور دو تھیٹروں میں سے جو پاس پاس ہی تھے، انبوہ کثیر نکل رہا تھا۔ زیادہ تر جوڑے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہشاش بشاش۔ اور رنگوں کی موجیں پھر بہت زور سے ابھریں۔ ایک جگہ زبیری چلتے چلتے ٹھنک کر کھڑا ہی ہو گیا۔ عزیز جھنجھلا گیا "توبہ، زبیری"۔

"ہونہہ... تجھ جیسے خشک آدمی کے ساتھ باہر نکلنے میں سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ بھلا، عزیز کوئی ایسا نظارہ دیکھ کر بھی آگے بڑھ سکتا ہے؟"

عزیز نے دیکھا دو لڑکیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک تو دبلی پتلی اور معمولی سی تھی اور پھیکے زرد فراک میں اور پیلے بالوں میں اور بھی زرد اور بیمار سی نظر آ رہی تھی۔ دوسری لڑکی اس کے بالکل برخلاف۔ اس کے اُنگ اُنگ سے زندگی پھوٹ رہی تھی۔ خون شاید اس کی رگوں میں شرارے بن کر بہہ رہا تھا۔ بالوں کا رنگ سرخی مائل براؤن تھا۔ اور وہ ایک چست خونیں رنگ کا فراک پہنے ہوئے تھی جو اس کے جسم پر چپکا ہوا تھا اور جسم لاجواب تھا، اس قدر کسا ہوا، اور سفید ناگنوں کی سی باہیں کمانیں تانتی ہوئی سر کے پیچھے بندھی ہوئی تھیں اور ایک پاؤں پیچھے رکھے ناچ کے سے انداز میں، انگوٹھے کے بل، سر پیچھے پھینک کر وہ اپنے خوبصورت سڈول جسم کے پورے تناؤ کے ساتھ کھڑی تھی۔ عزیز بھی سوچے بغیر نہ رہ سکا۔

ابھی تو یہ لڑکی کچھ ترچھی کھڑی ہے، اگر پورے طور سے اس کا رخ سامنے ہو جائے تو قیامت اٹھ کھڑی ہو۔ زبیری تو نظریں کھوئے دے رہا تھا۔ اچانک لڑکی نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا، اور زبیری کو یوں گھورتے ہوئے دیکھ کر، ایک کڑی، غصہ سے بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔

عزیز چیخ اٹھا "دیکھا زبیری! ہر عورت کو تاکتا رہتا ہے یہ بھی خیال کیے بغیر کہ... دیکھا اس لڑکی نے کتنی کڑی نظروں سے دیکھا ہماری طرف...."

زبیری ایک بڑی ہی بے شرم مسکراہٹ لبوں پر لیے بولا "اس کے یوں دیکھنے سے تو سمجھتا ہے وہ برا مان گئی ہے۔ تو کیا جانے ان باتوں کو۔ اچھا ہاتھ پر ہاتھ مار اور شرط دے۔ اگر اس لڑکی کا اور میرا، اسی طرح تین چار دفعہ اور سامنا ہو جائے تو بس اگر وہ میرے...."

عزیز جھنجھلا گیا "شرط ورط رہنے دے زبیری آخر ہم کام سے چھاؤنی آئے ہیں۔ فرنیچر خریدنا ہے۔ اور تو اس طرح ہر قدم پر کھڑا ہو جاتا ہے اور ہر راہ چلتی عورت کو پھانسنے کے منصوبے گانٹھتا رہتا ہے تو... کہیں تیرے ساتھ کھڑے دیکھ کر مجھے بھی رُسوا نہ ہونا پڑے۔ اس لڑکی نے کیسی نظروں سے دیکھا تھا ہماری طرف۔ تو تو بے شرم ہے کھڑا رہ...."

عزیز کچھ دور جا کر سڑک کے دوسرے سرے پر فٹ پاتھ کے کنارے زبیری اور اس لڑکی کی طرف پیٹھ موڑے کھڑا ہو گیا۔ جب بہت دیر تک بھی زبیری اس سے نہ آملا تو اس نے مڑ کر دیکھا، اور اس کی نظریں حیران رہ گئیں۔ وہ دُبلی پتلی لڑکی جا چکی تھی۔ زبیری اب بھی اسی طرح کھڑا اس لڑکی کو گھورے جا رہا تھا۔ اور وہ ہوش ربا لڑکی اب بھی اسی طرح کھڑی تھی، سر پیچھے پھینکے، باہیں تان کر سر کے پیچھے باندھے، ایک پاؤں پیچھے رکھے انگوٹھے کے بل ناچ کے سے انداز میں، اپنے جسم کے پورے تناؤ کے ساتھ۔ لیکن اب اس کا رخ پورے طور سے زبیری کی طرف تھا۔ اور وہ زبیری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرائے جا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں دعوت تھی، اس کی نظروں میں سپردگی۔

"زبیری۔" عزیز وہیں سے چیخا۔ "میں جا رہا ہوں۔"

زبیری جلدی جلدی قدم بڑھاتا اس سے آن ملا۔ اس کے لبوں پر ایک فاتحانہ

مسکراہٹ تھی۔ عزیز بھی اسے تحسین کی نظروں سے دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ ''واہ زبیری میرا ابھی استاد ہے تو۔ کس طرح پہچان جاتا ہے۔۔۔۔''

''میں نے کہا تھا نا تجھ سے، کسی بھی عورت کو پہلی ہی نظر میں دیکھ کر پہچان جاتا ہوں کہ وہ گرے گی یا نہیں۔۔۔ اور کبھی میرا قدم غلط پڑا بھی تو بہت جلد سنبھل جاتا ہوں پکڑے جانے سے پہلے۔ اب یہیں دیکھ میں نے اس کالی سی لڑکی کو آنکھ ماردی تھی نا۔ اگر اس کے بشرے سے یہ ظاہر ہوتا کہ یہ اچھی لڑکی ہے اور میری یہ حرکت اسے ناگوار گزری ہے تو جانتا ہے میں کیا کرتا۔ اس کھڑکی کو پار کرنے سے پہلے دو تین دفعہ اسی طرح آنکھ کو جھپکتا اور زور زور سے چیخ کر، تا کہ وہ لڑکی سن لے تجھ سے کہتا ''عزیز، جانے کیوں آج میری آنکھ صبح سے بری طرح درد کر رہی ہے؟''

دونوں قہقہوں کے طوفان میں ڈوب گئے۔ عزیز چیخا ''زبیری تو تو پورا شیطان ہے۔۔۔ لیکن وہ لڑکی تو تیرے آنکھ مارنے کے جواب میں مسکرا کر کچھ دیر کھڑکی کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔ پھر آ کر تجھے شوخ اور بے باک نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔۔۔ لیکن یہ لڑکی، توبہ، میں تو بالکل نہ سمجھ سکا۔ سمجھا اب خیر نہیں، بہت برا مان گئی یہ۔ اس کے تیور دیکھ کر ایسا لگا جیسے وہ ابھی اپنی خوبصورت سرخ اونچی ایڑی کی گرگابی پاؤں سے نکال کر تیرے منہ پر دے مارے گی۔ اور اب جو دیکھتا ہوں کہ کتنی میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی تجھے، اور کیسی دعوت بھری مسکراہٹ لیے۔ یہ لڑکیاں بھی ایک معمہ ہیں۔''

''اور اس معمہ کو سمجھنا کوئی آسان بات نہیں۔ میں خوب سمجھ سکتا ہوں۔ اپنے وسیع تجربے کی بنا پر۔'' وہ ہنسا ''تو نے سمجھا وہ برا مان گئی۔ پہلے تو وہ کڑی نظر اس لیے تھی کہ وہ دبلی پتلی لڑکی اس کے ساتھ اور تو میرے ساتھ موجود تھا۔ اگر کوئی لڑکی مرد کی بری نظروں کو دیکھ کر سہم جائے یا ان کی پروا کیے بغیر بے اعتنائی سے نکل جائے تو الگ بات ہے۔ لیکن جب وہ غصہ بھری نظر سے جواب دے تو سمجھ لے ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ اس کڑی نظر کی ایک نفسیات بھی ہے۔ میں بتاؤں تجھے کڑی نظر کے معنی؟ وہ اسے بتانا چاہتی ہے کہ وہ جان گئی ہے وہ اس

کی طرف کس نیت سے، دل میں کیسے جذبات لیے اسے دیکھ رہا ہے۔ اور جب وہ اسے یہ احساس دلائے کہ وہ جان گئی ہے اس کے احساس میں بھی وہ شریک ہے تو جذبات اور بھڑک اٹھتے ہیں......

''واقعی زبیری، تو تو استاد ہے ان باتوں میں۔ تو اتنی ساری عورتوں کو پھانستا ہے، ہر قوم کی، ہر عمر کی، کیا کیا گر نہ ہوں گے تیرے پاس! تو کنواری لڑکیوں کو محبت کے دھوکے میں شکار کرتا ہوگا۔ انھیں بتاتا ہوگا کہ وہ نہ ملیں تو جان بھی دے دے گا۔ میں نے کئی مردوں کو کہتے سنا ہے کہ وہ پہلے محبت کا دام بچھاتے ہیں اور اس میں عورت تو آ ہی جاتی ہے۔ اور پھر میدان صاف۔ کسی کا مشہور قول ہے کہ جب مرد سچی محبت کرتا ہے تو وہ سفلی جذبات سے اونچا اٹھ جاتا ہے۔ لیکن جب عورت محبت کرتی ہے تو وہ کسی بھی بات کے لیے تیار رہتی ہے بلکہ اپنے آپ کو محبوب کے سپرد کر دینا اس کے نزدیک سب سے بڑی قربانی ہے۔ اپنی دوشیزگی سب سے قیمتی نذر ہے۔''

زبیری ہنسا۔ ''مجھے تو ایسی معصوم لڑکیاں نہیں چاہئیں بھئی۔ کون اٹھائے ان کے ناز نخرے۔ رومانی، جذباتی محبت.... میں محبت وحبت کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتا۔ لڑکیوں پر یہ صاف ظاہر کر دیتا ہوں کہ یہ محبت نہیں کچھ اور ہے....''

''تو پھر کیسے؟''

''اوہ، تو سمجھتا ہے کہ آج بھی عورت وہی ہے، یعنی عورت کسی سے سچی محبت کرنا اور سچی محبت پانا چاہتی ہے اور جب ایک کو دل میں بسا لیتی ہے تو....'' زبیری نے ایک قہقہہ لگایا۔ ''آج کل کی لڑکیاں تو تجربوں کی تلاش میں ہوتی ہیں۔ اچھا سن تجھے ایک واقعہ بتاتا ہوں۔ تو نے اس لڑکی کملا کو دیکھا ہے نا، جو چند دنوں میرے پڑوس میں تھی۔ وہی سڈول، گدرائے ہوئے بدن اور مست آنکھوں والی، گندمی رنگ کی دلکش لڑکی جس کے ساتھ میں... اس لڑکی سے میری کئی دنوں تک آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوتی رہیں اور اشارے ہوتے رہے۔ گھر پر صرف وہ اور اس کا باپ رہتے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ اس کا بوڑھا باپ اخبار

اور رسالے بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتا تھا، میں ہر صبح اس کے ہاں چلا جایا کرتا۔ پوچھتا آج کل کی خبریں کیا ہیں۔ اس کی دلچسپی کی باتیں کرتا۔ اپنے میگزین اسے بھجواتا۔ اس طرح اس سے دوستی کر لی اور آنے جانے لگا۔ جب میں واپس لوٹ رہا ہوتا تو صحن کی دوسری طرف وہ میری منتظر ہوتی۔ لیکن ہم چند منٹ سے زیادہ نہیں رہ سکتے تھے۔ ایک دن میں نے اس سے کہا ''کوئی صورت نہیں ہو سکتی ہمارے کہیں اور ملنے کی؟'' اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا: ''میں کوئی صورت نکالوں گی۔'' اور ایک دن وہ وعدے کے مطابق مجھے آملی۔ میں نے پوچھا ''کیسے آئیں؟'' ہنس کر بولی ''پتا جی سے کہہ دیا کہ اپنی ایک سہیلی کے گھر جا رہی ہوں۔ سیتا کا گھر اسی راہ پر پڑتا ہے۔ اس سے پہلے میں سیتا سے کہہ چکی تھی کہ پتا جی کبھی پوچھیں تو کہہ دے میں آج شام ان کے ہاں تھی۔ اور چلی آئی۔'' وہ اس دن کھلی فضا میں آکر بڑی شوخ اور بے باک ہو گئی تھی۔ جب ہم واپس لوٹ رہے تھے، میں نے کہا ''تمھاری بے باکی کی وجہ سے مجھے اندازہ نہ لگا تھا کہ تم ابھی تک... اب معلوم ہوا۔ تمہیں اس کا رنج تو نہیں ہے؟''

''بالکل نہیں۔ ہاں ایک ہلکا سا احساس ہے کہ اب میں پاکیزہ نہیں رہی۔ لیکن صرف ہلکا سا۔'' ''تو پھر تم اسی طرح ملتی رہو گی؟''

''ضرور۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایسی چمک آگئی۔ پھر میں نے یونہی پوچھا ''اچھا تم میری طرف کیوں کھنچ آئیں۔ تم نے یہ سمجھا مجھے تم سے محبت ہے؟'' وہ ہنسی ''بالکل نہیں۔ اور نہ میں نے تم سے محبت کا جذبہ محسوس کیا۔ میں جانتی تھی یہ محبت نہیں کچھ اور چیز ہے۔ مجھے تو تمھاری آنکھوں نے کھینچ لیا۔ وہ عجیب قسم کے اشارے کرتی تھیں۔ چھپے ہوئے جذبات افشا کرتی تھیں، اور مجھے محسوس ہونے لگا میں تم سے ملے بغیر نہ رہ سکوں گی۔'' میں نے کہا ''اچھا تم یونہی ملتی رہو گی؟ اور کوئی خوف کی بات ہو جائے تو ڈرو نہیں، مجھ سے کہو۔ میرے پاس ایک دوا ہے جو اثر میں کبھی نہیں چوکتی۔ میں نے کئی لڑکیوں پر آزمایا ہے۔'' اس نے خوش ہو کر کہا ''تب تو مجھے کوئی خوف نہیں۔ میں ضرور ملتی رہوں گی۔'' دیکھا؟ یہ تھی ایک کنواری لڑکی!

''اور شادی شدہ لڑکیوں کو پھانسنا تو اور بھی آسان ہے۔ اور شادی شدہ عورتیں تو جسمانی طور پر اور بھی زیادہ کشش انگیز ہوتی ہیں۔ میرا مطلب ان سے ہے، جو زیادہ بچے ہو جانے کی وجہ سے ڈھل نہ چکی ہوں۔ پھر صحت مند اور نارمل جنسی زندگی ان کے چہروں پر بھی نکھار پیدا کر دیتی ہے۔ وہ زیادہ کشش کی حامل بھی ہوتی ہیں اور انھیں پھانسنا بھی زیادہ آسان ہے۔ ایک تو یہ جنسی زندگی کی عادی ہوتی ہیں، پھر انھیں ایسے ویسے شوہر ملے ہوں اور یہ تشنہ ہوں تو کیا کہنے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ انھیں نتیجے کا ڈر نہیں رہتا۔ ہاں صرف یہ مشکل ہے کہ ان کے شوہروں کو معلوم ہو جائے تو کیا ہو۔ لیکن اس کی فکر بھی مجھے نہیں کرنی پڑتی۔ تو نہیں جانتا یہ عورتیں کتنی چالاک ہوتی ہیں۔ توبہ ہم مردوں کے کان کاٹتی ہیں۔ یہ کچھ ایسی چال چلتی ہیں کہ ان کے شوہروں کو ذرا بھی پتہ نہیں چلتا.... ایک لڑکی تھی میری دور کی رشتہ دار۔ میں کبھی کبھی ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ مرد باہر رہا کرتے۔ دن میں گھر پر صرف وہ اور اس کی اندھی نانی۔ کھانے پینے کی چیزیں لے جا کر میں اندھی بوڑھی کو خوب خوش کیا کرتا اور وہ زبیری بیٹا کا دم بھرتی۔ اے امینہ ذرا زبیری بیٹا کے لیے چائے تو بنا دے، پان تو لگا دے۔ اور آ جا بھئی کیا پردہ، تیرا بھیا ہی تو ہے۔'' اور بھیا بہن کے درمیان پردہ تو کبھی کا اٹھ چکا تھا۔ اور لڑکی میرے ساتھ ہوتی اور بڑھیا پکارتی بھی تو کہہ دیتی ''زبیری بھیا کے لیے پان لگا رہی ہوں نانی۔'' اور میں وہاں گھنٹوں ہوتا بھی تو اسے پتہ نہ چلتا۔ ''زبیری بیٹا چلا گیا امینہ؟'' اور میرے پاس بیٹھی وہ مزے سے کہتی ''ہاں، نانی وہ تو کبھی کے چلے گئے۔'' پھر وہ کہیں چلی گئی۔ اور وہیں اس کی شادی بھی ہو گئی تھی۔ کئی سالوں سے نہ ملی۔ ایک دو ہفتہ پہلے وہ لوگ یہاں آئے۔ میں پہلے اس سے جا کر ملا تو متعجب ہو گیا۔ زرد رو اور دبلی پتلی سی لڑکی تھی وہ لیکن اب شادی کے بعد خوب تندرست ہو گئی تھی۔ بھرا ہوا بدن، سرخ گال، دیکھتے ہی منہ میں پانی بھر آیا۔ اس کے شوہر نے یہ سن کر کہ میں اس کے رشتہ کا بھائی ہوں، میری بڑی خاطر کی۔ پھر وہ چلا گیا اور جونہی ہم دونوں اکیلے رہ گئے، میں نے بغیر جھجک کے پہلا کام جو کیا... وہ گھبرا گئی۔ ''یہ کیا کرتے ہو...'' ''پہلے تو برا نہ مانتی تھیں تم۔''

اس نے جواب دیا ''اس وقت کی بات اور تھی۔ اب میں کسی کی ملکیت ہوں، امانت ہوں، اب مجھے کیسے چھو سکتے ہو؟'' لیکن میں نے اسی طرح اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ''لیکن اس سے پہلے تم میری ملکیت رہ چکی ہو۔ اپنے شوہر سے پہلے میری بن چکی ہو۔ اس لیے میرا حق زیادہ ہے۔'' اس پر وہ خوب ہنسی۔ میں نے موقع تاڑ کر فوراً کہا ''اچھا تو اب ملنے کی کیا صورت نکالو گی؟'' اور اس نے دو تین دن میں ملنے کی صورت نکال لی۔ اس نے بڑے لاڈ سے اپنے شوہر سے کہا ''مجھے میوزیم دیکھنے کی کتنی تمنا ہے۔ کبھی لے گئے تم؟ اچھا جانے دو میں گلہ نہیں کرتی۔ تمہیں فرصت ہی کہاں ہوتی ہے۔ ہفتہ کا دن زبیری بھائی بھابھی اور ان کی بہنوں کو میوزیم لے جا رہے ہیں۔ میں بھی جاؤں ان کے ساتھ؟ وہ یہاں آ کر مجھے لے جائیں گے، پھر انھیں کے گھر چائے وائے پی کر ہم سب نکلیں گے، بھابھی اور بہنیں۔'' اور اس کے شوہر نے اجازت دے دی... اور تو تو جان گیا ہوگا، ساتھ زبیری کے بہنیں یا بیوی ویوی کوئی نہیں تھی اور نہ تانگے نے ہمیں میوزیم پہنچایا تھا...۔''

''ایک اور داستان سن۔'' زبیری کو اپنی داستانیں سنانے میں بڑا لطف آتا تھا۔ ''میرے پڑوس میں پنجابی آ کر رہے تھے۔ صرف میاں بیوی۔ مرد کوئی پینتالیس سال کا ہوگا۔ لیکن ایک دن اس کی غیر حاضری میں اس کی بیوی دروازے پر آ کر کھڑی ہوئی، تو اسے دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا۔ پندرہ سالہ نوخیز لڑکی تھی۔ شاید اسے اس کے شوہر نے بڑی پابندی سے رکھا تھا۔ کبھی کبھار ہی نظر آیا کرتی تھی۔ کیا اٹھتی جوانی تھی، ستار کے تاروں کی طرح کسا ہوا جسم، سنہرا رنگ، نظریں بہکی ہوئی، جیسے کسی منزل کی تلاش میں تھیں، لیکن منزل نہ تھی۔ وہ نہایت مضطرب اور بے چین سی پھرتی رہتی تھی۔ جیسے ستار کے کسے ہوئے تاروں کو صرف چھیڑ کر چھوڑ دیا گیا ہو۔ میں اسے دیکھ کر بے تاب ہو گیا تھا۔ اور کامیابی بھی یقینی تھی۔ لیکن مجھے اس کے شوہر سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ آخر پٹھان تھا۔ پھر ایک صورت نکلی۔ ہمارے گھر کے پاس ہی ایک نیچ ذات کی عورت رہتی تھی۔ وہ ہمارے ہاں بھی کچھ کام کر دیا کرتی تھی، اس کے ہاں بھی میں نے اسے 'رشوت' دے کر... تو جانتا ہے میری رشوت کیا ہوتی ہے، اور

وہ عورت ادھیڑ اور خوب پیاسی۔ تو میں اسے رشوت دیتا رہا اور اسے اس بات پر رضامند کر لیا کہ ہمارے درمیان پیام پہنچائے اور جب اس کا شوہر گھر پر نہ ہو اور میری بیوی غسل خانہ وغیرہ میں ہوتی تو وہ اسے کھڑکی کے پاس لا کھڑا کرتی اور ہم دونوں میں اشارے ہوتے۔ لیکن بات بڑھنے نہ پائی تھی۔ ایک دن مجھے اچھا موقع ملا۔ ان کے گھر کی بجلی بند ہو گئی۔ میں ان کے گھر گیا۔ اس کے شوہر سے مل کر ہمدردی ظاہر کی۔ پھر لائٹ آفس کو فون کر کے بجلی ٹھیک کروائی۔ پھر اس سے کہا "اس شہر کے لیے نئے ہیں۔ کوئی کام پڑے تو مجھ سے مدد لیجیے میں یہیں رہتا ہوں۔" ایسے موقعوں پر میں یہ بھی کہا کرتا ہوں "آپ ہمیں بالکل اپنا رشتہ دار سمجھیں۔ آپ کی بیوی اور میری بیوی بہنیں ہیں۔ آپ کی بیوی میری بھی بہن کی طرح ہے، میری بیوی آپ کی بہن کی طرح ہے، پردہ وردہ کیسا؟" لیکن یہ یاد رکھنا عزیز! زبیری نے بڑی ہی عیار نظروں سے دیکھ کر کہا "یہ بات کہ میری بیوی آپ کی بہن ہے آپ کے سامنے پردہ کیا" والی بات میں صرف ادھیڑ یا کمزور قسم کے سیدھے سادے مردوں کے سامنے کہا کرتا ہوں۔ کیوں کہ اس کی بیوی کو اپنی بہن بنانے میں میرا ہی فائدہ ہے لیکن اگر جوان یا ایسا ویسا مرد ہو تو یہ بات نہیں کہتا، کہیں مجھے بھی خسارہ نہ اٹھانا پڑے۔"

عزیز یہ سن کر ہنس پڑا "تو تجھے اپنی بیوی پر بھروسہ نہیں۔"

"میں کہتا ہوں نا کہ ہر عورت کمزور ہوتی ہے اور کوئی بھی عورت ہو، اگر دس دن تک....."

"اب بس رہنے دے، تیرے دعوے اور تیرے مقولے، یہ داستان سنا، بڑی دلچسپ ہے۔" عزیز گو ان کاموں سے الگ رہتا تھا لیکن زبیری کی باتیں سننا چاہتا تھا۔ اس کی باتوں میں اسے بڑا لطف آتا تھا۔

زبیری نے داستان کا تار پھر اٹھا لیا۔ "میرے یہ کہنے پر اس کا شوہر بہت خوش ہوا۔ گو اس کے بشرے سے میں نے یہ اندازہ تو لگا لیا کہ 'پردہ کیا' والی بات اسے پسند نہیں آئی اور اس نے اپنی بیوی کو میرے سامنے کہا تو نہیں لیکن وہ مجھے اکثر دعوتیں دیا کرتا۔ مجھے گھر بلا کر باتیں کرتا۔ میں نے موقع پا کر گھر کا چپہ چپہ جان لیا۔ ان کے سونے کا کمرہ، غسل خانہ،

سب کچھ۔ پھر ایک دن وہ نیچ ذات والی عورت اسے بلا لائی۔ جب اس کا شوہر گھر پر نہیں تھا اور میری بیوی اپنے میکے میں تھی۔ جلدی جلدی ہم نے بات طے کر لی اور دوسرے دن رات کے دو بجے میں اس کی خواب گاہ کی کھڑکی کے پاس گیا۔ دیکھا تو بیڈ لیمپ دھیمی سی روشنی سے جل رہا تھا، اور وہ شوہر کے پہلو میں سو رہی تھی۔ مخصوص اشارہ کیا۔ پھر میں کانپ گیا۔ اگر شوہر جاگ جائے تو؟ پینتالیس سال کا سہی لیکن آخر پٹھان تھا۔ مجھے زندہ چھوڑے گا، جان کی خیر نہیں۔ مجھے اپنی حماقت پر بڑا افسوس ہوا۔ لیکن وہ لڑکی ہی ایسی تھی کہ... اتنے میں وہ اٹھی۔ شاید وہ جاگ رہی تھی۔ نہایت آہستہ اسے دھکا لگے بغیر، اور عزیز اس وقت تو میں دم روکے کھڑا رہا۔ جب وہ اپنی بلینکٹ بھی نہایت احتیاط سے کھینچ رہی تھی۔ اس نے بلینکٹ بھی لے لی۔ بیڈ لیمپ کی بتی نہایت ہلکی پھونک سے بجھا کر بچتی ہوئی باہر آئی.... نیند کے خمار سے مست اٹھتی ہوئی جوانی، نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا جسم، اسی لیے تو میں اس دفعہ جان بھی ہتھیلی پر لے کر آ گیا تھا۔ لیکن اس نے اپنی چالاکی سے مجھے بھی بچا لیا آپ بھی بچ گئی۔ وہ واپس بھی اسی احتیاط سے ہوئی اور بڑی آہستگی سے پلنگ پر رینگ گئی۔ میں کچھ دور پر کھڑا تھا۔ شاید اس وقت اس کا شوہر جاگ پڑا۔ میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ لیکن وہ نہایت مطمئن تھی۔ اور اس انداز سے بیٹھی ہوئی تھی، آدھی بیٹھی ہوئی آدھی لیٹی ہوئی آنکھیں ملتی ہوئی جیسے ابھی اٹھ رہی ہو۔ اس کے شوہر کے پوچھنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھی۔

''توبہ کیسا برا خواب دیکھا! میں تو ڈر کر اٹھ گئی۔ اور دیکھا تو ہوا کے زور سے چراغ بھی بجھ گیا ہے۔ اور بھی ڈر گئی۔ ذرا جلا لو نا چراغ۔ اوہ کتنی ٹھنڈ ہے میں کیسے اٹھ سکوں گی!''

اور اس کے شوہر، جوان بیوی کے ناز بردار ادھیڑ شوہر نے پیار سے جواب دیا ''نہیں، نہیں، تم نہ اٹھو، میں جلائے دیتا ہوں، تمہیں کہیں سردی نہ لگ جائے۔''

چراغ جلانے سے پہلے میں تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا نکل گیا۔ اس وقت تو مجھ جیسے شیطان کا دل بھی چیخ اٹھا ''او خدایا! کتنی عیار ہوتی ہیں یہ عورتیں، ایک چودہ پندرہ سالہ

لڑکی اور تجھی سے یہ.....''

فرنیچر کی دکانیں قریب آ گئی تھیں۔ عزیز دو تین دکانوں میں گیا۔ ایک صوفہ سیٹ دیکھا، ایک شیشہ لگی خوبصورت الماری کے دام چکائے اور باہر آیا۔ زبیری باہر ہی کھڑا تھا۔ اس کے قول کے مطابق وہ کنٹونمنٹ صرف رنگین نظارے دیکھنے آیا کرتا تھا اور وہ باہر کھڑا نظارے ہی دیکھتا رہا۔ جب باہر آیا تو اس نے کہا ''ادھر سے ہو کر جائیں۔''

''اُف! زبیری تیرے ساتھ باہر آنا بھی ایک آفت ہے۔ آخر ادھر سے کیوں، بس اسٹینڈ دور پڑے گا، خواہ مخواہ کی دیر۔''

''تو چل بھی میں بتاتا ہوں کیوں۔''

اور وہ مجبوراً ساتھ ہو لیا۔ ایک خوبصورت سی عمارت کے پاس زبیری رک گیا۔

''عزیز، اسی عمارت کے بالا خانہ پر وہ پارسی عورت رہتی ہے۔ میں نے پرسوں بتایا تھا نا کہ میں وہاں گیا تھا۔ اس کا شوہر لیفٹیننٹ ہے۔ محاذ پر ہے۔ ہر ماہ تنخواہ بھیج دیا کرتا ہے۔ پھر یہ بھی کاروبار کھولے بیٹھی ہے۔ پچیس روپے لیتی ہے۔ میں پرسوں گیا تھا۔ آج ہم دونوں چلیں، عزیز کیا کہتا ہے؟ تیرے سر کی قسم ایسا مال ہے، تیس بتیس سال کی ہے۔ ایسا بھرپور گداز جسم، خوب پکا، لذیذ پھل ہے، تو بھی کیا یاد کرے گا کہ زبیری نے کیسا پھل.....''

عزیز کا منہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ ''زبیری تو دوسروں کو بھی اپنی طرح سمجھتا ہے؟''

''بس بس دیکھے ہیں، بہت ایسے بناوٹی غصہ دکھانے والے، تیرے بھی منہ میں پانی بھر آیا ہوگا، ڈر نہیں، وہ بالکل پوشیدہ کاروبار کرتی ہے۔ تو یہاں آئے تو کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ طوائف کے ہاں گیا تھا۔''

عزیز نے اسی طرح منہ پھلائے ہوئے کہا ''پھر بھی۔''

زبیری نے ایک کریہہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''میں بھی جانتا ہوں تو کیوں انکار کر رہا ہے۔ تو کنجوس ہے۔ ایک دم جیب سے پچیس روپے کیسے نکلیں گے.....''

عزیز کا غصہ اور بڑھ گیا ''زبیری تو سمجھتا ہے کہ میں صرف روپیوں کے خیال سے.....''

لے پچیس روپے، لے ابھی۔'' اس نے اسی وقت نوٹ گن کر زبیری کو دیے۔ ''انھیں اپنے دوست کو دے دے جو اس غیر معروف محلے میں مسجد بنوانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

زبیری نے یہ سوچ کر کہ عزیز نے یونہی جوش اور جذبے میں یہ روپے دے دیے ہیں، انھیں واپس کرنے لگا۔

''نہیں، میں واپس نہیں لوں گا... سچ انھیں اپنے دوست کو دے دے...'' عزیز نے سنجیدگی سے کہا اور زبیری اسے حیران نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے اسے یقین نہیں آتا تھا کہ کنجوسی، ریاکاری اور بزدلی کے علاوہ کوئی اور جذبہ بھی کسی کو اس گناہ رنگین سے روک سکتا ہے۔ پھر وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر کہنے لگا ''میں بھی اس کے لیے نہیں جا رہا ہوں۔ بلکہ مجھے اس سے ایک بات طے کرنی تھی۔ اس کے پڑوس میں ایک اینگلو انڈین لڑکی رہتی ہے۔ میں چاہتا ہوں اسے زیادہ روپے دے کر رضامند کر لوں کہ وہ اس لڑکی کو اس وقت کسی بہانے سے اپنے گھر بلا لے، جب میں یہاں آؤں... باقی مدارج تو میں طے کر لوں گا... میں آج کل تڑپ رہا ہوں اس لڑکی کے لیے۔ سچ کہتا ہوں میں کسی لڑکی کے لیے اتنا تڑپا نہیں تھا۔ بلکہ تڑپنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ لیکن یہ لڑکی ہاتھ آنا ذرا مشکل ہے۔ اچھے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے اور ابھی بچی ہے۔ گیارہ بارہ سال کی۔''

عزیز مبہوت ہو کر چیخا ''زبیری کیا عیاشی نے تیرے ہوش ایسے اڑا دیے ہیں کہ تجھے قانون کا بھی ڈر نہیں۔ گیارہ بارہ سال کی لڑکی....''

زبیری قہقہہ مار کر ہنسا ''کیا میں اتنا ناسمجھ ہوں کہ اس حد تک....''

''پھر بھی وہ تو بچی ہوگی!'' لیکن عزیز کی آنکھوں میں تجسس بیدار ہوا۔

زبیری کہنے لگا ''اس عمر میں لڑکیوں کی اٹھان عجیب ہوتی ہے۔ اس عمر کی لڑکیاں پکا نرم پھل نہیں ہوتیں۔ بلکہ چٹپٹی، ترش، کچی کیری کی سی اور تازہ کچی کیری کو دیکھ کر رال ٹپک پڑتی ہے نا؟ اور یہ لڑکی تو ایسی ہے بس انار کا شگوفہ، ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی پھرتی ہے تو قیامت ڈھاتی ہے... اس عمر میں ان کی جنسی حس ابھی ابھی جاگی ہوتی ہے اور جنس کے

متعلق ان کا جذبہ تجسس اس قدر بڑھا ہوتا ہے، اور میں اس جذبہ تجسس کو خوب بھڑکاتا ہوں اور... ایک اینگلو انڈین لڑکی میرے پاس اردو پڑھا کرتی تھی۔ بس گیارہ سال کی ہوگی۔ پھر بھی ایسی طاق تھی۔ ایک دن اس کا یہ جذبہ تجسس مجھ پر ظاہر ہوگیا۔" اور پھر زبیری ساری تفصیل بیان کرنے لگا۔

عزیز تاب نہ لاسکا۔ "بس زبیری بس، مجھے تیری دوستی چھوڑ دینی چاہیے۔ تو تو پورا شیطان ہے...."

زبیری خاموش ہوگیا۔ اور کچھ دیر وہ یونہی خاموش چلتے رہے پھر بس اسٹینڈ مل گیا۔ اور بس انھیں سٹی لے آئی۔ دونوں اتر پڑے، ایک موڑ پر انھیں جدا ہونا تھا۔ کیوں کہ دونوں کے گھروں کے راستے مخالف سمتوں میں تھے۔ عزیز نے پوچھا "تیری بیوی کو پتہ ہے تیرے ان کرتوتوں کا...؟"

زبیری ہنسا "بالکل نہیں۔ وہ سمجھتی ہے، میں بڑا ہی وفادار شوہر ہوں۔"

"مجھے اس پر بڑا رحم آتا ہے۔ غریب عورت! تو ان سب عورتوں کے ساتھ مزے اڑا کر اس سے بہت برا سلوک کرتا ہوگا؟"

"برا سلوک؟ کیوں؟ وہ بھی تو انھیں عورتوں کی طرح گوشت پوست کی بنی ہوئی ہے... میں اس سے بھی ان عورتوں جیسا سلوک کرتا ہوں، میں نے اسے بھی خوب کھلا پلا کے تندرست، گرم اور تازہ بنا کر رکھا ہے۔ ارے یار وہ بھی تو ایک طوائف ہے... اب دیکھ دوسری عورتوں کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے، ویسے تو یار میں اس معاملے میں بھی بڑا... کئی لڑکیاں تو کچھ دیے بغیر ہی... ہی... ہی... ہی... مجھ سا تجربہ کار انھیں کہاں ملے گا۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اور بیوی؟ یہ تو سب سے بڑی طوائف ہے، اس کے لیے تو مجھے اپنی ساری تنخواہ صرف کرنی پڑتی ہے۔ اور پھر یہ خرچ کبھی کبھار کا تو نہیں ساری عمر کا ہے، میں تو اس سے بھی خوب خوب صلہ وصول کر لیتا ہوں۔"

زبیری قہقہوں کے طوفان میں ڈوب گیا۔ عزیز کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

جوار بھاٹا

بڑی بڑی شربتی آنکھیں، گھنی بھویں، گلابی گال، گول چہرہ، وہ ایک خوبصورت، شرمیلا، سترہ سالہ نوجوان تھا جب اس کی زندگی میں چمپا آ گئی....

چمپا جو چمپا ہی کی طرح زرد اور نازک تھی۔ اسے چمپا کا چمپئی رنگ، گھنی پلکوں والی بڑی بڑی چمکدار آنکھیں اور اداس سا حسن پسند تھا۔ اس کی محبت خاموش تھی، اس کی محبت میں شرم اور جھجک تھی۔ کبھی کبھی بہت جرأت کر کے وہ اس کی نوکدار ٹھوڑی ہاتھ میں لے کر کہتا ''چمپا!'' اور اس کا نازک کومل ہاتھ اٹھا کر اپنے دل پر رکھ لیتا۔ چھٹیوں کے بعد وہ شہر چلا جاتا تو اس کے ہر لمحے پر چمپا کی یاد چھائی ہوتی۔ اسکول میں بھی، باہر بھی۔ دل میں ہمیشہ ایک میٹھا میٹھا درد رہتا۔ اور اس درد سے اسے محبت تھی۔ جب وہ چھٹیوں میں پھر اپنے گاؤں آتا تو چمپا کے لیے چوڑیاں لے آتا۔ اور اس کے ہاتھوں میں پہنا کر کہتا، یہ پریم کی چوڑیاں ہیں۔ اور جب چمپا اپنی گھنی پلکیں اٹھا کر اسے شرمیلی نگاہوں سے دیکھتی تو اسے محسوس ہوتا وہ ان آنکھوں پر اور ایسی ایک نگاہ پر ساری کائنات نچھاور کر دے گا۔ چمپا اس کی کائنات تھی، اس کی زندگی تھی اور پھر ایک سال جب وہ چھٹیوں میں گاؤں آیا تو اس نے دیکھا اس کی چمپا دلہن بنی کسی اور کے گھر جا رہی ہے۔ جب اس نے چمپا کی ڈولی اور ڈولی کے ایک گوشے میں گلابی آنچل کی ایک جھلک دیکھی اور چمپا کی سسکیوں کو سنا تو اس نے محسوس کیا اب وہ ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکے گا۔ جب چمپا ہی نہیں تو زندگی میں کیا ہے....

اور اس کی زندگی میں کسم آ گئی۔

جب ساری چھٹیاں رو رو کر گزار کے اس نے پھر شہر جا کر کالج میں داخلہ لیا تو اسے دنیا کا رنگ ہی الگ نظر آیا۔ غازے سے اپنے حسن کو دوبالا کیے ہوئے، گٹھے ہوئے گداز بدن کی، چست کپڑوں میں اپنے خموں اور قوسوں کو نمایاں کرتی ہوئی کالج کی لڑکیوں کو دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ زیتونی رنگ، جھکی ہوئی آنکھوں اور اداس حسن کے علاوہ اور باتیں، اور چیزیں بھی ہیں جو نظروں کو جذب کر لیتی ہیں۔ اور جب ایک دن گاؤں میں اپنے گھر کے سامنے کھڑے ہوئے اس نے اپنی تیس سالہ، بیاہی، دو بچوں والی ہمسائی کسم کو گھڑے لے کر کنویں کی طرف جاتے ہوئے، دور سامنے کی ناہموار چڑھائی چڑھتے ہوئے، پیچھے کی طرف سے دیکھا تو اس کی نگاہیں جذب ہو کر رہ گئیں، اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔ اور جب پانی کے گھڑے کمر اور سر پر رکھے واپس آتی ہوئی کسم نے اپنے مسّی آلودہ پکے ہوئے جامنوں کے سے رس بھرے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ لیے، تیکھی نظروں سے اسے دیکھ کر کہا ''اوہو اب تو غضب کے جوان نکل آئے ہو۔'' تو اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک سرخ ہو گیا۔ اور دوسری صبح وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تو اسی شوخ مسکراہٹ اور تیکھی نظروں کے ساتھ کسم نے کہا ''خوب پر پرزے نکالے ہیں۔ اپنی سندرتا پر بڑا ناج ہے آں؟'' اور وہ مڑتے ہوئے کچھ اس طرح سر کو پیچھے کی طرف پھینک کر ترچھی نظروں سے دیکھتی ہوئی، مٹکتی، لچکتی چلی گئی کہ اس کے جسم میں شعلہ سا لپک اٹھا۔ اس نے سوچا کسم کے بھاری جسم میں، اس کے گندمی چہرے میں جسے جوانی اور ادھیڑ پن کے ملاپ نے گول اور بھرپور بنا دیا تھا، اس کے مسی سے رنگے پکے جامنوں کے سے رس بھرے ہونٹوں میں اور کاجل لگی آنکھوں کی بے باک نگاہوں میں ان کالج کی لڑکیوں کے حسن سے زیادہ کشش ہے۔ اور کسم گھڑے لیے چڑھائی چڑھ رہی تھی۔ اس نے سوچا کسم کی جنسی اپیل خطرناک ہے۔ اور کسم ہر روز ایک آدھ فقرہ کس کر بے باک نگاہیں اور مسکراہٹیں بکھیرتی چلی جاتی۔ اس نے خیال کیا کسم سے اسے محبت ہو گئی ہے اور کسم نے اسے بلا لیا۔ کسم اسے بھینچتی تو اسے محسوس

ہوتا اسے بیک وقت محبوبہ اور ماں کا پیار مل رہا ہو۔ وہ محسوس کرتا اسے کسم سے محبت ہو گئی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ اسے کسم سے واقعی محبت ہو گئی ہے۔ کسم اس کی زندگی پر ایک گھٹا کی طرح چھا گئی۔ وہ ہر روز بلا ناغہ وہاں جاتا رہا۔ اور پھر اس نے جان لیا کہ اس کی اور چمپا کی محبت سے الگ یعنی دل کے درد اور سرد آہوں پر مشتمل محبت کے علاوہ کوئی اور قسم کی 'محبت' بھی ہے۔ لیکن جانے کیوں جب شام میں کسم کا شوہر لوٹ آتا اور کسم ڈیوڑھی میں کھڑی ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہی ہوتی تو اس کی 'رگِ رقابت' ایک لمحے کے لیے بھی نہ پھڑکتی، گو کسم سے اسے بہت محبت تھی....

پھر وہ کالج چلا گیا اور نزہت اس کے دل کی دنیا میں آ گئی۔

نزہت جو بی اے میں پڑھ رہی تھی اور بلا کی ذہین تھی۔ خصوصاً ادب اور آرٹ پر وہ کچھ اس طرح بحث کرتی کہ وہ اسے بے تحاشہ ایڈ مائر کرنے لگا۔ اور اس نے اپنے آپ سے کہا، محبت میں صرف جنس ہی نہیں رفاقت بھی بہت ضروری ہے۔ اور نزہت بہترین رفیق ہے۔ نزہت اسے یوسف کہا کرتی۔ ''حسن یوسف پایا ہے تم نے تو''۔ وہ اپنی دو چوٹیوں کو ایک ادا سے پیچھے ڈال کر کہتی۔ نزہت نے اسے شاعر بنا دیا۔ نزہت سے اسے بے پناہ محبت ہو گئی تھی۔ ایک دن بھی وہ کالج نہ آتی یا کالج سے باہر اس سے نہ ملتی تو وہ دیوانہ سا ہو جاتا۔ اور وہ محسوس کرتا، وہ نزہت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گا۔ وہ نزہت سے رقت بھری آواز میں کہتا:

''نزہت یہ مذہب کی دیوار ہمارے بیچ میں کیوں حائل ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے پرکاش کے بجائے یوسف ہی سمجھ لو، یا میں تمھیں نزہت کے بجائے نلینی سمجھ لوں۔ جب دو دل ایک ہو گئے ہوں اور دو انسان ایک دوسرے کے بہترین رفیق ہوں تو وہ ایک کیوں نہیں ہو سکتے؟ نزہت ہم سماج کو ٹھکرا کر ایک ہو جائیں گے۔'' اور وہ محسوس کرتا اگر نزہت سے اس کی شادی نہ ہو سکی تو....

اور گاؤں میں اس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اور اس کی دنیا میں کنول

رانی آ گئی.... گلابی گٹھری کا گھونگھٹ اٹھا کر اس نے دیکھا، اس کی کنول، کنول کی طرح خوبصورت تھی۔ پھر اس نے اسے چھما چھم کرتی، پازیب چھنکاتی، پتلی کمر لچکاتی، چلتی پھرتی دیکھا تو اسے خیال ہوا وہ چمپا سے اور کسم سے اور نزہت سے بدرجہا خوبصورت ہے۔ وہ ایک سپنوں کی رانی معلوم ہوتی ہے۔ ایک خواب، تصور کی تکمیل! پھر اس کی وہ میٹھی، لوچ دار آواز، وہ حیا، وہ نرمی، وہ شفقت، وہ جذبہ پرستش، اس کے سینے میں محبت کے چشمے ابلنے لگے۔ وہ دن بھر گھر پر رہتا۔ اسے محسوس ہوتا وہ اپنی محبوب بیوی سے ایک لمحے کے لیے بھی جدا نہیں رہ سکے گا۔ ایک سال بعد جب اسے شہر میں ملازمت مل گئی اور اپنی بیوی سے جدا ہونا پڑا۔ تو وہ زمانے کو کوسنے لگا۔ یہ فکر روزگار کیوں لگی ہے۔ یہ زمانہ کتنا ظالم ہے کہ اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز بیوی سے بچھڑا رہا ہے۔ "میں تم سے دور کیسے رہ سکوں گا کنول...؟"

اور جب وہ دور چلا گیا تو جمیلہ اور پرمیلا اور....

جمیلہ کے متعلق اسے معلوم تھا کہ وہ کئی مردوں کی محبوبہ رہ چکی ہے اور اب بھی جب وہ اسے چاہنے لگا تھا، وہ کئی مردوں کو اس کے گرد منڈلاتے دیکھتا تھا۔ وہ ان سب کے سامنے اپنے آپ کو پھینک دیتی تھی۔ لیکن جمیلہ کی وہ مسکراہٹ؟ جمیلہ خوبصورت نہ تھی۔ لیکن اس کا بدن چھریرا اور متناسب تھا۔ اس کے ہونٹ موٹے تھے اور دہانہ بھی چوڑا تھا، پھر بھی اس کے ان لپ اسٹک سے سرخ کیے ہوئے ہونٹوں پر یہ مسکراہٹ بہت بھلی لگتی تھی۔ اس کی وہ میٹھی مسکراہٹ جس میں خلوص تھا، محبت ٹپکتی نظر آتی تھی! وہ مسکراہٹ تو اسی کے لیے مخصوص تھی۔ وہ اپنے آپ سے کہتا۔ شاید جمیلہ اس کے حسن پر فریفتہ ہو گئی ہے۔ اور شاید اس نے اس کے اندر سوئی ہوئی عورت کو جگا دیا ہے۔ عورت جو کسی سے سچا پیار کرنا چاہتی ہے، اور کسی سے سچا پیار پانا چاہتی ہے، کتنی معصوم نظر آتی ہے وہ! بھلا اس کے اندر عورت نہ ہوگی۔ بس وہ عورت سوگئی تھی۔ ہوس کے بوجھ تلے دب گئی تھی۔ اب اس محبت نے اسے جگا دیا ہے۔ جمیلہ واقعی اس سے محبت کرتی ہے۔ ورنہ اس کی وہ نگاہیں جن سے خلوص ٹپکا پڑتا

ہے، اس کی وہ میٹھی مسکراہٹ جس سے محبت چھلکی پڑتی ہے۔ پھر... پھر ایک دن جب وہ حسب معمول اس کے گھر گیا تو جمیلہ نے اس سے کہا: ''بیٹھو پرکاش پیارے، میں ابھی آئی۔'' جب وہ بہت دیر تک نہ آئی تو اس نے ملحقہ کمرے میں یونہی جھانک کر دیکھا۔ جمیلہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے سامنے سعید کھڑا ہوا تھا۔ جذبات سے عاری کالا پتھریلا چہرہ۔ سعید نہایت بدصورت تھا۔ لیکن اب اس کی قسمت جاگ اٹھی تھی اور وہ ہزاروں میں نہار رہا تھا۔ پہلے وہ غریب تھا۔ وہ جمیلہ کا بہت پہلے سے عاشق تھا۔ آہیں بھرا کرتا، ملتجی نظروں سے دیکھتا لیکن جمیلہ اس کے پیار پر ٹھوکریں مارتی پھرتی، اسے کتے کی طرح دھتکار کر اپنے در سے نکال دیتی۔ اب بھی وہ اسی بیوقوفانہ انداز میں جمیلہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تحیر تھا اور وہ بیوقوفوں کی طرح منہ کھولے کھڑا تھا۔ ''کیا سچ، سچ جمیلہ، تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟ کیا اب میرے نصیب کھل گئے ہیں؟'' جمیلہ نے اپنی ساری ادائیں سمیٹ کر کہا ''میں تو ہمیشہ تم سے محبت کرتی رہی ہوں۔ تمھیں اس وجہ سے پاس نہیں آنے دیتی تھی کہ لوگ خواہ مخواہ کی باتیں بنائیں گے اور پھر اس لیے کہ ہم دور رہیں تو ہماری محبت میں اور زیادہ تڑپ پیدا ہو جائے گی۔'' پھر سعید کا منہ بیوقوفانہ انداز میں کھل گیا۔ ''سچ جمیلہ میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ میں غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ میں سمجھتا تھا تم پرکاش سے....'' جمیلہ نے ایک لطیف قہقہہ لگایا ''پرکاش سے؟ بالکل نہیں۔ وہ یونہی میرے پیچھے پڑا ہوا ہے، میں اسے بالکل لفٹ نہیں دیتی۔ ہم پرکاش، وہ چھچھورا، جو جس لڑکی کو بھی دیکھتا ہے اس کے پیچھے... اس چھچھورے سے محبت؟''

سعید ہکلا کر کہہ رہا تھا ''لیکن پرکاش کتنا خوبصورت ہے اور میں کتنا....''

''نہیں تو، تم بدصورت نہیں ہو، میرے لیے تو بدصورت نہیں ہو۔ رنگ کچھ کم ہے بھی تو کیا۔ مجھے تو سانولا رنگ پسند ہے۔ اس میں نمک ہوتا ہے۔ گورا رنگ مجھے خاک پسند نہیں....'' سعید کا منہ اور بھی کھل گیا۔ ''اب مجھے کہیں جانا ہے۔ کل ملوں گی۔ کار بھیج دو تو تمھارے گھر پر ہی چلی آؤں گی۔'' اور وہ سعید کو گیٹ تک چھوڑ آئی اور جب وہ اسے

رخصت کر رہی تھی، تو اس کی نگاہوں میں وہی خلوص تھا، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، میٹھی مسکراہٹ جس سے محبت چھلکی پڑ رہی تھی.... وہ اسی کمرے کو لوٹی جس میں وہ اور سعید تھے، اور وہیں سے شیریں آواز میں، نہایت محبت بھرے لہجے میں اسے پکارنے لگی ''پرکاش پیارے، یہیں چلے آؤ نا!'' لیکن وہ اس کے آنے سے پہلے گھر سے باہر نکل آیا۔

اور پھر پرمیلا ایک پارۂ سیماب کی طرح آگئی۔

پرمیلا اپنے بھڑکیلے حسن اور سیمابی اداؤں کے ساتھ، اس کے خیالات، تصورات، اس کی شاعری پر چھا گئی۔ پرمیلا کی چنچل ادائیں، اس کی آنکھ مچولی، گریز، اور پھر سپردگی اسے خاص طور پر پسند آئی تھی۔ اور وہ محسوس کرتا وہ پرمیلا کی محبت میں جل رہا ہے۔ وہ اب تک کسی عورت کی محبت میں اتنا بے تاب نہیں ہوا تھا، پرمیلا سے اسے بے اندازہ محبت ہے۔ اس نے سوچا وہ ایک آرٹسٹ ہے اور آرٹسٹ مختلف عورتوں سے متاثر ہوتا ہے، حسن کی مختلف صورتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ آرٹسٹ کی محبت اتنی تنگ نہیں ہوتی کہ ایک ہی عورت اس میں سما سکے۔ آرٹسٹ کا دل، اس کی محبت وسیع ہونی چاہیے اور محبت کے اس وسیع دامن میں وہ کئی عورتوں کو سمیٹ لیتی ہے۔ عورتوں کو اور ان کے حسن کو، ان کا حسن اور ان کی کشش اس کے جذبات کو بھڑکا دیتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنے آرٹ کے لیے وجدان پاتا ہے۔ وجدان کے لیے ہر دفعہ ایک نیا شعلہ چاہیے، اور اس نے سوچا میں ہندوستان کا شیلے ہوں اور پرمیلا میری زندگی میں ایملیا ویانی بن کر آئی ہے۔ اس کا شعلہ ساماں حسن اس کا ذہین دماغ، اس کے قرب کی آگ، اسے وجدان کی بلندیوں پر پہنچا دیتے ہیں اور اس کے اشعار.... اب اس کے دن اور اس کی راتیں پرمیلا کی تھیں۔ وہ اس پر سینکڑوں روپے لٹا رہا تھا اور کنگال ہوا جا رہا تھا۔ لیکن وہ پرمیلا کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا.... اور پھر اس کے گھر سے خط آیا ''بچی سخت بیمار ہے۔'' اسے گھر گئے اور بیوی بچوں کو دیکھے کئی ماہ ہو گئے تھے۔ وہ جانے لگا۔ پرمیلا اسے چھوڑنے آئی تھی۔ ٹرین آنے میں کچھ دیر تھی۔ راستے میں کچھ دیر وہ اس جگہ ٹھہر گئے جہاں وہ اکثر ملا کرتے تھے۔ اس پر رقت طاری ہو گئی۔ اس نے پرمیلا کا

ہاتھ پکڑ لیا" میں کیسے جا سکتا ہوں پرمیلا تمھیں چھوڑ کے۔ لیکن مجھے جانا ہی ہو گا۔ بچی سخت بیمار ہے۔ تمھیں نہیں معلوم اس ننھی سے مجھے کیسی محبت ہے۔" اور پرمیلا نے جو اس کی سرد آہوں کا، اس کی محبت، محبت کی رٹ کا، اس کے جذباتی اور شاعرانہ انداز محبت کا مذاق اڑایا کرتی تھی، قہقہہ لگا کر کہا" تم سبھی سے بے حد محبت کرتے ہو....." اس کے دل کو چرکہ سا لگا۔ "مذاق نہ کرو پرمیلا، تم نہیں جانتیں میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ اب میں اتنے دن کیسے تم سے....." وہ اس کی گود میں سر رکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پڑا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو پرمیلا آنچل میں منھ چھپائے ہنسے جا رہی تھی۔ اسی دم اسے پرمیلا سے نفرت ہو گئی۔ وہ تیزی سے خدا حافظ کہے بغیر اسٹیشن چلا گیا۔

کنول ایک اُداس مسکراہٹ سے اس کا استقبال کر رہی تھی۔

وہ اب بھی اتنی ہی خوبصورت تھی اور کم سن نظر آتی تھی۔ اس کے سینے میں محبت کی دھارا امنڈ آئی۔ وہ دونوں گھنٹوں بیمار بچی کے پاس بیٹھے رہتے۔ کنول کی دکھی ماتا کو دیکھ کر اس کا دل خون ہو جاتا۔ کنول اس کے پاس بیٹھی ہوتی اور وہ سوچتا کنول سے اسے کتنی محبت ہے۔ وہ کیسے اس سے دور رہ سکا تھا۔ جب بچی اچھی ہو گئی اور اسے پھر جانا پڑا۔ اور جب وہ کنول سے رخصت ہو رہا تھا اسے ایسا محسوس ہوا اس کا دل پھٹا جا رہا ہے۔ کنول نے اپنے بھرے ہوئے نین کٹورے اٹھا کر کہا: "تم آنے میں اتنی اتنی دیر کر دیتے ہو۔" تو وہ رقت سے بولا "نہیں کنول، میں جلد آؤں گا۔ اس دفعہ چھٹیاں لے کر جلد آؤں گا۔ کوئی مستقل معقول ملازمت مل جائے تو پھر تمھیں شہر لے جا کر ساتھ ہی رکھوں گا۔ میں تم سے کیسے دور....." اور وہ کنول کو لپٹا کر خوب رویا۔

راستہ بھر وہ کنول کی یاد میں کھویا بیٹھا رہا۔ پھر اسے جلدی بس پکڑنی تھی۔ کچھ دیر کے لیے کنول کے خیال نے اسے چھوڑ دیا۔ بس میں بیٹھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور ادھر ادھر کے درختوں کو اور سرسبز کھیتوں کو دیکھ کر اور ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں سے اس کی طبیعت بحال ہوئی۔ اس نے بس کے مسافروں کا جائزہ لیا۔ کونے میں ایک سانولی لیکن

دلکش لڑکی بیٹھی تھی۔ چہرے پر کسی کی نگاہوں کو محسوس کر کے لڑکی کی گھنی پلکیں اوپر اٹھیں اور بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں سے اس نے ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی۔ اور اس کے غنچے کے سے دہانے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر وہ مڑ کر باہر دیکھنے لگی۔ لیکن وہ اسے لگاتار دیکھتا رہا۔ کبھی وہ آدمی جو لڑکی کے پاس بیٹھا تھا، شاید اس کا باپ، اوپر دیکھتا تو وہ نظریں جھکا لیتا۔ اور کئی مرتبہ اس کی اور لڑکی کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اس کے دل میں میٹھا میٹھا درد اٹھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں پھر ملیں۔ اس نے ایک ہلکی سی آہ بھر کر چاند پر نظریں جما دیں۔ اور پھر لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی کے چھوٹے دہانے پر پھر وہی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور وہ کچھ شرما گئی۔ یہ لڑکی بس چند میل اس کے ساتھ رہے گی۔ پھر زندگی میں وہ اسے دیکھ بھی نہ سکے گا۔ اس کا نام بھی جان نہیں سکتا۔ کاش کسی طرح اس کا اڈریس معلوم ہو جاتا۔ وہ کم از کم اسے محبت بھرے خطوط تو لکھا کرتا۔ لیکن اڈریس ملنا ناممکن تھا۔ اور اس کی منزل ختم ہو رہی تھی۔ اب کوئی دم میں وہ چلی جائے گی۔ وہ چاند پر نظریں جمائے آہیں بھرنے لگا....

●●●

نغمے کی موت

وہ اپنی ناولٹ کو آخری ٹچ دے رہا تھا۔ چیز بہت اچھی بن رہی تھی اور وہ بے حد مسرور تھا۔ شام کا وقت تھا، ٹھنڈی خوشگوار ہوا بہہ رہی تھی، اور سمندر کی خنکی سے لدی ہوئی ہوا کے سرد جھونکے، فرحت افزا جھونکے، میز کے پاس والے دریچے سے آرہے تھے اور اس کا ذہن تازہ تھا، اور اس کا قلم بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ آج وہ اس ناولٹ کو مکمل کر دینا چاہتا تھا، اور ابھی اسے ختم کر دینا تھا ورنہ....

نقرئی قہقہوں کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ بھڑکیلے لباس میں دو لڑکیاں سڑک پر سے گزر رہی تھیں۔ وہ قلم ہاتھ سے رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور تیزی سے دریچے کے پاس آکر انھیں دیکھنے لگا۔ ایک لڑکی نے ساری پہن رکھی تھی۔ دوسری نے شلوار، قمیص اور دوپٹہ۔ دوسری لڑکی بڑی طرح دار تھی۔ اس نے دانت بھینچ لیے۔ اور یہ طرح دار لڑکی جس میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری معلوم ہوتی ہے، کہیں مل جائے تو اگر وہ یہ پتہ لگانے میں کامیاب ہو جائے کہ یہ لڑکی کون ہے اور کہاں رہتی ہے تو اسے شکار کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ آخر وہ ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے مشہور ہے۔ کئی لڑکیاں محض اس کی شہرت کی وجہ سے تو اس کے پاس کھنچی چلی آتی ہیں، اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیتی ہیں۔ کوئی بھی لڑکی اس کی محبوبہ بننے پر فخر کرے گی، اسے اپنی خوش قسمتی سمجھے گی۔ اس کی نظریں دور تک ان لڑکیوں کا تعاقب کرتی رہیں۔ وہ غور کرنے لگا کس قوم کی ہوگی وہ لڑکی؟ پہلی لڑکی کا مذہب تو اس کی ساری

باندھنے کے انداز سے معلوم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ لڑکی جو چلتے چلتے میں قیامت ڈھا رہی تھی، کس مذہب کی ہوگی۔ اور پھر جیسے اسے فوراً اس کا جواب بھی مل گیا۔ کیوں کہ اس کی ساتھی لڑکی اونچی آواز میں اس سے چیخ چیخ کر باتیں کر رہی تھی اور باتیں کرتے ہوئے اس نے اسے نام سے مخاطب کیا۔

اوہ تو اس مذہب کی لڑکی ہے؟ تب تو اور بھی یقینی... انتقام کی خاطر۔ ہاں ان دنوں وہ اس مذہب کی لڑکیوں کو چن چن کر... جب کبھی فسادات ہو جاتے ہیں تو دو قوموں کے افراد ایک دوسرے کا قتل عام شروع کر دیتے ہیں یا ایک دوسرے کی عورتوں سے... انتقام کی یہ دوسری صورت تو بڑی ہی مزیدار ہے۔ لطف کا لطف اٹھاؤ اور اپنے ہم قوموں کی نظر میں قابل تحسین بھی ٹھہرو۔ اس کے دل میں بھی اس مذہب کے لوگوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی ہے۔ اور وہ انتقام کی یہ دوسری صورت اختیار کر رہا ہے لیکن اپنے مقصد کو چھپائے، اور بڑے مہذب طریقہ پر، ایک آرٹسٹ کا مہذب انتقام!

اس نے قلم اٹھالیا۔ آج تو یہ ناولٹ پوری کر دینی ہی چاہیے۔ نہیں معلوم پھر موقع ملے گا یا نہیں۔ ایک تو بہت دنوں سے اس نے کچھ لکھا ہی نہیں۔ اور پھر یہ ناولٹ بھی کب سے شروع کر رکھی تھی۔ آج وہ اسے ختم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ چند ایک اختتامی پیراگراف ہی تو لکھنے تھے لیکن یہ بھی وہ لکھ نہ سکا تھا۔ آج صبح سے اس کی نئی محبوباؤں میں سے تین لڑکیاں یکے بعد دیگرے آ دھمکی تھیں۔ اور اب ذرا سی دیر میں اس کی دیرینہ لیکن دیرپا محبوبہ رنجنا آنے والی تھی۔ اور اس کے آنے سے پہلے یہ ختم نہ ہو جائے تو... اس نے لکھنا شروع کیا، اس کے ذہن میں اب بھی تازگی تھی، قلم میں اب بھی زور، چند لمحوں میں اس نے اختتامی پیراگراف لکھ ڈالے۔ اور اس نے ناولٹ کو شروع سے ایک دفعہ پڑھا۔ اس کا دل مسرور ہو گیا، سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ کتنی مکمل چیز تھی۔ آغاز، تعمیر، اٹھان، اختتام، جذبات کی روانی، الفاظ اور جملوں کا حسن، زور قلم، اور آخری جملوں کی اپیل کتنی زوردار تھی۔ اس نے آخری جملوں کو بار بار، منہ ہی منہ میں دہرایا... اور موضوع اور زاویہ سو فیصدی ترقی پسند۔ کیا چیز

ہے۔ بہت دنوں بعد وہ ایسی چیز لکھ پایا ہے۔ لوگ شاکی ہیں کہ اس کی حالیہ تحریریں بڑی پھیکی ہیں۔ وہ خود اپنی تحریروں سے مطمئن نہیں ہے۔ وہ توجہ سے بالکل نہیں لکھ رہا ہے، وقت ہی نہیں ملتا۔ توبہ یہ لڑکیاں بھی کیا وقت کو کھا جاتی ہیں۔ لیکن، وہ مسکرایا، اسے اپنی ذہانت اور زورِ قلم پر اعتماد ہے۔ اب اس ناولٹ پر بھی اس نے خاص توجہ نہ دی تھی۔ پھر بھی کیا چیز بنی ہے۔ لوگ پھر ایک دفعہ چونک اٹھیں گے۔ اس سے وہ اپنا کھویا ہوا وقار پالے گا۔ لوگوں کی نظروں میں وہ پھر ایک دفعہ وہی آرٹسٹ بن جائے گا۔ وہی 'حساس آرٹسٹ' جس کی نوکِ قلم کی ہر جنبش میں جوش اور ولولہ ہے۔ جس کی تحریر میں بلا کا اثر ہے۔ اور موضوع اور زاویۂ نظر دیکھ کر تو سب کو پھر اس کی انسانیت دوستی پر یقین آ جائے گا۔ کیسا سو فیصدی ترقی پسند موضوع ہے۔ عورت معصوم اور مجبور ہوتی ہے، یہ ہم مرد ہی ہیں جو اسے طوائف بناتے ہیں، وہ مردوں پر کیسے برسا ہے، 'سماج کی گندگی' کو کس طرح بے نقاب کیا ہے۔

اس نے پھر ایک مرتبہ ناولٹ کو شروع سے آخر تک پڑھا۔ لیکن اس دفعہ اس میں اسے کسی چیز کی کمی شدید طور پر محسوس ہوئی۔ آخر کس چیز کی کمی ہے۔ آغاز، تعمیر، اٹھان، اختتام، سب نہایت اچھے ہیں، آرٹسٹک ہیں۔ اور جملوں کی بندش کیسی حسین ہے۔ اور اسٹائل نے بھی جذبات کا ساتھ دیا ہے۔ کہیں مترنم اور حسین الفاظ نے حسن اور موسیقی بکھیر دی ہے۔ کہیں الفاظ کے جوش اور ولولہ انگیز جملوں کی امنڈتی ابھرتی موجوں نے طوفانی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ لیکن صرف الفاظ زوردار ہیں۔ اور جملوں کے اس طوفان کے سے چڑھاؤ کے باوجود وہ اثر پیدا نہیں ہوا ہے۔ ہاں اس میں خلوص نہیں ہے۔ اور خلوص کی اس کمی کو وہ اختتام کی آخری زوردار اپیل بھی پورا نہیں کر سکی ہے۔ اس میں خلوص کیسے آ سکے گا؟ اس ناول میں وہ ان مردوں پر برسا ہے۔ جو معصوم لڑکیوں کی زندگی تباہ کر دیتے ہیں۔ انھیں طوائفیں [طوائف] بنا دیتے ہیں جب کہ وہ خود کتنی ہی زندگیاں تباہ کر چکا ہے، کتنی ہی لڑکیوں کو طوائفیں [طوائف] بنا چکا ہے۔ اس کے لبوں پر ایک عیار سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ اپنے قلم سے کھیلنے لگا۔ اور پھٹے ہوئے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر ان لڑکیوں کے اور

عورتوں کے نام لکھنے لگا جو اس کی زندگی میں آئی تھیں۔ ان لڑکیوں کے نام جو سب سے پہلے اس کے بچھائے ہوئے دام میں پھنسی تھیں، جنھیں اس نے طوائف بنایا تھا۔ پھر ان عورتوں کے نام جو اس کے لیے اپنے شوہروں تک کو چھوڑ کر آ گئی تھیں لیکن جنھیں اس نے مستقل سہارا نہ دیا تھا، اور اب ان کی زندگی تباہ ہو چکی تھی اور ان کی اس بے بسی میں اسے ایک قسم کا ساڈی (Sadistic) بھی ملا تھا اور اس کا غرور اور بڑھ گیا تھا کہ اس کے لیے عورتیں کیا کیا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ پھر وہ عورتیں جنھیں اس نے طوائف نہ بنایا تھا بلکہ وہ پہلے ہی سے خوب طاق اور تجربہ کار تھیں اور ان کے اسی تجربہ کی خاطر اس نے ان سے تعلق قائم کیا تھا۔ اور پھر یہ نئی نئی لڑکیاں، تعلیم یافتہ، فیشن ایبل، نئی روشنی کی لڑکیاں جو اس کی شہرت کی وجہ سے کھنچی چلی آتی تھیں اور اس کی محبوبہ بننے میں فخر محسوس کرتی تھیں۔ اوہو کتنی لڑکیاں اور عورتیں... فخر سے اس کا سینہ پھول گیا۔ ایک طویل فہرست بن گئی تھی۔ سب سے اوپر سر فہرست رنجنا کا نام تھا۔ رنجنا اس کی دیرینہ لیکن دیرپا محبوبہ تھی۔ رنجنا کو اس نے پہلے پہل اس وقت جانا تھا جب وہ بالکل کم سن کوئی سولہ سترہ سالہ لڑکی تھی۔ معلوم نہیں اگر وہ اس وقت اس کی زندگی میں نہ آیا ہوتا تو وہ اب کیسی ہوتی۔ ممکن ہے اس کی شادی ہو چکی ہوتی، اس کا ایک گھر ہوتا، شوہر ہوتا، ننھے ہوتے، ایک چھوٹی سی خاموش جنت ہوتی۔ لیکن وہ اس کی زندگی میں آ گیا تھا۔ سب سے پہلے اس کی وجہ سے رنجنا اس عمر میں لڑکی سے عورت بن گئی تھی۔ طوائفیت کا پہلا زینہ اس نے طے کرایا تھا اور پھر وہ تیزی سے چڑھتی چلی گئی۔ اب تو وہ ایسی طاق تھی کہ پیشہ ور طوائفوں کے بھی کان کاٹتی تھی۔ اسے عیاش مردوں کو خوش کرنے کے گر بھی معلوم تھے۔ معصوم جذباتی قسم کے نوجوانوں کو پھانسنے کے بھی۔ وہ اپنے آپ کو ہر طرح ڈھال سکتی تھی۔ ہر طرح کا روپ بدل سکتی تھی۔ وہ عیاش مردوں کے لیے 'تجربہ کار طوائف' بھی تھی۔ بھولے بھالے نوجوانوں کے لیے ایک معصوم، کم سن پہلی محبت کا ڈھونگ دلانے والی لڑکی بھی۔ وہ بلا کی ریاکار اور عیار تھی۔ اتنی کہ اس کی ریاکاری سچ بن جاتی تھی۔ وہ ابھی کسی کے سامنے گویا سچے دل سے خلوص اور محبت جتا رہی

ہوتی اور ابھی اس کے پیٹھ موڑتے ہی اس کی تحقیر اور مذمت کرنے لگتی۔ خود اسے بھی، گو وہ رنجنا کی فطرت کی ایک ایک بات جانتا تھا، اس کی ریا کاری کو عریاں دیکھا تھا، اور جو خود بھی ریا کار تھا، اسے خود بھی دھوکا ہونے لگتا۔ اور وہ کبھی کبھی رنجنا کے اظہار محبت میں یہ محسوس کرتا وہ واقعی اس سے سچی محبت کرتی ہے۔ وہ اتنے مردوں کی ہونے کے باوجود اسی سے وابستہ ہے، وہ اسی کی ہے... شاید رنجنا کی یہی بات یعنی دھوکے کو بالکل سچ کا روپ دینا، اور اپنی جھوٹی عارضی ہر دم بدلتی ہوئی، طوطا چشم محبت کو بالکل سچی محبت سا بنانے میں طاق ہونا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ رنجنا اتنے عرصہ سے اس کی محبوبہ رہی ہے، ورنہ دوسری لڑکیوں کو تو وہ چند ہی دنوں میں... حالانکہ ان میں سے کئی ایک لڑکیاں خوبصورت تھیں اور رنجنا خوبصورت تو کیا کوئی خاصی قبول صورت بھی نہیں... فہرست میں نرملا کے نام پر اس کی نظر ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی۔ ایک لمحے کے لیے سرور اور پھر غم اس کے دل کے کسی گوشے میں دہک اٹھا۔ کیوں کہ اس کی زندگی میں آئی ہوئی لڑکیوں میں صرف نرملا ہی تھی جس نے اس کے دل میں محبت کے پاکیزہ جذبات کو بیدار کر دیا تھا۔ اور اسے سچی محبت سے آشنا کیا تھا۔ اور جب وہ اس کی زندگی سے یکلخت نکل گئی تھی تو وہ کافی عرصے تک سنبھل نہ سکا تھا... لیکن یہ احساس صرف ایک لمحے کا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس پر اس کے ضمیر کی بے حسی غالب آ گئی۔ عرصہ ہوا اس کا ضمیر سو چکا تھا، شاید مر چکا تھا۔ اور اس کا دل زیادہ سرد زیادہ بے رحم ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس کی فطرت پر ریا کاری کی اور زیادہ تہیں چڑھتی جا رہی تھیں۔ اس نے سینے سے شدید جذبات کے سرچشمے کو ہی سکھا دیا تھا۔ لیکن اس کی ناولیں رقت بھری جذباتیت سے بھرپور ہوتیں، شاید اس نے اپنے دل سے احساس اور جذبات کا آخری قطرہ بھی نچوڑ دیا تھا۔ اور یہ سب کچھ اپنے قلم میں منتقل کر دیا تھا، اس کا دل جتنا زیادہ سرد ہوتا جاتا، وہ اپنی ناولوں میں الفاظ کے ذریعہ اتنی ہی گرمی، اتنی ہی حدت گھول دیتا....

پاس والے کمرے سے اس کی بیوی کی چڑچڑی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔ شاید وہ بچے کو ڈانٹ رہی تھی۔ تو بہ دن بہ دن کس قدر چڑچڑی اور بد مزاج ہوتی جا رہی ہے

یہ عورت۔ اس نے نفرت سے اس کمرے کی طرف نگاہ ڈالی۔ پھر یہ سوچ کر وہ دل ہی دل میں ہنسا کہ اپنی بیوی کے اس چڑچڑے پن اور بدمزاجی کی آڑ لے کر تو وہ خوب کھل کھیل رہا ہے۔ اگر اس کی بیوی خوبصورت اور خوش مزاج ہوتی تو لوگ اس کی اس بے پروائی اور اس کی بڑھتی ہوئی جنسی بدعنوانیوں پر اسے مطعون کرتے لیکن اب... اب لوگ، اس کے دوست احباب، اس کے ملنے والے، اس کے آرٹ کے پرستار دیکھتے کہ اس کی بیوی کس قدر ناقابل برداشت ہے، جب وہ ان سب کے سامنے اس کی خبر لیتی، پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتی، ہر وقت بڑبڑاتی رہتی اور وہ کچھ جواب دیے بغیر نہایت مسکین بنا بیٹھا رہتا یا خندہ پیشانی سے اس کی گھرکیوں کا استقبال کرتا اور ایک عفو بھری مسکراہٹ لبوں پر لیے اپنی بیوی کو دیکھتا تو وہ سوچتے، واقعی یہ فرشتہ ہے فرشتہ۔ کتنا اچھا سلوک کرتا ہے۔ اسے بیوی کیسی ملی ہے۔ کتنی بدمزاج، پھوہڑ اور معمولی صورت کی، ایک اتنے حساس اور اعلیٰ ذوق رکھنے والے آرٹسٹ کو ایسی عورت ملے! ایک حساس اور خوش ذوق آرٹسٹ، اس کا آدرش کتنا بلند ہوگا۔ اور یہ عورت! ٹھیک ہی تو ہے کہ وہ دوسری لڑکیوں اور عورتوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ شاید وہ ان میں اپنے آدرش کو ڈھونڈتا رہتا ہے اور آدرش ملنا مشکل ہے۔ اور وہ ایک لڑکی سے مایوس ہو کر دوسری کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، پھر وہی مایوسی، اور پھر... اس کی زندگی کتنی ٹریجک ہے!... پھر جب نرملا اس کی زندگی میں آ گئی تھی، اور جب لوگوں نے نرملا کو اور اس کی محبت کو دیکھا تو کہا اب اسے اپنا آدرش مل گیا ہے۔ آرٹسٹ اس دیوی کی پرستش کرے گا۔ اب وہ سیدھی راہ سے نہیں بھٹکے گا۔ اسے منزل مل گئی۔ اور جب نرملا کی شادی ہوگئی اور کچھ ہی عرصہ اس کے غم میں مبتلا رہ کر وہ اسے تقریباً بھول چکا اور نئی نئی لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گیا تو شاید ان کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اور اس کے بعد جب انھوں نے دیکھا وہ نہایت سستی عام سی لڑکیوں سے بھی تعلقات قائم کرنے لگا تو سب پر ظاہر ہو گیا کہ وہ محض حظ اٹھانے کے لیے... اور اچانک سب کی نظروں میں اس کی وقعت جاتی رہی۔ اس کے دوست بھی اب اس سے کھنچے کھنچے سے رہنے لگے ہیں۔ گو ایسے دوست

جنھیں اس سے غرض تھی اب بھی ہر وقت اس کے ساتھ رہتے۔ اس کی اتنی ہی خوشامد کرتے۔ لیکن اب یہ ظاہر تھا کہ ان کی تعریفوں میں رسمیت تھی، غرض تھی۔ ان کی نگاہوں میں بھی اس نے دوری کو پڑھ لیا تھا... اور پبلک؟ اس سے محبت کرنے والی، اس کے آرٹ کی پرستش کرنے والی پبلک؟ اس پبلک کی نظروں سے اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی بہت کوشش کی۔ دور کے بہت سے دوسرے ناولسٹوں، افسانہ نگاروں، شاعروں اور آرٹسٹوں کا سارویہ اس نے اختیار نہیں کیا تھا۔ جن کی ترقی پسندی آخر اس تان پر ٹوٹتی تھی کہ سماج گندہ ہے۔ اس کے اصول، اس کی پابندیاں لوگوں کو غلاظت میں دھکیل رہے ہیں۔ ہم بھی چونکہ اسی گندہ سماج میں رہتے ہیں اس لیے اسی گندگی اور غلاظت میں آلودہ ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ جنسی بھوک ہمارے سماجی حالات کی پیدا کردہ ہے۔ ہم بھی اس کے شکار ہیں۔ اس لیے اگر عورت ہمارے اعصاب پر سوار ہے، ہماری جنسی زندگی بدعنوان ہے، اگر ہم یہ جنسی بھوک مٹانے کے لیے عورت کا جسم خریدتے بھی ہیں تو یہ سماج کا، حالات کا قصور ہے، جب تک یہ سماج، یہ نظام سرے سے نہ بدل جائے، جب تک اس فرسودہ عمارت کو ڈھانہ دیا جائے، اور اس کی بنیادوں کو... ہم جنسی کجروی اور بدعنوانیوں اور غلاظتوں کو بے نقاب کرتے ہیں اور ہم خود ہی اس غلاظت میں آلودہ ہیں تو کوئی بات نہیں کیوں کہ وہ لوگ جن کی غلاظت بھری زندگی کو ہم بے نقاب کرتے ہیں، ریاکار ہیں۔ اپنی داڑھیوں میں ہوس کو چھپائے گناہ کرتے ہیں۔ جھوٹی مذہبیت اور جھوٹے اخلاق کا لبادہ اوڑھے رہتے ہیں ورنہ دراصل وہ گندے ہیں، ان کے جذبات گندے ہیں۔ ہم ان کی ریاکاری کا پول کھولتے ہیں۔ ہم تو باغی بن کر گناہ کرتے ہیں۔ جرأت کے ساتھ۔ لیکن وہ جرأت کے ساتھ علانیہ گناہ کرنے کا قائل نہیں تھا کیوں کہ وہ چاہتا تھا لوگوں کی نظروں میں وہ پاک رہے اور وہ لوگوں کی نظروں میں دیوتا بنا رہا... کسی کو اس کی پرائیویٹ زندگی کے بارے میں معلوم نہیں تھا بجز اس کے خاص دوستوں کے اور ان لوگوں کے جنھوں نے اسے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ دوسروں کے سامنے وہ دیوتا کے روپ میں اپنے آپ کو پیش کرتا

تھا۔ نیکی، انسان دوستی، انکسار، کسرنفسی اور خلوص کا مجسمہ! وہ ہر ایک کو اپنی دوستی، ہمدردی اور اعانت کا یقین دلاتا، عام سے عام آدمی سے بھی اسی اخلاق ومحبت سے پیش آتا۔ سب اس کے گرویدہ تھے۔ اور اس کے آرٹ کے پرستار پبلک کو اس کی ذات سے بھی بے حد، بے پناہ عقیدت تھی۔ اس کی نظروں میں وہ دیوتا تھا... لیکن اب، اب... کسی بھاری بوجھ نے اس کے دل کو مسل دیا۔ اس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اب وہ لوگوں کی نظروں میں بالکل گر چکا تھا۔ ابھی ابھی ان پر اس کی پرائیویٹ زندگی کے راز کھلے تھے۔ اور اس کا اثر اور ردعمل کتنا فوری ہوا تھا۔ آبادنگر کے واقعہ کا خیال آتے ہی وہ کانپ گیا۔ شاذ ہی کسی اور جگہ کے لوگ اس کے آرٹ کی، اس کے ذات کی ایسی پرستش کرتے تھے جیسے آبادنگر کے لوگ۔ اسے وہاں انتہائی مقبولیت حاصل تھی۔ اور جب وہ پہلی دفعہ آبادنگر گیا تھا تو لوگ اسے دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے تھے۔ اس کا کس گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ ان کی نظروں میں بے پناہ عقیدت تھی اور جب وہ ان میں عام سے عام آدمی سے ہنس ہنس کر نہایت خوش اخلاقی سے ملا تھا۔ اور اپنے ضرب المثل انکسار سے ان کو یہ محسوس نہ ہونے دیا تھا کہ وہ ایک مشہور آدمی سے باتیں کررہے ہیں تو لوگوں کی نظروں میں عقیدت کی چمک اور بڑھ گئی۔ اور ان کے دل جذبہ محبت سے معمور ہوگئے۔ لیکن جب وہ دوسری بار آبادنگر گیا تھا، اس خوبصورت شہر اور اس کے مضافات کی اچھی طرح سیر کرنے کے لیے اور اس سیر سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے اپنی نئی محبوباؤں میں سے دو لڑکیوں کو بھی ساتھ لیتا گیا تھا، اس وقت بھی اس کے استقبال کے لیے لوگ جوق در جوق آئے، ایک دفعہ پھر ان کی عقیدت بھری نظریں اٹھیں، لیکن ان دوستی اور عام لڑکیوں کو اس کے ساتھ دیکھ کر جن کے سستے، چھچھورے عشووں سے اور ناولسٹ کے 'پیشہ ور عاشقوں' کے سے انداز سے انھوں نے چند ہی لمحوں میں تاڑ لیا تھا کہ ان کے درمیان کیسے تعلقات ہیں، تو ان کی نظروں میں عقیدت کی چمک یکا یک بجھ گئی اور استقبال کی گرمجوشی، سردمہری میں تبدیل ہوگئی۔ پچھلی دفعہ جب وہ یہاں آیا تھا، اسے بہترین جگہ ٹھہرایا گیا تھا۔ پارٹیوں پر پارٹیاں دی گئی تھیں۔

کاروں پر ٹیکسیوں پر سیریں کرائی گئی تھیں۔ ہر روز ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ لوگ اس کے سامنے بچھے جاتے تھے۔ لیکن اس دفعہ جیسے اسے اپنے آپ پر چھوڑ دیا گیا تھا، نہ اس کی سیروں کے لیے ٹیکسیوں اور کاروں کا انتظام کیا گیا، نہ کوئی پارٹی دی گئی، یہاں تک کہ اس سے ملنے کے لیے بھی کوئی نہیں آتا تھا۔ اور پھر اس کی شامت جو آئی تو دو ایک گھروں میں جہاں اسے بلایا گیا اس نے وہیں کی لڑکیوں پر ڈورے ڈالنے شروع کیے تو اس کی جان کے لالے پڑ گئے، اپنی جان بچانے کے لیے اسے وہاں سے بھاگ آنا پڑا تھا۔ کسی نے اسے آکر وقت پر بتا دیا تھا کہ اس بات پر کہ وہ یہاں کی لڑکیوں کو بھی پھانسنے کی کوشش کر رہا ہے، آبادنگر کے لوگ بپھر اٹھے ہیں کہ ایسا آدمی جو اپنے آرٹ کی مقبولیت اور اپنی شہرت سے فائدہ اٹھا کر شریف گھرانے کی بہو بیٹیوں کو خراب کرتا ہے، گولی سے اڑا دیے جانے کے قابل ہے....

اس نے اپنے لبوں پر تحقیر بھری مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔ ہمیشہ کی طرح یہ کہہ کر نالنا چاہا ''ہونہہ! کس قدر قدامت پرست تھے یہ آبادنگر کے لوگ!'' لیکن مسکراہٹ اس کے لبوں پر آنہ سکی اور ایک سرد خوف نے اسے سر سے پاؤں تک لرزا دیا....

یہ صرف آبادنگر ہی کی بات نہ تھی۔ یہ مایوس کن حقیقت اب اس کے سامنے تھی کہ وہ خاص حلقوں میں تو گر ہی چکا تھا، اب تو وہ عوام میں بھی اپنی مقبولیت کھو چکا تھا... یہ مقبولیت حاصل کرنے کے لیے اس نے کیا کیا نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے آپ پر ایک خول چڑھا لیا تھا۔ میٹھی میٹھی باتیں، خوشامدیں، ریاکاری، محبت اور دوستی کے اظہار کی فراوانی، حد درجہ انکساری، اور اس کی یہ ایکٹنگ اتنی مکمل تھی کہ کسی کی نظر اس خول کے اندر پہنچ کر اصل آدمی کو دیکھ نہیں پاتی تھی۔ اور وہ اپنی تحریروں پر بھی ایک خول چڑھا دیتا تھا۔ وہ ان میں انسانی محبت، ہمدردی اور انسان دوستی کا بہت بڑا 'ڈوز' دے دیتا۔ اتنا بڑا کہ انسانی محبت اور ہمدردی سے اس کی تحریریں لبریز ہو کر چھلکتی نظر آتیں۔ اس نے یہ گر ہمیشہ استعمال کیا تھا، اور یہی اس کی بے پناہ مقبولیت کا راز تھا۔ ورنہ اس کے کئی ہم عصر اس سے اچھے اور بلند پایہ

فن کار تھے جن کی تحریروں میں گمبھیرتا، ٹھوس پن اور گہرائی ہوتی تھی، لیکن اس کی تحریروں کی جوش بھری جذباتیت عام پڑھنے والوں کے لیے اپیل رکھتی تھی۔ اور وہ سوچتے کتنا حساس آرٹسٹ ہے۔ اس کا دل افسانوی محبت اور دردمندی سے لبریز ہے۔ وہ موضوع چنتے وقت بھی اس کا خاص خیال رکھتا تھا کہ وقت کی نبض پر اور لوگوں کے دل پر بیک وقت ہاتھ پڑے، یعنی گرما گرم موضوع، ایسے واقعات اور حادثات جن سے لوگوں کے دل اس وقت سب سے زیادہ متاثر ہوں۔ اور اس کا قلم تو ندی کی سی روانی سے چلنے کا عادی تھا۔ اور یہ گر اپنا کام کر جاتا۔ لوگوں کے دلوں میں عقیدت اور بڑھ جاتی کہ یہ آرٹسٹ کس قدر حساس اور دردمند دل رکھتا ہے کہ جہاں کہیں بھی مظلوموں کو ظلم اور بہیمیت کا شکار ہوتے دیکھا، انسان کو مصیبت اور درد میں دیکھا، بے حد متاثر ہو جاتا ہے اور اس کا قلم خون بہانے لگتا ہے۔ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ صرف اس کا قلم خون بہاتا ہے، اس کا قلم خون بہانے کا عادی ہو چکا ہے اور اس وقت بھی گرم گرم خون بہاتا ہے جب اس کا دل برف کی طرح سرد اور منجمد ہو جاتا ہے۔ لیکن اب لوگوں نے یہ جان لیا تھا کہ یہ رقت بھری جذباتیت تو اس کی اسٹائل میں تحلیل ہو چکی ہے اور جوش اور ولولے اور درد میں ڈوبے ہوئے یہ الفاظ اور جملے تو میکانکی طور پر اس کے قلم سے نکل آتے ہیں۔ اور بہت سی قیافہ شناس نظریں اس کے خول کے اندر جا کر اصل آدمی کو دیکھ چکی تھیں۔ اور جنھوں نے اسے قریب سے دیکھا تھا، اس کے قریب رہا کرتے تھے۔ اور وہ مداحوں اور دوستوں کے ایک بڑے گروہ کو ساتھ رکھتا تھا۔ ان پر تو اس کی یہ شخصیت کی یہ دورنگی صاف ظاہر تھی۔ حالانکہ اس نے ان سے بھی اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن قرب نے اسے ظاہر کر دیا تھا اور پھر بہت سے دوست اس سے دھوکا کھا چکے تھے۔ دوستی، محبت اور عنایتوں کی بوچھار کرتے کرتے وہ اندر ہی اندر دھوکا دے دیتا تھا۔ سو اب اس کے دوستوں کو بھی اس پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ اور یہ انکشافات، یہ باتیں آہستہ آہستہ پھیلتی گئی تھیں اور ان حالات میں اس کی بڑھتی ہوئی جنسی بدعنوانیاں، جواب علانیہ ہو چکی تھیں۔ ایک دفعہ بھانڈا پھوٹ جانے کے بعد وہ کھلے طور پر اور زیادہ آزادی سے

یہ سب کرنے لگا تھا۔ ان بڑھتی ہوئی عیاشیوں نے اور بھی کاری ضرب لگا دی تھی اور جتنی تیزی سے وہ چڑھ کر بلندیوں پر پہنچ چکا تھا، اتنی ہی تیزی سے نیچے گر رہا تھا گرتا جا رہا تھا...۔

اس نے اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے سر کو اٹھا کر زور سے جھٹک دیا، وہ ان خیالات کو جن سے اسے نا قابل برداشت ذہنی کوفت ہو رہی تھی، پرے ہٹا دینا چاہا۔ ایک انداز خودسری سے تن کر بیٹھ گیا۔ اور جھنجھلا کر کہا ''آخر یہ ہندوستانی اتنے تنگ نظر کیوں ہوتے ہیں؟ اگر وہ عورتوں سے کھیلتا ہے، ان سے حظ اٹھاتا ہے تو کیا ہوا۔ آخر میں ایک آرٹسٹ ہوں، یہ لوگ ایک آرٹسٹ کی محض آرٹسٹ کی حیثیت سے قدر کیوں نہیں کرتے۔ اس کی پرائیویٹ زندگی سے کچھ سروکار رکھے بغیر...؟'' لیکن، لیکن کیا اس کا آرٹ بھی گرتا نہیں جا رہا تھا؟ وہ اس حقیقت کو بھی جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ اس کے پڑھنے والی وسیع پبلک میں سوائے ان کے جن کو کوئی ذوق ہی نہیں تھا اور جو اس کی بیکار سے بیکار چیز کو بھی ایک شاہکار سمجھ لیتے تھے محض اس لیے کہ وہ اس کے قلم سے نکلی ہوئی تھی۔ ان لوگوں کو تو محض ایک جدت یا تکنیکی پینترا دے کر ہی مبہوت کر سکتا تھا۔ لیکن جو ذوق رکھتے تھے انھیں یہ احساس ہو چلا تھا کہ اس کی تحریروں میں اب پہلی سی بات نہیں رہی۔ پہلی سی بات تو کیا کچھ بھی نہیں رہا۔ وہ خود بھی محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کی تحریریں اپنے ظاہری حسن اور رنگینی اور ظاہری گرمی کے باوجود نہایت پھیکی ہوتی جا رہی ہیں کھوکھلی، بے روح اور بے اثر، نہ ان میں فنی بلندی تھی نہ اثر تھا۔ فنی پہلوؤں پر توجہ دینے کے لیے تو اسے بہت کم وقت ملتا تھا۔ اور اس فنی بے مائیگی کو وہ نت نئی جدتوں اور تکنیکی پینتروں میں چھپانے کی کوشش کرتا۔ پھر بھی بات نہ نبھتی۔ اور ان میں اثر اس لیے نہیں کہ ان میں خلوص نہیں ہوتا تھا۔ وہ خلوص کی اس کمی کو الفاظ کی بھرمار سے پورا کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اب جب کہ وہ سرمایہ دار بن چکا تھا اس کا قلم اور زیادہ زور کے ساتھ سرمایہ داروں کو گالیاں دیتا اور طبقاتی تفریق کی مذمت کرتا، اس میں سرمایہ دارانہ ذہنیت جتنی بڑھتی جاتی، اس کی تحریروں میں 'مزدور' اور 'کسان' کی اور زیادہ رٹ ہوتی، اور وہ اپنے سرمایہ سے جتنی زیادہ لڑکیوں کے جسم خریدتا تھا، اور اپنی شہرت

سے جتنی شریف لڑکیوں کو طوائفیت کا زینہ طے کراتا تھا، اتنا ہی زیادہ اس کی تحریروں میں عورت کی عصمت وعفت، اس کی معصومیت اور پاکیزگی کے احترام کی رٹ ہوتی۔ اسی طرح الفاظ کے ذریعہ اثر پیدا کرنا آسان تھا اور اس طرح وہ عرصہ تک لوگوں کو اپنے خلوص سے دھوکا دیتا رہا تھا۔ لیکن آخر وہ کب تک دھوکا دے سکتا تھا، کب تک، کب تک۔ اب تو سب یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اس کی تحریریں خلوص سے عاری ہیں اور دن بہ دن پھیکی، اور بے روح، اور بے اثر ہوتی جارہی ہیں۔

اس کی بیوی اب بھی چلا رہی تھی۔ اس دفعہ اس کی بدمزاجی، اور عتاب کا ہدف شاید نوکر لڑکا تھا، کیوں کہ آواز باورچی خانہ کی طرف سے آرہی تھی۔ آخر اس کی بیوی کیوں دن بہ دن اتنی بدمزاج ہوتی جارہی تھی؟ اس کا ذمہ دار بھی تو وہی تھا۔ آج مدتوں بعد اس کا سویا ہوا ضمیر کچھ جاگا تھا اور آج اسے اپنی بیوی سے بھی ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ وہ پہلے تو ایسی نہیں تھی۔ شادی سے چند مہینے پہلے اور چند مہینے بعد، وہ تو ایک بہت ہی خوش مزاج بلکہ کھلنڈری سی لڑکی تھی۔ بات بات پر اس کی باچھیں کھل جاتی تھیں اور اس کا کشادہ دہانہ اور بھی کشادہ ہو جاتا پھر بھی بھلا لگتا۔ لیکن اب اس نے برسوں سے اسے ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ اگر کبھی کبھار وہ ہنستی بھی یا مسکراتی بھی تو اس کی ہنسی میں اس کی مسکراہٹ میں کتنی تلخی ہوتی تھی۔ یہ تلخی اور یہ زہر اسی نے تو بھرا تھا۔ شادی کے چند ہی مہینوں بعد جب وہ پھر دوسری لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا، گو اس وقت وہ یہ بات اپنی بیوی سے چھپا کر کرتا تھا۔ لیکن وہ عورت تھی اور اس نے کسی نہ کسی طرح پتہ لگالیا تھا۔ پہلے وہ اس سے التجائیں کیا کرتی تھی۔ اس کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رویا کرتی تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے شوہر کے سخت دل پر اس کی التجاؤں اور آنسوؤں کا ذرہ بھر اثر نہیں ہوتا تو اس میں خود اپنی توہین سمجھ کر اس نے رونا چھوڑ دیا۔ اور وہ اندر ہی اندر گھٹتی گئی۔ اس میں اندر ہی اندر زہر سرایت کرتا گیا۔ اس کی ہنسی مرگئی اور وہ بدمزاج اور چڑچڑی ہوگئی۔ اور وہ اپنے ملنے والوں اور دوستوں کو بتانے کے لیے اس زہر کو اور بڑھاتا گیا، اس کی بدمزاجی کو اور اکساتا رہا۔ وہ

لڑکیوں کو کھلم کھلا اپنے گھر بلانے اور ساتھ لے آنے لگا۔ یہی نہیں وہ اسے ان لڑکیوں کی مہمان نوازی کرنے پر مجبور کرتا تھا، اور اسے کرنی پڑتی تھی، اور وہ خاموشی سے یہ سب کچھ برداشت کرتی تھی۔ لیکن یہ خاموشی کبھی طوفان بن جاتی، دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ سب پر بلاوجہ برس رہی ہے، اور اس کے دوست اور ملنے والے کہتے کتنی چڑچڑی اور بدمزاج ہے یہ عورت اور معمولی سی۔ ایک اتنے حساس اور اعلیٰ ذوق آرٹسٹ کو ایسی بیوی ملی ہے، اس کا آدرش کتنا بلند ہوگا۔ ٹھیک ہی تو ہے کہ وہ دوسری لڑکیوں کی طرف... انھیں کیا خبر تھی کہ یہ بدمزاج اور معمولی شکل کی عورت اس کے پلّے باندھ نہیں دی گئی تھی بلکہ اس نے اس سے باقاعدہ مہینوں عشق لڑا کر، محبت جتا کر پھانسا تھا، اور اس سے شادی کی تھی اس لیے کہ وہ ایک دولت مند باپ کی بیٹی تھی....

اس کی بیوی اب بھی چلاّ چلاّ کر ملازم کو گالیاں دے رہی تھی۔ اور اس کا چلانا اچانک کلائمکس کو پہنچ گیا۔ وہ تاڑ گیا کہ اس کا چلاّنا عروج پر کیوں پہنچ گیا ہے۔ شاید رنجنا آ رہی تھی اور اس کی بیوی نے رنجنا کو آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس کی محبوباؤں میں سے رنجنا سے خاص طور پر اس کی بیوی کو چڑ تھی، ایک تو شاید اس لیے کہ اس کی دوسری محبوبائیں ہنگامی ثابت ہوتی تھیں، رنجنا گویا اس سے چمٹ گئی تھی۔ اور جہاں دوسری لڑکیاں اس کی بیوی سے یا تو بے پروائی برتتیں یا جو نوآموز ہوتیں اسے دیکھ کر کچھ guilty سی محسوس کرنے لگتیں، لیکن رنجنا اس کی بیوی سے نہایت میٹھی باتیں کرتی تھی، اپنے آپ کو یوں ظاہر کرتی جیسے وہ اس کی بیوی کی ہمدرد اور غمگسار ہو، اس کی بہترین دوست ہو... اس کا قیاس ٹھیک نکلا کیوں کہ دوسرے لمحے رنجنا اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہی دلفریب اور دل نشیں اور دل ربا مسکراہٹ جس سے مرد مسحور ہو جاتے تھے۔ اور جو میکانکی ہونے کے باوجود فطری اور بے ساختہ معلوم ہوتی تھی۔ جو بیسیوں مردوں پر اسی فیاضی سے چھنکی جانے کے باوجود ان میں سے ہر مرد یہی محسوس کرتا تھا کہ وہ مسکراہٹ صرف اسی کے لیے مخصوص ہے۔ اور رنجنا کی اس مسکراہٹ میں وہ اپنے پچھلے سارے اذیت دہ خیالات کو بھول گیا، رنجنا کی

مسکراہٹ نے اس کے مدتوں بعد جاگے ہوئے ضمیر کو پھر تھپک تھپک کر سلا دیا اور وہ سب کچھ بھول کر عورت کی مسکراہٹ، عورت کی خوشبو، عورت کے قرب میں کھو گیا۔

پھر اس نے رنجنا سے پوچھا "تو آج کیا پروگرام ہوگا، خوب گھومیں کسی شاندار سے ہوٹل میں کھانا کھائیں اور سکنڈ شو اور، اور، اور۔"

وہ ایک دلربایانہ انداز میں آ کر اس کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔ "یونہی گھومنا؟ کچھ کام بھی تو ہو۔ میں پرسوں... سیٹھ کی دوکان پر گئی تھی۔ اس کے پاس ساریوں کا نیا اسٹاک آیا ہے۔ ایک آبی رنگ کی مہین زرتار ساری تو اس قدر خوبصورت تھی میں کہہ آئی ہوں کہ میرے لیے رکھ چھوڑیں، دو تین دن میں لے جاؤں گی۔ میں تو تم سے یہ ساری لے کر رہوں گی۔ کب سے تمھارا وعدہ ہے۔"

"آج تو جو کچھ بھی تم چاہو گی تمھارے قدموں میں بچھا دیا جائے گا۔ آج میں نے ایک شاندار ناولٹ ختم کیا ہے۔ واقعی بڑھیا چیز، بہت دنوں سے میں نے ایسی چیز نہیں لکھی تھی...."

"اوہ!" رنجنا نے یونہی اس کے سامنے سے مسودہ اٹھا لیا۔ اس کی نظر اختتامی پیراگراف پر پڑی "اوہو! اپیل تو بڑی زوردار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آپ تائب ہو رہے ہیں...." وہ شوخی سے مسکرائی۔

وہ ہنسا "تائب؟ ہا، ہا، یہ تو میرے افسانوں اور ناولوں کی باتیں ہیں رجنی ورنہ میں تو وہی ہوں رند کا رند۔" لیکن یہ کہتے کہتے اچانک اس کا چہرہ بجھ گیا۔ حالانکہ یہی جملہ وہ کئی بار رنجنا سے کہہ چکا تھا۔ اور رنجنا بھی صرف اس سے مذاق کے موڈ میں ایسی باتیں کہتی تھی۔ طنز سے نہیں۔ کیوں کہ رنجنا ان عورتوں میں سے تھی جنھیں طوائفیت کا چسکا لگ جاتا ہے۔ اس زندگی میں دھکیلنے پر وہ اس کی شاکی نہیں تھی۔ اس کے لہجے میں طنز بالکل نہیں ہوتا تھا۔ لیکن آج جانے کیوں رنجنا کا یہ جملہ اس کے دل میں چبھ سا گیا... وہ تیزی سے اٹھ گیا "اچھا چلیں، رجنی!..."

جاتے ہوئے وہ باورچی خانے کے پاس کچھ دیر ٹھٹکے۔ قصداً۔ اس کی بیوی کو

اذیت دینے میں دونوں کو برابر لطف آتا تھا۔ اس کی بیوی نے پلکیں جھپکا کر نظریں نیچی کر لیں اور بہت دیر تک، بمشکل وہ یونہی نظریں جھکائے رہی، لیکن وہ خود بخود ان کی طرف اٹھ گئیں۔ رنجنا اس کے اور بھی قریب کھسک آئی اور اس نے مسکراتے ہوئے کنکھیوں سے رنجنا کی طرف دیکھا۔ اس کی بیوی چلائی "توبہ کس جانور سے پالا پڑا ہے۔ ترکاری تک ٹھیک سے چن نہیں سکتا۔" اور اس نے ترکاری کی رکابی کو زور سے ٹھوکر لگائی۔ رکابی دور جا پڑی اور چنی ہوئی ترکاری ساری رسوئی میں بکھر گئی۔ نوکر حیران اور سہمی ہوئی نظروں سے تینوں کو باری باری تکنے لگا۔ غصہ کے اس اُبال کا سبب پہچان کر وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مسکرائے۔ اس کی بیوی نے ان کی معنی خیز نظروں کو دیکھا اس مسکراہٹ کو محسوس کیا اور چپ رہی۔ وہ دونوں باورچی خانے کے اندر آ گئے۔ اس نے مسکرا کر اپنی بیوی سے کہا "بھئی، آج تو، قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ آج رات ہمیں کھانا نہیں ملے گا۔ اچھا بھئی باہر کھا لوں گا۔"

اس کی بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور رنجنا نے سموسوں کی سینی پر نظریں جما کر کہا "بہن، آج مجھے جلدی جانا ہے۔ ورنہ میں تمھارے ہاتھ کے بنے ہوئے مزیدار سموسے کھائے بغیر نہ جاتی....." اس کی بیوی بدستور خاموش رہی۔ البتہ اس کا نچلا ہونٹ اس کے دانتوں میں آ گیا تھا۔ اور تلخی اور کرب سے اس کا منہ ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ اور اس کے چہرے پر حقارت، نفرت اور اندرونی درد و کرب کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ کتنی بدصورت نظر آ رہی ہے وہ اس وقت! اس نے نفرت سے اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹا لیں، اور رنجنا کے چہرے پر جما دیں اور اس نے محسوس کیا رنجنا بھی تو خوبصورت نہیں ہے۔ اس کا دہانہ بھی چوڑا ہے۔ ہونٹ موٹے ہیں اور اوپر کا ہونٹ تو بالکل سپاٹ ہے۔ خموں کے بغیر۔ پھر بھی وہ ہونٹ ہر وقت ایک خوش رنگ لپ اسٹک سے رنگے ہوتے تھے۔ اور ان پر ایک دلکش مسکراہٹ ہمیشہ کھیلتی رہتی تھی اور اس کی بیوی کا چوڑا دہانہ تلخی سے ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ ورنہ دونوں کے خد و خال معمولی تھے، دونوں میں کوئی نمایاں فرق نہ تھا۔ لیکن زندگی کی رنگینی نے

رنجنا کے معمولی چہرے میں دلکشی اور رعنائی پیدا کر دی تھی، اسے تازہ پھول کی سی شگفتگی دی تھی۔ زندگی کی تلخی نے اس کی بیوی کے چہرے کو مرجھا دیا تھا، اس کے معمولی چہرے کو بدصورت بنا دیا تھا۔ اور اس نے سوچا، لیکن اس کی بیوی کے چہرے سے نفرت محسوس کرنے کی اور رنجنا کے چہرے میں دلکشی محسوس کرنے کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ اس کی بیوی اس کی بیوی تھی اور رنجنا اس کی بیوی نہیں تھی۔ داشتہ، ہاں داشتہ کی حیثیت ہی تھی اس کی۔ لیکن داشتہ کس قدر ثقیل لفظ ہے۔ محبوبہ! اور محبوبہ کے لفظ کی لذت کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے وہ رنجنا کی طرف مڑا اور اپنے لہجے میں سارا پیار اور لاڈ بھرتے ہوئے کہا ''تو چلیں، رجنی!''

''جاتی ہوں، بہن، نمستے۔'' وہ دونوں باہر نکل آئے اور اس کی بیوی کی آنکھوں سے پوری طرح اوجھل ہونے سے پہلے رنجنا اس سے بالکل قریب ہو گئی۔ اور اس نے اپنا بازو اس کی کمر میں حمائل کر کے اسے اور قریب کھینچ لیا پھر گھر سے باہر نکلتے ہوئے اس نے اپنا بازو نکال لیا۔

باورچی خانے میں بچھے ہوئے ایک بوریے پر اس کی بیوی دھڑام سے گر پڑی۔ اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس کا سارا جسم سسکیوں سے دہلنے لگا اور نوکر لڑکا، جو نیا نیا آیا تھا حیران کھڑا دیکھ رہا تھا کہ آخر اس کی مالکہ کو اچانک ہو کیا گیا۔ ابھی اس پر رعب گانٹھ رہی تھی اور اتنا بگڑ رہی تھی، اور اب اسی کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے؟

رنجنا راستہ میں چہکتی آ رہی تھی۔ اور وہ اس کے چہکنے سے اس کی دل نشیں مسکراہٹ سے اس کی نظروں کی شوخی، بے باکی، دعوت اور سپردگی سے محظوظ ہوتا ہوا بڑھا جا رہا تھا۔ وہ کچھ ہی دور گئے تھے کہ اچانک اسے اپنا ایک نہایت عزیز دوست دکھائی دیا۔ جس سے وہ بہت مدت سے نہیں مل سکا تھا۔ وہ حیرت آمیز مسرت سے اس کی طرف بڑھا۔ وہ بھی انھیں کی طرف آ رہا تھا۔ دونوں نے مصافحہ کیا۔ ''چلو گھر چلیں''۔ لیکن اس کا دوست وہیں کھڑا باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ وہیں سے جانے لگا تو اس نے متعجب ہو کر کہا ''گھر نہیں چلو گے؟

قریب ہی تو ہے۔ اتنے عرصہ بعد آئے ہو، میں تمھیں نہیں چھوڑوں گا۔"

جب کوئی لڑکی اس کے ساتھ ہوتی تھی، اور اس کے دوست آ جاتے تو وہ کچھ بے اطمینانی اور ناگواری کا اظہار کرتا۔ اور ان کی طرف زیادہ توجہ نہ دیتا تھا۔ آج وہ رنجنا کو چھوڑ کر اس دوست کے ساتھ جانے کو تیار تھا، کیوں کہ وہ اسے بے حد عزیز تھا۔ اور مدت بعد ملا تھا۔ لیکن اس نے دیکھا اس کے دوست کے ہونٹوں پر ایک تحقیر اور طنز بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اس نے کہا "میں تو تمھارے ہی گھر آ رہا تھا۔ لیکن تمھیں شریمتی رنجنا کے ساتھ دیکھ کر سوچا یہیں سے باتیں کر کے چلا جاؤں گا۔ دیکھیے، پھر کبھی آؤں گا موقع ہوا تو۔" اور وہ اس کے کچھ کہنے سے پیشتر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہ وہیں کھڑا رہا۔ ساکت و سامت جیسے اسے کسی سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اس کے اس دوست کی آنکھوں میں جن میں محبت، عقیدت اور جذبہ پرستش ہوتا تھا، آج اجنبیت کیوں تھی۔ اور یہ دوست جو اس کے اخلاق کا اس قدر گرویدہ تھا، آج اس سے ایسے کیوں پیش آیا؟ وہ تو اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اور رنجنا کے بارے میں بھی وہ صرف یہ جانتا تھا کہ وہ غریب گھرانے کی لڑکی ہے اور وہ اسے یہاں وہاں کام دلا کر اس کی مدد کر رہا ہے۔ اسے سب کچھ کیسے معلوم ہوا۔ شاید دوسرے دوستوں نے....

رنجنا نے پوچھا "ابھی تک کیوں کھڑے ہو؟" اور وہ غیر ارادی طور پر آگے بڑھنے لگا۔ کپڑوں کی دکانیں جوں جوں نزدیک آتی جاتی تھیں، رنجنا اور بھی چہک رہی تھی، اس کا اظہارِ محبت نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس کی مسکراہٹ اور بھی دل نشیں ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن وہ بے چین سا ہو گیا تھا۔ یہ مسکراہٹ اس پر اثر نہیں کر رہی تھی کیوں کہ پھر اسی احساس نے جو ایک عرصے سے ابھر کر اسے ستایا کرتا تھا، جسے وہ ٹالنا چاہتا تھا اور جو آج نہایت واضح ہو گیا تھا، اور بھی شدت کے ساتھ اس کے دل اور ذہن کو جیسے شکنجے میں کس لیا... اس نے سب کچھ کھو دیا تھا۔ اپنے دوستوں کی محبت، اپنی بے پناہ مقبولیت، اپنی پوزیشن... اس کا آرٹ گر چکا تھا اور وہ بلندیوں پر سے گر چکا تھا....

●●●

وجدان کی پرواز — بیاتریچے

''اٹھو کھانا کھالو، بھوک لگ رہی ہوگی تمھیں۔ آج کتنا تھک کر آئے تھے۔'' اس کی بیوی آہستہ آہستہ اس کا شانہ ہلا رہی تھی۔ اس نے کسمسا کر کروٹ بدلی۔ وہ سویا نہ تھا۔ یونہی آنکھیں بند کیے لیٹ رہا تھا اور ابھی اٹھنا نہ چاہتا تھا۔ اس کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ ایک میٹھے تصور نے اس پر غنودگی سی طاری کر دی تھی اور وہ یونہی آنکھیں بند کیے بستر کی گرم نرمی محسوس کرتا اس میٹھے تصور میں کھویا رہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی بیوی کے اس محبت بھرے نرم لہجے نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

وہ ہاتھ منہ دھو رہا تھا اور اس کی بیوی میز پر کھانا لگا رہی تھی اور وہ یونہی بے مقصد اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ لانبے قد کی دبلی سی عورت اس کا کاسنی دوپٹہ شانوں سے لٹک رہا تھا۔ وہ بڑی پھرتی سے چیزیں لا رہی تھی، اور قرینے سے میز پر لگا رہی تھی۔

''اوہو، کتنی چیزیں تیار کر لی ہیں تم نے آج اور انڈے کا حلوہ بھی واہ!...'' وہ خوش ہو کر کھانے پر بیٹھ گیا۔

''تمھیں پسند ہے اس لیے سوچا آج پکاؤں...''

''اور اتنی بہت سی لذیز چیزیں...؟'' وہ اپنی تعریف سن کر شرما گئی۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، اس کی کالی گہری جڑی ہوئی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے چمک آ گئی۔ پھر غائب ہو گئی اور اس کی جگہ ترس نے لے لی۔ اس کی بیوی سب چیزیں نہایت محبت سے

اصرار کر کے کھلا رہی تھی اور وہ رحم اور شفقت اور ترس بھری نظروں سے اسے دیکھتا۔

''کتنی گرمی ہے۔'' اس نے اپنے شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔ اس کی بیوی چپکے سے اٹھ کر ساری کھڑکیاں کھول اس کے پاس آ بیٹھی۔ ہوا اپنے ساتھ سمندر کی ٹھنڈک لے آئی۔ وہ کھانے میں محو تھا۔ اسے یوں کھاتے دیکھ کر وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ اس کی نظریں اس کے کالے، گھنے چمکتے ہوئے بالوں پر پڑیں، پھر جھکی ہوئی آنکھوں پر، پھر شانوں پر، پھر کشادہ سینے پر جم کر رہ گئیں۔ اس کی سفید شرٹ کے کالر تیز ہوا میں اس کے سینے پر پھٹ پھٹا رہے تھے، اور اس کا سینہ کھلا تھا۔ اس کی بیوی کی نظریں اس تندرست چوڑے بالوں بھرے سینے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ ان نظروں میں فخر اور غرور تھا، تحسین تھی، محبت تھی، اس کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے اوپر اٹھیں، پھر جھک گئیں۔ ندامت کی ایک لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی....

اس کی بیوی کی نظروں سے نظریں ملانے کی وہ اپنے آپ میں ہمت کر نہیں پا رہا تھا۔ وہ ان نظروں کا جواب شفقت سے دے سکتا تھا، محبت سے نہیں۔ اور اسے ندامت محسوس ہو رہی تھی، کتنی محبت، کتنے غرور سے وہ تکے جا رہی ہے۔ اس کا سینہ! اس سے بے خبر کہ اس سینے کے پیچھے جو دل ہے وہ اب اس کے لیے نہیں دھڑکا کرتا۔

کھانا کھا چکنے کے بعد اس کی بیوی نے کرسیاں کھینچ کر دریچے کے قریب ڈال دیں۔ چاند ابھی نہیں نکلا تھا۔ اور سمندر تاریکی میں لپٹا ہوا مہیب معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن خوش گوار ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ان کے جوان چہروں پر ہلکے ہلکے تھپیڑے مار رہے تھے۔ اور وہ مسرور ہو کر باتیں کیے جا رہی تھی لیکن وہ جیسے غائب سا، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ اس کی باتیں توجہ سے سن رہا ہے کبھی کبھی وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا کرتا، بہت دیر تک وہ یونہی بیٹھے رہے۔ پھر اس نے مڑ کر اپنی بیوی سے کہا ''بہت تھک گئی ہو گی تم آج، جا کر سو جاؤ سلمیٰ!''

''ہاں نیند آ رہی ہے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور خواب گاہ کی طرف جانے لگی۔ پھر کچھ دور جا کر وہ مڑی اور پلکوں کی اوٹ سے شوخ نظریں اس کی طرف پھینکتے ہوئے بولی

''تم نہیں آ ؤ گے کیا؟''

اس نے دیکھا اس کی بیوی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر شفقت بھرے لہجے میں بولا ''نہیں سلمیٰ، تم سو جاؤ مجھے اپنی تازہ تصویر پر کچھ کام کرنا ہے۔'' اس کی بیوی کے چہرے کی سرخی غائب ہو گئی۔ اور وہ اُداس سر جھکائے آہستہ آہستہ چلی گئی۔ اسے یوں سر جھکائے جاتا دیکھ کر، اس کا دل رنج سے بھر آیا۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔

''مجھے کیا ہو گیا ہے؟ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ وہ مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے اور میں... میں اچھا سلوک کر تو رہا ہوں۔ لیکن کیا وہ میرے پیار میں گرمی کی کمی محسوس نہ کرتی ہو گی؟ میں بھی کتنا... آخر وہ میری جیون ساتھی ہے۔'' وہ اپنی اسٹڈی کی بجائے خواب گاہ کی طرف مڑ گیا۔ دروازے میں رک کر اس نے دیکھا۔ اس کی بیوی سوئی نہ تھی۔ تکیہ کا سہارا لیے بستر پر بیٹھی، کھوئی کھوئی نگاہوں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے خوف نے اسے جکڑ لیا۔ کیا وہ جان گئی ہے؟ اور اس نے نہایت نرم میٹھے لہجے میں کہا ''لو میں آ گیا ہوں سلمیٰ! تم سوئی نہیں اب تک؟''

اس میٹھے جملے کے سہارے چہرے کی ساری اداسی دور ہو گئی۔ جھکی ہوئی نظریں آہستہ سے اوپر اٹھیں ''جی، نہیں۔''

وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا ''لو اب سو جاؤ۔'' اسے نہ سوتا دیکھ کر وہ لیٹ گیا۔ وہ بھی لیٹ گئی۔ ہاتھ اور بڑھا کر وہ اس کا بازو آہستہ آہستہ نرمی سے سہلانے لگا۔ اور وہ سو گئی۔ وہ اٹھ کر غور سے دیکھنے لگا، اسے اچھی نیند آ گئی ہے؟ ہاں وہ بڑی گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی لٹیں اس کی پیشانی پر بکھر گئی تھیں۔ کھڑکی کے شیشے سے چھن کر آتی ہوئی، دودھیا چاندنی میں اس کا سانولا چہرہ معصوم، پرسکون نظر آ رہا تھا۔ بلینکٹ اس کے پاؤں پر پڑی ہوئی تھی۔ اس نے نہایت آہستگی سے بلینکٹ اس کی گردن تک کھینچ کر اڑھا دی۔ اور باہر نکل آیا۔

تو آج کا دن بھی گزر گیا۔ اسی سکون سے۔ اس کی زندگی میں سکون تھا، آرام تھا۔ خوشگوار جگہ اس کا گھر تھا۔ سمندر کے کنارے۔ سمندر کا کنارا اور خوبصورت سینری۔ لیکن وہ نیچرل سینری اور لینڈ اسکیپ کی تصویریں بہت کم بنایا کرتا تھا۔ اس کے آرٹ کا موضوع 'انسان' تھا۔ اور وہ ایک مفلوک الحال آرٹسٹ نہیں تھا۔ آرٹ صرف اس کے شوق کی چیز تھی۔ وہ کافی اچھے کام پر تھا، اچھا کماتا تھا۔ اور گھر پر صرف وہ اور اس کی بیوی۔ اس کی بیوی اسے چاہتی تھی۔ اسے ہر طرح کا آرام دیا کرتی تھی۔ ہاں، زندگی میں اسے سکون، آرام اور اطمینان میسر تھا۔ لیکن اس کی روح کیوں اس قدر بے چین تھی، کیوں، کیوں، کیوں؟ شاید یہ سکون، یہ ٹھنڈک اسے پسند نہ تھی۔ وہ جوشیلا نوجوان تھا۔ اس کی سرشت میں بلا کی حدت اور بے قراری سمائی ہوئی تھی اور یہ سرشت طوفان کی بے قراری چاہتی تھی۔ آگ کی جلا دینے والی گرمی چاہتی تھی....

اوہ! وہ خیالوں میں اس قدر غرق رہا تھا کہ اسے پتہ بھی نہ لگا وہ اپنی اسٹڈی میں پہنچ گیا ہے۔ میز پر اس کی تازہ تصویر رکھی تھی۔ کس نے نکالی؟ وہ چونک پڑا۔ شاید اس کی بیوی نے نکال کر دیکھی تھی۔ اور پھر اسے خوف نے جکڑ لیا... کیا وہ جان گئی ہوگی... کہ اس میں اس کی اپنی محبت کی تڑپ اور بے بسی کھینچی ہے۔ نہیں، وہ کیا جانے غریب عورت! اس کی تصویروں کی روح کو پہچاننا تو کیا، وہ ٹھیک طرح سے ان کا ظاہر بھی نہیں پہچان سکتی۔ پرسوں ایک تصویر بنانے پر اس نے کہا تھا ''ہاں اچھی تو ہے، لیکن یہاں رنگ کتنا ہلکا ہے، کچھ گاڑھا کر دیا ہوتا۔'' اور وہ مسکرا کر چپ ہو گیا تھا....

لیکن شہناز؟ شہناز! شہناز! اس کے ہونٹوں نے کئی بار ہلکے سے یہ نام دہرایا۔ اس کے سازِ ہستی کا ہر تار جھنجھنا اٹھا، اس کے سارے وجود میں آگ لگ گئی، اس کی ساری کائنات تڑپ اٹھی۔ شہناز تو اس کی تصویروں کو خود اس کی نظروں میں اور بھی زیادہ حسین بنا کر رکھ دیتی تھی۔ شہناز جس نے اس کی زندگی میں آ کر اس کا چین اجاڑ دیا تھا۔ وہ اچانک اس کی زندگی کے افق پر نمودار ہوئی اور اس کے خیالوں پر، اس کے تصورات پر، اس

کے آرٹ پر، اس کی کائنات پر چھاتی چلی گئی۔ وہ اب اس کے آرٹ سے کچھ اس طرح وابستہ ہوگئی تھی کہ شہناز کے بغیر وہ اپنے آرٹ کا تصور ہی نہ کر سکتا تھا۔ شہناز کا تصور اور اس کی یاد، اور وجدان کی رو اسے کہیں کا کہیں بہا لے جاتی۔ اور خوبصورت تصویریں بنتی جاتیں، بنتی جاتیں... اس نے تازہ تصویر ہاتھ میں لے لی۔ اس میں تو اس نے اپنی روح اور دل کی تڑپ، جلن، بے چینی، اپنی محبت کی محرومی، بے بسی حلول کر کے رکھ دی تھی۔ یہ تصویر اس کا شاہکار ہوگی۔ اس کی مایوس نگاہیں خلا میں کھو گئیں... نہیں، اس کی زندگی میں آئی کہاں تھی شہناز؟ شہناز تو اس کے لیے صرف ایک شیریں خیال تھی، ایک میٹھا تصور، ایک تڑپا دینے والی یاد!

اور شہناز کی خاطر اس نے اس راز کو اپنے سینے میں دفن کر لیا تھا۔ اور یہ راز اس کے سینے میں انگارہ بن کر دہک رہا تھا....

اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اتنی کہ وہ بے چین ہو کر کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہوا۔ چاندنی اپنے پورے جوبن پر تھی — دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔ اور خنکی سے بوجھل ہوا کے سرد اور تیز جھونکے اس کے چہرے کو، اس کے ہاتھوں کو، اس کے سینے کو خنکی میں دھو رہے تھے، لیکن اس کے سینے کی آگ کو سرد نہ کر سکتے تھے....

ناریل کے درختوں کے پیچھے سے چاند آہستہ آہستہ ابھر آیا۔ پورا چاند! چاند کتنا دلکش تھا لیکن کتنا دور! شہناز بھی تو چاند ہے، اور اس کی دسترس سے اتنی ہی دور!... اس وقت وہ کیا کر رہی ہوگی جب کہ وہ اس کی یاد میں ڈوبا ہوا ہے۔ ممکن ہے وہ سو رہی ہو۔ اس کے شوہر کے بازو اس کے گرد حلقہ کیے ہوئے۔ رقابت کا ایک تیز جذبہ خنجر کی دھار کی طرح اس کے دل کو چیر گیا۔ لیکن صرف ایک لمحے کے لیے۔ اوہ! میں کیوں اتنا گرا جا رہا ہوں۔ یہ کتنا گرا ہوا جذبہ ہے۔ شہناز اس کے شوہر کی ہے جو اس سے بے حد محبت کرتا ہے... اور... اور شہناز بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ ان دونوں کی محبت سے مجھے خوش ہونا چاہیے۔ ہاں میں

خوش ہوں، میں خوش ہوں، میں خوش ہوں۔ وہ اپنے دل کو سمجھانے لگا۔ ان کی محبت سے مجھے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ رقابت؟ میری محبت ان سب باتوں سے، بہت بلند رہے گی۔

وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آیا۔ کمرے کی دیواروں پر اس کی بنائی ہوئی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ تصویروں پر باری باری اس کی نظریں رکی رہیں۔ اس کی پہلی تصویریں کتنی پھیکی نظر آتی تھیں۔ اس کی تازہ تصویروں کے سامنے۔ ان میں رنگوں کی خوبصورت آمیزش تھی، نفاست تھی، آرٹسٹ کا خلوص بھی تھا، سب کچھ تھا۔ پھر بھی ان میں وہ بات نہ تھی۔ ان تصویروں میں اس کی روح ہے، حسن ہے، درد ہے، بلندی ہے....

ہاں ہاں، شہناز اس سے دور ہے، ہمیشہ دور رہے گی۔ لیکن اس دوری نے، اس روحانی کشش نے، اس کی محبت کو پرستش میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس دوری نے اس کی محبت کو سونا بنا دیا ہے۔ اور اس پاکیزہ لیکن جلانے والی محبت کی تپش اس کے آرٹ کو جلا دے دے گی۔ اس کے آرٹ کو غیر فانی بنا دے گی....

●●●

اوتھیلو
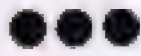
وہ کار میں وہیل کے سامنے بیٹھا غصّے سے تلملا رہا تھا۔ وہ ابھی نہیں آئی۔ اس کا میک اپ کہاں ختم ہوگا۔ کولڈ کریم اور فاؤنڈیشن کریم اور پاؤڈر اور لپ سٹک اور روژ اور مسکرا اور کیوٹکس۔ بال بنانا، بھویں اکھیڑنا، پلکیں سنوارنا، توبہ کس قدر نفرت انگیز! لیکن جانے کیوں وہ اتنا بے بس تھا۔ اس کی گرفت میں قیدی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ کار کا دروازہ کھلا اور وہ اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ سرمئی زرتار ساڑی کی اور دو چھوٹی چھوٹی موٹی چوٹیوں کی جو گھنگریالے بالوں کے خوبصورت گچھوں پر ختم ہوتی تھیں، ایک جھلک اسے دکھائی دی۔ اس ساڑی میں اور اس میک اپ کے ساتھ وہ غضب کی حسین لگ رہی ہوگی۔ لیکن اس نے آنکھیں پھیر کر اسے دیکھا بھی نہیں۔ آخر یہ بناؤ سنگار اس نے اس کے لئے تو نہیں کیا تھا۔ اس نے کار اسٹارٹ کر دی۔

وہ دونوں بالکل خاموش تھے اور کار چلی جا رہی تھی۔ تین سال پہلے وہ اسی طرح پہلو بہ پہلو بیٹھے اسی کار میں گھوما کرتے تھے۔ وہ پانچ مہینے! انکی شادی سے پہلے دو مہینے اور شادی کے بعد کے تین مہینے..... وہ شامیں کتنی رنگین ہوتی تھیں، رنگین اور پر کیف ایک دوسرے کے قریب پہلو بہ پہلو کار کی رفتار سے خوشگوار ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے سرور حاصل کر کے محبت بھری نگاہوں کا تبادلہ کرتے، ان کے دل دھڑک رہے ہوتے، ایک دوسرے کی قربت سے ان پر نشہ سا چھایا ہوتا۔ لیکن اب وہ اس طرح قریب بیٹھے رہ کر بھی ایک

دوسرے سے کتنے دور تھے۔ ان کے دلوں میں اجنبیت اور دوری کا ایک شدید احساس تھا۔ اور وہ ایک دوسرے کی موجودگی سے بے پروا، ایک دوسرے کے وجود کو فراموش کرتے ہوئے بڑھے جا رہے تھے۔ ایک ہی کار میں، لیکن ان کی منزلیں جدا جدا تھیں۔ وہ اپنے دوست کے گھر جا رہی تھی، اور وہ اپنی دوست سے ملنے! ''اب ٹائم کیا ہے ڈارلنگ؟ میں گھڑی بھول آئی ہوں۔ آنند نے کہا تھا ٹھیک پانچ بجے پہنچ جانا''۔ پانچ میں ابھی پندرہ منٹ ہیں۔'' اس نے رکھائی سے جواب دیا۔ اس کے لبوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ڈارلنگ! ہونہہ! یہ لفظ کیوں اٹک کر رہ گیا ہے۔ اس کو بھی کیوں نہ کاٹ کر پھینک دیا جائے..... ''تمہیں بھی سنیہ لتا نے چائے پر بلایا ہے کیا؟''

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ''نہیں، ہم دونوں ہوٹل میں چائے پییں گے۔ اور پھر سنیما جائیں گے۔''

''اوہ!'' اس نے بے پروائی سے کہا اور مڑ کر باہر دیکھنے لگی۔ جب سے وہ آ بیٹھی تھی۔ موہن نے اسے ایک نظر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے دیکھے، اس کے حسن کی ہوش ربا کیفیت کو دیکھ کر یہ اندازہ لگائے کہ کس طرح اسے دیکھ کر آنند کے حواس باختہ ہو جائیں گے۔ یہ اندازہ لگائے اور کڑھے۔

''موہن ڈارلنگ! وہ دیکھو''۔ اس نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

''کیا ہے؟'' وہ بدستور سامنے کی طرف نظریں جمائے ہوئے بولا۔

''نہیں، کچھ نہیں''۔

اور پھر وہی خاموشی!.....

موہن بھی رنگیلا نوجوان تھا۔ وہ متمول تھا اور شادی سے پہلے اپنی دولت سے خوب کیف اٹھایا تھا۔ بہت سی حسین لڑکیوں کے ساتھ اس نے کھیلا تھا۔ لیکن جب اس نے نلینی کو دیکھا۔ اس بھڑکیلی لڑکی کو جو ہر جگہ شمع محفل بن جاتی تھی۔ ان گنت جوان اس کے گرد پروانوں کی طرح منڈلاتے رہتے وہ اپنے شعلہ بداماں حسن، اپنی عشوہ طرازیوں اور اپنی

ذہانت کی مقناطیسیت سے سب کو اپنی طرف کھینچ لیتی، لیکن خود اڑ جاتی، کسی کے ہاتھ نہ آتی۔ اور اس نے محسوس کیا، وہ اس چنچل دوشیزہ کو جسے پانے کے لئے سب بے تاب ہیں، لیکن جسے کوئی بھی نہیں پا سکتا، حاصل کرنے میں اپنا سب کچھ بازی لگا دے گا۔ اور اس نے نلینی کو پا لیا۔ اور جب اس نے اپنی شادی کی شام سب کو اپنی خوش قسمتی پر رشک کرتے دیکھا، اپنے دوستوں کو آنکھوں میں رشک لئے، اور نلینی کے عاشقوں کو بجھے ہوئے چہروں سے مبارکباد کہتے دیکھا تو اس کا سینہ غرور سے پھول گیا۔ اور اس نے محسوس کیا وہ دنیا کا کامیاب ترین اور خوش قسمت ترین انسان ہے۔

اور پھر شادی کے بعد وہ تین چار مہینے ایک کیف آور، سرور آگیں خواب کی طرح گذر گئے۔ وہ اپنی ساری عشوہ طرازیاں اس پر صرف کر دیتی۔ مختلف قسم کے بناؤ سنگار اور لباس کے ساتھ وہ ہر دفعہ ایک نئے حسن کے ساتھ ایک نئی لڑکی بن کر آتی۔ اور اس کے ہوش و حواس پر بجلیاں گرا دیتی۔ وہ اپنی محبت کا اظہار نئے نئے انداز میں کرتی۔ اور اسے محسوس ہوتا۔ وہ نلینی سے کبھی نہیں تھکے گا، وہ اپنے تنوع کے ساتھ ہمیشہ اس کے لئے تازہ اور شگفتہ رہے گی۔ اور وہ سوچتا وہ بے وقوف تھا جو اتنی لڑکیوں کے پیچھے پھرا کرتا تھا۔ اب اسے منزل مل گئی ہے۔ وہ اب کبھی نہیں بھٹکے گا نلینی سے محبت کرنے میں ایک کیف ہے، ایک میٹھا سرور۔ اب وہ آگ تو نہیں جو وہ دوسری لڑکیوں کے لئے اور خود نلینی کے لئے پہلے پہلے محسوس کرتا تھا۔ لیکن ایک نرم سا میٹھا سا سرور جو اسے مدہوش کئے دیتا تھا۔ اس عورت کو پیار کرنے میں جو اس کی اپنی تھی۔ ایک الگ ہی قسم کی ایک نئی قسم کی مسرت تھی۔ اب وہ بد عنوانیوں کی طرف کبھی نہیں بھٹکے گا۔

اس کی زندگی خوشگوار اور تندرست و توانا ہو گی۔ ایک گھر، مثالی بیوی، اور بچے، خوبصورت، ذہین مہذب بچے! وہ بے حد خوش تھا......

وہ غرور سے اسے ساتھ ساتھ لئے پھرتا۔ گھر میں خوب پارٹیاں دیتا تاکہ لوگ اس نایاب ہیرے کو اس کے پہلو میں جگمگاتے دیکھ کر رشک کریں اور جب وہ اس کی بیوی کی

تعریف کرتے، اور تحسین آفریں نگاہیں ادھر اٹھتیں تو غرور سے اس کا سینہ پھول جاتا۔ لیکن جب وہ تحسین بھری نگاہیں بے باک ہوتی گئیں اور تعریف اس کے سامنے ہونے کے بجائے اس کی بیوی ہی سے ہلکی سی سرگوشیوں میں ہونے لگی۔ اور اس نے دیکھا ان ہلکی سرگوشیوں اور بے باک نگاہوں کی چمک سے اس کی بیوی کی آنکھوں میں بھی چمک آجاتی ہے اور اس کے چہرے پر گلابی رنگ کی چھوٹ ہوتی ہے تو وہ حسد کی جلن سے تڑپنے لگا۔ اس نے پارٹیاں بند کردیں۔ لیکن وہ اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی خود ہی چلی جاتی۔ اس کے کئی دوست بن چکے تھے۔ وہ حسد اور رقابت کی آگ میں تڑپتا رہا۔ لیکن اس نے بیوی پر کھل کر کبھی اس کا اظہار نہ کیا۔ اس کا اظہار کرتے اسے شرم آتی تھی۔ وہ محسوس کرتا اپنی بیوی کے سامنے اس کا اظہار کرنا خود اس کی توہین ہے۔ اس نے سختی کرنی شروع کی۔ لیکن نلینی نے اس کی بھی پرواہ نہ کی۔

نلینی کے دوستوں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ اب وہ اس کی بالکل پرواہ نہیں کرتی تھی۔ اس کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتی تھی۔ اس نے کئی دفعہ چاہا نلینی کو چھوڑ دے۔ سول میرج ہی تو تھی۔ لیکن کورٹس، بدنامی، بے عزتی اتنا بڑا اسکینڈل، اپنی پوزیشن کو اتنا بڑا دھکا۔ او خدایا، وہ بے بس تھا۔ اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی ظالم گرفت میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اور شکنجے کی گرفت سخت ہوتی جارہی تھی۔ اس نے ایک بے ترتیب طوفانی زندگی کے بعد سکون چاہا تھا۔ ایک پر سکون زندگی، گھر، محبت کرنے والی بیوی، بچے۔ اور اب؟ وہ گھر ہی کیسا جس سے اس کی بیوی ہی اکثر باہر رہا کرتی ہو۔ اور بچے؟ خوبصورت اور ذہین اور مہذب بچے؟ وہ شاید اس کی قسمت میں تھے ہی نہیں اسے نلینی کی سطحی زندگی سے نفرت ہوگئی تھی۔ اس کی زندگی ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی اور اس زندگی سے بھاگنے کے لئے وہ پھر گندگی میں گر گیا۔ لڑکیاں اور شراب۔ لیکن اسے یہاں بھی پناہ نہیں ملی۔ اسے گناہ میں اب وہ کیف نہ ملتا تھا، جیسا شادی سے پہلے نئے نئے اندازوں میں ملتا تھا بلکہ صرف ایک نہایت عارضی لذت اور پھر اس کے بعد زندگی کی بے مزگی کا، زندگی سے بیزاری کا،

نفرت کا احساس پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ اسے آدبوچتا۔ اپنی طبیعت کے میلان سے نہیں محض اپنی بیوی سے انتقام لینے کے لئے وہ لڑکیوں کے پاس جاتا رہا۔ لیکن نلینی اس کی بھی پرواہ کرتی نظر نہ آتی تھی۔ اس کی بے پروائی کے احساس سے وہ اور بھی کڑھتا۔ اسے اس خیال سے کبھی بھی تسکین نہیں ہوئی کہ وہ اور مردوں کے ساتھ جاتی ہے تو جانے دو میں بھی تو دوسری لڑکیوں کے ساتھ....

اب ان دونوں میں برائے نام تعلقات رہ گئے تھے۔ وہ ایک چھت کے نیچے رہتے تھے اور بس۔ دونوں کو ایک دوسرے کے متعلق اب اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ سب کچھ علانیہ کیا کرتے تھے۔ بلکہ وہ کئی دفعہ ایک ساتھ، ایک ہی کار میں اپنے اپنے محبوبوں کے پاس جاتے تھے....

اس نے نلینی کو جوش اور مسرت سے ویو آرٹ کرتے دیکھا تو باہر نظر دوڑائی۔ آنند کچھ دور پر کھڑا تھا۔ شاید وہ اس کا انتظار کرتے کرتے یہاں نکل آیا تھا۔

''کار یہیں روک لو ڈارلنگ! میں یہیں سے چلی جاؤں گی''۔ اس نے مشینی انداز میں، کچھ کہے بغیر، بریکیں لگا دیں۔ نلینی نے اترتے ہوئے کہا ''شکریہ'' اور تقریباً بھاگتی ہوئی آنند کے پاس چلی گئی۔ وہ ادھر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس کی نظریں خود بخود ادھر اٹھ گئیں۔ آنند سے ملتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اور وہ پوچھ رہی تھی....

''تم یہاں کیوں چلے آئے، کیوں میں نے بہت دیر کر دی کیا!''۔ ''نہیں بالکل ٹھیک وقت پر آ رہی ہو۔ میں کیوں چلا آیا؟.....

اور آنند آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس پر جھک گیا ''تمہیں دیکھنے کی بے تابی جو تھی!'' اور اچانک اس کی نظریں کار کی طرف چلی گئیں۔ وہ چونکا اور شرمندہ ہو گیا ''اوہ! موہن!'' نلینی نے بھی ادھر دیکھا۔ پھر ایک جھٹکے سے منہ موڑ لیا گویا کہہ رہی ہو۔ ''ہونہہ! دیکھے تو دیکھے ہمیں کیا!''

اسی لمحے اس نے کار اسٹارٹ کر دی۔ اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا گیا تھا۔ شاید ساری عمر یہ درد اسے نہ چھوڑے گا۔ اس سے اسے اپنے گرد و پیش کا بالکل احساس نہیں تھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا وہ کہاں جا رہا ہے۔ صرف کار اسے بڑھائے لئے جا رہی تھی۔ اس نے اپنے ذہن پر زور ڈال کر سوچا۔ وہ کہاں جا رہا ہے آخر؟ اور دماغ کے کونے میں کہیں ایک نام ابھرا۔ اوہ! سنیہہ لتا، اس کی نئی دوست؟ سنیما کا پروگرام تھا۔ لیکن وہ سنیہہ لتا کے ساتھ سنیما جا کر کیا کرے گا۔ لتا اس کے پاس بیٹھی اسے لبھانے کی کوشش کر رہی ہوگی۔ لیکن وہ اس کا ہاتھ پکڑے بے بس کھویا ہوا بیٹھا رہے گا......... اوہ! زندگی میں کوئی خوشی نہیں، کوئی خوشی نہیں.........

●●●

میگھ ملہار

- نیل کمل
- سرسوتی
- آرفیوس، یوریڈیس
- آرفیوس، نارسائس/شیریں فرہاد

نیل کمل

یہ نیل کمل ہیں، یہ نیل کم ہیں۔
کتنے سندر ہیں یہ، یہ پاؤں، یہ بالکل وہی ہیں، یہ بالکل وہی ہیں۔
جیسے اس مکمل حسین چاندنی میں دیوی کے سندر کنول جیسے پاؤں۔
یہ وہی ہیں، یہ وہی ہیں، یہ نیل کمل۔
اف، کتنا سکون ہے، کتنا سکون ہے ان میں!
ان چرنوں کی مٹی اپنی آنکھوں پر مل لوں تو ان میں ٹھنڈک آ جائے۔
ان چرنوں میں تو میں اپنا سارا جیون بتادوں!
یہ نیل کمل ہیں اور آپ دیوی ہیں، وہی سندر دیوی!
ہاں آپ وہی ہیں۔
وہی دیوی جو اس مکمل، حسین چاندنی میں میری ستار کی لے پر ناچ اٹھی تھی!
کتنی گہری پرسکون، سحر زدہ رات تھی وہ!
اور وہ چاندنی کتنی مکمل، کتنی حسین، کتنی مسحور کن!

ساری کائنات اس چاندنی کے سحر میں لپٹی ہوئی تھی، اور ستار کی مدھر تانیں اس پرسکون فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیتی تھیں، اور ایک عجیب محویت کے عالم میں میری انگلیاں ستار کے تاروں کو چھیڑ رہی تھیں۔

ان تاروں سے ایک نغمہ پھوٹا، مچلا، تڑپا۔

کہیں دور سے پائل کی کھنک سنائی دی، یہ پائل کی کھنک قریب آنے لگی، اور قریب۔

جھن جھن جھن جھن پائل باجے
جھن جھن جھن جھن...

ایک پرچھائیں نظر آئی۔

اور پھر دو پاؤں۔ صرف پاؤں۔ اتنے پیارے، اتنے سندر، اتنے پاکیزہ اور شفاف، جیسے تازہ کھلے ہوئے، جھیل میں نہائے کنول! نیل کنول!

پائل بج اٹھی، وہ پاؤں آہستہ آہستہ تال دینے لگے۔

وہ پرچھائیں اپنے پورے روپ میں نمودار ہو گئی۔ بہت ہی سندر، لانبے بال کھولے جو گھٹنوں تک لہرا رہے تھے، منور چہرہ، گول اور بیضوی کا امتزاج، گول ٹھوڑی میں ننھا سا گڑھا، بھرے بھرے رخسار، گہری نیلی آنکھیں، چاندی سی پیشانی پر دمکتا ہوا ٹیکہ اور سر کے گرد ایک عجیب سی، پراسرار روشنی کا ہالہ۔

نیلی ساری میں لپٹا ہوا متناسب جسم۔

نازک کلائیوں پر موتیا کے گجرے، موتیا کی لڑیوں میں لپٹی ہوئی باہیں۔

موتیا کی لڑیوں میں لپٹی ہوئی باہوں کا لہراؤ، بدن کے ہر ہر عضو میں بلا کی لچک...

وہ چپنگ ہے روپ میں کہ بجلی لہرائے
وہ رس آواز میں کہ امرت للچائے
رفتار میں وہ لچک پون، رس بل کھائے
گیسو میں وہ لٹک کہ بادل منڈلائے
آ آ کے راگنی کھڑی ہوتی ہے
دیکھے کوئی سجل بدن کا یہ رچاؤ

ہر خط بدن کی لو میں مدھم جھنکار
یہ شعلۂ حسن جیسے بجتا ہو ستار *

اُف وہ روپ!

میں ایک عالم دیوانگی میں اپنی ستار بجائے جا رہا تھا، بالکل کھویا ہوا۔ وہ مست ناچے جا رہی تھی۔

نہیں معلوم وہ کب تک ناچتی رہی اور میں کب تک بے خبر، خواب کے سے عالم میں ستار بجاتا رہا۔ مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی، جیسے میں کسی سحر کے زیر اثر تھا۔

اچانک وہ سحر ٹوٹ گیا۔

وہ روپ ایک پرچھائیں، ایک سلہوت میں تبدیل ہو گیا لیکن پرچھائیں بنتے بنتے روشنی کے ایک چھوٹے سے دائرے میں وہ دو حسین پاؤں پھر نظر آئے۔

بالکل یہی پاؤں، ایسے ہی سندر، نیل کنول۔

وہ نیل کمل تھم گئے، پائل کی چھم چھم تھم گئی۔

وہ پرچھائیں آہستہ آہستہ غائب ہو گئی۔

آنکھیں بند کر کے میں نے اپنے سر کو ایک زور کا جھٹکا دیا۔ اور اپنے آپ کو اس سحر سے آزاد پا کر اپنے آس پاس دیکھا۔

صبح صادق کی سپیدی نمودار ہو چکی تھی۔

ستار میرے ہاتھوں سے گر چکی تھی۔ اس کے تار ٹوٹ گئے تھے۔ میری انگلیاں زخمی ہو گئی تھیں۔ ان سے خون رس رہا تھا۔

اور پھر وہ روپ کبھی نظر نہ آیا۔

چاندنی راتوں میں اپنی ستار لیے میں دیوانہ وار باہر نکل جاتا اور اسی محویت سے، اسی جنون کے عالم میں اپنی ستار بجائے جاتا....

---

* 'روپ' از فراق گورکھپوری

کھماج، ایمن کلیان، تلک کاموو، نیلامبری۔

للت، جے جے ونتی۔

بسنت بہار، میگھ ملہار۔

راگ بجتے رہے، گیت پھوٹتے رہے۔

میری انگلیوں سے خون رستا رہا۔

میرے جذبات واحساسات کی گہرائی ان نغموں میں حلول ہوتی رہی، میری روح میری ستار کی تاروں میں تحلیل ہوگئی۔

لیکن وہ ایک دفعہ نمودار ہوکر، پھر کبھی نظر نہیں آئی۔

پھر کبھی نہیں۔

چاندنی راتیں اماوس کی راتوں میں تحلیل ہوتی رہیں، ان کاجر کاری رینوں سے اندھیرا چھوٹتا رہا، آکاش میں چاندنی اپنا جادو پھیلاتی رہی۔

اور میں اس روپ کو دیوانہ وار ڈھونڈتا رہا.....

یہ پاگل ہوجائے گا، یہ پاگل ہوجائے گا۔

اس سے ستار چھین لو، اس سے ستار چھین لو۔

کئی آوازیں گونجیں۔

اس نے دیوی کا سب سے کامل روپ دیکھا ہے، بھاگیہ وان ہے، بھاگیہ وان۔

یہ سنگیت کی آتما کو چھولے گا۔ دوسری اور سے کسی نے کہا (یہ ہندو پنڈت تھے، سنگیت کے استاد)۔

اس پر کسی کا سایہ ہوگیا ہے، یہ پاگل ہوجائے گا۔

اس سے ستار چھین لو... یہ آوازیں حاوی ہوگئیں۔

اور مجھ سے ستار نہیں،

میری روح چھین لی گئی!

اُتار کے لیے ٹونکا کیا جانے لگا۔ اور اس عمل کے دوران میں، میں نے محسوس کیا، کوئی شے بڑی مضطرب، بڑی بے چین میرے من سے نکلی جا رہی ہے، اسے سخت اذیت پہنچ رہی ہے۔

''یہ ٹونکا بند کر دو''، میں چلا اٹھا، بند کر دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی نہیں بجاؤں گا۔ اور اسی رات میں نے ستار ڈھونڈ نکالی۔ اور اسے لیے چپکے سے باہر نکل گیا۔

وہ رات بھی اتنی ہی گہری، اتنی ہی سحر زدہ تھی۔

پونم کے چاند کی شیتل کرنوں میں ساری کائنات نہائی ہوئی تھی۔ وہی سپنوں کا سا جادو تھا، وہی آنند، وہی شانتی!

اور میں ستار لیے اپنے تنہا گوشے میں بیٹھ گیا۔ ستار کو آخری مرتبہ چھیڑنے کے لیے میری انگلیاں بے قرار ہو اٹھیں۔ میں نے آخری گیت چھیڑا، اس میں اپنے من کی ساری نراشا، سارا دکھ درد سمو دیا۔

پھر میں نے اپنی ستار کو ایک چھوٹے سے ٹیلے پر رکھا۔ اسے موتیا کے گجرے پہنائے، اس پر چنبیلی کی لڑیاں لپیٹیں۔ اس کے نیچے عنبر اور لوبان جلایا اور ستار کو ٹیلے پر چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، ہاتھ جوڑے اور اپنے من کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک پرارتھنا کی:

دیوی، میری ایک پرارتھنا سن لو۔

میں تمھیں وچن دیتا ہوں دیوی، اب ستار کبھی نہیں چھیڑوں گا۔

سوگند ہے دیوی، تمھاری سوگند!

شما کرو دیوی، میں نے تمھیں بہت تکلیف دی ہے۔ کیول تم جانتی ہو، یہ کشٹ میں نے تمھیں نہیں دیا۔

میرے من کی پوترتا، میرے من کی موہ سے تم انجان نہیں ہو دیوی!

تمھیں مجھ پر وشواس ہے تو میری یہ بھینٹ قبول کرلو۔

میں تمھیں وہ بھینٹ دے رہا ہوں دیوی، جس سے سارے سنسار میں میرے لیے اور کوئی چیز پیاری نہ تھی۔

میں ستار* تمھاری نذر کرتا ہوں۔

اور ستار تو تمھاری ہی ہے نا؟ ستار اور سرسوتی وینا۔ تم اس سے راگنیاں چھیڑتی ہو، تمھاری وینا سو جاتی ہے تو ساری دنیا سو جاتی ہے۔

تم میری یہ بھینٹ لے لو، گر میرے من کی موہ میں سچائی ہے۔

پائل کی مدھم سی جھن جھن... جھن جھن... جھن جھن

وہ چاند کی کرنوں پر ہولے ہولے، تھم تھم کر آ رہی تھی۔ 'کنول' پدگامنی کے گاتے قدموں کی گنگناہٹ...**

میرے ہردے میں ایک بے چین لہر اٹھی، میرے من کی موہ جاگ اٹھی۔

میری پلکیں تھرتھرا کر کھلنے لگیں۔ میں ایک بار اور وہ روپ دیکھ لوں، صرف ایک بار اور۔ لیکن میری نظریں نہ اٹھ سکیں۔

نظریں نیچی جمی رہیں۔ ''ہر نقش کف پا سے لو سی لہرا کے اٹھتی تھی۔'' اور ہر گام پہ کنول کھل رہے تھے۔

اُف وہ نیل کنول، وہ نیل کنول!

میں نے بے قرار ہو کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ سحر ٹوٹ گیا۔

وہ غائب ہو گئی تھی۔ اور میری ستار بھی غائب ہو گئی تھی۔

میری بھینٹ قبول کر لی گئی، میری ستار امر ہو گئی، میری ستار امر ہو گئی۔

اور پھر نہ پوچھیے، نہ پوچھیے مجھ پر کیا گزری۔

---

* ستار یوں تو مذکر ہے لیکن جب کسی کو کسی شے سے جنون کی حد تک پیار ہو تو وہ مونث بولی جا سکتی ہے۔

** 'روپ' فراق گورکھپوری

گیا من کا دھیرج، بڑھی بے کلی سی...

اس کے بعد پھر کبھی چاندنی مجھے سکون نہیں پہنچاتی تھی۔ چاندنی ظلم ڈھاتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، چاندنی مجھے ڈس رہی ہے۔ پونم کی چاندنی اور برکھا کی بھیگی راتیں مجھے پاگل بنا دیتی تھیں۔ چاندنی راتوں میں اور برکھا کی بھیگی رینوں میں ستار بجانے کے لیے، ستار کی تاروں کو صرف چھیڑنے کے لیے میں بے قرار ہو اٹھتا۔ اور یہ تڑپ اتنی شدت اختیار کر لیتی کہ میں رات رات بھر سو نہ سکتا۔

اب بھی کسی کو ستار بجاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھ پر ایک جنون، ایک وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ جی مچل جاتا ہے کہ ستار اس سے چھین لوں اور خود چھیڑنے لگوں۔ لیکن اس رات کی وہ سوگند مجھے روکے رکھتی ہے، اور مجھ پر ایک قیامت گزر جاتی ہے۔

میرے بدن کا رواں رواں ستار کی چھیڑ سے متاثر ہوتا ہے۔ میرے من کی وین کے تار بج اٹھتے ہیں، میں کھو جاتا ہوں، مدہوش ہو جاتا ہوں، اور کبھی کبھی مجھے اچانک اس روپ کی ایک جھلک سی نظر آ جاتی ہے، صرف ایک جھلک، اور صرف ایک لمحے کے لیے مختصر سی جھلک!

لیکن آج کی رات!

آج کی رات بھی اتنی ہی گہری، اتنی ہی سحر زدہ ہے! آج اس رات پر ایک جادو چھایا ہوا ہے۔ فضا کنچن نیر سی نکھری ہوئی ہے۔ اور اس مکمل، حسین، مسحور کن چاندنی میں کتنا سکون ہے، کتنا آنند، کتنی شانتی!

اور وہ سنگیت کی، کلا کی، روپ کی دیوی، جو اس رات ستار کی لے پر ناچ اٹھی تھی، چاندنی کی شیتل کرنوں پر ہولے ہولے، چھم چھم کرتی آئی تھی، زندہ، متحرک، انسانی روپ میں آ گئی ہے۔

میری بھینٹ کے صلے میں دیوی خود میرے پاس چلی آئی ہے۔

ہاں آپ وہی ہیں، آپ وہی ہیں، روپ کی، کلا کی، سنگیت کی دیوی۔*
معصوم، پاکیزہ، مقدس۔
موسیقی کی روح!
اب وہ روپ ایک بولتی ہوئی تصویر حیات ہے۔

یہ وہی روپ ہے۔
یہ گھنیرے گیسو،
یہ مدھ ماتے، رس بھرے نین کنول،
اور یہ نیل کنول،
کتنے سندر ہیں یہ، یہ پاؤں
کتنا سکون ہے، کتنا آنند ہے ان میں!
ان چرنوں کی مٹی اپنی آنکھوں پر مل لوں تو ان میں ٹھنڈک آ جائے! ان چرنوں میں تو میں اپنا سارا جیون بتا دوں!

یہ وہی ہیں،
یہ وہی ہیں، یہ نیل کمل،
یہ نیل کمل... یہ نیل کمل۔

●●●

* یونانی دیو مالاؤں میں وینس حسن کی دیوی ہے اور آپالو موسیقی کا دیوتا لیکن ہندو دیو مالاؤں میں حسن اور فن میں جو یگانگت اور ازلی رشتہ ہے اس کے اعتبار سے حسن کی دیوی ہی موسیقی اور فن کی دیوی بھی ہے۔ چنانچہ روپ کلا اور سنگیت کی ایک ہی دیوی ہے... سرسوتی۔

سرسوتی

نیل کمل مسکائے، رے بھونرا،
رس پی اور اڑ جائے،
نیل کمل مسکائے...
دیوی، نیل کمل،
اور بھونرا؟

سبز پانیوں پر نیل کنول کھل رہے تھے۔

اور دو نیل کنول جیسے پاؤں تالاب کے کنارے بنی ہوئی مرمریں سیڑھیوں پر دھیرے دھیرے اتر رہے تھے۔

کمر پر نازک سی ایک گاگر تھامے وہ نیر بھرن آئی تھی۔

اس نے نیر بھرا اور گاگر ایک طرف رکھ دی۔ اپنے دونوں کومل ہاتھ بڑھائے۔ کنول کے پھولوں سے کھیلنے لگی، بچوں کی سی معصومانہ مسرت اس کے سندر مکھڑے پر کھیل رہی تھی۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی نیلی ساری کو پنڈلیوں پر سے اٹھائے پانی کی سطح پر اپنے پاؤں سے لہریں بنانے لگی۔ اور کنچن نیر میں نہائے ہوئے یہ نیل کنول سے پاؤں دیکھ کر تالاب کے نیل کنول ماند پڑ گئے۔

پھر گاگر اپنی کمر پر رکھے وہ دھیرے دھیرے اوپر آئی،

ایک مدھر سا گیت گنگناتی ہوئی۔

اچانک اس کی نظریں اجنبی کی نظروں سے ٹکرائیں، جو تالاب کے کنارے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا، عجیب عقیدت اور پرستش بھری نگاہوں سے۔

''تم کون ہو پردیسی، یہاں کیوں آئے ہو؟''

بڑی میٹھی، نرم آواز اجنبی کے کانوں میں آئی۔ اس آواز میں امرت کی سی مٹھاس تھی۔

''تم کون ہو پردیسی، یہاں کیوں آئے ہو؟''

''میں، میں۔''

وہ چونک پڑا، ''ایک بھولا بھٹکا راہی ہوں، گاؤں سے چلتے چلتے شام ہو گئی، یہ گھنا جنگل بیچ میں پڑا ہے، راہ بھائی نہیں دیتی۔''

''چنتا نہ کرو پردیسی، میری کٹیا میں چلے چلو، رات وہیں بسر کر لینا، پھر سویرے اٹھ کے چلے جانا۔ میری کٹیا اس چھوٹی سی پہاڑی کے اوپر ہے، چلو میرے ساتھ۔''

وہ جیسے ایک سحر کے زیر اثر اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے دیکھا، کٹیا میں وہ اکیلی رہتی ہے، اور کوئی ساتھ نہیں ہے۔

''آپ یہاں بالکل اکیلی رہتی ہیں؟''

''ہاں اکیلی ہی سمجھیے۔ ویسے بالکل اکیلی بھی نہیں۔ یہاں ایک سنیاسی رہتا ہے۔ لیکن وہ نگر نگر گھومتا رہتا ہے۔'' ایک خوبصورت پیالے میں وہ شربت انڈیلتے ہوئے بولی ''کبھی کبھار ہی یہاں آتا ہے۔''

''پہلے یہ پی لو پردیسی، تمھیں پیاس لگی ہوگی۔'' اس نے پیالہ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ کیسا شربت تھا یہ؟ اس کے ہونٹوں نے تو کبھی ایسا شربت نہ چکھا تھا۔ اس میں ایک ہلکا سا سرور اور خمار تھا لیکن شراب کا سا بہکانے والا نشہ نہیں۔ اور امرت کی سی مٹھاس تھی، وہ امرت جو سورگ کی نہروں میں بہتا ہے۔

"تمھیں بھوک بھی لگی ہوگی پردیسی، ابھی کھانا گرم کیے دیتی ہوں۔" گیلی لکڑیوں پر پھونکیں مارتے مارتے دھوئیں سے اس کی کنول جیسی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

اس کے سامنے دال بھات رکھتے ہوئے وہ بولی "تمھیں دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی تو نہیں ہے پردیسی۔ بس یہی دال بھات ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔" بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اسے اس حال میں دیکھ کر اجنبی کا دل رو پڑا۔

اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے "ہائے میں بھی کیسی مورکھ ہوں۔ ذرا ذرا سی بات پر میرے آنسو نکل آتے ہیں۔ جانے کیوں؟ نہیں مجھے تو کوئی دکھ نہیں، میں تو سکھی ہوں۔"

"ٹھہرو پردیسی، میں تمھارے لیے ایک چیز ابھی پکائے دیتی ہوں۔ دیکھو اب لکڑیاں بھی خوب جل اٹھی ہیں۔ کبھی کنول کے بیجوں کی کھیر کھائی ہے؟"

"کنول کے بیجوں کی کھیر؟"

"ہاں، ہاں۔ یہ نیچے تالاب میں کنول کھلے ہیں نا۔ میں ان کے بیج جمع کر کے انھیں خوب سکھا لیتی ہوں اور ان کا چھلکا اتار کر دودھ میں ابال لیتی ہوں۔ بڑی مزیدار کھیر بنتی ہے۔"

ہاں، دیوی، جس چیز کو بھی یہ مقدس، آسمانی ہاتھ چھو جائیں اس کے ذائقہ کے کیا کہنے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ اور وہ حیران رہ گیا۔ کنول کے بیجوں کی اس کھیر میں بھی وہی مزا تھا جیسے وہ سورگ میں بہنے والی نہروں کے امرت سے بنی ہو۔

اب اسے کوئی شک نہ تھا۔ یہ وہی تھی، یہ وہی تھی۔

"آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟ یہاں کیسے آئیں؟ اس سنیاسی کے ساتھ کیوں رہتی ہیں؟"

"تم باور نہیں کروگے پردیسی۔ میں اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ اپنی پچھلی

زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں۔ مجھے صرف یہ بتایا گیا ہے کہ میں بدیسہ میں سرسوتی کے مندر کے کھنڈروں کے پاس بے ہوش پائی گئی۔ اور یہ سنیاسی مجھے اٹھا کر یہاں لے آیا۔ تب سے میں یہیں رہتی ہوں۔''

''اس کے سوا آپ کو کچھ بھی یاد نہیں پڑتا؟''

''نہیں بالکل نہیں۔ شاید میں گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ ممکن ہے میرے سر میں چوٹ آئی ہو یا گرنے میں دماغ کو ایسا دھکا پہنچا ہو کہ میں اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں سب کچھ بھول گئی ہوں۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی میں کون ہوں، میرا نام کیا ہے؟ بڑے اچنبھے کی بات ہے نا؟''

وہ کچھ دیر کھوئی کھوئی نظروں سے افق کے اس پار دیکھتی رہی جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو، جیسے افق کے اس پار اس کے جیون کا راز چھپا ہو۔ کٹیا کے قریب بانس کے درختوں کے جھنڈ پر پونم کا چاند آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ وہ کھوئی ہوئی سی، چاند کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

پھر اس نے اپنی نظریں ہٹا لیں۔ اور اس احساس کے تحت کہ مہمان کے سامنے یوں اداس نہیں رہنا چاہیے، اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی:

''اچھا پردیسی، اب اپنے بارے میں تو کچھ بتاؤ نا۔ تم نے مجھ سے تو اتنے سارے سوال کر ڈالے اور اپنے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا۔ تم کون ہو، کہاں کے رہنے والے ہو اور تمھیں کہاں جانا ہے؟''

وہ ہنس پڑا ''میرا وجود آپ کی طرح کوئی راز تو نہیں۔ معمولی آدمی ہوں۔ میرا گاؤں یہاں سے قریب ہی ہے اور مجھے شیام کہتے ہیں۔ میرا اصل نام تو شیام نہیں ہے۔ گاؤں والے مجھے شیام اس لیے کہتے ہیں کہ بنسی بجاتا ہوں۔ اور... اور... جس لڑکی سے میں پریم کرتا ہوں، جس سے میری منگنی ہو چکی ہے اس کا نام رادھا ہے۔''

اس کی ساری اداسی دور ہو گئی اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کتنی مدھر تھی وہ ہنسی! جیسے چاندی کے پھول جڑے ہوں۔

''بہت اچھے، بہت اچھے! مرلیا والے شیام؟ اچھا کنہیا جی یہ تو بتاؤ، بنسی اپنے ساتھ لے آئے ہو؟''

''میری بنسی تو میری جیون ساتھی ہے۔ میں اسے ہمیشہ پاس رکھتا ہوں۔''

''تو پھر کچھ سناؤ نا۔ بانسری کی تانوں میں یہ رات کتنی اچھی کٹے گی۔ تم کیا جانو پردیسی، میں ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتی ہوں۔ مجھے یہاں اکیلے میں اتنا ڈر لگتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے اس جنگل میں کوئی گھوم رہا ہے۔ اور میں ڈر کے مارے سوتی ہی نہیں ہوں۔ دروازہ بھیڑے چپ چاپ دم سادھے ساری رات یہیں بیٹھی رہتی ہوں۔ آج تم آ گئے ہو تو بالکل ڈر نہیں لگ رہا۔ اور رات بڑی اچھی معلوم ہو رہی ہے۔''

اُف کتنی معصوم اور بھولی بھالی تھی وہ! اجنبی کے ساتھ رات گزارتے ہوئے اسے بالکل کسی خوف یا جھجک کا احساس تک نہ تھا۔ اس کی پوتر ہستی پاپ اور گناہ سے بالکل انجان تھی۔ یا پھر شاید اسے اجنبی کے من کی پوترتا پر وشواس تھا۔

شیام نے اپنی بانسری نکال کر ہونٹوں سے لگائی۔ لیکن کوئی دھن چھیڑنے سے پہلے وہ بول اٹھی، یہاں نہیں پردیسی، چلو باہر چلیں۔ باہر کیسی اچھی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ چاندنی راتیں مجھے بے چین کر دیتی ہیں لیکن میں ڈر کے مارے باہر نہیں نکل سکتی۔''

وہ دونوں باہر نکل آئے۔ جیسے سارے سنسار پر سندرتا چھائی ہوئی تھی۔ فضا کیسی کنچن نیر سی نکھری ہوئی تھی۔ نیلے گگن پر پونم کا چاند اپنا جادو بکھیر رہا تھا اور چاند کی شیتل شیتل کرنیں تالاب کے پانیوں اور کنول کے پھولوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ اور کنول کے پھولوں کے درمیان چاند کا حسین عکس تیر رہا تھا۔

یہ سندر رین، یہ سپنوں کا سا جادو، یہ چاندنی اور سنگیت۔ بجائے جاؤ پردیسی اپنی بنسی بجائے جاؤ، بانسری کی تانوں سے تو تم امرت رس گھول رہے ہو۔

وہ آنکھیں بند کیے گویا سنگیت میں کھوسی گئی۔

وہ اپنی بنسی پر راگنیاں چھیڑتا رہا اور رات گہری ہوتی گئی۔

اور اس گہری رات میں اچانک اس نے میگھ ملہار چھیڑنا شروع کیا۔ اور اس نے دیکھا، وہ بالکل مدھوش ہوئی جارہی ہے۔ میگھ ملہار کی چھیڑ سے اس کے سارے بدن میں ایک لہرسی دوڑ گئی اور اس کے انگ انگ سے اضطراب اور بے چینی چھلکنے لگی اور پھر اچانک اس کی انگلیاں اضطراری طور پر خلا میں یوں حرکت کرنے لگیں جیسے وہ کسی ان دیکھی وین کو چھیڑ رہی ہوں۔

اس کی وین کہاں تھی؟ اس کی وین کہاں تھی؟

بسنت رت مدماتی آئی تھی، پر اس کی وین کہاں تھی؟

وین نہیں تھی لیکن...

من کی بین متواری باجے

من کی بین متواری باجے...

من کی بین متواری...ی...ی...ی

گاؤں میں ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ میلے میں آئے ہوئے سپیرے بین بجا کر سانپوں کو کھلا رہے تھے اور مندر سے پوجا کر کے واپس آنے والی عورتوں اور لڑکیوں کے جھرمٹ کے جھرمٹ ان سپیروں کو گھیرے ہوئے تھے۔

اس نے دور ہی دور سے دیکھا۔ اس جھرمٹ میں اس کی رادھا بھی تھی، لیکن آج اس کی بے چین نظریں رادھا کو نہیں کسی اور کو تلاش کر رہی تھیں۔

اچانک اس کی نظریں ایک اجنبی سے ٹکرائیں جو اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اجنبی نے اسے اپنے پاس بلا لیا ''جسے تم ڈھونڈ رہے ہو، وہ میں ہی ہوں۔ میں بہت دیر سے تمھیں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم کسے ڈھونڈ رہے ہو وہ میں ہی ہوں سورداس، اونتی سے آیا ہوں۔''

سورداس؟ وہ حیران رہ گیا۔ سورداس، سنگیت میں اتنا بڑا نام؟ کیا یہی سورداس ہے؟ یہ میلے پھٹے ہوئے کپڑے، یہ بھونڈی سی شکل، یہ پتھریلا جذبات سے عاری چہرہ۔ بھلا وہ روپ پر کیوں دھیان دے رہا ہے۔ اس کے پاس تو کلا ہے اور سنگیت۔ کلا اور سنگیت میں یہ کمال ہو تو روپ کی کیا پروا؟

اس نے جھک کر سورداس کے چرن چھوئے ''میں بھاگیہ وان ہوں مہاراج، جو آپ کے درشن ہوئے۔ مجھے سنگیت سے لگاؤ ہے۔ کچھ کچھ جانتا ہوں۔ مہاراج مجھے آپ اپنا چیلہ بنا لیجیے، اپنے چرنوں میں رہنے دیجیے۔''

سورداس نے اسے آشیرواد دی۔ ''میں جانتا تھا تمھیں سنگیت سے ضرور پیار ہوگا۔ تمھارے پتا میرے متر تھے، انھیں میگھ ملہار چھیڑتے سنا ہے، تمھارے پتا کو بھی سنگیت میں کمال تھا۔ تم نے بھی کچھ سیکھا ہے اپنے پتا سے؟ کچھ بجا لیتے ہو؟''

''ہاں بنسی بجا لیتا ہوں مہاراج۔ پر میرے من میں بہت دنوں سے ایک اچھا ہے۔ میں وین سیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے سنا تھا آج میلے میں ایک نامی وین بجانے والا آئے گا۔ میں اسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا آج سورداس جی کے درشن ہو جائیں گے۔ میں بھاگیہ وان ہوں مہاراج۔ بتائیے میں کہاں آپ کے پاس آیا کروں، آپ کہاں رہتے ہیں؟''

''بدیسہ میں دیوی سرسوتی کا ٹوٹا ہوا مندر تم نے دیکھا ہوگا۔ میں آج کل وہیں رہتا ہوں۔ لیکن سنو، کل تم مجھ سے یہیں ملنا اور اپنی بنسی بھی ساتھ لیتے آنا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم میں وہ گہری موہ ہے کہ نہیں جو سنگیت کے لیے چاہیے۔ اگر ہے تو میں تمھیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔ تم مجھ سے جو چاہو سیکھ سکتے ہو۔''

''آپ کی بڑی کرپا ہے مہاراج!'' اس نے پھر جھک کر سورداس کے چرن چھوئے۔

وہ بڑا ہی خوش گھر لوٹ رہا تھا۔ آج وہ سورداس سے ملا تھا۔ سورداس اسے سنگیت

سکھائیں گے! وہ اپنے آپ میں یوں مگن چلا جا رہا تھا کہ پیچھے سے کسی کے آنے کی اسے خبر تک نہ ہوئی اور کسی نے پیچھے سے اس کی آنکھیں بند کر لیں۔

اس نے ان ہاتھوں کو چھو کر دیکھا۔ بڑے نرم، کومل، نازک سے ہاتھ تھے۔

''رادھے'' وہ پکار اٹھا۔ بھلا یہ چنچل رادھے کے سوا اور کون ہو سکتی تھی؟

رادھا نے اپنے ہاتھ اس کی آنکھوں پر سے ہٹائے اور گھونگھٹ کاڑھ لیا۔

اور گھونگھٹ کے پٹ کھول کر اس نے دیکھا آج اس کی رادھے بڑی پیاری، بڑی سندر لگ رہی تھی۔ ہلکی سبز ساری کے آنچل میں اس کا چمپئی مکھڑا خوب کھل رہا تھا۔ ماتھے پر وہ ایک نازک سا نارنجی تلک لگائے ہوئی تھی اور اس کے سیاہ گھنیرے بالوں میں چمپا کی ادھ کھلی کلیوں کی وینی بجی تھی۔

''جاؤ میں تم سے کبھی نہیں بولوں گی۔'' وہ روٹھ گئی۔ ''تم نے میلے میں مجھے دیکھا تک نہیں۔ ایک بار دیکھا، لیکن دیکھ کر بھی میرے پاس نہیں آئے۔ جانے کسے ڈھونڈتے رہے۔ اور پھر اب تک اس بڑے لمبے آدمی سے کھڑے باتیں کرتے رہے۔''

''ایسا نہ کہو رادھا! تم نہیں جانتیں وہ کون ہیں۔ وہ ایک بہت بڑے سنگیت گرو ہیں۔ اور پھر میں تم سے ملنا ضرور چاہتا تھا، لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ تم اتنی دیر رکی رہو گی۔ اپنی سکھیوں کے ساتھ گاؤں واپس نہیں لوٹ جاؤ گی۔ آج کیسے تم اکیلی اتنی دیر تک رک گئیں [گئی]؟''

''پتاجی کچھ دنوں کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں، ماتا جی سے کہہ دوں گی مندر سے پوجا کے بعد واپس لوٹتے شام ہو گئی۔''

''اچھا یہ بات ہے! وہ ہنسا۔''

''بنسی لے آئے ہو نا؟''

وہ دونوں چلتے چلتے اس جگہ پر آ گئے جو ان دونوں پریمیوں کی خاص جگہ تھی۔

''اپنی روٹھی ہوئی رادھا کو منا لیں؟''

رادھا کے چرنوں میں ڈاری مرلیا...

شیام نے اپنی بنسی رادھا کے قدموں میں ڈال دی۔ رادھا نے بھی سر اٹھایا اور ہنس کر بنسی اپنے پاؤں پر سے اٹھائی اور شیام کے ہونٹوں سے لگا دی۔

رادھا کے چرنوں میں ڈاری مرلیا...

جانے کتنی دفعہ یونہی اپنی رادھا کو پاس بٹھائے اس نے بنسی بجائی تھی۔ اور وہ دونوں پریمی بنسی کی تانوں میں کھو جایا کرتے تھے۔ پریت اور سنگیت میں کتنا گہرا سمبندھ ہے، لیکن آج جانے کیوں وہ بے چین تھا، اسے رہ رہ کر ایک ہی خیال آ رہا تھا، کیا میں اچھا بجا سکتا ہوں؟ کیا میں سورداس جی کے امتحان میں پورا اتروں گا، وہ مجھے سنگیت سکھائیں گے؟

''بہت اچھا بجا لیتے ہو، تم میں وہ سارے گن ہیں۔ مجھے تم سے یہی امید تھی کہ تمھارے پتا جی کی وہ سنگیت کی موہ تم میں ضرور ہوگی۔ اچھا اب میگھ ملہار چھیڑنا۔''

سورداس جی کی تعریف سے اس کا من کھل اٹھا۔ اس نے اپنی روح کو سنگیت میں سموتے ہوئے میگھ ملہار چھیڑا....

'جیو شیام جیو۔ بالکل اپنے پتا جی کی طرح چھیڑتے ہو۔ میں بس تم سے یہی سننا چاہتا تھا۔ میگھ ملہار۔ آج رات تم میرے پاس آؤ، وہیں سرسوتی کے مندر میں۔ بدیسہ یہاں سے دور نہیں ہے۔ لیکن میں وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گا۔ مجھے اونتی واپس جانا ہے۔''

''آپ اونتی جائیں گے تو میں بھی ساتھ چلوں گا مہاراج۔ سنگیت کے لیے تو میں سنسار کے کونے کونے تک بھی جا سکتا ہوں۔''

درختوں کے جھنڈ کے اس پار اس نے دیکھا، رادھا کی سکھیاں پانی بھرنے پنگھٹ پر آئی ہوئی ہیں، لیکن ان میں رادھا نہیں تھی۔ جانے کیوں وہ آج پانی بھرنے نہیں آئی ورنہ وہ اس سے یہیں کہہ دیتا کہ وہ آج بدیسہ جا رہا ہے اور نہیں معلوم کب لوٹے گا۔ اس نے

دیکھا رادھا کی سب سے پیاری سکھی کرشنا وینی ایک درخت کی اوٹ میں کھڑی اسے دیکھ رہی ہے۔ شاید وہ اس کی اور سورداس کی باتیں سننے کے لیے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''سنو وینی جی، ادھر آنا ذرا۔'' اس نے پکارا۔

''کیوں شیام جی اپنی رادھے کو دیکھ رہے ہو؟ وہ نہیں آئی آج، آپ کی رادھے''۔

''کیوں؟'' ''یہ تو آپ جانیں، بھلا میں کا جانوں؟'' وہ بلا کی شوخی اور چنچلتا سے اسے چھیڑتی رہی۔

لیکن وہ کرشن کنہیا کی طرح شریر، چنچل، چھیل چھبیلا تو تھا نہیں کہ گوپیوں سے ہنسی مذاق اور شرارت کرے۔ نہ اس نے کرشنا وینی کی گاگر سے نیر چھلکایا نہ اسے اس میٹھی شکایت کا موقع ہی دیا۔

بھر پچکاری
مکھ پر ماری
بھیگ گئی ساری
ہماری... بھیگ گئی سا... ری
ہولی کھیلت کرشن کنہیا... ہولی کھیلت کرشن کنہیا

وینی کی چنچلتا کا جواب اس نے گمبھیرتا سے دیا ''وینی جی، آج میں گاؤں سے باہر جا رہا ہوں، مجھے رادھے سے یہ بات کہنی ہے۔ وہ پانی بھرنے ادھر آتی ہوگی، تم اس سے کہہ دینا۔ میں یہاں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔''

وینی اپنی گاگر اٹھائے جلدی جلدی رادھا کے گھر کی طرف چل دی۔ دوسری سکھیاں بھی اس کے ساتھ ہولیں۔

''کیوں ری رادھے، آج نیر بھرن کیوں نہیں آئی ری؟''

''ماتا جی کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔''

''میں تیرے لیے ایک سندیسہ لائی ہوں، لیکن چل میں تجھ سے نہیں بولوں گی۔''

''دیکھ وینی یوں روٹھا نہیں کرتے۔''

''موری اچھی یمنا تم ہی کچھ بولو نا۔'' رادھے بے چین ہوگئی۔

''میں تو کچھ نہیں جانتی۔'' یمنا بولی: ''وینی ہم سے الگ ہو کر کہیں چلی گئی تھی۔ وینی ہی سے پوچھ لو۔''

چنچل وینی گاگر کمر پر رکھے ناچ کے انداز میں گھوم گئی...

میں جل جمنا بھرن جاتی تھی،

بیچ میں مل گیو شیام سندرنا،

چلو رادھے، تو ہے شیام بلاوت

چلو رادھے تو ہے... شیام...

''سچ وینی؟ تجھے مورے سر کی قسم۔''

''اور کیا جھوٹ کہہ رہی ہوں؟ تمھارے کنہیا اسی میلے والے آدمی سے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو کہنے لگے: رادھے سے کہہ دینا میں یہاں اس کی راہ دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اس سے کچھ کہنا ہے۔''

شرمائی لجائی رادھے کو ساری سکھیوں نے گھیرے میں لے لیا*۔ (* گوپیوں کا ناچ)

میں جل جمنا بھرن جاتی تھی،

بیچ میں مل گیو، بیچ میں مل گیو شیام سندرنا،

چلو رادھے، تو ہے شیام بلاوت

چلو رادھے، تو ہے شیام بلاوت

چلو رادھے...

''رادھے، مجھے جانا ہوگا رادھے۔''

''سنگیت، سنگیت، سنگیت! تم تو باؤلے ہوگئے ہو شیام۔ جیسے تم سنگیت جانتے ہی

نہیں، اتنی اچھی بنسی بجا لیتے ہو، گا بھی لیتے ہو۔ تمھیں اور کیا سیکھنا ہے؟"

"تم سمجھ نہیں سکو گی رادھے! سنگیت کے لیے میری موہ، میری تڑپ کو تم سمجھ نہیں سکتی ہو۔ میں جانتا ہی کیا ہوں؟ ذرا سی بنسی بجالی اور بس؟ سنگیت کی بلندیوں کو چھو لینا کوئی آسان بات نہیں؟ سنگیت کے لیے تو ایک جیون کا تیاگ چاہیے اور سوچو تو رادھے، میرے بھاگ کیسے جاگ اٹھے ہیں۔ سورداس جی میرے سنگیت گرو ہوں گے۔ رادھے، شیام جب تمھاری مانگ میں سیندور بھر کے، تمھیں اپنی بنا کے گھر لے آئے گا اس وقت وہ کوئی معمولی آدمی نہ ہوگا۔ سنگیت میں ایک نام ہوگا۔ کیا تم نہیں چاہتی کہ ایسا ہو؟ بتاؤ رادھے!"

"میں کچھ نہیں جانتی شیام۔ مجھے تو تم جیسے ہو، ویسے ہی اچھے لگتے ہو۔ کیول تمھاری سنگیت کی چاہ سے میں انجان نہیں ہوں۔ میں تمھیں روکوں گی نہیں۔ جہاں جانا چاہتے ہو، جاؤ۔ میں تمھارا انتظار کرلوں گی۔ تمھاری رادھے تمھاری راہ میں نین بچھائے رہے گی۔ تمھاری رادھے تمھارا انتظار کرے گی۔ ہمیشہ ہمیشہ تمھارا انتظار کرتی رہے گی۔"

جہاں کبھی دیوی سرسوتی کا شاندار مندر کھڑا تھا، وہاں اب ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ سامنے ایک گھنا جنگل تھا اور پاس ہی ندی بہتی تھی۔ اس ٹوٹے ہوئے مندر کے سامنے سورداس اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"اچھا ہوا تم ٹھیک سے پر آگئے۔ میں پوجا پاٹ کی تیاریاں کر رہا تھا۔" سورداس نے اس کے گلے میں زرد گیندے کے پھولوں کے ہار پہنائے، خود بھی ایسے ہی ہار پہنے۔ دونوں نے پوجا کی اور مندر کے باہر آبیٹھے۔

پورنیا کی رات تھی، پورا چاند نکل آیا تھا، لیکن ان کے سامنے اتنا گھنا جنگل تھا، چاند کی روشنی چھپ گئی تھی۔ گھنے درختوں کی ٹہنیوں میں سے چاند کی کرنیں صرف ایک جال سا بن کر رہ گئی تھیں۔

"جانتے بھی ہو آج کون سی رات ہے؟"

"پونم کی رات۔"

''اور یہ بھی جانتے ہو یہ کون سا مہینہ ہے؟''

''ہاں اساڑھ۔''

''اساڑھ کا مہینہ اور پورنیما کی رات۔ آج رات میں تمھیں وہ نظارہ دکھاؤں گا جسے تم جیون بھر بھول نہیں سکو گے۔ آج کی رات تمھارے جیون کی سب سے بڑی رات ہو گی!''

شیام نے حیران ہو کر سورداس کی طرف دیکھا ''آج رات کیا ہو گا مہاراج؟''

''آج رات سرسوتی آکاش سے دھرتی پر اتر آئے گی۔''

''سچ مہاراج؟''

''ہاں۔ تم جانتے ہو اس جگہ کسی زمانے میں سرسوتی کا شاندار مندر تھا، دیس کے سارے سنگیت جاننے والے، کوی، لیکھک، چترکار، سارے کلاکار یہاں پوجا کے لیے آیا کرتے تھے۔ یہ گویا کلاکاروں کا کاشی تھا۔ وہ بہت دور دور سے آیا کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ یہاں آکر سرسوتی کی پوجا کر لیں اور سرسوتی کا آشیرواد حاصل کر لیں تو وہ کلا میں نام پیدا کریں گے۔ آج بھی گو یہ مندر اب کھنڈر رہ گیا ہے، اساڑھ، سربل اور بھدرا ان تین مہینوں میں، پونم کی رات کو اس ٹیلے پر بیٹھ کر، کوئی میگھ ملہار چھیڑے تو دیوی سرسوتی خود اس کے سامنے چلی آتی ہے۔ اور جو کوئی اپنے آپ کو سنگیت میں کھو کر اس طرح یہ راگ چھیڑ سکتا ہو کہ دیوی خود مسحور ہو کر دھرتی پر اتر آئے، جو کوئی سرسوتی کا روپ دیکھ لیتا ہے وہ سنگیت میں بڑا نام پیدا کرتا ہے۔ وہ سنگیت کی آتما کو چھو لیتا ہے۔''

''یہ راگ آپ چھیڑیے مہاراج۔ بھلا مجھ میں اتنی شکتی کہاں ہے؟ سنگیت میں وہ جوہر کہاں ہے کہ میں اس طرح یہ راگ چھیڑ سکوں؟''

''نہیں، میں تو اب ادھیڑ ہو چکا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ یہ راگ چھیڑنے والا نوجوان ہو، کنوارا ہو، اس کے جذبات بہت گہرے ہوں، اس کا من پوتر اور پاک ہو۔ تم میں یہ ساری باتیں ہیں۔ اپنی جوانی میں، میں نے بھی دیوی کا یہ روپ دیکھا ہے۔ آج تمھیں دکھانا چاہتا ہوں۔''

شیام حیرت سے سورداس جی کی یہ باتیں سن رہا تھا۔ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آرہا تھا۔

دیوی سرسوتی؟ سرسوتی، سنگیت کی، کلا کی، روپ کی دیوی! سرسوتی! جس کی وین کی تانیں کلاکاروں کے من میں آگ لگا دیتی تھیں، سنگیت کے دیوانوں کی آتما کو چھو لیتی تھیں۔ راگ، راگنیاں، کویتائیں، رچنائیں، تصویریں، کلا اور فن کے ہر اظہار کے لیے جو وجدان کا سرچشمہ تھی، جس میں حسن و فن دونوں مجسم تھے۔ سرسوتی، جس کی ہستی حسن اور فن کے ازلی رشتہ کا اظہار تھی۔ کیا وہ ایک تصور نہیں تھی؟ کیا وہ ایک حقیقت تھی جسے آنکھوں سے دیکھا جا سکے؟

دیوی سرسوتی آج اس کے سامنے آئے گی؟ سرسوتی، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا چہرہ کنول کا سا حسین ہے، جس کے بال گھنگھور گھٹاؤں کی طرح...

"شیام اب میگھ ملہار چھیڑنا شروع کر دو، وہ سمے آگیا ہے۔ دیکھو چاند ہمارے سروں پر آگیا ہے اور آدھی رات بیت چکی ہے۔" سورداس کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

اس نے اپنی بنسی نکالی اور جیسے ایک سحر کے زیر اثر میگھ ملہار چھیڑنا شروع کیا۔ آج سے پہلے کبھی اس نے اس طرح میگھ ملہار نہ چھیڑا تھا۔ اس کے من میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اس کی روح بنسی کی تانوں میں تحلیل ہوئی جا رہی تھی۔

اچانک جنگل میں دور ایک روشنی نمودار ہوئی۔ یہ چاند کی روشنی نہیں تھی۔ چاند کی کرنیں تو گھنے درختوں کی ٹہنیوں میں سے اندھیرے اور روشنی کا ایک جال سا بن رہی تھیں اور بس۔ نہیں یہ چاند کی روشنی نہیں تھی، یہ کوئی اور ہی روشنی تھی، اتنی خیرہ کن جیسے ہزاروں چاند ایک ساتھ گگن میں آئے ہوں۔

شیام کی آنکھیں اس خیرہ کن روشنی سے چندھیا گئیں۔ وہ روشنی آگے بڑھتی گئی اور شیام کی حیران نظروں نے دیکھا ایک غیر معمولی، انتہائی حسین عورت سامنے کھڑی ہے۔ اس کے سر کے گرد روشنی کا ایک ہالہ ہے۔ اس کے سارے بدن سے روشنی کی خیرہ کن

شعائیں پھوٹ رہی ہیں۔ اس کا چہرہ چاند سے زیادہ منور ہے، اور کنول کی طرح حسین۔ اس کے گھنگھور گھٹاؤں جیسے کھلے بال ایک طرف شانے پر پڑے ہوئے گھٹنوں تک لہرا رہے تھے۔ سر پر ہیروں اور زمرد کا تاج تھا اور متناسب جسم پر لپٹی ہوئی نیلی ساری یاقوت اور موتیوں سے بنی ہوئی کمر پٹی سے کسی ہوئی تھی۔ اور نازک کلائیوں میں چمیلی کے گجرے اور باہوں سے موتیا کی لڑیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ اور کنول جیسے پاؤں کو اپنے دامن میں لینے کے لیے دھرتی سے آپ ہی آپ پھول اُگ آئے تھے۔ ایک نادر حسن تھا۔ ایک عجیب شان اور گمبھیرتا!

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی آ رہی تھی۔ شیام پر ایک عجیب کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ بنسی بجاتے بجاتے رک سا گیا۔ دیوی نے ہاتھ سے اشارہ کیا، بجائے جاؤ۔ شیام بجاتا رہا اور راگ ختم کرنے پر اسے سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس نے سورداس کی طرف دیکھا اور سورداس کی آنکھوں میں اسے ایک ایسی چمک نظر آئی جو اسے بالکل پسند نہ آئی۔ وہ کچھ عجیب ہی نظروں سے دیوی کو گھورے جا رہا تھا۔

شیام کا دل اس وقت جذبہ عقیدت اور پرستش سے معمور تھا۔ اپنی نگاہوں میں یہی جذبہ پرستش لیے وہ دیوی کو دیکھتا رہا۔ دیوی آگے بڑھی، اسے یوں لگا جیسے دیوی اس سے کچھ پوچھنا چاہتی ہو۔ اس غنچہ دھن کے یاقوتی لب کھلے، لیکن اسی سے اچانک دیوی کا وہ روپ فضا میں تحلیل ہوتے ہوئے غائب ہو گیا۔

شیام پر بہت دیر تک اس سحر کا اثر رہا۔ سورداس کی آواز نے اسے اس بے خودی سے چونکا دیا "دیکھ لیا نہ تم نے دیوی کا روپ! اب تم جا سکتے ہو۔ میں جب اوٹنی جاؤں گا تمھیں ساتھ لے چلوں گا۔"

شیام کی سمجھ میں نہ آیا کہ سورداس جی اتنی رات گئے اسے گاؤں لوٹنے کو کیوں کہہ رہے ہیں۔

اتنی رات گئے اسے جنگل پار کر کے گاؤں لوٹنا تھا۔ اسے کچھ ڈر سا لگنے لگا، لیکن آج

رات اسے ایسا لگ رہا تھا اب وہ دیوی سرسوتی کی پناہ میں ہے۔ وہ اس کی حفاظت کرے گی۔ وہ بغیر کسی خوف کے اس گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔ بیچ جنگل میں اس نے دیکھا ایک طرف درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں روشنی سی ہو رہی ہے۔ اسے کچھ شک سا گذرا اور وہ جھنڈ کے پاس اور قریب گیا۔ اور اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ دیوی ابھی تک وہیں تھی۔ اس کے بدن سے روشنی کی شعائیں پھوٹ رہی تھیں، لیکن اب یہ روشنی خیرہ کن نہیں تھی۔ جگنو کی روشنی کی طرح ہلکی نیلی سی اور ٹھنڈی تھی، وہی نادر حسن تھا، لیکن اب اس حسین چہرہ پر ایک عجیب کرب اور بے چینی سی نمایاں تھی۔ کنول جیسی آنکھیں نیم باز تھیں، جیسے وہ کسی ان جانے نشہ سے بوجھل ہوئی جا رہی ہوں اور وہ اسی جھنڈ میں بار بار اس طرح چکر کاٹ رہی تھی جیسے راہ بھول گئی ہو۔

شیام سہم گیا۔ اسے سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کرے۔ اور وہ کر بھی کیا سکتا؟ دیوی کو اس حالت میں دیکھ کر شیام کے دل میں ایک درد پھوٹ پڑا۔ کاش وہ کچھ کر سکتا، وہ کچھ کر سکتا!

سویرے ہی شیام اچاریہ پورنا بردھن کی سیوا میں جا پہنچا۔ اچاریہ پورنا بردھن سے اسے بڑی عقیدت تھی۔ اس نے سوچا شاید وہ کچھ کر سکیں۔ اس نے انھیں رات کا سارا ماجرا کہہ سنایا۔ آچاریہ تڑپ اٹھے۔

''تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ بتایا شیام۔ میں تمھیں اس آدمی کے ساتھ جانے نہ دیتا وہ آدمی جس کا تم ذکر کر رہے ہو ہرگز ہرگز سورداس نہیں تھا۔ میں نے سورداس کو دیکھا ہے اور اس آدمی کو بھی۔ وہ گندیا تھا۔ اس نے سورداس کے ساتھ بھی یہی کیا تھا۔ جس وقت سورداس نے اس مندر کے پاس اسی ٹیلے پر بیٹھے میگھ ملہار چھیڑا تھا، یہ بہروپیا بھی ساتھ تھا۔ روایت ہے سورداس کی سوز بھری آواز سے مسحور ہو کر دیوی سرسوتی خود اس کے سامنے چلی آئی تھی۔ دیوی نے خوش ہو کر سورداس سے پوچھا تھا، اس سے وہ جو مانگنا چاہتا ہے مانگ لے۔ اور سورداس نے دیوی سے یہ مانگا کہ اس کا نام سنگیت میں بڑا نام ہو۔ اور وہ سنگیت کی گہرائیوں کو پا سکیں۔ دیوی نے سورداس کے سارے ارمان پورے کرنے کا وچن

دیا۔ گندیا کو پاس بیٹھا دیکھ کر اس سے بھی یونہی پوچھا کہ وہ بھی کچھ مانگنا چاہتا ہے تو مانگ لے۔ دیوی کا حسن دیکھ کر گندیا کے سینے میں کچھ اور ہی ارمان سلگ رہے تھے۔ اس نے ڈھیٹ بن کر کہا: ''میں تمھیں مانگتا ہوں۔''

دیوی کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ نکلے، دیوی کے غصہ سے دھرتی کانپ اٹھی۔

''مجھے اپنانا چاہتے ہو؟ سرسوتی کو تو کوئی بھی اپنا نہیں سکتا۔ اور پھر تم جیسا کمینہ، جاہل آدمی، جس کے پاس کوئی علم نہیں، کوئی ہنر نہیں، جسے کلا اور سنگیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں، تم جیسا آدمی مجھے کہاں پا سکتا ہے؟ تمھاری یہ مجال کہ مجھی کو مانگو؟ سرسوتی کو اپنانا چاہو؟'' دیوی بپھری ہوئی واپس چلی گئی۔ اور اس دن سے یہ کمینہ اسی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح دیوی کو انسانی روپ میں لے آئے اور قید کر کے اپنے پاس رکھ لے۔ اس نے جادو، منتر، ٹونے ٹوٹکے سیکھنے شروع کیے۔ یہاں ایک ایسا گروہ بھی ہے جو ہمارے دھرم کو نشٹ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ان کے گرو کے پاس اس نے وہ منتر سیکھے اور پھر وہ کسی ایسے آدمی کی جستجو میں تھا جو میگھ ملہار اس طرح چھیڑ سکے کہ دیوی مسحور ہو کر پھر دھرتی پر اتر آئے اور اس سے وہ منتروں سے اسے رام کر لے۔ جو کچھ تم نے ابھی سنایا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کل رات اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب ہو گیا ہے.....

شیام تم نے بہت بڑا پاپ کیا ہے۔ سوچ بھی سکتے ہو تم نے کیا کیا ہے؟ تم نے دیوی سرسوتی کو قید کرنے میں ایک مہاپاپی کی مدد کی ہے!''

شیام پاگل ہو گیا۔ انجانے میں اس سے کتنا بڑا پاپ ہو گیا تھا! اس نے اپنے نوجوان، ولولہ بھرے دل سے ایک عزم کیا۔ وہ دیوی کو کسی نہ کسی طرح آزاد کرائے گا۔ اس معصوم، پوتر، مقدس دیوی کو اس ناپاک، ہوس پرست سے بچائے گا۔ وہ یہ جانتا نہیں تھا کہ وہ یہ کیسے کر سکے گا، لیکن وہ اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے، اپنا جیون تیاگ دینے کے لیے، اپنی جان کی بازی لگا دینے پر تیار تھا!

اپنے نوجوان دل میں ایک جوش، ایک عزم، قربانی کا ایک جذبہ لیے ہوئے وہ

گاؤں سے چل کھڑا ہوا۔ اس نے رادھے سے بھی نہیں کہا وہ کہاں جا رہا ہے۔ ماں سے رخصت مانگی، ماں کے چرن چھوئے اور ماں کا آشیرواد لے کر چلا۔ مگدھ کی اس وسیع سلطنت میں وہ شہر شہر، نگر نگر مارا مارا پھرتا رہا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسے ایک مدت گزر گئی۔ وہ بہروپیا کہاں تھا؟ دیوی کہاں تھی؟

جہاں کہیں بھی وہ جاتا تھا، عجیب وغریب خبریں سننے میں آتی تھیں۔ راج دربار میں ایک ماہر بت تراش ایک بت بنا رہا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ یہ بت اس کا شاہکار ہوگا، لیکن اچانک جانے اسے ہو کیا گیا تھا، وہ بت نہایت بدہیئت سا بننے لگا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں تراش کا وہ ہنر ہی نہیں رہا تھا۔ ایک نامی چترکار، ایک تصویر پر کام کر رہا تھا، جو اس کے فن کا بہترین نمونہ ہو سکتی تھی۔ اچانک تصویر کے نقوش بگڑ گئے اور اب وہ جو کوئی بھی تصویریں بناتا مبتدی اور معمولی ہوتیں۔ ایک مشہور مصنف ایک ادبی کارنامہ ایک 'ایپک' تخلیق کر رہا تھا۔ لیکن اچانک اس کی یہ حالت ہو گئی کہ اسے اظہار کے لیے الفاظ ہی نہیں ملتے تھے۔

شاہکار نامکمل رہ گئے تھے، تصویروں میں حسن نہ رہا تھا، موسیقی سے روح چلی گئی تھی، ساز بے سر ہو گئے تھے۔

دیوی سرسوتی کی وین خاموش تھی اور سنسار میں فن مر گیا تھا۔

من کی وین متواری باجے،
من کی وین متواری... ی

کسی ان دیکھی وین کو چھیڑتی ہوئی انگلیاں رک گئیں۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں، جیسے وہ کسی بڑے ہی میٹھے سپنے سے بیدار ہوئی ہو۔

"ارے میں تو باوری ہو گئی ہوں۔ تم نے یہ کیا راگ چھیڑا تھا پردیسی؟ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے پونم کی اس چاندنی میں، سنگیت میں اور میرے پچھلے جیون میں کوئی بہت گہرا

سمبندھ تھا۔ میں بھی کیسی باؤلی باتیں کر رہی ہوں۔ چلو جانے دو۔ اب کٹیا میں چلیں۔ بہت رات بیت چکی۔"

آج رات پہلی دفعہ وہ گہری نیند سوئی اور شیام رات بھر کٹیا کے باہر بیٹھا اس کی حفاظت کرتا رہا۔

صبح وہ سنیاسی کی تلاش میں چل دیا۔ پاس کے گاؤں میں اسے ڈھونڈ کر وہ واپس آ رہا تھا کہ سنیاسی بھی دوسری اور سے ادھر آتا اسے دکھائی دیا۔ وہ شاید اس کے جانے کے بعد کٹیا میں آ گیا تھا۔

سنیاسی کی نظر شیام پر پڑی "ارے تم یہاں کہاں؟"

"سنیاسی جی، کیا آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں یہاں کس لیے آیا ہوں؟"

شیام کے لہجے کا بھرپور طنز محسوس کر کے سنیاسی چکرا سا گیا۔ "تمھارے برا بھلا کہنے کی کوئی ضرورت نہیں، میں خود اپنے کیے پر انتہائی نادم ہوں۔ اس دن سے آج تک میں بھی اسی کوشش میں لگا ہوں کہ جو کچھ میں نے کیا تھا، اس کا توڑ کر سکوں۔"

"آپ کی باتوں پر مجھے پورا وشواش ہے۔" شیام کی طنز گہری ہوتی گئی۔

"باور کرو، میں کٹیا میں رہتا تک نہیں ہوں۔ گاؤں گاؤں، نگر نگر گھومتا رہتا ہوں۔ کبھی یہاں آیا بھی ہوں تو مجھ پر ایک عجیب ہیبت سی طاری ہو جاتی ہے۔ کٹیا میں جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ یہیں جنگل میں راتیں گزار لیتا ہوں۔ تم باور کر لو، میں نے اسے چھوا تک نہیں ہے۔" "یہ ناپاک ہاتھ اس مقدس بدن کو کبھی نہیں لگے۔ وہ ابھی تک ایسی ہی پوتر اور پاکیزہ ہے!"

"اور یہ دیکھو شیام، میرے ہاتھ میں کیا ہے۔ میں آج اپنے ساتھ کیا لے آیا ہوں۔ اس لٹیا میں مقدس پانی ہے۔ میں بہت دنوں سے اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح توڑ ہو سکے، لیکن کسی گرو، کسی مہاتما کو یہ توڑ معلوم نہ تھا۔ آخر مجھے ایک ایسے مہاتما مل ہی گئے جو یہ توڑ جانتے تھے۔ انھوں نے اس پانی پر کچھ پڑھ کر دیا کہ یہ مقدس پانی اس پر چھڑکا جائے تو

وہ اپنی اصلی حالت پر آ جائے گی۔"

"لیکن شیام بڑی مجبوری ہے۔ میں یہ پانی لے تو آیا ہوں، پر چھڑکنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ میں جانتا ہوں میں نے بہت بڑا پاپ کیا ہے۔ ایک ایسا پاپ جس کے لیے میری جگہ ہمیشہ کے لیے نرک کی آگ ہوگی۔ لیکن یہ تو مرنے کے بعد کی بات ہے۔ اس پانی میں تو اسی وقت کی موت ہے۔"

"موت سے ڈرتے ہو؟ ادھر لاؤ وہ پانی مجھے دے دو۔"

"پہلے سوچ تو لو، شیام۔ اس پانی میں یقینی موت ہے۔ اس پانی کے چھڑکتے ہی تم پتھر ہو جاؤ گے!"

"میں امر ہو جاؤں گا۔"

میں امر ہو جاؤں گا۔ شیام مقدس پانی کی لٹیا کو مضبوطی سے تھامے واپس ہوا۔ وہ اپنی گاگر میں نیر بھرے، آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ رہی تھی، وہ ہاتھوں میں کنول کے پھولوں کے ڈنٹھل تھامے تھی۔ شام کی شفق کی سرخ روشنی میں اس کا کنول سا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ وہ مکھڑا اس کے ہاتھوں میں تھامے ہوئے کنول سے کہیں زیادہ حسین تھا۔

"ارے پردیسی تم آ گئے؟ بہت اچھا کیا۔ چلو گھر چلیں۔ آج سنیاسی بھی آیا ہوا ہے۔"

"سنیاسی تو چلا بھی گیا۔ اب وہ بہروپیا کبھی نہیں آئے گا۔ اب ان نیل کنولوں پر کوئی نرموہی بھونرا نہیں منڈلائے گا۔"

وہ حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ "اچھا سنیاسی کو جانے دو۔ اب تم گھر چلے چلو۔ آج بھی میں نے کنول کے بیجوں کی کھیر پکائی ہے، تمھیں پسند آئی تھی نا۔"

وہ چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ اپنے برتاؤ سے کسی طرح اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کے من میں کیسی ہلچل مچی ہوئی ہے۔ اس نے کل ہی کی طرح کھانا کھایا اور بیٹھا باتیں کرتا رہا۔

''اب باہر چلیں پردیسی۔ تم اپنی بنسی بجائے جاؤ، تم تو اپنی بنسی کی تانوں سے امرت رس گھولتے ہو۔''

وہ باہر نکل آئے۔ آج رات چاندنی اور بھی نکھری ہوئی تھی اور مکمل، حسین، مسحور کن چاندنی میں کتنا آنند تھا، کتنی شانتی!

اُف کتنی حسین رات ہے! کتنی گہری، کتنی جادو بھری، یہ رات جو اس کے جیون کی آخری رات تھی!

وہ بنسی کو اپنے ہونٹوں سے لگائے راگنیاں چھیڑتا رہا، اور آج سچ مچ اس کی روح بنسی کی تانوں میں تحلیل ہوئی جا رہی تھی۔

''راگ چھیڑو نا پردیسی، جو کل رات تم نے سب سے آخر میں چھیڑا تھا۔''

اس نے سر اٹھا کر دیکھا، چاند سر پر آ گیا تھا۔ آدھی رات بیت چکی تھی۔

''آپ کو معلوم ہے یہ کون سی رات ہے۔''

''ہاں پونم کی رات، کل تیرہویں تھی۔ چودھویں تو آج ہے۔''

''اور یہ بھی جانتی ہیں یہ کون سا مہینہ ہے؟''

''نہیں تو۔ میں تو مہینوں کے نام بھی بھول گئی ہوں، اور آبادی سے اتنی دور رہ کر پتہ بھی نہیں چلتا کہ کون سا مہینہ ہے، کون سا سال ہے، بس سے یونہی بیتا جا رہا ہے۔''

''یہ اساڑھ کا مہینہ ہے اور پورنیما کی رات اور اب آدھی رات بیت چکی ہے۔''

اس نے میگھ ملہار چھیڑنا شروع کیا۔ میگھ ملہار کی چھیڑ سے اس کے بدن میں لہر دوڑ گئی۔ انگ انگ سے بے چینی چھلکنے لگی۔ وہ مدہوش سی ہو گئی اور اس کی انگلیاں خلا میں یوں حرکت کرنے لگیں جیسے وہ کسی ان دیکھی وین کو چھیڑ رہی ہوں۔

پھر میگھ ملہار کا سحر آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور اپنی خلا میں حرکت کرتی ہوئی انگلیوں کی طرف دیکھا ''ارے میں تو سچ مچ باؤری ہو گئی ہوں۔ جانے کیوں پردیسی جب کبھی تم یہ راگ چھیڑتے ہو تو مجھے کچھ یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے

پورنیما کی چاندنی میں، سنگیت میں اور میرے جیون میں کوئی بہت گہرا سمبندھ تھا۔"

"اپنے ذہن پر ذرا زور دیجیے، سوچیے آپ کون تھیں؟"

"نہیں مجھے کچھ یاد نہیں آتا، کچھ بھی نہیں۔"

ہائے، اپنے آپ کو بھلا دینے والی دیوی، اپنے آپ کو بھول جانے والی دیوی! شیام کا دل رو پڑا۔

"ذرا سوچیے تو، یاد کیجیے، یاد کرنے کی کوشش کیجیے، آپ کہاں سے آئی ہیں اور کون تھیں!"

وہ پھر کھوئی ہوئی نظروں سے افق کی طرف دیکھنے لگی۔

"نہیں تو مجھے کچھ بھی یاد نہیں پڑتا۔ مجھے صرف اتنا پتہ ہے کہ میں بدیسہ میں دیوی سرسوتی کے مندر کے پاس بے ہوش....."

"آپ دیوی سرسوتی ہیں!"

شیام نے اٹھ کر دیوی کے چرن چھوئے اور ان کنول جیسے پاؤں پر مقدس پانی کے کچھ چھینٹے دیے۔ اور دیوی کے کنول جیسے پاؤں کو اپنے دامن میں لینے کے لیے دھرتی سے کنول اگ آئے۔

"آپ دیوی سرسوتی ہیں۔ سنگیت کی، کلا کی، روپ کی دیوی! دیوی، آپ کے بنا تو سنسار کا فن مر گیا تھا! حسن فنا ہو گیا تھا۔"

اور اس کے قلب و روح ایک وجدانی کیفیت سے سرشار ہو گئے۔ اس احساس سے کہ وہ نہ صرف دیوی کو قید سے آزاد کرا رہا ہے بلکہ وہ فن کو موت سے اور حسن کو ابدی فنا سے بچا رہا ہے۔

پھر اس نے اس مقدس حسین بدن کے ہر حصہ پر پانی چھڑکنا شروع کیا۔

اور آخر میں اس نے اس سندر مکھڑے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اس حسین چہرے پر، اور انسانی روپ میں وہ نور کھو کر بھی کنول کی طرح حسین تھا، اب ایک اور ہی طرح کا

حسن پھوٹ پڑا۔ ایتھری، آسمانی حسن۔

دیوی اپنے حسین ترین روپ میں اس کے کتنے پاس کھڑی تھی۔ دیوی کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ان نگاہوں میں بے پناہ تشکر کا جذبہ تھا۔ اور وہ نگاہیں اس پر لطف و عنایت برسا رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اب وہ بڑی خوشی سے اپنی جان دینے کے لیے تیار تھا۔

چند لمحوں کے لیے اس کی پچھلی ساری زندگی اس کے ذہن میں گھوم گئی۔ آخر اس کی عمر ہی کیا تھی۔ چوبیس سال۔ کتنی بھلی، کتنی بے فکری زندگی تھی! باپ کی موت اس کی زندگی کا دکھ تھا۔ لیکن ماں نے باپ کی جگہ لے لی تھی۔ اسے ماں سے کیا کچھ نہ ملا تھا۔ کتنا پیار، کتنا آنند اور کیسی ممتا! اسے اپنی ماں کا چہرہ اب بھی دکھائی دیا۔ وہ ماں جس نے اسے آشیرواد دے کر بھیجا تھا، ڈیوڑھی سے لگی اس کا اب بھی انتظار کر رہی تھی۔ اس کا لعل کبھی نہ کبھی واپس آئے گا۔ انتظار کرتے کرتے اس کی بوڑھی آنکھیں نیم اندھی ہو چکی تھیں۔ اور ماں کے بعد ایک اور ہی کومل، سندر چہرا، اس کے سامنے ابھرا....

''تمھاری رادھے تمھاری راہ میں نین بچھائے رہے گی۔ تمھاری رادھے تمھارا انتظار کرتی رہے گی، انتظار کرتی رہے گی۔'' اور یہ انتظار واقعی اب سدا کا انتظار تھا۔ اس کی رادھے مضطرب اور بے چین اس کی تلاش میں بھٹک رہی تھی!

اچانک اس کے کانوں میں ایک ایسی موسیقی گونجی جیسے وہ اس سنسار کی نہیں، ایتھری، آسمانی موسیقی ہو، ستاروں کی موسیقی! اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

دیوی چاند کی کرنوں پر اڑی جا رہی تھی۔ اب اس کے ہاتھوں میں اپنی وچتر وین تھی۔ اور وہ اپنی وین پر کوئی ان جانا آکاش وانی راگ چھیڑ رہی تھی۔ اب بھی دیوی کی مہربان نگاہیں اس پر جمی تھیں۔ دیوی کا حسین ترین روپ اس کے سامنے تھا۔ اور دیوی اپنی وین چھیڑتی ہوئی چاند کی کرنوں پر آکاش کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

کتنی حسین موت تھی، کتنی حسین موت تھی!

ہم سے نہ بیتی جائے عمریا...

آشرم میں ایک نئی لڑکی داخل ہوئی تھی۔ اس نے اتنی کم سنی میں جیون بھر کنوارا رہنے کی سوگند کھائی تھی۔ وہ آشرم کی سب سے اچھی سیوک تھی۔ اس نئی لڑکی کا نام رادھے تھا!

چاندنی راتوں میں جانے اسے کیا ہو جاتا تھا۔ وہ آشرم سے باہر گھنٹوں بیٹھی کسی کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ جیسے اب بھی کوئی واپس آئے گا۔ پونم کی راتوں کو وہ بے چین، باوری سی ہو جایا کرتی تھی۔ کیوں کہ ان راتوں کو وہ ایک عجیب سا سپنا دیکھتی، ہمیشہ ایک ہی سا سپنا...

مگدھ اور بدیسہ کے درمیان کی سڑک کے اس پار چھوٹی سی پہاڑی پر ایک کٹیا تھی۔ کٹیا کے سامنے بانس کے درختوں کا ایک جھنڈ اور اس جھنڈ میں پورنیا کی چاندنی میں ایک پتھر کا مجسمہ نظر آتا تھا، جس کی شکل ہو بہو اس کے شیام سے ملتی تھی۔ اور پون چلتی تو اس مجسمہ کے پاس کی بانسوں سے ایسی آواز نکلتی جیسے بانسری پر کوئی میگھ ملہار چھیڑ رہا ہو:

تنہائی میں تیری یاد جیسے ایک سریلی دھن
جیسے چاند کی ٹھنڈی لو جیسے کرنوں کی کن من
جیسے جل پریوں کا ناچ!*

●●●

* ناصر کاظمی

آرفیوس، یوریڈیس

بربط کے تاروں سے ایک نہایت میٹھی، مدھر لے نکلی اور جھیل کے پانیوں سے ٹکرائی، موسیقی کی لہریں جھیل کی لہروں کو کاٹتی ہوئی نیچے تہہ تک اترتی چلی گئیں۔

جھیل کی ساری جل پریاں ابرنیساں کے قطروں کو سیپیوں میں گرتے ہوئے دیکھنے میں محو تھیں۔ ابرنیساں سے ایک گول، موٹا سا قطرہ کسی سیپ میں گرتا اور اپنی کوکھ کی گہرائیوں میں اس قطرے کو چھپائے سیپ آپ ہی آپ بند ہو جاتی۔

جانے یہ کیا راز تھا کہ یہ پانی کا قطرہ سیپ کی کوکھ سے موتی بن کر نکلتا تھا!

جل پریاں سوچ رہی تھیں کہ ابرنیساں کے یہ قطرے سیپیوں میں ایک عرصے تک چھپے رہیں گے اور پھر ان سیپیوں سے سچے موتی نکلیں گے، مکمل، گول، نہایت حسین اور آبدار موتی! اور ان موتیوں کو وہ نقرئی تاروں میں پروئیں گی اور ان کی لڑیاں بنا کر اپنے گلوں میں اور نازک نازک کلائیوں میں پہنیں گی، اپنی سڈول مرمریں باہوں پر موتیوں کی لڑیاں لپیٹیں گی... جل پریاں جو خود موتی مونگے کی بنی معلوم ہوتی تھیں، اس مدھرت سے سرشار، جھیل کے پانیوں میں رقص کرنے لگیں۔

اور اچانک غیر معمولی، سحر انگیز موسیقی کی لہریں ان کے کانوں سے ٹکرائیں اور ساری جل پریاں بے چین ہو کر سطح آب پر تیر آئیں۔

اور پھر انھوں نے بربط بجانے والے کو دیکھا اور یہ دیکھ کر کہ وہ کون ہے، ان کے

دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

''اری دیکھ تو یہ کون ہے۔'' وہ مضطرب اور مشتعل ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔ ''یہ آرفیوس ہے ری، آرفیوس۔ اپالو کا سلونا بیٹا!''

''ہاں ہاں۔ موسیقی کے دیوتا اپالو کو بھی شاعری کی میوز سے محبت ہو گئی تھی۔ اور آرفیوس اسی میوز کا بیٹا ہے۔''

''یوں معلوم ہو رہا ہے ساری کائنات اس کی موسیقی کے سحر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ بھلا جس کی پیدائش موسیقی اور فن کے دیوتا اور شاعری کی دیوی کے ملاپ سے ہوئی ہو اس کی موسیقی میں یہ سحر کیوں نہ ہو!''

ایک جل پری بڑی گمبھیرتا اور شان سے بولی۔ یہ جل پری یوریڈیس تھی، جوان ساری جل پریوں میں سب سے زیادہ حسین تھی، اور ان جل پریوں کی شہزادی معلوم ہوتی تھی۔

آرفیوس کو ادھر آتا دیکھ کر ساری جل پریاں جھیل میں غوطہ لگا گئیں۔ صرف یوریڈیس بغیر کسی جھجک کے اوپر ہی، سطح آب پر کھڑی رہی۔

''چلی آ، یوریڈیس، واپس چلی آ۔'' گہرے پانیوں میں اترتی ہوئی اس کی سہیلی کی جیسے کہیں دور سے آواز آئی۔

''نیچے چلی آ یوریڈیس، ورنہ دیکھ تو پچھتائے گی۔ بھلا ہم جل پریوں کا دیوتاؤں کے بیٹوں سے کیا ملاپ؟''

''تم نیچے اپنے سیپیوں اور موتیوں کے جل محل میں چلی جاؤ، میں یہیں اوپر، سورج کی دنیا میں رہوں گی!''

''سورج کی دنیا ہمارے لیے نہیں ہے یوریڈیس!''

''لیکن میں اسے اپنا لوں گی۔ میرا مقدر میرے ساتھ ہے۔ میں اپنی تقدیر کی آپ مالک ہوں!''

یوریڈیس کا اٹل فیصلہ سن کر اس کی سہیلی نیچے اتر گئی۔ دوسری سب جل پریاں

یوریڈیس کے انتظار میں جھیل کی نصف گہرائیوں میں ادھر ادھر تیرتی پھر رہی تھیں۔ یوریڈیس کی سہیلی نے اس کا جواب انھیں سنایا تو جل پریوں کی ٹولی نیچے اپنے سیپیوں کے جل محل میں چلی گئی۔

صرف یوریڈیس اوپر رہ گئی، جھیل کی سطح پر۔

اور اس وقت، نیلے پانیوں پر کھڑی ہوئی یوریڈیس اتنی حسین لگ رہی تھی، اتنی حسین کہ جب آرفیوس نے اسے دیکھا تو اسے یوں گمان ہوا جیسے نیلے پانیوں پر کنول کے پھولوں کے درمیان، سفید جھاگ میں سے اچانک وینس ابھر آئی ہو!

دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اور اسی سے درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے چھپے ہوئے شریر، ننھے کیوپڈ نے اپنی کمان کھینچی۔ کیوپڈ کی تنی ہوئی کمان سے یکے بعد دیگرے دو سنہرے تیر نکلے اور یہ سنہرے تیر آرفیوس اور یوریڈیس کے سینوں میں ایک ساتھ پیوست ہو گئے۔

اپنی موسیقی کے سحر سے ساری کائنات کو مسحور کرنے والا آرفیوس خود مسحور ہو کر آگے بڑھا۔ اور یوریڈیس بھی جھیل کے پانیوں پر چلتی ہوئی دھرتی پر آ گئی۔ اس کے ننگے پیروں کے تلووں میں ٹھنڈی، سبز مخملیں گھاس کی خنکی بڑی راحت بخش اور بھلی معلوم ہو رہی تھی کیوں کہ زندگی میں پہلی بار وہ زمین پر آئی تھی!

''آپ کون ہیں؟ دیوی؟ جل پری؟''

''دیوی کہاں؟ میں تو ایک معمولی جل پری ہوں۔ اور... اور میں جانتی ہوں آپ کون ہیں۔''

''بھلا بتایئے میں کون ہوں؟''

''آپ آرفیوس ہیں، دیوتا اپالو کے بیٹے۔'' اور آرفیوس کی نظریں اپنے چہرے پر جمی دیکھ کر یوریڈیس نے شرم سے اپنی نظریں جھکا لیں۔ آپ کے باپ موسیقی کے دیوتا ہیں اور ماں شاعری کی دیوی۔ بھلا دیوتاؤں کے بیٹوں کا ہم جل پریوں سے کیا ملاپ؟''

''آپ بھی تو کیالپسو کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہی کیالپسو جس نے آٹھ سال تک یولی سس کو اپنے دام محبت میں گرفتار کر رکھا تھا۔ کیالپسو جسے خداؤں نے لاثانی حسن اور سدا بہار جوانی عطا کر رکھی ہے؟''

''نہیں آرفیوس، نہیں۔ میں تو ایک معمولی جل پری ہوں۔ کیالپسو جل پری ہوتے ہوئے بھی ایک دیوی ہے۔''

''پھر بھی آپ حسین ساحراؤں کی اسی قبیل سے ہیں۔ ابھی دیکھیے میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا ہے اور جانے ابھی سے میرے سینے میں یہ کیا جذبہ بیدار ہو گیا ہے۔ آپ نے تو مجھے پہلی ہی نظر میں مسحور کر دیا۔ آپ نیلگوں کی ساحرہ! کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟''

یوریڈیس نے اپنی حسین آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ وہ جو جھیل کے پانیوں کی طرح نیلی تھیں۔ اور اپنی خوبصورت زلفیں، جن میں ایسی ہی لطیف لہریں تھیں جیسے جھیل کے پرسکوں سطح آب پر پیدا ہوتی ہیں، اور جو سورج کی کرنوں کی طرح چمکیلی اور سنہری تھیں۔ اپنی منور پیشانی اور نازک صراحی دار گردن پر سے پیچھے ہٹا کر نرمی سے کہا:

''یوریڈیس، مجھے یوریڈیس کہتے ہیں۔''

''یوریڈیس، یوریڈیس'' آرفیوس نے یہ نام زیر لب دہرایا۔ یوریڈیس، تم آبی دنیا کی پری ہو اور میں سورج کی دنیا میں دیوتاؤں کا بیٹا ہوں۔ کیا ہمارا ملاپ ممکن نہیں؟ ضرور ممکن ہے۔ تم بھول جاؤ کہ ہم میں کوئی امتیاز ہے۔ میں تمھیں اپنانا چاہتا ہوں۔''

یوریڈیس شرما گئی اور کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اس کی شرم میں، جس نے اس کے حسین گالوں پر گلال پھیر دی تھی، اثباتی جواب موجود تھا۔

''یوریڈیس، میں ایک بھولا بھٹکا راہی ہوں۔ بہت دور سے تمھاری اس حسین، شاداب وادی میں چلا آیا ہوں۔ پیاسا ہوں۔ تمھارے جل محل میں ایک پیاسے مسافر کے لیے کچھ راحت کا سامان ہے؟''

یوریڈیس یہ سن کر تیر کی طرح بھاگ نکلی اور جھیل میں ایک چھلانگ لگا کر اندر چلی

گئی۔ آرفیوس کو یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بجلی کوند گئی ہو۔

آن کی آن میں یوریڈلیس پھر نیلے پانیوں کی سطح پر ابھر آئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک جام تھا اور بلوریں صراحی۔ بلوریں صراحی میں ایک آتشیں سیال تھا جس کا رنگ شعلوں کا سا سرخ تھا۔ وہ اپنے آرفیوس کے لیے نکتار لے آئی تھی۔ نکتار اور امبروزیا، دیوتاؤں کی غذا تھی۔ بڑی نایاب اور لذیز، لیکن اس کا آرفیوس تو دیوتاؤں کا بیٹا تھا، اور وہ چاہتی تھی اسے ایسا مشروب پلائے جو دیوتاؤں کے شایان شان ہو۔

وہ دونوں ایک ٹیلے پر بیٹھ گئے اور یوریڈلیس اپنے نازک ہاتھوں سے یہ رنگین مشروب بلوریں صراحی سے جام میں انڈیلتی رہی، اور آرفیوس کو پلاتی رہی۔ قرمزی رنگ کے اس مشروب میں ہلکا سا نشہ تھا اور شہد کی شیرینی!

نکتار کے گھونٹوں نے آرفیوس کو تازہ دم کر دیا، اور اس نے پھر اپنی بربط اٹھالی اور اس کے تاروں کو چھیڑنا شروع کیا اور اس کی بربط سے ایسے شیریں نغمے پھوٹنے لگے جیسے اس سے پہلے کبھی نہ پھوٹے تھے۔ کیوں کہ اب ان میں محبت کی چاشنی شامل ہو گئی تھی!

اور وہ دونوں یونہی ملتے رہے۔ یلیزین وادی کے حسن اور موسیقی کے سحر نے انھیں قریب سے قریب تر کر دیا۔

اور دیوی جونو کو ان محبت کے دیوانوں پر ترس آ گیا اور اس نے آرفیوس اور یوریڈلیس کو ایک ایسے بندھن میں باندھ دیا جو جیون بھر ٹوٹ نہ سکے!

اور وہ دونوں اب ایک دوسرے کے جیون ساتھی تھے۔

شادی کے نئے نئے دن تھے اور ان دونوں متوالوں کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی کی ساری خوشیاں انھیں پر ختم ہو گئی ہوں۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں مگن، کھوئے ہوئے، دنیا و مافیہا سے بے خبر یلیزین کی اس حسین وادی میں یوں رہنے لگے جیسے آدم و حوا اپنی پہلی معصومیت میں، ایڈن کے بہشتی چمن میں رہا کرتے تھے۔

یلیزین وادی نہایت سرسبز و شاداب اور بلا کی زرخیز تھی، پھلوں پھولوں سے ہمیشہ

لدی رہتی تھی، ہر طرف مخملیں دوب کے زمردیں قطعے تھے، شفاف جھرنے تھے، چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اس وادی کو اپنے دامن میں لیے ہوئی تھیں۔

یوریڈیس زمین پر چلتی تو مخملیں، سبز، ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس اس کے قدموں میں بچھی جاتی، کہ ہمیشہ پانی میں رہنے کے عادی یہ نازک پاؤں زمین کی سختی محسوس نہ کریں۔ درختوں کی ڈالیوں سے لذیذ پکے، میٹھے پھل اس کے ہاتھوں میں آپ ہی آپ آجاتے تھے۔ اور خود رو پھول اپنی نازک ٹہنیوں سے جھک کر اس کے کومل پیروں کو چوم چوم لیتے تھے۔

اور یوریڈیس اپنی آبی دنیا، اپنے سیپیوں کے جل محل اور اپنی سہیلی جل پریوں کو تقریباً بھلا چکی تھی۔ یہ سورج کی دنیا تھی، یہ حسین اور سرسبز وادی، آرفیوس کی بے پناہ محبت اور آرفیوس کی سحر انگیز موسیقی!

آرفیوس موسیقار بھی تھا اور شاعر بھی۔ باپ سے اس نے موسیقی وراثت میں پائی تھی اور ماں سے شاعری! وہ اپنی بربط کے تاروں کو چھیڑتا ہوا اپنے گیت گنگناتا۔ اس کی آواز میں بھی وہی جادو تھا جو اس کی بربط کی لے میں تھا۔ ساری وادی پر اس کی موسیقی کا سحر چھایا ہوا تھا۔ درختوں کی شاخیں اس کے شیریں نغموں سے مسحور نیچے جھک آتیں، اور آرفیوس اور یوریڈیس پر اپنا سایہ پھیلا دیتیں۔ جنگل سے ہر نوع کے جانور اس کی موسیقی کے سحر سے کھنچے چلے آتے۔ شیر، چیتے، بڑے اطمینان اور امن سے بھیڑ بکریوں کے پاس ہی بیٹھے رہتے۔ اور ایک ناگ کہیں سے نکل آتا اور آرفیوس کی بربط کی لے پر مست جھومنے لگتا۔

رات ہوتی تو سب جانور جنگل کو لوٹ جاتے اور آرفیوس اور یوریڈیس وادی میں گھومتے ہوئے، ٹھنڈی پرسکون چاندنی سے لطف اندوز ہوتے اور چاندنی میں آرفیوس کی موسیقی کا سحر دوبالا ہو جاتا۔ یوریڈیس آرفیوس کے اس کمال پر تحسین کے پھول نچھاور کرتی۔ لیکن آرفیوس کہتا:

''یقین کرو یوریڈیس اس سے پہلے میرے نغمے کبھی اتنے شیریں نہ ہوتے تھے، اور نہ میرے شعروں میں یہ حسن ہوتا تھا۔ مانا کہ میرے یہ جوہر فطری ہیں اور اپنے والدین

سے ورثہ میں ملے ہیں، لیکن اس فطری جوہر کو جلا دینے والی تم ہو یوریڈیس! تم میرے وجدان کا سرچشمہ ہو، میری موسیقی کی روح ہو!''

موسیقی کی روح؟

میں موسیقی کی روح ہوں!

یوریڈیس چاندنی میں ٹھنڈی گھاس پر لیٹے لیٹے مدہوش سی ہو جاتی اور آرفیوس اسے اپنے پہلو میں لپٹائے، سوئے ہوئے بھی بربط کے تاروں کو چھیڑتا رہتا۔ بڑے ہلکے سروں میں، تاکہ اس کی یوریڈیس کو میٹھی نیند آ جائے۔ اور یوریڈیس کے کانوں میں ایک مدھر راگنی گونجتی رہتی اور وہ گہری، میٹھی نیند کی دنیا میں کھو جاتی۔ آرفیوس چاند کی روشنی میں اس خوابیدہ حسن کو دیر تک دیکھتا رہتا۔ اور پھر اس کی آنکھیں بھی نیند کے نشہ سے بوجھل ہو کر بند ہو جاتیں لیکن گہری نیند میں بھی اس کی انگلیاں اضطراری طور پر بربط کے تاروں کو چھیڑتی رہتیں۔

ان دونوں کی زندگی کتنی حسین تھی!

لیکن حسین زندگی ایک خواب ہوتی ہے۔

اور جیون سپنے ٹوٹ جاتے ہیں!

یوریڈیس! یوریڈیس! یوریڈیس!

ایک درد میں ڈوبی ہوئی، چوٹ کھائی ہوئی، زخمی آواز پھڑپھڑا کر ساری وادی میں گونجتی ہوئی، جھیل کی لہروں سے ٹکرائی۔

جھیل کی ساری جل پریاں ایک بار پھر بے چین ہو کر سطح آب پر تیر آئیں۔

''اری یہ تو آرفیوس کی آواز ہے۔ کیسی چوٹ کھائی ہوئی ہے۔ ہماری یوریڈیس کو کچھ ہو نہ گیا ہو!''

جل پریاں جو آبی دنیا میں یوریڈیس کی غیر موجودگی کو بری طرح محسوس کرتی تھیں اور اس کی جدائی کو سہہ نہ سکتی تھیں۔ یوریڈیس سے پھر ملنے کی آرزو لیے جھیل سے نکل کر زمین پر اتر آئیں۔ ان کی ٹولیاں یوریڈیس کو ساری وادی میں ڈھونڈتی پھریں۔ درختوں

کے جھنڈوں میں تلاش کیا۔ کچھ پہاڑیوں کے اوپر چڑھ گئیں۔ ٹیلوں کے پیچھے دیکھا، اور اچانک اس کی سہیلی کی نظر یوریڈیس پر پڑی جو ایک ٹیلے کے نیچے گھاس پر پڑی ہوئی تھی، بے جان سی۔ اس کا سر آرفیوس کے زانوؤں پر تھا اور آرفیوس اسے اس طرح پکارے جا رہا تھا، جیسے اس کا دل پھٹا جا رہا ہو!

یوریڈیس! یوریڈیس! یوریڈیس!

''کیا ہو گیا ہماری یوریڈیس کو؟'' مضطرب ہو کر سب نے بیک وقت اس سے سوال کیا۔

''میں کچھ نہیں جانتا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔''

وہ پاگل سا ہو رہا تھا۔

کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یوریڈیس امر اور لافانی نہیں ہے۔ جل پریاں تو عموماً لافانی ہوا کرتی ہیں۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یوریڈیس فانی ہے۔ میں اپنے باپ دیوتا اپالو کے پاس سے امبروزیا مانگ لاتا، اور ہر روز رات کو جب وہ سوئی ہوئی ہوتی، اس کے حسین جسم کے ہر حصہ پر امبروزیا مل کر اسے آگ کے پاس رکھ دیتا۔ اور اس آگ میں اس کا فانی وجود پگھل جاتا، اور وہ رفتہ رفتہ لافانی اور امر ہو جاتی۔

اور کوئی زبردست طاقت، حتیٰ کہ موت بھی میری یوریڈیس کو مجھ سے چھین نہ سکتی! اب بے رحم موت نے میری یوریڈیس کو ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا کر دیا ہے۔

میری روح مجھ سے چھین لی ہے!

کیا واقعی یوریڈیس مر چکی تھی؟ جل پریوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ انھوں نے یوریڈیس کا پنڈا چھو کر دیکھا۔ برف کی مانند سرد تھا، اور وہ دل جو کبھی تیزی سے دھڑکا کرتا تھا، خاموش تھا۔

لیکن موت میں بھی وہ کتنی حسین اور شگفتہ معلوم ہو رہی تھی!

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گہری نیند سوئی ہوئی ہو، میٹھے سپنوں میں کھوئی ہوئی، اس

کی سنہری زلفیں اس کے مرمریں شانوں پر پریشان تھیں، گلابی ہونٹ ادھ کھلے غنچے کی طرح نیم وا تھے۔ شاید مرتے وقت آرفیوس کا نام اس کے لبوں پر تھا۔ اور ان ہونٹوں پر ایک لطیف سی معصوم مسکراہٹ منجمد ہوگئی تھی۔ اس کے چہرے پر آکاش کی اپسراؤں کا حسن تھا۔

موت میں بھی وہ کتنی حسین لگ رہی تھی!

لیکن وہ مری کیسے؟

یوریڈیس کی سہیلی کی نظر اسکے کومل پاؤں کے تلوے پر پڑی۔ ''یہ دیکھو'' وہ چیخ اٹھی۔ تلوے پر ایک ہلکا سا زخم تھا۔ خون کی ایک لکیر نیچے بہہ گئی تھی اور زخم کے آس پاس جلد نیلی ہو چکی تھی۔

''زہر، سانپ۔''

''سانپ، سانپ، سانپ!'' وہ سب چلا اٹھیں۔ ''یوریڈیس کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ زہر چوس ڈالو، جلدی سے زہر چوس ڈالو!''

نہیں اب کوئی فائدہ نہیں، وہ مر چکی ہے۔

وہ مر چکی ہے!

سانپ، سانپ، سانپ؟

سانپ نے یوریڈیس کو ڈس لیا ہے؟ آرفیوس اپنی دیوانگی سے چونکا۔ سانپ، یعنی وہی ناگ جو اس کی بربط کی لے پر مست جھومتا رہتا تھا، جو یوریڈیس کے قدموں میں لوٹا کرتا تھا، وہ ناگ یوریڈیس کو کیسے ڈس سکتا تھا؟ اس طرح کہ وہ ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سو جائے؟

سانپ؟ جو یوریڈیس کے حسن سے بھی اتنا ہی مسحور تھا جتنا آرفیوس کی موسیقی سے۔ سانپ، جو یوریڈیس کو دیکھ کر...

جب میں نے اسے دیکھا، وہ مجسم معصومیت تھی!

وہ مکمل تھی!

اس کی روح گویا جسم کی سرحد پر حیران کھڑی تھی!*

وہ مکمل تھی، وہ معصوم تھی!

اور اس تکمیل کو توڑنے، اس معصومیت کو ملوث کرنے کے لذت آگیں تصور سے میں آگے بڑھا کہ اسے ترغیب دوں اور اچانک میں نے محسوس کیا وہ خود سراپا ترغیب تھی!

تو پھر ترغیب آسان تھی۔ اور میں نے اسے اس درخت کا ثمر کھانے کی ترغیب دی جوان کے لیے ممنوعہ تھا۔ کہا کہ اس کے کھانے پر ان پر سارے علوم روشن ہو جائیں گے۔ اور وہ ابدی، لافانی ہو جائیں گے!

انھوں نے وہ پھل کھالیا اور پھر انسان کو نیکی اور بدی کے علم سے آگاہی ہوئی۔

اور اس پہلے گناہ کے بعد انسان کی افتاد واقع ہوئی۔

---

* Eve, as once I came upon her,
Among her first thoughts stood forlorn,
To Spirits her lips parted were
Before me stood this perfect one,
Her flank, vast and with gold over-run,
Of sun or man without a fear;
Offered to any air that scanned,
The soul still stupified, as it were,
At a loss on flesh's borderland.

Yea! from my leafy pst above
Reptile tasting bird like bliss,
Even the while my chettering wove
The net work of its williness,
Unlistening beauty, I drank you in.
Heavy with charms, limpid, serene,
I dominated furtively,
Eying your burning golden wool
Your nape, inscrutable and full
Of all your motions secrecy.

(رسالہ 'سویرا' میں جب یہ افسانہ پہلی بار شائع ہوا تو یہ نظم درج تھا جسے بعد میں حذف کر دیا گیا)

اور موت، * انسان پر عیاں ہوئی!

اور پھر خداوند نے سانپ سے کہا:

''تیری سزا یہ ہوگی کہ تو زندگی بھر پیٹ کے بل گھسٹتا چلے گا۔ تیری نسل میں اور انسان کی نسل میں ہمیشہ دشمنی ہوگی۔ وہ تیرا سر کچلے گا تو اسے ڈس لے گا....

سانپ نے یوریڈیس کو کیسے ڈس لیا تھا؟ وہی سانپ جوان دونوں کے سامنے مسحور، مست جھومتا رہتا تھا۔ جب وہ دونوں ساتھ ہوتے تھے، اس نے دونوں کو کیوں نہ ڈس لیا۔ کاش اس نے دونوں کو ایک ساتھ ڈس لیا ہوتا، وہ دونوں ایک ساتھ مرتے، اور ان کی روحیں ایک ساتھ رہتیں! آرفیوس، یوریڈیس کا سر اپنے زانوؤں پر لیے، اس کا زخمی پاؤں اپنے ہاتھ میں لیے تڑپتا رہا!

(ساوتری اپنے پتی کا سر زانوؤں پر لیے بیٹھی تھی۔ غم سے اس کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ اس کے پتی کو ایک ناگ نے ڈس لیا تھا۔ اس کا نیا نیا سہاگ لٹ گیا تھا۔ اس کا سارا جیون سونا ہو گیا تھا... پیا بن اس کی عمریا کیسے بیتے گی۔ یہ جیون بھر کا دکھ اس سے کیسے سہا جائے گا؟

آج اس کی سہاگ رات تھی، اور آج اس کے پیتم کا یہ انگ چتا کی اگنی میں جلا دیا جائے گا۔

ناگ کو ڈسنا ہی تھا تو اس نے دونوں کو کیوں نہ ڈس لیا۔ کاش وہ ناگ پھر آئے، ساوتری کو بھی ڈس لے، تاکہ ان دونوں کی آتمائیں...

ایک ڈراؤنی چھبی ساوتری کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

یہ موت کا دیوتا یاما تھا۔ جو اپنا حق لینے آ گیا تھا۔

---

* یونانی Mythology میں گناہ سے پہلے کی معصومیت، بنیادی گناہ، اور گناہ سے موت کے عیاں ہونے کا تصور نہیں ہے۔ یہ تصور یہودیت، عیسائیت، اسلام اور دوسرے بڑے مذہبوں میں پایا جاتا ہے۔ اس سانپ کی مطابقت سے جو آرفیوس کی موسیقی پر جھومتا تھا، اور جس نے یوریڈیس کو ڈس لیا تھا، میں نے بنیادی گناہ کی اس انجیلی symbolism سے مناسبت پیدا کی ہے۔ م۔ ش۔

"آج میری سہاگ رات ہے دیوتا! میرے پتی کو تم کیسے چھین سکتے ہو۔ اسے لے جانا ہو تو مجھے بھی ساتھ لے جاؤ۔" ساوتری نے رو رو کر موت کے دیوتا سے پرارتھنا کی۔

"دیوتا! آج میری سہاگ رات ہے۔ میں تم سے اپنے سہاگ کی بھیک مانگتی ہوں! میرا پتی مجھے واپس دے دو۔"

دیوتا ہنسا۔ ایک خوفناک تحقیر بھری ہنسی!

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی مرنے کے بعد پھر جیون پا سکے؟ کوئی میرے پاس آئے اور اسے واپس لوٹا دوں؟ میں موت کا دیوتا ہوں۔ اور موت ایک ایسی طاقت ہے، جس سے کسی کو گریز نہیں، جس پر کوئی فتح نہیں پا سکتا۔ ہے کوئی ایسی طاقت جو موت پر فتح پا سکے؟"

"ہاں ہے۔ اور وہ پریم ہے۔" ساوتری نے ایک گمبھیرتا سے سر اونچا کر کے کہا۔

"اور میری پریت اتنی سچی، اتنی گہری ہے کہ موت پر بھی اس کی جے ہوگی۔"

"اچھا جا، تجھے اپنی بھیک مل گئی۔ تیرا سہاگ تجھے واپس دیتا ہوں۔"

موت کا دیوتا یاما یہ کہہ کر غائب ہو گیا۔ اور ساوتری کو اس کا سہاگ واپس مل گیا۔ ساوتری کی پریت کی شکتی نے موت پر جے پائی!

اور موت کے دیوتا یاما نے ساوتری کے پتی کا جیون...)

میں موت کے دیوتا پلوٹو سے اپنی یوریڈیس کی زندگی کی بھیک مانگوں گا۔ اپنی اتھاہ، بے کراں محبت کا واسطہ دے کر۔ لیکن موت کے دیوتا کو محبت سے کیا واسطہ؟

کاش مجھ میں ہرکولیس کی قوت ہوتی، کہ میں یوریڈیس کو موت کی زیر زمیں اندھیاری دنیا سے واپس لا سکتا۔ جیسے ہرکولیس موت کے دیوتا سے لڑ کر آل سس ٹس کی روح کو روحوں کی اندھیاری دنیا سے واپس لے آیا تھا۔

مجھ میں وہ قوت بازو کہاں؟ لیکن میں بھی دیوتا اپالو کا بیٹا ہوں۔

میں سورج کی روشن دنیا کے سارے دیوی، دیوتاؤں سے مدد مانگوں گا!

آرفیوس نے یوریڈیس کے مردہ جسم کو اس کی سہیلیوں کے حوالے کیا کہ اسے موت

کے آخری سفر کے لیے تیار کریں، اور آپ دیوتاؤں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

جل پریاں رورو کر بین کرنے لگیں۔

''ہائے یوریڈلیس، تو ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئی!''

''میں نہ کہتی تھی یوریڈلیس، سورج کی دنیا ہمارے لیے نہیں ہے۔ تو پچھتائے گی۔ تو ہماری آبی دنیا میں ہوتی تو یوں نہ مرتی۔ اور مرتی بھی تو جھاگ بن کر جھیل کے پانیوں میں تحلیل ہو جاتی۔ اب تجھے ہم اس آخری سفر کے لیے کیسے تیار کریں؟ تیرے اس حسین جسم کو کیسے منوں مٹی کے سپرد کریں؟''

اپالو اپنے سنہرے رتھ میں سوار گھوڑے دوڑائے جا رہا تھا۔ آرفیوس نے آگے بڑھ کر سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی باگ تھام لی۔

''اپنی رتھ روک لو، مقدس باپ! آپ کا بیٹا ایک زخمی دل لیے آپ سے ایک بھیک مانگنے آیا ہے۔''

''کیا بات ہے، آرفیوس؟ آج کچھ رنگ دگر ہے۔ بڑے پریشان معلوم ہو رہے ہو۔''

''میری بیوی یوریڈلیس مر چکی ہے، مقدس باپ، مجھے کسی طرح اس کی زندگی واپس دلوا دو۔''

''تم نے بہت دیر کی، بیٹے۔ پہلے کیوں نہ مجھ سے امبروزیا مانگ لے گئے۔ تم یہ جانتے تھے کس طرح امبروزیا سے فانی کو لافانی بنایا جا سکتا ہے۔''

''میں کیا جانتا تھا، مقدس باپ، کہ وہ لافانی نہیں ہے۔''

''اب کچھ نہیں ہو سکتا، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا؟ آپ دیوتا ذیوس کے بیٹے ہیں، جو خداؤں کا خدا ہے۔ بھلا ذیوس کے حکم کے سامنے پلوٹو کی کیا چلے گی۔''

''ذیوس کی گرج دار برق پلوٹو کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ پلوٹو اپنی روحوں کی دنیا کا خود مختار بادشاہ ہے۔ وہاں صرف اس کی بادشاہت چلتی ہے۔ خداؤں کے خدا ذیوس بھی اسے

مجبور نہیں کر سکتے۔"

اور اپالو آرفیوس کو یونہی مغموم چھوڑ کر، اپنی رتھ بڑھائے آگے چلا گیا۔

دیوی آرٹیمس سارے ہتھیار تھامے، آنکھوں سے آگ برساتی، سامنے سے گزری۔

"دیوی آرٹیمس، آپ جنگ کی دیوی ہیں۔ مجھے اپنا کوئی ہتھیار دے دیجیے تاکہ میں موت کے دیوتا سے جنگ کر سکوں!"

"موت کے دیوتا کے ساتھ جنگ میں میرا کوئی ہتھیار کام نہیں آئے گا۔"

دیوی آرٹیمس نے بھی وہی مایوس کن جواب دیا۔

"دیوی آرٹیمس، آپ نے افی جی نیا کو دوبارہ زندہ کر کے اسے دوسری زندگی بخشی تھی۔ یوریڈیس کو بھی دوسری زندگی بخشیے۔"

"لیکن افی جی نیا تو مری نہیں تھی۔ میں نے اسی وقت اسے زندہ اٹھالیا تھا، جب وہ میرے آلٹر پر قربان کی جانے والی تھی۔"

دیوی آرٹیمس ہتھیار تھامے چلی گئی۔

افروڈائٹ، حسن مجسم ایک عجیب شان سے کھڑی تھی!

آرفیوس دیوانہ وار اس کی طرف بھاگا اور دیوی کے پیروں پر گر گیا۔

"دیوی افروڈائٹ، آپ کے سوا اور کوئی میری مشکل کشائی نہیں کر سکتا۔"

"محبت کیا ہوتی ہے، یہ صرف آپ جان سکتی ہیں۔ میرے دل کا زخم صرف آپ دیکھ سکتی ہیں۔"

دیوی افروڈائٹ، آپ محبت کی دیوی ہیں! آپ یہ کیسے گوارا کر سکتی ہیں کہ محبت مر جائے؟"

ایک فاتحانہ مسکراہٹ دیوی افروڈائٹ کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ اور دیوی نے اپنی بلندیوں سے اپنے پاؤں پر پڑے ہوئے آرفیوس کو دیکھا اور کہا:

"محبت تو امر ہے۔ محبت کیسے مر سکتی ہے؟ محبت نہیں مری، یوریڈیس مر گئی ہے۔

موت نے تمھاری محبت کو اور گہرا کر دیا ہے، تمھاری تڑپ اور بڑھا دی ہے، اور یہ میری فتح ہے!"

"آپ ایک زخمی دل کی کراہ، نالہ وفغاں کو محبت کی فتح سمجھتی ہیں؟ کیا آپ یہ نہیں چاہتیں کہ محبت زندہ و جاندار ہو؟"

"چاہتی ضرور ہوں، لیکن میں اس معاملے میں تمھاری کچھ مدد نہیں کر سکتی۔ مجھے تو تمھیں جو کچھ دینا تھا وہ تحفہ تمھیں بخش دیا تھا....

جانتے ہو نا میرا تحفہ کیا ہوتا ہے؟ اور پیرس کو میں نے تحفہ میں کیا دیا تھا؟

الوہی حسن کو اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ عریاں دیکھ کر پیرس مبہوت ہو گیا تھا۔ اس کے سامنے تین دیویاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین! انھوں نے اپنے دیویوں کے لبادے اتار ڈالے تھے۔ اور بالکل برہنہ ہو گئی تھیں تا کہ وہ انھیں اچھی طرح جانچ سکے کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ حسین ہے۔

پیرس ایک سے دوسری کو پھر دوسری سے تیسری کو دیکھتا رہا۔ وہ بوکھلا گیا تھا اور اسے سوجھ نہیں رہا تھا کہ کس کا انتخاب کرے اور کسے سب سے زیادہ حسین ہونے کا اعزاز عطا کرے۔ کیوں کہ ان میں سے ہر ایک اپنے انداز میں حسن کا مکمل نمونہ تھی!

پھر ہیرا آگے بڑھی۔ اس نے پیرس سے کہا: "تم مجھے انتخاب کرو گے تو میں تمھیں بے پناہ اقتدار دوں گی۔ انسان اقتدار کا بھوکا ہے۔ اور اس کے لیے کیا کچھ نہیں کر بیٹھتا! بولو تمھیں اقتدار چاہیے؟"

ہیرا زیوس کی بیوی تھی اور وہ جتنا چاہے اسے اقتدار بخش سکتی تھی! پھر اتھینے (Athene) آگے بڑھی اور پیرس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی:

"میں تمھیں علم و دانش سے مالا مال کر دوں گی، میں علم و دانش کی دیوی ہوں۔"

میں چپ چاپ کھڑی یہ تماشہ دیکھتی رہی۔ میں جانتی تھی فتح میری ہو گی۔ آخر میں حسن و محبت کی دیوی ہوں۔ مجھ سے بڑھ کر حسین کون ہو گا؟

اور مجھے یہ بھی پورا یقین تھا پیرس کو میرا تحفہ سب سے زیادہ پسند آئے گا۔ میں جو کچھ اسے دے سکتی تھی پیرس کو اس کی سب سے زیادہ ہوس تھی۔ اقتدار و حکومت اور علم و دانش کی نہیں۔

میں اپنی جگہ کھڑی رہی اور اشارے سے پیرس کو اپنے پاس بلایا۔ اور اپنی ساری اداؤں اور رعنائیوں کی اس کے سامنے نمائش کرتے ہوئے کہا: ''اور جانتے ہو میں تمھیں کیا دے سکتی ہوں؟''

اور پھر اس کی بوکھلاہٹ اور تجسس کے اضطراب سے پورا فائدہ اٹھا کر، آہستہ آہستہ، ایک ایک لفظ تول کر کہا:

''میں تمھیں یونان کی حسین ترین عورت تحفہ میں دوں گی!''

پھر تو یہ قیاس کرنا آسان ہے کہ پیرس کو میں نے جیت لیا۔ اس نے مجھے سب سے زیادہ حسین ہونے کا اعزاز بخشا، اور میں نے اپنے وعدے کے مطابق یونان کی حسین ترین عورت اسے تحفے میں دی۔

وہ ہیلن تھی، حسن کی سمبل!

اور اس حسن کی پیدائش رات اور دن کے ملاپ سے ہوئی تھی۔

اس کی ماں لیڈا ایک جل پری تھی۔ اور جانتے ہو لیڈا کیسی تھی؟

She walks in beauty like the night*!

وہ رات کی طرح حسین تھی۔ اور دن کا اس سے ملاپ ہوا۔

ایک رات یہ جل پری لیڈا چاندنی میں اپنے عریاں نیلے جسم کا حسن دیکھ کر آپ ہی آپ مسحور ہوئی جا رہی تھی، اور ایسے میں ایک نہایت خوبصورت، سفید براق راج ہنس اس کے پاس آیا اور نہایت پیار سے اپنی لانبی حسین گردن اور چونچ اور پنکھ اس پر پھیرتا رہا۔ لیڈا کے دل میں اس راج ہنس کے لیے بے پناہ محبت امڈ آئی، اور وہ راج ہنس کے سر اور

*Byron

گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرتی رہی۔ راج ہنس نے اس کے عریاں نیلے جسم کو اپنے اجلے پنکھوں میں لپیٹ لیا اور وہ مدہوش ہو کر سو گئی۔

صبح اٹھ کر اس نے دیکھا، اس کا راج ہنس کہیں غائب ہو گیا تھا۔

اور اس کے پاس ایک انڈا پڑا ہوا تھا۔

یہ انڈا حسن تھا۔ جو رات اور دن کے ملاپ سے پیدا ہوا تھا۔

اور ہیلن اسی حسن سے نکلی۔ وہ حسن کی سمبل تھی!

میں نے پیرس کو وہ حسن تحفہ میں دیا تھا، جس کا وژن دیکھ کر اپنی روح شیطان کے حوالے کرنے والا ڈاکٹر فاسٹس پکار اٹھا:

Was this the face that launched a thousand ships,
And burnt the topless towers of illium?
Sweet Helen, make me immortal with a kiss -
Her lips suck forth my soul :...

Here will I dwell, for heaven is in these lips,
And all is dross that is not Helena*

اور یہی ہیلنا جو حسن کی سمبل تھی، جو وجدان کا سر چشمہ تھی، ایک تباہ کرنے والی آگ بن گئی۔ ** ہیلن کے لیے یونان اور ٹرائے کے درمیان دس سال تک خونیں جنگ ہوتی رہی۔

الیم کے برج جل اٹھے، ٹرائے تباہ ہو گیا!

اور جب ٹرائے کے میدان جنگ میں پیرس زخمی پڑا تھا، جان بلب، اس وقت اس نے اپنے پاس بلایا، لیکن بے وفا ہیلن نے مرتے ہوئے پیرس کو پوچھ کر بھی نہ دیکھا اور اسے یونہی جان بلب چھوڑ کر چلی گئی۔

پھر انونی زخمی پیرس کے پاس آئی۔ وہی انونی جسے ہیلن کی محبت میں پیرس چھوڑ چکا تھا۔ لیکن جواب بھی اس کی وفا کا دم بھرتی تھی!

---

* Marlowe : 'Dr. Faustus

** ایک نوجوان، جدید ڈچ شاعر کی نظم میں ہیلنا کا تصور۔

باوفا انونی پیرس کو اس حال میں دیکھ کر تڑپ اٹھی، اور اس کے زخموں پر لگانے کے لیے جڑی بوٹیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر چن لائی۔ لیکن انونی کی یہ کوشش بے سود تھی، کیوں کہ اس کے لوٹنے تک پیرس اپنی جان دے چکا تھا۔

اس وقت میں پیرس کی کوئی مدد نہ کر سکی تھی، اور نہ ہیلن کی بے وفائی پر کوئی سرزنش کی تھی۔ پیرس کو یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ جب ہیلن نے اپنے شوہر مینلاس سے بے وفائی کی تھی تو اس سے بھی ایک نہ ایک دن بے وفائی کرے گی۔

جب پیرس مر رہا تھا، میں اس کی کوئی مدد نہ کر سکی تھی۔ اور نہ اسے ہیلن کی وفا دی تھی۔ میرا کام تو بس اسے ایک تحفہ دینا تھا۔

اور میں نے پیرس کو یونان کی حسین ترین عورت تحفہ میں دی تھی۔

اور تمھیں آرفیوس، تمھیں میں نے یلیزین وادی کی سب سے حسین جل پری دی تھی۔ اور اب کہ وہ مر چکی ہے، میں تمھیں اسے واپس نہیں دے سکتی۔"

محبت کی دیوی افروڈائٹ نے بھی اسے مایوس لوٹا دیا تو اب اسے کسی دیوی دیوتا سے کوئی امید نہ رہی۔

کاش مجھ میں ہرکولیس کی قوت ہوتی کہ میں خود اپنی قوت بازو سے یورڈیس کو موت کے دیوتا سے چھین لاسکتا!

"تمھارے پاس ایک ایسی قوت ہے، آرفیوس، جو ہرکولیس کی قوت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ تم اس کے ذریعہ گہرائیوں میں پہنچ سکتے ہو۔ جہاں تک ہرکولیس اپنی قوت بازو کے ذریعہ بھی رسائی حاصل نہیں کر سکتا! تمھاری پہنچ ان گہرائیوں تک ہے۔ تم روح کی دنیا میں اترتے چلے جاؤ۔"

یہ غیبی آواز سن کر آرفیوس چونکا اور اپنے سامنے اپالو کا ایک وژن دیکھا۔ اپالو ایک لارل کی شاخ تھامے اور اپنی سنہری بربط لیے کھڑا تھا۔ اپالو کی بربط کے تاروں کی ایک ہلکی سی چھیڑ نے آرفیوس کو سمجھا دیا کہ اس کے پاس وہ کیا قوت تھی جسے دیوتا اپالو نے ہرکولیس کی

قوت بازو سے کہیں زیادہ کہا تھا۔ اور جس کے ذریعہ وہ روحوں کی گہرائیوں میں اتر سکتا تھا۔

لیکن موت کے دیوتا کو موسیقی اور فن سے کیا واسطہ؟ آرفیوس نے سوچا۔

موت کے دیوتا کو محبت سے کیا واسطہ؟

نہیں، یہ بات نہیں۔ آخر دیوتا پلوٹو نے بھی محبت کی چوٹ کھائی تھی.....

ئیٹنا کی اگلتی ہوئی آگ، گرم گرم لاوے اور آئے دن پھٹتی ہوئی زمین سے تنگ آ کر، جہاں یہ پھٹتی ہوئی زمین اس کی روحوں کو پناہ نہ دے سکتی تھی، وہ جزیرۂ سسلی میں ایک ایسی سرزمین کی تلاش میں آ نکلا تھا جو مضبوط ہو اور زرخیز، تا کہ وہ اپنی رحوں کی سلطنت کو وہاں منتقل کر سکے۔

وہ زیرِ زمین اپنی رتھ پر گھوڑے دوڑائے جا رہا تھا۔ ہر جگہ کی زمین کو ٹھونک بجا کے دیکھتا ہوا۔ ایسے میں وینس نے اپنے بیٹے کیوپڈ سے کہا: ''دیکھو بیٹے۔ اس وادی میں تو اب میری کوئی قدر نہ رہی۔ میرا اقتدار باقی نہ رہا۔ شکاری ڈائنا تو محبت وحبت سے کوئی سروکار نہیں رکھتی۔ اور سیرس کی بیٹی پراسر پائن کا بس چلے تو عمر بھر کنواری رہے۔ اب میں کوئی ایسا حیرت انگیز کارنامہ چاہتی ہوں جس سے میرا اقتدار اچانک پھر بلندیوں پر پہنچ جائے اور بھلا اس سے زیادہ بڑا کارنامہ کیا ہوگا کہ خود موت کے دیوتا کو محبت میں مبتلا کر دیا جائے؟ دیکھو ابھی ادھر سے موت کے دیوتا پلوٹو کا گزر ہوگا، تم اپنے سنہری تیر کمان سنبھالے رکھنا اور موقع دیکھ کر، اس طرح اس کے دل پر سیدھے تیر مارنا کہ خطا نہ ہو، اور اس زخم سے وہ تڑپ اٹھے!''

اور کیوپڈ اپنی تیر کمان سنبھالے کھڑا ہو گیا۔

سسلی میں یہ وادی انتہائی زرخیز اور خوبصورت تھی۔ کیونکہ دھرتی ماتا سیرس خود یہاں رہتی تھی اور اس کی دیکھ بھال سے کھیتوں میں خوب اناج اگتا تھا۔ وادی پھلوں پھولوں سے لدی رہتی تھی۔ ہر طرف حتیٰ کہ پہاڑیوں پر بھی ہریالی ہی ہریالی نظر آتی تھی۔

اسی حسین سرسبز وادی میں جو ایڈن کے بہشتی چمن سے مشابہ تھی، ایک حوا اپنی مکمل

معصومیت میں، معصوم، شگفتہ پھولوں کے درمیان، مخملیں سبز گھاس پر گھومتی پھرا کرتی تھی۔

اور، ایک بار اور * حوا کی معصومیت ملوث کی جانے والی تھی!

دھرتی ماتا سیرس کی ننھی، نوخیز لڑکی پراسر پائن، جس سے، ماں سیرس کو بے اندازہ محبت تھی، اس سرسبز وادی میں ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی پھرتی تھی۔ پراسر پائن ابھی بچی ہی تھی اور جوانی اور بچپن کی سرحد پر کھڑی تھی۔ جوانی کے نئے نئے شعور سے وہ بے چین اور مضطرب سی رہا کرتی تھی۔ وہ اب بھی سہیلیوں کے ساتھ بچوں کے کھیل کھیلتی تھی۔ اور وادی کے پھول چننے میں بچوں کی سی مسرت محسوس کرتی تھی۔

اس صبح بھی وہ اپنی سنہری چپلیاں [چپلیں] اتار پھینک کر، اوس میں بھیگی ہوئی ٹھنڈی گھاس پر ننگے پیروں سے چلتی ہوئی، اپنی سہیلیوں کے ساتھ پھول چنتی جا رہی تھی۔ حد نظر تک پھول ہی پھول بچھے نظر آتے تھے۔ رنگا رنگ، ہر نوع کے شبنم میں نہائے ہوئے شگفتہ گلاب، بنفشہ، یاسمین، لالہ و نرگس، سورج مکھی، میری گولڈ، ڈیلیا، ڈیزی، پینزی۔ پراسر پائن اور اس کی سہیلیوں نے پھول چن چن کر ٹوکریوں میں بھر لیے اور ٹوکریوں میں جگہ نہ رہی تو ان کے گلدستے بنا کر اپنے سینوں پر سجا لیے، اور جنگلی گلاب کے ہار بنا بنا کر اپنے گلوں اور اپنی باہوں پر لپیٹ لیے۔

اور پھر پراسر پائن کو کچھ دور پر ایک نرگس کا پھول نظر آیا۔ غیر معمولی حسین اور بہت بڑا۔ ایسا پھول اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور اتنی دور سے اس گل کی مہک اسے مدہوش کیے دے رہی تھی۔ اس گل کی کشش سے بے اختیار کھنچ کر وہ آگے بڑھی۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی تھی، پھول اور بھی دور ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی سہیلیوں کو چھوڑ کر بہت آگے نکل گئی۔

---

* ملٹن نے Paradise Lost میں، حوا کی ایڈن کے بہشتی چمن میں یہی تصویر کھینچی ہے۔ اور اسے اس زرخیز وادی میں دھرتی ماتا سیرس کی بیٹی پراسر پائن سے تشبیہ دی ہے۔ اور حوا کی ترغیب اور Rape of Proser pine میں مماثلت پیدا کی ہے۔

دوڑتے دوڑتے وہ ہانپ رہی تھی، پسینہ کے قطرے موتیوں کی طرح اس کے حسین گلابی چہرے پر ابھر آئے تھے۔ اور گلوں میں بسی ہوئی پراسرپائن خود ایک شبنم میں نہایا ہوا شگفتہ گلاب معلوم ہو رہی تھی!

آخر کار وہ پھول کے پاس پہنچ گئی۔ لیکن اس کا ڈنٹھل اتنا سخت تھا کہ اس سے ٹوٹ نہ سکا۔ اس نے پورے پودے کو زمین سے زور دے کر نکال لیا۔ اور جیسے ہی وہ پودا جڑ سے اکھڑ آیا۔ اردگرد کی مٹی ڈھیلی ہوگئی، اور زمین کھلنے لگی۔ اور اسی وقت پلوٹو کا رتھ بالکل اسی جگہ پہنچا تھا۔ کھلتی ہوئی زمین سے روشنی اندر آئی تو اس نے اوپر دیکھا۔ نکھتوں میں بسی ہوئی ایک معصوم، نوخیز کلی حیران و پریشان کھڑی تھی! مشتعل اور شعلہ رو، وہ اپنی پریشانی اور اضطراب میں اور بھی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ موت کا دیوتا پلوٹو اسے دیکھ کر اتنا بے چین ہو گیا کہ آن کی آن میں اس نے پراسرپائن کو گود میں اٹھالیا اور رتھ میں اسے اپنے پہلو میں بٹھائے سرپٹ گھوڑے دوڑا دیے۔ گھبرائی ہوئی پراسرپائن کی ایک آخری چیخ وادی میں گونجتی رہ گئی!

اور دھرتی ماتا سیرس نے پراسرپائن کی چیخ سنی اور ساری وادی میں دیوانہ وار اسے ڈھونڈتی پھری، اور اسے نہ پا کر گوشہ نشین ہوگئی۔

پھول مرجھا گئے، درخت سوکھ گئے، غلہ برباد ہوگیا، وادی میں قحط پھیل گیا۔

سورج کی دنیا کے دیوتاؤں نے یہ حالت دیکھی تو اپنے قاصد مرکیوری کو، جس کے پیروں پر ننھے ننھے سنہری پر لگے تھے، موت کے دیوتا پلوٹو کے پاس بھیج کر یہ طے کروایا کہ پراسرپائن کچھ عرصہ اس کے پاس رہے گی اور سال کا بیشتر حصہ اپنی ماں کے پاس گزارے گی۔

اور جب نو بہار چمن پراسرپائن دھرتی ماتا سیرس کے پاس رہتی، روئے زمین پر بہار چھائے رہتی، اور جب پراسرپائن روحوں کی دنیا میں پلوٹو کے پاس واپس چلی جاتی اور سیرس پھر گوشہ نشین ہو جاتی، دنیا پر خزاں چھا جاتی۔

اور یوں بہار اور خزاں کے موسم پیدا ہوئے۔

اب پراسر پائن بھی خوش تھی کہ وہ ایک عرصہ تک ماں کے پاس رہتی تھی اور بقیہ وقت روحوں کی دنیا کی ملکہ بنی وہاں حکومت کرتی تھی۔

تو محبت کی بے پناہ قوت، محبت کے سحر نے موت کے دیوتا کو بھی رام کر لیا تھا! آرفیوس کو اب امید پیدا ہو چلی تھی کہ وہ محبت کا واسطہ دے کر موت کے دیوتا سے اپنی یوریڈیس کی روح واپس مانگ لائے گا۔

وہ اب ہیڈس کی ندی کے کنارے کھڑا تھا۔ یہاں کشتیوں میں روحیں اس پار، زیر زمین روحوں کی دنیا میں پہنچائی جا رہی تھیں۔ کشتی رانوں نے اسے اپنے ناؤں میں بٹھا کر اس پار لے جانے سے انکار کر دیا، کیونکہ وہ صرف روحوں کو اس پار لے جاتے تھے، اور آرفیوس ابھی مرا نہیں تھا۔ اس کا وجود مادی تھا۔

وہ دوسری طرف زمینی راستہ سے پہنچا۔ یہاں زمین میں ایک سوراخ سا تھا، جس سے ایک تنگ سا راستہ نیچے جاتا تھا۔ جیسے ہی وہ اندر اترا، موت کی سلطنت کے دروازے پر ایک خوفناک تین سروں والا کتا سربیرس آگے بڑھا۔ آرفیوس نے اسے نان کے ٹکڑے نہیں کھلائے بلکہ صرف اپنی بربط کی تاروں کو ہلکے سے چھیڑا۔ اور یہی ہیبت ناک کتا جو ہر کولیس پر اپنے خونیں دانت اور پنجے بڑھائے جھپٹ پڑا تھا، یوں چپ چاپ مسحور کھڑا رہا جیسے پلیزین وادی کے قریب جنگل کے وہ سارے جانور جو آرفیوس کی موسیقی سے مسحور اس کے آس پاس کھڑے رہتے تھے۔

آگے بڑھ کر ایک اور بڑا آہنی دروازہ تھا۔ اور یہاں سے تنگ راستہ وسیع ہو گیا تھا۔ لیکن یہاں سے گزرنا اتنے ہی خطرات کا حامل تھا، جیسے سلا اور کیربڈس کے درمیان سے گزر جانا۔

اس آہنی دروازے پر دو نہایت ڈراؤنی شبیہیں پہرہ دے رہی تھیں۔ ان میں سے ایک موت تھی، دوسری گناہ*۔

---

* ملٹن کے Paradise Lost میں دوزخ کا ذکر جب شیطان وہاں جاتا ہے۔

موت آگے بڑھ کر آرفیوس کا راستہ روک کے کھڑی ہوگئی۔ وہ کیسے اندر جا سکتا تھا، جب کہ وہ موت سے ہم کنار نہ ہوا تھا، اور ابھی زندہ تھا۔ آرفیوس دوسری طرف بڑھا تو گناہ نے اس کا راستہ روک لیا۔ آرفیوس نے کوئی گناہ نہ کیا تھا، اور گناہ کی دنیا میں اس کا بار نہیں تھا۔

آرفیوس نے پھر اپنی بربط اٹھائی اور اسے چپکے سے چھیڑا، اور موت اور گناہ کی ہیبت ناک شبیہیں بھی بربط کی لے سے اسی طرح مسحور ہو کر ساکت و جامد کھڑی رہیں اور اسے اندر جانے کے لیے راستہ دے دیا۔

اب آرفیوس اپنی بربط بجاتا ہی چلا گیا۔ اب اس کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہی تھی۔ سارے پہرے دار موسیقی کے نشے میں ڈوب جاتے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے ساتوں مہلک گناہوں کی شبیہوں کے درمیان سے گزر گیا*۔

موت کے دیوتا کے کانوں سے ایک سحر انگیز موسیقی کی لہر ٹکرائی اور وہ حیران رہ گیا کہ یہ کون تھا جو اس کی روحوں کی دنیا میں اس طرح نڈر چلا آیا تھا۔ اور یہ کیسی موسیقی تھی جس کا نشہ روحوں کی دنیا کے سارے باسیوں کو مدہوش کیے دے رہا تھا؟

اب آرفیوس اپنی بربط بجاتا ہوا اُس تخت کے سامنے کھڑا تھا، جہاں موت کا دیوتا پلوٹو اور ملکہ پراسرپائن ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔

ساری روحیں آرفیوس کی موسیقی سے مسحور اس کے قریب کھنچ آئی تھیں۔ دوزخ کی آگ میں جلنے اور دوزخ کی اذیتوں سے تڑپنے والی روحوں کو بھی آرفیوس کی موسیقی سے قرار آ گیا تھا۔

وہ خوفناک فیوریس، جن کے بالوں میں سانپ کنڈلیاں مارے لپٹے ہوئے تھے، وہی فیوریس جو کسی سے گناہ سرزد ہو جانے پر اس کا اس طرح پیچھا کرتی تھیں کہ وہ اذیت دہ زندگی سے تنگ آ کر ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے موت کی پناہ مانگتا تھا، چپ چاپ کھڑی تھیں، اور فیوریس کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔

---

* سات مہلک گناہوں Seven Deadly Sins کا تصور خاص طور سے عیسائیت میں پایا جاتا ہے۔ ملٹن کی دوزخ میں ان شبیہوں کا بھی ذکر ہے۔

لیکن نیوبی کے ہمیشہ بہنے والے آنسو تھم گئے!

بلیڈس نے اپنے گاگر نیچے رکھ دیے۔

ٹنٹالس اپنے پیاسے لب اس پانی کی طرف بڑھانا بھول گیا، جو ہمیشہ اس کے لبوں سے دور چلا جاتا تھا۔

اور نارسی سس نے پہلی بار پانی میں اپنے عکس سے نظریں ہٹا کر آرفیوس اور اس کی بربط پر جمادیں۔

یہ کیا غیر معمولی قوت تھی؟ یہ کیسا سحر تھا جو نارسی سس کی توجہ کو اپنے عکس سے ہٹا سکتا تھا؟

پرسیوس نے گورگن میڈوسا کا خوفناک سر جلدی سے اپنے پیچھے چھپا لیا کہ اسے دیکھ کر کہیں یہ ساحر موسیقار پتھر نہ بن جائے!

وہ چکر جس سے باندھ کر یکزیان کو اذیت دی جاتی تھی، آپ ہی آپ تھم گیا۔

ہرکیولیس کا انسانی وجود ابھی تک بے پناہ تکلیف اور ناقابلِ برداشت آگ کی سی جلن سے پاگل ہو کر اپنے جسم سے اژدہے کے زہر میں ڈوبے ہوئے لبادے کو الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اور وہ جہاں جہاں سے لبادے کو نوچ پھاڑ کر اپنے جسم سے الگ کرتا تھا، اس کی جلد اور گوشت تک اس کے ساتھ نکل آتا تھا۔ ہرکولیس چند لمحوں کے لیے اپنی تکلیف بھول گیا، اور لبادے کو پھاڑتے پھاڑتے رک گیا۔

اور انسانیت کا پہلا مسیحا، جسے پتھر کی سولی پر آہنی زنجیروں سے باندھا گیا تھا، اور جو انسانوں کی نجات کے لیے اپنے زخمِ جگر سے خون بہا رہا تھا، کراہتے کراہتے رک گیا۔

یہ پرومیتھیوس تھا، جو انسانوں کے لیے آسمانی آگ چرا لایا تھا، اور انسان کو علم کی روشنی دی تھی۔ جس کی سزا کے طور پر ذیوس نے پرومیتھیوس کو کوہ قاف کی چوٹی سے موٹی موٹی آہنی زنجیروں سے باندھ دیا تھا۔ اور ایک گدھ مسلسل اس کا جگر چبایا کرتا تھا۔

گدھ بھی پرومیتھیوس کے جگر پر ٹھونگیں مارتے مارتے اچانک رک گیا۔

موت کا دیوتا حیران تھا کہ آخر یہ کیا سحر تھا جس نے اس کی روحوں کی سلطنت میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا؟

''تم کون ہو؟'' موت کے دیوتا نے آرفیوس کو مخاطب کیا: ''یہاں میری سلطنت میں کیوں آئے ہو؟ جہاں کسی کو بار نہیں۔ لیکن ہم تمھیں معاف کیے دیتے ہیں، کیوں کہ تم نے اپنی موسیقی کے سحر سے ہمیں، موت کو بھی، مسحور کر لیا ہے۔ ہم سے جو مانگنا چاہتے ہو، مانگ لو! ہمیں منظور ہے۔''

''میں اپنی موسیقی کی روح مانگتا ہوں دیوتا۔ آپ نے میری موسیقی کی روح چھین لی ہے۔''

''تمھاری موسیقی کی روح چھین لی ہے؟''

''ہاں یوریڈیس، جو میری موسیقی کی روح تھی!''

''لیکن تمھاری یوریڈیس تو مر چکی ہے۔ اور تم یہاں سے اسے کیسے واپس لے جا سکتے ہو۔ مرنے کے بعد کسی کی زندگی واپس لوٹائی جا سکتی ہے؟ ناممکن!''

''آپ چاہیں تو مجھے اس کی زندگی کی بھیک دے سکتے ہیں، دیوتا! آپ کی بے پناہ طاقت سے میں ناواقف نہیں ہوں۔ کسی کو موت سے مفر نہیں۔ ہم سب کو ایک نہ ایک دن آپ کے پاس واپس لوٹنا ہے۔ لیکن موت کا بھی ایک وقت ہوتا ہے دیوتا! یوریڈیس کی زندگی کی معیاد ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ ابھی ابھی جوان ہوئی تھی، ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ابھی ابھی پایا تھا، ہمارے وجود کی تکمیل تو اب ہوئی تھی!

محبت کیا ہوتی ہے۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں دیوتا! یاد کیجیے آپ نے ملکہ پراسرپائن کو کیسے اپنایا تھا۔ اور جب قاصد مرکیوری انھیں اپنی ماں سیرس کے پاس واپس لے جانے آیا تھا تو آپ نے پراسرپائن کو چپکے سے چند انار کے دانے کھلا دیے، تا کہ وہ پھر آپ کے پاس آ سکے۔ اب بھی جب ملکہ پراسرپائن اپنی ماں دھرتی ماتا سیرس کے پاس رہتی ہیں تو کیا آپ بے چین نہیں رہا کرتے؟ ذرا سوچیے، اگر پراسرپائن آپ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے

چھین لی جاتیں تو آپ پر کیا گزرتی؟ اور آپ تصور کر سکتے ہیں دیوتا، مجھ پر کیا گزر رہی ہوگی، جب کہ میری بیوی یوریڈیس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھین لی گئی ہے۔

ملکہ پراسرپائن، میری یوریڈیس بھی بالکل آپ کی طرح تھی، ایک معصوم، شگفتہ پھول! وہ ہری ہری، ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر یونہی گھوما کرتی تھی، اور پھول چنا کرتی تھی، اور پھول اپنی نازک ٹہنیوں سے جھک کر اس کے کومل پیروں کو چوم چوم لیتے تھے!"

پراسرپائن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے شوہر سے التجا کی کہ یوریڈیس واپس دے دی جائے۔ پلوٹو کے دل پر بھی آرفیوس کی باتیں اثر کر گئی تھیں۔ اس نے آرفیوس سے کہا:

"اچھا ڈھونڈ نکالو اپنی یوریڈیس کو!"

آرفیوس نے اپنے اردگرد روحوں کے اس بے کراں سمندر پر نظر دوڑائی، لیکن یوریڈیس اسے کہیں نظر نہ آئی۔

کہاں چلی گئی میری یوریڈیس؟ کیا اسے میری بربط کی لے سنائی نہیں دی؟ جب کہ ساری روحیں میرے پاس کھنچ آئی ہیں، یوریڈیس کی روح میرے پاس کیوں نہیں آئی؟ کہیں وہ مجھ سے گریزاں تو نہیں ہے، جیسے ڈیڈو کی روح اینیس سے گریزاں تھی؟

*جب اینیس زیرِ زمین روحوں کی دنیا میں اترا تھا، اور اپنے بوڑھے باپ کی روح سے ملا تھا، اسے ڈیڈو بھی نظر آئی، لیکن اینیس کو دیکھنے کے باوجود وہ اس سے کترا کر چلی گئی، اپنے شوہر کی روح کے پاس!

لیکن ڈیڈو اینیس سے اس لیے کترا کر چلی گئی تھی کہ اینیس خود اسے اپنی محبت میں گرفتار کرنے کے بعد، اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا، اور ڈیڈو نے خودکشی کر لی تھی اور اپنے آپ کو چتا کی مقدس آگ میں جلا دیا تھا۔

اینیس کو بھی ڈیڈو سے شدید محبت ہو گئی تھی، لیکن یہ محبت اس کے اعلیٰ مقصد کے

* Virgil : Aenied

آگے ایک رکاوٹ تھی۔ اینیس جو شکست خوردہ ٹرائے چھوڑ کر روما، ایک نیا ملک بنانے اور وہاں اپنی سلطنت قائم کرنے نکلا تھا، اس کے لیے عورت پاؤں کی زنجیر تھی جو اسے آگے بڑھنے سے روکتی تھی، اور چپ چاپ ڈڈو کو بتائے بغیر کارتھیج سے چلا گیا تھا۔ اور مرتی ہوئی ڈڈو نے یہ بددعا کی تھی کہ اس کے کارتھیج میں، جہاں کی وہ ملکہ تھی، اور اینیس کے روم میں نسل در نسل دشمنی چلی آئے، اور دونوں سلطنتوں کے درمیان خونی جنگیں ہوتی رہیں۔

روحوں کی دنیا میں بھی ڈڈو کا اینیس سے منہ موڑ کر چلا جانا قرین قیاس تھا، لیکن اس کی یوریڈیس اس سے کیوں گریزاں ہوگی؟

وہ تو سیاست دان نہیں تھا، وہ فن کار تھا۔ اسے اقتدار اور ملک گیری کی ہوس نہیں تھی، موسیقی اور فن سے پیار تھا۔ موسیقی اور فن کی جن بلندیوں کو وہ چھونا چاہتا تھا، محبت ان کے آگے رکاوٹ نہیں تھی۔ سیاسی مقصد کے لیے محبت رکاوٹ ہوسکتی ہے، لیکن فن کے لیے محبت وجدان کا سرچشمہ ہے!

یوریڈیس اس کے لیے پاؤں کی زنجیر نہیں تھی۔ یوریڈیس اس کی موسیقی کی روح تھی!

''میری یوریڈیس تو یہاں دکھائی نہیں دیتی، وہ کہاں ہے دیوتا؟''

''وہ ابھی آتی ہی ہوگی۔ تم اپنی بربط پر ایک اور نغمہ چھیڑو، ہم سننا چاہتے ہیں!''

''ایک ٹوٹے ہوئے دل کا راگ کیا سنئے گا دیوتا!''

آرفیوس کی زخمی روح اور شکستہ دل کی آواز اس کی بربط کی لے میں گھل گئی، اور اس کے ٹوٹے ہوئے دل سے ایک ایسا نغمہ پھوٹا کہ ساری فضا میں اس کا درد گھل گیا۔

پراسرپائن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہے جا رہے تھے۔ اس کا نرم دل تڑپ اٹھا۔ موت کے دیوتا کا دل بھی اس نغمہ کی آگ میں موم کی طرح پگھلنے لگا۔

''آرفیوس، تمھارے درد کو ہم جان گئے۔'' موت کے دیوتا کی آواز بھرا گئی۔ ''آج محبت کے درد اور موسیقی کے سحر نے موت پر فتح پائی ہے!''

''تم اپنی یوریڈیس کو واپس لے جاسکتے ہو۔ لیکن ایک شرط ہے، ایک شرط!''

"وہ کیا ہے دیوتا؟"

"تمھیں اعتماد ہونا چاہیے، کامل اعتماد۔ تم آگے بڑھے چلے جاؤ، یوریڈیس تمھارے پیچھے پیچھے آتی رہے گی۔ لیکن اوپر کی روشن دنیا میں پہنچنے سے پہلے تمھارے دل میں کوئی شک وشبہ گزرے کہ کہیں تمھیں دھوکا تو نہیں دیا گیا، اور تم یہ دیکھنے کے لیے کہ واقعی یوریڈیس تمھارے پیچھے آرہی ہے کہ نہیں، تم نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھا تو تم دوبارہ یوریڈیس کو کھو دو گے، اس طرح کہ وہ کبھی تمھارے پاس واپس نہیں آئے گی۔ وہ تم سے چھوٹ کر پھر روحوں کی دنیا میں واپس چلی آئے گی۔

"مجھے یہ بھی منظور ہے دیوتا۔"

"اب تم آگے آگے چلے جاؤ، وہ تمھارے پیچھے پیچھے چلی آئے گی۔"

آرفیوس یوریڈیس کو دوبارہ پالینے کے خیال سے نہایت مسرور آگے بڑھا چلا گیا۔ راستے میں اس کے دل میں کئی بار یہ شک گزرا کہ آیا یوریڈیس اس کے پیچھے واقعی آرہی ہے کہ نہیں۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا، اور پوری قوت ارادی سے کام لے کر اپنے آپ کو پیچھے مڑ کر دیکھنے سے روکے رکھا۔ یہاں تک کہ وہ سارا اندھیارا راستہ پار کر گیا۔ اس نے روشنی کی ایک کرن اندر آتے دیکھی، اور چڑیوں کو چہچہاتے سنا۔ اس کا دل خوشی سے معمور ہو گیا کہ اب وہ کوئی دم میں سورج کی روشن دنیا۔ میں واپس پہنچ جائے گا، اور اب یوریڈیس پھر اس کے ساتھ ہوگی! پھر اچانک اس لمحہ اس کے دل میں اس شبہ نے زور پکڑا کہ یوریڈیس واقعی اس کے ساتھ چلی آئی ہے کہ نہیں۔

اب تو منزل آ ہی گئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھ لینے میں ہرج ہی کیا ہے؟

اور اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک لمحہ کے لیے اسے اپنی بیوی کا وہ حسین چہرہ نظر آیا، جو اس کے ساتھ واپس روشن دنیا میں چلے آنے کے خیال سے پھول کی طرح کھل اٹھا تھا، لیکن آن کی آن میں وہ پھول سا چہرہ مرجھا گیا، اور اس چہرہ پر بے پناہ مایوسی چھا گئی۔ یوریڈیس اپنی بے بسی میں اس کی طرف بے اختیار ہاتھ بڑھائے ہوئے تھی، کہ وہ اسے اوپر

کھینچ لے، لیکن کوئی نا معلوم، ان دیکھی، زبردست طاقت اسے پیچھے لیے جا رہی تھی۔ وہ یونہی بے بسی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے ہوئے اور آرفیوس پر اپنی اداس الوداعی نظریں جمائے دھیرے دھیرے پیچھے چلی گئی اور نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

آرفیوس کا دل اس لمحہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اس نے اب اپنی یوریڈیس کو دوبارہ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔

اب اس کے درد کا درماں اور اس کی تنہا ساتھی صرف اپنی بربط تھی۔ یوں ساری فطرت، ساری کائنات اس کے غم میں شریک تھی۔ بادل آنسو بہاتے تھے، درخت آہیں بھرتے تھے، جانور چپ چاپ، مغموم اس کے پاس کھڑے اس کے نغمے سنتے رہتے تھے۔

اور جب وہ دیوانہ وار ساری وادی میں اپنی یوریڈیس کو پکارتے ہوئے گھوما کرتا، ساری پہاڑیاں اس کے ساتھ اسی دکھ سے یوریڈیس کا نام دہراتی تھیں۔

یوریڈیس، یوریڈیس، یوریڈیس!

اب آرفیوس کے ٹوٹے ہوئے دل سے جو نغمے نکلتے تھے، وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ حسین ہوتے تھے۔ سوز و گداز نے اس کی موسیقی میں بے پناہ اثر پیدا کر دیا تھا، اور جب وہ بربط بجاتا تھا اس کی زخمی روح ان تاروں میں تحلیل ہوئی جاتی تھی!

اس کی موسیقی کے سحر اور مردانہ حسن کی کشش سے عورتیں اس کے پاس کھنچی چلی آتیں کہ وہ انھیں اپنا لے گا۔ لیکن آرفیوس اپنی یوریڈیس کی یاد میں اس طرح محو رہتا کہ ان کا اس کے پاس آنا بھی اسے گراں گزرتا۔ اسے اپنی یوریڈیس کے سوا کوئی اور عورت نہیں چاہیے تھی، کوئی اور نہیں! اور عورتیں حیران رہ جاتیں کہ آخر وہ ایک مردہ عورت کے لیے کب تک اپنی زندگی برباد رکھے گا۔ آخر آرفیوس کو چند امیزاں قسم کی عورتوں سے پالا پڑا، جنھوں نے اس کے توجہ نہ دینے کو اپنی توہین سمجھی، اور یوں بگڑیں کہ آن کی آن میں آرفیوس کی تکا بوٹی کر دی۔ اس کے جسم کے سارے حصے الگ الگ کر کے پھینک دیے، اور آرفیوس کے سر اور اس کی بربط کو ایک ندی میں بہا دیا۔

آرفیوس کی موت ہیبت ناک اور المیہ موت تھی، لیکن اب وہ اپنی یوریڈیس سے مل گیا تھا۔ اور اب ان دونوں کے روحانی وجود ہاتھ میں ہاتھ ڈالے یلیزین کی حسین وادی میں آزادی سے گھوما کرتے۔

آرفیوس اور یوریڈیس کو جسمانی طور پر فانی تھے، موسیقی نے انھیں امر کر دیا تھا۔

جہاں آرفیوس کے جسم کے حصے دفن ہیں، وہاں کی بلبلیں اب بھی سحر انگیز نغمے گاتی ہیں۔

پہاڑیوں سے اب بھی آرفیوس کی آواز کی بازگشت آتی ہے:

یوریڈیس، یوریڈیس، یوریڈیس!

اور وہ ندی جس میں آرفیوس کا سر اور اس کا بربط بہایا گیا تھا۔ جس کا نام آرفیوس کے نام پر آلفیوس رکھا گیا تھا، اس ندی سے اب بھی وہی لے نکلتی ہے۔

آرفیوس کی بربط کی لے!

●●●

آرفیوس؟ نارسائس؟/شیریں، فرہاد

کتنی گہری، کتنی سحر زدہ شب تھی!

اور چاندنی کتنی مکمل، کتنی حسین، کتنی مسحور کن!

لیکن وہ چاندنی ظلم ڈھا رہی تھی!

وہ حسین رات کسی ان جانے راز سے بوجھل معلوم ہو رہی تھی!

وہ سحر زدہ فضا کسی آنے والے حادثے کا پتہ دے رہی تھی!

میرا دل کانپ اٹھا۔

میں نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے قانون کے تاروں کو چھیڑا، اور میرے دل کا گداز ان تاروں میں پگھل کر بہنے لگا....

اور نغمے کی ان درد بھری لہروں پر، اس نقرئی، نورفشاں چاندنی میں، وہ چپکے سے، اپنے پاؤں کی انگلیوں کے بل یوں چلی آئی، جیسے کوئی بہشتی حور فلک سے اتر کر چاند کی نورانی کرنوں پر تیرتی چلی آئے۔ یا کوئی حسین آبی پریزاد اپنی جھیل سے نکل کر رقص کرتی چلی آئے۔

میرے پہلو میں بیٹھ کر اس نے اپنا ننھا سا سر میرے شانے پر ڈال دیا۔ ”آقائے شیرازی، بجائے جاؤ، قانون کی پرسوز، درد بھری لے سے میں کھنچی چلی آتی ہوں۔ بجائے جاؤ، آج تو میں اپنے وجود کو موسیقی کی لہروں میں کھو دینا چاہتی ہوں!“

اس رات وہ نہایت بے چین اور مضطرب تھی۔ اتنی مضطرب کہ بید مجنوں کی طرح کانپ رہی تھی۔ اس کے قرمزی لبوں کے گوشے پھڑک رہے تھے۔ رخسار انگارے بن کر دہک رہے تھے۔ ان انگاروں کی تپش میں اپنے شانے پر محسوس کر رہا تھا۔

''آج تمھیں کیا ہو گیا ہے، جانم، کیا ہو گیا ہے تمھیں؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، اور یونہی آنکھیں بند کیے، وہ میرے شانے پر سر ڈالے بیٹھی رہی۔ اس کے سارے بدن پر کپکپی طاری تھی، اور بدن آگ کی طرح جل رہا تھا۔

ہم اپنے پائین باغ کے اس محبوب گوشے میں بیٹھے تھے جہاں میں اکثر چاندنی راتوں میں قانون بجایا کرتا تھا۔ مجھے خوف ہوا، کہیں اسے بخار نہ ہو، اور یہاں باہر ہوا کی خنکی اسے نقصان نہ پہنچائے۔ آہستہ سے تھام کر میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا، اور گرم کشمیری شال اسے اڑھا دی۔ شال خوب لپیٹے وہ پھر یونہی میرے شانے سے لگی بیٹھی رہی۔ بالکل چپ چاپ۔

میرا دل ایک نامعلوم خوف سے بیٹھا جا رہا تھا۔

یہ فضا اتنی سحر زدہ کیوں تھی؟

یہ چاندنی، جو میرے کمرے کے فرانسیسی دریچوں سے یوں امڈی چلی آ رہی تھی، مجھے ڈس کیوں رہی تھی؟

اور یہ رات، یہ حسین رات، کسی گہرے راز، کسی المیے سے بوجھل کیوں معلوم ہو رہی تھی؟

خداوند! میں تیری رحمت یزدانی کی پناہ مانگتا ہوں!

وہ اچانک پھر بے چین ہو گئی: ''قانون، اپنی قانون اٹھاؤ، چھیڑے جاؤ۔ میں آج اپنے آپ کو، اپنے وجود کو، موسیقی کی لہروں میں کھو دینا چاہتی ہوں۔''

میں قانون آہستہ آہستہ چھیڑنے لگا۔ اور اسے کچھ سکون سا محسوس ہونے لگا، لیکن رہ رہ کر ایک بے چین لہر اس کے بدن میں دوڑ جاتی تھی۔ اس کی دراز، ریشمیں مژہ پر

ستارے کانپنے لگے۔ اور اس نے بڑی دھیمی آواز میں، جیسے کہیں گہرائیوں کے اندر سے بول رہی ہو، زیرلب کہا:

"یاد ہے نا، آقائے شیرازی، میں تم سے کیا کہا کرتی تھی۔ جب میں تمھارے پاس نہیں ہوں گی، یہ قانون تم ہمیشہ اپنے پاس رکھنا، اور سمجھ لینا کہ میں تمھارے پاس ہوں۔ یہ قانون میرا اسم ہے، اس میں میری روح ہے۔"

"ہاں، جانم، یہ قانون تمھارا اسم ہے۔ میں اسے ہمیشہ ہمیشہ اپنے قریب رکھوں گا۔ لیکن اب تو تم خود ہی میرے پاس ہو۔ آج یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو، جانم؟"

اس نے اداس لہجے میں، نہایت دکھ سے کہا: "شما نمی دانید، من می دانم۔" یہی جملہ جو وہ اکثر اتنی شوخی سے ادا کیا کرتی تھی، آج اتنے درد بھرے لہجے میں کیوں کہہ رہی تھی؟

"شما نمی دانید، من می دانم!" وہ کیا جان گئی تھی؟

میں بے پناہ اداسی کے عالم میں قانون بجائے گیا۔ جانے میری ان انگلیوں کو، میرے اس محبوب ساز کے تاروں کو کیا ہو گیا تھا، یکے بعد دیگرے وہ سارے نغمے جاگ اٹھے، جن سے ہماری محبت کی داستان مرتب ہوئی تھی۔ آخری نغمہ ختم کر کے میں نے چپ چاپ قانون نیچے رکھ دیا۔

اس کی آنکھیں نیم باز تھیں اور اس پر نیم بیہوشی سے طاری تھی۔ لیکن جیسے ہی میں نے قانون رکھ دی، وہ چونک کر بیدار ہو گئی اور اسی طرح مضطرب اور بے چین، اصرار کرنے لگی: "تم نے قانون رکھ دیا؟ تھک گئے، آقائے شیرازی؟ میں پھر تو کبھی تم سے نہیں کہوں گی، لیکن آج، آج کی رات، بجائے جاؤ۔ کوئی راگ چھیڑ دو، ایک ایسا راگ جس سے میرے سارے وجود میں، میری روح میں آگ لگ جائے!"

"یہ راگ تو دیپک راگ ہی ہو سکتا ہے، اور یہ راگ گاتے ہوئے خود تان سین کے وجود میں آگ لگ گئی تھی۔ یہ راگ ہر کوئی گا نہیں سکتا، اور نہ ساز پر چھیڑ سکتا ہے۔ اور میں کوئی تان سین نہیں ہوں۔"

''پھر بھی، کوئی ایسا راگ چھیڑ دو، جس کی گرمی سے میری روح پگھل جائے۔ کوئی ایسا آتشیں نغمہ، جس کی لہروں پر میری روح شعلہ بن پرواز کر جائے!''

مجھے خود نہیں معلوم میں نے کیا راگ چھیڑا تھا، بے اختیار میری انگلیوں نے قانون پر ایک ایسا راگ چھیڑنا شروع کیا، جس کی گرمی سے روح پگھل جائے، جس سے سارے وجود میں ایک آگ لگ جائے۔

میں خود اس آگ میں جلنے لگا، اور اس کی حالت تو کچھ نہ پوچھیے کیا تھی۔ اتنی دگرگوں تھی، اُف!... اس کی جبین منور عرق آلود ہو گئی تھی اور پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح گر رہے تھے۔ رخسار سرخ شعلے بنے دہک رہے تھے۔ سارے بدن میں ایک آگ سی لگی تھی۔ اور سانس اتنی تیز کہ سینے میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اور میں تھا کہ بالکل بے خبری کے عالم میں قانون بجائے جا رہا تھا۔ اور جیسے جیسے تانیں بلند ہوتی گئیں، یہ آگ تیز ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ اس جلن کی تاب نہ لا کر، تاروں پر ایک تیز ضرب دے کر میں نے اپنی انگلیاں روک لیں۔

ہوش میں آیا تو میں نے دیکھا قانون کے تار ٹوٹ گئے ہیں، میری انگلیاں زخمی ہو گئی ہیں، ان سے خون رس رہا ہے۔ اور وہ محبوب وجود جو ابھی میرے پہلو میں آگ کی طرح جل رہا تھا، ٹھنڈا ہو چکا ہے۔

اس کی روح ایک پاکیزہ شعلہ بن کر موسیقی کی لہروں کے دوش پر پرواز کر گئی تھی! وہ مر چکی تھی!

اُف، کتنی حسین موت تھی!

میں نے آہستہ سے اس محبوب جسم کو جو اب برف کی طرح ٹھنڈا تھا اور وزنی ہو چکا تھا، اپنے کندھے سے الگ کیا اور نیچے لٹا دیا۔

میں اس بے جان حسن کو دیکھتا رہا، دیکھتا رہا....

وہ موت میں بھی کتنی حسین لگ رہی تھی۔ گویا ایک پاکیزہ، سچا، آبدار موتی۔ اس

کے چہرے پر آسمانی حوروں کا سا حسن تھا، اور اس کے ہونٹوں پر جو ابھی تک شگفتہ تھے، وہ مخصوص مسکراہٹ منجمد ہو گئی تھی، وہ ابدی مسکراہٹ جو لیونارڈو ڈونچی نے مونا لزا کے ہونٹوں پر ثبت کر دی تھی!

میں دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔ ایک سکتے کے عالم میں۔ موت کا گہرا راز میرے ادراک سے باہر تھا!

میں خود نہیں جانتا، اس وقت مجھ پر کیا گزر رہی تھی! میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ لیکن میری آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ تھا!

اچانک باہر دروازے پر کسی نے دستک دی۔

میں نے دروازہ کھولا۔ اس کا شوہر تھا۔ (ہاں وہ شادی شدہ تھی، شادی شدہ تھی)

''آغا،... شیریں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ بتائے بغیر اسے اندر اپنے کمرے میں لے آیا۔

وہ تڑپ اٹھا: ''آغا، چہ گزشت؟''

''بڑی حسین موت تھی!'' میں نے زیرِ لب گویا اپنے آپ سے کہا: ''اس کی روح ایک پاکیزہ شعلہ بن کر موسیقی کی لہروں کے دوش پر پرواز کر گئی!''

وہ میری بات کو بالکل سمجھ نہ سکا۔ اسے موسیقی سے کوئی گہرا ربط نہ تھا۔ اور نہ یہ احساس کہ موسیقی اس کے لیے کیا معنی رکھتی تھی! اسے صرف یہ احساس تھا کہ اس کی محبوب بیوی مر چکی ہے۔ وہ چپ چاپ کھڑا اپنے ہاتھ ملتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

میں نے اس محبوب، بے جان جسم کو اپنی باہوں میں اٹھا لیا، اور چپ چاپ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں دے دیا۔

''آغا اسے لے جایئے، یہ جسم آپ کا تھا۔ اس کی روح میری ہے۔''

اور پھر وقت ٹھہر گیا۔

کائنات بدل گئی۔

نہیں، نہیں۔ سب کچھ وہی تھا، دنیا وہی تھی، کائنات وہی تھی!

But oh the difference to me!

میرے لیے وقت ٹھہر گیا، یعنی وہ وقت جس کی ایک اندرونی حقیقت ہے۔ لیکن وہ وقت جس کی حقیقت بیرونی ہے، آگے بڑھتا گیا۔ ماہ و سال گزرتے گئے، زمان و مکان بدلتے گئے....

شیرازی کی شاندار، خوبصورت کوٹھی میں شیرازی کا یہ مخصوص کمرہ جسے خالصتاً مشرقی ایرانی طرز پر سجایا گیا تھا۔ اس کمرے کی ہر ہر چیز ایک فن کارانہ مزاج کا پتہ دیتی تھی۔ یہ کمرہ گویا موسیقی کے لیے وقف معلوم ہوتا تھا۔ بیش بہا، دبیز، ایرانی قالینوں سے مزین۔ کمرے میں ایک طرف چاندنی بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیے لگے تھے۔ شیرازی خاندان کے قدیم ایرانی ساز یہاں رکھے ہوئے تھے۔

اور قانون — جواب اس کے لیے رفیقۂ حیات تھا، یہ قانون اوپر کیبنٹ پر رکھا ہوا تھا۔ کچھ اس طرح کہ اس کا ایک سرا آتش دان کے اوپر لگی ہوئی ایک قد آدم رنگین اور نہایت حسین پورٹریٹ کے قدموں میں تھا۔ دوسری طرف مینٹل پیس پر ایک خوبصورت طاؤس سا بنا رکھا تھا جس میں مختلف خوشبوئیں تھیں۔ آتش دان میں ایک 'ارن' سی بنی ہوئی تھی، جس میں عود اور لوبان اور دوسری خوشبوئیں ڈالی جاتی تھیں۔ یہ سارا کمرہ مقدس خوشبوؤں میں بسا ہوا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا یہ کوئی قربان گاہ ہے یا کسی دیوی کا آلٹر۔

یہ ایک دیوی کا آلٹر ہے، میں یہاں عود اور لوبان اور خوشبوئیں جلاتا ہوں۔ آتش دان میں شعلے دہک رہے ہیں۔ میں آگ میں، ان شعلوں میں اتنی کشش کیوں پاتا ہوں؟

مجھے محسوس ہوتا ہے آگ میں ایک بلندی اور عظمت ہے۔ آگ کے پاکیزہ شعلے آسمان کی بلندیوں کو چھو لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

وہ جو کبھی سب سے بلند مرتبت فرشتہ تھا، جسے عرش معلی کی قربت حاصل تھی، آگ سے بنا تھا۔ اس کا وجود ناری تھا۔ اب بھی وہ شعلہ بن کر آسمان کے قریب پہنچتا ہے اور عرش

بریں کے راز معلوم کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔

کیا آگ صرف اہرمن کا اسم ہے؟ یا یزداں کی پاکیزگی اور بلندی کا مظہر؟

میں، یوسف شیرازی، عجمی ہوں۔ مجھ میں اپنے آباواجداد کا پارسی خون ہے، وہ جو زرتشت کی پیمبری کے قائل تھے۔ وہ جو آگ کی پرستش کرتے تھے۔ شاید اسی لیے میں آگ میں یہ کشش پاتا ہوں، اور ایک جذبہ عقیدت۔

لیکن اب میں خالصتاً عجمی نہیں ہوں۔ عرب نے عجم پر فتح پالی، جب وہ نور مشرق ہویدا ہوا، اور ایک سادہ پاکیزہ مذہب نے، جس نے خدا کے وجود مطلق سے ایک سیدھا، براہ راست رشتہ قائم کیا، ایران کی اس آتش پرستی کی جگہ لے لی۔

میں مسلمان ہوں، اور اپنے مسلمان ہونے پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ اب ہماری ملت کی یہ حالت ہے کہ ہمارے حافظ شیراز نے نہایت افسوس کے ساتھ کہا تھا:

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں

شاید ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھے اس آگ سے، ان خوشبوؤں سے، اس رسم و ریت سے دور رہنا چاہیے، کہتے ہیں اسلام میں رسم و ریت کی گنجائش نہیں ہے۔ تو پھر حج کعبہ، طواف، حجر اسود کا چومنا، قربانی دینا، کیا یہ سب رسومات میں شامل نہیں ہیں؟ بقرعید کی قربانی رسم نہیں تو کیا ہے؟ یہ قربانی جو حضرت ابراہیم کی اپنے عزیز بیٹے کی قربانی کی یادگار ہے۔ اور جو ایک اور آنے والی بہت بڑی قربانی کا اسم تھی! یہ بہت بڑی اور بہت اہم قربانی جو میدان کربلا میں دی گئی۔

میں اس قربانی کی وقعت کو سمجھتا ہوں جو ایک بہت بڑے اصول کے لیے دی گئی۔ حضرت امام حسین نے اپنے خون سے اسلام کو سینچا، اپنی قربانی سے اسلام کو دوبارہ زندگی بخشی اور اسلام ہر کربلا کے بعد پھر سے زندہ ہوتا ہے....

امام حسین ایک اور مسیحا تھے، یہ اور بات ہے کہ اس نیزے کو جس پر ان کا مقدس سر

چڑھایا گیا ہم ایک اور صلیب نہ بنالیں!

لیکن اس قربانی میں ہمارے لیے اتنی ہی روحانی اور جذباتی اپیل ہے جتنی کہ عیسائیوں کے لیے مسیح کے مصلوب ہونے میں۔ مسیح کی قربانی فن مصوری اور ادب کا ایک بہت بڑا موضوع ہے۔ حسین کی قربانی ہمارے فن و ادب کا بہت بڑا موضوع کیوں نہیں بنتی؟ دنیا کے اس فن میں انتہائی بلندی ہے، جس کا مذہب سے بہت گہرا تعلق ہے۔ خواہ وہ ادب ہو، یا موسیقی یا رقص یا فن مصوری! پھر اسلام کو فن سے اتنا دور کیوں رکھا جاتا ہے؟

میں اپنے موسیقی کے اس جنون کو مذہب کے منافی نہیں سمجھتا۔ مجھے مذہب سے گہرا لگاؤ ہے۔ مانا کہ موسیقی ایک کافر طبیعت کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن روحانی جذبات بھی بیدار کرتی ہے۔ موسیقی میں ایک روحانی عرفان ہے....

اور میں اپنی موسیقی کی دیوی کے حضور ہدیہ عقیدت پیش کررہا ہوں....

شیرازی نے ایک خاص ایرانی خوشبو ارن میں ڈالی اور سارا کمرہ اس کی مہک میں ڈوب گیا۔ اس خوشبودار دھوئیں نے قانون کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور پھر قانون کے اوپر اس تصویر کو۔

یہ تصویر کس کی تھی؟ یہ لڑکی کون تھی جو تصویر میں ایرانی حسن کا مکمل نمونہ اور موسیقی کی دیوی کا ایرانی مظہر معلوم ہوتی تھی؟

یہ ستار، اور یہ طاؤس، یہ دھوئیں کی مہک، یہ آلٹر اور موسیقی کی دیوی کا یہ ایرانی روپ!... شیرازی کی نظریں تصویر پر جمی رہیں۔ تصویر کے کونے میں درج تھا...

"شیریں افراسیاب شیرازی۔"

شیریں افراسیاب شیرازی میری بنت عم تھی۔ ہم دونوں اس سرزمین خاک سے پیدا ہوئے تھے جس سے وہ شاعر رنگیں بیاں، گوہر افشاں، حافظ شیراز اٹھا تھا۔ شاعری اور موسیقی کا جنون ہم نے گویا ورثے میں پایا تھا۔

وہ میری بنت عم تھی، میری بچپن کی رفیق، میری عزیز ترین دوست، میری محبوب!

انہی دنوں سے ہماری رفاقت تھی جب کہ میں ابھی طفلک سیماب پا تھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ شباب کی منزلوں میں یہ طفلانہ انس اور رفاقت بڑی عجیب وغریب، آتشیں محبت میں تبدیل ہوگئی۔ میں تمھیں بتا نہیں سکتا، تم اندازہ نہیں کر سکتے یہ کس نوع کا عشق تھا۔ ہماری محبت بہت غیر معمولی تھی، بہت ہی غیر معمولی! وہ خود بھی ہر لحاظ سے بڑی غیر معمولی لڑکی تھی۔ نادر اور یکتا! اس کی ہستی کچھ ایسی بلندیوں کی حامل تھی، کچھ ایسی بلند و بالا تھی کہ عام لڑکیوں سے اس کا مقابلہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

میں تمھیں کیسے بتاؤں وہ کیا تھی، کیسی تھی؟

ایران کا حسن تم نے دیکھا ہے۔ حسن ہمارے ہاں نایاب شے نہیں ہے۔ حسن و جمال سے ایران کی عام عورت مزین ہوتی ہے۔ لیکن وہ تو ایرانی حسن کا ایک نادر نمونہ تھی۔ ہر اعتبار سے مکمل۔

شب دیجور سے سیاہ گیسو، وہ عنبریں کاکل برہم جو اس کے مرمریں شانوں پر ہمیشہ بکھرے رہتے تھے۔ جبین منور، بلوریں، صراحی دار گردن، وہ ابروؤں کی کمان جو ایرانی حسن کا خاصہ ہے۔ گہری، نیلی آنکھیں، سرگیں نرگسی آنکھیں!

وہ غنچہ دہن جس پر ہمیشہ یاقوت کی سی چھوٹ ہوتی تھی۔ اور وہ لب جن کے گوشوں پر وہ ہلکی سی نرم، لطیف مسکراہٹ ہوتی تھی جو دیکھی نہیں صرف محسوس کی جا سکے۔ وہ مونالزا کا مخصوص ابدی تبسم!

وہ چاہ ذقن جس کے بارے میں ہمارے شاعران ایران کہتے ہیں یہ ایک ایسا گڈھا ہے جس میں عشاق بری طرح گرتے ہیں اور جب گرتے ہیں تو اوپر آنے کے لیے انھیں زلفوں کے پیچ کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک!

شاید قدرت کو یہ منظور نہیں کہ کسی کا حسن اتنا مکمل ہو۔ ایک مرتبہ کار کے حادثے میں اس کا رخسار زخمی ہوگیا۔ وہ مجھ سے چھپی پھرتی تھی کہ کہیں زخم کا نشان دیکھ کر اور یہ دیکھ

کر کہ اس کے حسن میں اب داغ لگ گیا ہے، کہیں میری محبت میں کمی نہ آ جائے۔ حالاں کہ میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس حال میں بھی میری محبت وہی رہے گی۔ پھر اچانک وہ ایک دن، بہت دنوں بعد، میرے پاس آئی۔ میں نے دیکھا، زخم کا نشان مٹ چکا ہے، صرف ایک گہرا نقطہ باقی رہ گیا تھا، جس پر اس نے بڑی نفاست سے ایک مصنوعی سیاہ تل بنا رکھا تھا، اس نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔

وہ تل دیکھ کر مجھے 'بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را' کا خیال نہیں گزرا، اور 'اگر آں ترک شرازی بدست آرد دل مارا' کی شرط کا تو یہاں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لیکن سمرقند و بخارا کی بخشش تو 'مادّی' تھی، اور میں نے اسے اپنی 'روح' کی پیش کش کی تھی۔ وہ تو کچھ ایسی تھی جسے اپنا وجود، اپنی روح سپرد کی جائے!

میں حسن کے عضو بہ عضو تجزیے کا قائل نہیں۔ حسن ایک محدب شیشے سے دیکھا نہیں جاسکتا۔ حسن ایک مکمل تناسب ہے، ایک مکمل یکائی۔ اور وہ حسن کی تکمیل تھی!

(لوگ کہتے ہیں میں بھی حسن کا مالک ہوں۔ اور میرے فن کار اور مصور دوست جانے مجھے کس کس سے تشبیہیں دیتے ہیں۔ گویا میں برنی نی کا اپالو ہوں، مائیکل اینجلو کا ایک شاہکار نوجوان ڈیوڈ ہوں! کہتے ہیں پرسیوس کے مکمل ڈھلے ہوئے سر اور چہرے کی تراش سے میری تراش اور خدوخال ملتے ہیں۔

کہتے ہیں، مجھ میں اپنے ہم نام مہ کنعانی کا حسن ہے۔

میں سوچتا ہوں، میں ہوں ہی کیا؟ مجھ میں جو کچھ ہے وہ اس جمال ہم نشیں کا عکس ہے۔ حسن تو وہ تھی، نغمہ تو وہ تھی ...)۔

وہ حسن تھی، نغمہ تھی، شعر تھی...

جب وہ میرے پاس بیٹھی نازک بلوریں جام میں اپنی محبوب مئے شیری پلا رہی ہوتی تو وہ عمر خیام کی ساقی معلوم ہوتی نہیں محض ساقی نہیں، وہ تو عمر خیام کی رباعی تھی۔ مجسم "شراب، شعر اور تم پہلو میں" کے تینوں عناصر ایک 'تم' میں مل گئے تھے۔ ویسے مئے بھی

ہمارے ساتھ ہوتی تھی اور شعر بھی۔ اور پھر وہ خود بہ نفس نفیس، مینا بدوش آنکھیں، ساغر بکف نگاہیں لیے!

شراب، انگور کی بیٹی، دخت رز، بادہ از خون رزانست...

(مئے گلگوں اس وقت بھی میرے سامنے ہے، یہ کچے انگور میرے سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ شیری ہے۔ میں شیری اس لیے پیتا ہوں کہ وہ اس کی محبوب مئے تھی۔ وہ مجھے شوق سے پلایا کرتی تھی۔ شیری کی اس سے ایک اور گہری مناسبت ہے۔ اسی لیے میں شیری پیا کرتا ہوں۔

میرے دوست میرا مذاق اڑاتے ہیں کہ میں یہ ہلکی 'لیڈیز ڈرنک' پیتا ہوں۔ حالانکہ میں تو سیر بھر انگور کے ساتھ سکاچ بھی پی سکتا ہوں۔ ہالینڈ کی ڈرائی جن پی لوں مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہلکے سے سرور میں مست رہتا ہوں۔ بلکہ میں کونیک بھی پیوں تو وہ نہیں بولے گی، جسے 'مولاں روژ' میں Toulouse Lautrec نے پئے ہوئے کہا تھا: ''ماں، یہ میں نہیں بول رہا ہوں، میری کوک نیک بول رہی ہے۔'' میرا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ مجھ پر کبھی تیز نشہ نہیں چڑھتا۔ پھر بھی میں اکثر شیری ہی پیتا ہوں۔ میرے دوست بے سمجھ کیا جانیں کہ شیری میرے لیے کیا کچھ ہے؟

جب میں شیری پیتا ہوں، تو وہ میرے پاس ہوتی ہے!)

مئے دخت رز، بادہ از خون رزانست

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند
گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند
شکر ایزد کہ میان من وآں صلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

شراب اور شعر۔ حافظ شیراز کے شعر جو مئے سے کچھ کم مدہوش کن نہیں۔

حافظ شیرازی، سعدی، فردوسی، رومی کے شعری ورثے کے زیر سایہ پلی ہوئی اس

دخترِ ایران کو میں نے غالب و میر سے بھی روشناس کرایا تھا، اور غالب کے فارسی اشعار تو وہ بڑے شوق سے پڑھا کرتی تھی۔

اور پھر ان کے علاوہ ہماری وہ خاص چیز بھی تھی جس کے بغیر شراب اور شعر کے ساتھ اس تثلیث کی تکمیل ناممکن ہے... یعنی موسیقی!

یہ موسیقی ہی تھی جس کے ذریعے ہم دونوں میں اتنا گہرا روحانی ربط پیدا ہو گیا تھا! موسیقی بھی کیا شے ہے!

(موسیقی کائنات کی روح کو چھو لیتی ہے۔

بیتھوون کی موسیقی میں ایک کائناتی عرفان تھا۔

موسیقی فطرت کے عناصر پر اثر انداز ہوتی ہے...

آرفیوس کی موسیقی کے سحر سے درخت جھوم اٹھتے تھے، جانور کھنچے چلے آتے تھے، چٹانیں اپنی جگہ سے ہٹ کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتی تھیں، کائنات کے ہر ذرے پر اس کا سحر چھایا رہتا تھا۔

اور موسیقار ہندتان سین کے بارے میں روایات ہیں کہ ان کے بسنت سے بہار پھوٹ پڑتی تھی۔ ان کی موسیقی کی آتشیں لہروں کے اثر سے پتھر پگھل جاتے تھے، دیپک راگ سے روح میں آگ لگ جاتی تھی...

کیا یہ سب محض Legends ہیں؟ اور اگر ہیں تو ان میں گہرے رمزی معنی پوشیدہ ہیں۔

میں آرفیوس نہیں ہوں، بیتھوون نہیں ہوں، تان سین نہیں ہوں۔ میں ایک معمولی موسیقار ہوں۔ لیکن میں نے موسیقی کے حسن و سحر کو اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا ہے)۔

میں اپنے اس موسیقی کے جنوں کے لیے اسی کا مرہونِ منت ہوں۔ میری روح میں آگ لگانے، موسیقی کا جادو جگانے والی وہی تھی۔

میرے وجدان کا سرچشمہ، موسیقی کی روح، موسیقی کی دیوی!

موسیقی میں نے زیادہ تر اسی سے سیکھی تھی۔ گو میری استاد بھی تھی۔ وہ ماہر موسیقار تھی، لیکن صرف ایرانی موسیقی سے واقف تھی۔ مجھے جب ہندوستان اور پاکستان میں کافی عرصہ گزارنے کا موقع ملا تو میں نے اسی شوق سے یہاں کی کلاسیکی موسیقی سیکھی۔ دوبارہ ایران جانے پر اس نے مجھ سے یہاں کی کلاسیکی چیزیں سنیں تو بالکل وارفتہ ہو گئی۔ وہ یہاں کی کلاسیکی موسیقی کو برتر سمجھتی تھی۔ قانون سے تو اسے والہانہ انس تھا۔ وہ قانون کے چھیڑ میں اپنے ہر جذبے کا اتار چڑھاؤ محسوس کرتی، قانون گویا اس کے ہر گہرے جذبہ و احساس کا ترجمان تھا۔ اور میں خود بھی قانون بجاتے ہوئے محسوس کرتا تھا، اور اب بھی کرتا ہوں کہ اس قانون سے پھوٹتے ہوئے ہر راگ میں اس کا کوئی نہ کوئی روپ ہے۔

"یہ قانون میرا اسم ہے، اس میں میری روح ہے۔ جب میں نہیں ہوں گی، تم اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا اور سمجھ لینا کہ میں تمھارے پاس ہوں۔"

یہ قانون جو تم تھامے ہوئے ہو، یہ قانون جسے تم اتنے پیار، اتنے انہماک سے چھیڑتے ہو، یہ ستار قانون کی لَے میں تم ڈوب جاتے ہو، کھو جاتے ہو، یہ میں ہی ہوں، یہ میں ہی ہوں۔

فرہاد نے شیریں کے لیے جوئے شیر نکالی تھی۔ فرہاد کی جوئے شیر کی میرے یہاں کوئی زیادہ وقعت نہیں ہے۔ فرہاد کی 'کوہ کنی' محض ایک جسمانی مشقت تھی۔ میں تم سے جسمانی مشقت کی طلب گار نہیں ہوں۔ میں تم میں وہ روحانی کرب دیکھنا چاہتی ہوں جو ایک سچے فن کار کا تخلیقی کرب ہے۔ جب تک تم اس کرب سے نہیں گزرو گے، روح کی گہرائیوں میں نہیں اترو گے، مجھے کبھی نہیں پاؤ گے، کبھی نہیں....

اور میں جانتا تھا جب تک میں اس کرب سے نہیں گزروں گا، روح کی گہرائیوں میں نہیں اتروں گا، میں اپنی یوریڈیس کو کبھی نہیں پاسکوں گا، کبھی نہیں۔ وہ میرے پاس ہوتے ہوئے بلکہ میری اپنی ہوتے ہوئے بھی، میری رسائی سے دور تھی، بہت دور!

اور آہستہ آہستہ میری موسیقی میں وہ روحانی کیف پیدا ہوتا گیا، جس سے ہم دونوں سرشار ہو جایا کرتے تھے، اور ہمیں یہ محسوس ہوتا تھا، ہم دونوں کی روحیں موسیقی کے دھارے پر بہتی ہوئی ایک دوسرے سے مل گئی ہیں، ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئی ہیں۔

''میں اب تمھاری ہوں، تمھاری ہوں، آقائے شیرازی۔ اب تم نے مجھے صحیح معنوں میں اپنا لیا ہے۔ من تو شدم، تو من شدی، والی وحدت اب ہم میں پیدا ہو گئی ہے۔ ہم دونوں ایک ہیں، ہماری روحیں ایک ہیں، تم میرا ہی ایک الگ وجود ہو، اور میں تمھاری ہی ایک جدا ہستی ہوں۔ اگر زمانے یا قسمت نے مجھے تم سے چھین لیا، پھر بھی، یقین رکھو، میں تمھاری رہوں گی۔''

اگر قسمت نے چھین لیا؟ اور اس پر میرے اندر ایک اہرمن جاگ اٹھتا، جو طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کرتا۔ اور اس وقت ہمارے اس سکون میں ایک ہلچل سی مچ جاتی۔

میں نہایت تلخی سے کہتا: ''تم شیریں ہو، اور اس نام کے ساتھ دنیائے ادب کا ایک شہرۂ آفاق رومان وابستہ ہے، اور شیریں کے ساتھ ایک تثلیث ہے۔''

''تثلیث یعنی چہ؟'' وہ بچوں کی سی معصومیت سے سوال کرتی۔ ''تثلیث، یعنی شیریں، فرہاد اور خسرو کی تثلیث۔ فرہاد نے اپنے تیشے سے پہاڑ کاٹ ڈالے، اپنی جان جوکھم میں ڈال کر جوئے شیر نکالی، اپنی جان کی قربانی دے دی، اور شیریں تو خسرو کی تھی، اور فرہاد...

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب
مجھ کو منظور نکو نامی فرہاد نہیں''

''آقائے شیرازی۔'' وہ پلٹ کر ایک زخمی ہرنی کی آنکھوں سے مجھے دیکھتی (اُف! وہ چشم غزالیں!)۔ ''آقائے شیرازی، نمی دانم شما چنیں طور گفتگو می کنید، ایں شکوک واندیشہ ہا چہ معنی دارند؟'' جب وہ بپھری ہوئی، بات کرتی تو فارسی اس کے منہ سے کتنی شیریں معلوم ہوتی تھی۔ فارسی یوں بھی شیریں زبان ہے۔ لیکن جب وہ فارسی بولتی تھی تو اس کی شیرینی

کے کیا کہنے!

''شیریں، جانم، دیوانہ ام کہ ایں اندیشہ ہا دارم۔'' ایک بے پناہ جذبہ میرے سینے میں امڈتا اور میں اس کے ننھے سے سر کو سینے سے بھینچ کر اس کے ملائم بالوں کو چوم لیتا۔

''ہاں، میں دیوانہ ہوں، میں دیوانہ ہوں جو شک کرتا ہوں۔ تم میری ہو، تم میری ہو، تم میری ہو!''

''تم نے مجھے کتنا غلط سمجھا ہے۔'' وہ بے پناہ دکھ سے کہتی: ''پھر کیا شیریں نے بھی اپنی جان نہیں دے دی تھی؟ کون جانے تم نہیں، میں ہی اپنی جان دے دوں.....''

میں اپنے کہے پر پشیمان ہو کر اسے ہر طرح سے بہلانے کی کوشش کرتا۔ اور جب وہ سنبھل جاتی تو اس کی شوخی عود کر آتی: ''چہ می گوئی؟ فرہاد گرسنہ مزدور بود یا فن کار با کمال؟ بشنی، از شاعران ایران می گوید۔

بسکہ کار تیشۂ فرہاد رنگیں آمدہ
ہر کہ بیند نقش او، گوید کہ شیریں آمدہ''

اور اس برجستہ جواب کی میں داد دیے بغیر نہ رہ سکتا۔ شاید اس بڑے ادبی رومان کے لیے فرہاد کے فن کار ہونے کا تصور زیادہ صحیح تھا!

لیکن، آخر وہی ہوا، جس کا مجھے جانے کیوں بار بار شک گزرتا تھا۔ ایک خسرو ہمارے درمیان آ گیا۔ اس کی شادی تو مجھی سے ہونے والی تھی۔ بچپن ہی میں ہم دونوں کا رشتہ طے کر دیا گیا تھا۔ جیسا کہ تمھارے ہاں بھی رواج ہے، میری ماں اسے گہوارے ہی سے مانگ لائی تھی۔ اور چونکہ ہم ایک دوسرے کے منگیتر تھے، ہمارے ملنے جلنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ ویسے بھی ہم دونوں ایک بلند اخلاقی ماحول اور روایات کے زیر اثر پلے ہوئے تھے۔

اور عین اس وقت جب کہ ہماری شادی جلدی ہو جانے والی تھی، ایک خاندانی کشیدگی جو مدتوں چلی آئی تھی، اور جسے ہم دونوں کے روشن خیال اور فراخ دل والدین

ہمارے رشتے کے ذریعہ مٹا دینا چاہتے تھے، اچانک ایک شدید تنازع میں منتج ہوئی۔ اور میرے چچا نے نہ صرف اپنی دختر کی مجھ سے نسبت توڑ ڈالی، بلکہ فوراً ہی اس کا کسی اور سے رشتہ کر دیا۔

وہ خسرو بھی ایک عجیب خسرو تھا۔ اسے ہماری بچپن کی نسبت، ہماری گہری رفاقت کا علم تھا، اور وہ ایک طرح سے اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتا تھا۔ بلکہ وہ اس سے کہا کرتا تھا کہ ''تم صرف شیرازی کی ہو، تمھیں زبردستی میری بنا دیا گیا۔ یہ تم پر ظلم ہوا ہے۔'' تم باور نہیں کرو گے وہ کیسا آدمی تھا۔ وہ اس حد تک روادار تھا کہ اس نے اسے کھلی اجازت دے رکھی تھی کہ مجھ سے جب چاہے ملا کرے۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی میں چاندنی راتوں میں بیٹھا قانون بجایا کرتا تھا، اور جب میرے نغموں میں میری بے بسی، محرومی، میرا درد ھلول ہو جاتا تھا تو وہ میری قانون کی درد بھری لے سے بے اختیار کھنچی چلی آتی تھی۔ اور وہ اسے کبھی منع نہ کرتا تھا، نہ برا مانتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ خود مغربی تعلیم، تہذیب و تمدن سے پوری طرح آشنا ہونے کے باوجود مشرقی اخلاقی اقدار کی پابند تھی اور ایک مشرقی بیوی تھی۔ اور اپنا تو یہ عالم تھا:

ترے خیال کو چھوتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں!

اسے اپنی بیوی پر اور مجھ پر بھی پورا بھروسہ تھا۔ پھر بھی تعجب ہوتا ہے، کیا اس شخص میں جلن اور رقابت کا جذبہ بالکل نہیں تھا؟ وہ تو اس کا شوہر تھا۔ ممکن ہے اسے جلن اور اذیت ہوتی ہو۔ بعض لوگوں کو جلنے میں، اپنے آپ کو اذیت پہنچانے میں مزہ آتا ہے۔ نہیں معلوم وہ اس اذیت اور جلن میں لذت محسوس کرتا تھا یا اس کا یہ اقدام اپنی طرف سے ایک بہت بڑی قربانی تھا۔ بہر حال شوہر ہوتے ہوئے ہمارے دکھ اور محرومی کا احساس بہت بڑی بات تھی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بھی اس سے محبت کرتا تھا، گو میری اور اس کی محبت بہت مختلف تھی۔ 'ودرنگ ہائٹس' کے ہیت کلف کی طرح میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں چند لمحوں میں شیریں کو وہ محبت دے سکتا تھا، جو اسّی سال میں وہ نہ دے سکتا تھا۔ اتنا بڑا دعویٰ تو

میرے لیے مناسب نہ تھا، خصوصیت سے جب مجھے بھی اس کا احساس تھا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتا ہے، اپنے انداز میں... ہمارے مزاجوں میں بڑا فرق تھا۔ وہ نرم، بردبار، صالح طبیعت کا مالک تھا، اور میں بلا کی تیزی اور شدید طوفانی طبیعت کا! اس کی محبت نرم، شفقت بھری تھی، اور میری... جانے میری محبت کیسی تھی، گہری اور آتشیں! شاید میری اس محبت کا انجام ایک المیہ ہی ہوسکتا تھا۔ ہم دونوں المیے کے لیے ہی بنے تھے!

ہماری کوٹھیاں ایک دوسرے سے متصل تھیں، اور صحن کی ایک نیچی دیوار دونوں کوٹھیوں کے لیے مشترک تھی اور وہ کبھی کبھی میرے پاس چلی آتی تھی۔ قانون کی درد بھری لَے سے بے اختیار ہو کر کھنچی چلی آتی تھی!

اور اس رات، اس رات، اسے شاید اپنی موت کا شدید احساس ہو گیا تھا۔ اور شاید اس نے اپنے لیے پہلے سے یہ موت تجویز کر رکھی تھی۔

"تم نہیں۔ شاید میں ہی جان دے دوں...." اس نے کہا تھا۔ اور اس رات وہ میرے پاس چلی آئی اور میرے ہاتھوں میں اس نے جان دے دی....

اس کی موت کتنی حسین تھی! اس کی پاکیزہ روح موسیقی کی لہروں کے دوش پر پرواز کر گئی!

یوسف شیرازی بہت دیر تک کھویا ہوا، چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس نے پھر 'ارن' میں خوشبو ڈالی۔ کمرہ مہک اٹھا اور خوشبودار دھوئیں نے قانون کو اور تصویر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے ایک نظر تصویر پر ڈالی اور اس کے قدموں میں قانون اٹھا کر، بیٹھے بیٹھے، آہستہ آہستہ چھیڑنے لگا....

اچانک کمرے میں کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ شیرازی بھنا اٹھا: "تم کیوں چلی آئیں میرے کمرے میں؟ کتنی دفعہ کہا ہے تمھیں، اس کمرے میں نہ آیا کرو۔ لے جاؤ واپس، جو کچھ لے آئی ہو، خیر اس میز پر رکھ دو۔ دودھ لے آئی ہو؟"

"ہاں، میں تو... دودھ... لے... آئی۔" سہمی ہوئی ایکو نے وہی الفاظ دہرائے اور

دودھ کا گلاس میز پر رکھ کر ٹرے لیے چپ چاپ، دبے پاؤں لوٹ گئی۔

"کہنے کو تو یہ بھی میری بنت عم ہے، لیکن ہمیں تفاوت!"

"جانے کیوں بھائی جان مجھ سے اتنی نفرت کرتے ہیں۔ وہ کمرے میں میرا آنا تک گوارا نہیں کرتے۔ میں نے کیا قصور کیا تھا آخر۔ میں تو انھیں... اتنا چاہتی ہوں، ان کا اتنا خیال رکھتی ہوں، ان کی پرستش کرتی ہوں...." آنچل منہ پر ڈالے ایکو چپ چاپ روتی رہی اور سسکیاں لیتی رہی....

(ایکو کا دل ٹوٹ گیا ہے اس کا وجود تمھاری محبت کی آگ میں جل رہا ہے۔ تم کتنے بے رحم ہو نارسی سس! تم اپنے آپ میں مگن ہو۔ دوسروں کے دکھ کی تمھیں کوئی پروا نہیں۔ تمھارے لیے کوئی جلے تو جلے۔ سن رہے ہو، نارسی سس؟ ایکو کی یہ سسکیاں سن رہے ہو؟ نارسی سس، نارسی سس، نارسی سس!

میں نارسی سس نہیں ہوں، میں نارسی سس نہیں ہوں، میں آرفیوس ہوں، جس کی یوریڈیس ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو چکی ہے۔ مجھے کسی سے کوئی بیر نہیں، کوئی نفرت نہیں۔ لیکن اب کسی اور عورت کے لیے میرے دل میں جگہ نہیں رہی۔ یہ اتنی ساری عورتیں میری جان کے پیچھے کیوں پڑ جاتی ہیں؟ میں کسی سے کوئی سروکار رکھنا نہیں چاہتا۔ میں تنہائی چاہتا ہوں! اُف! میں تنہائی چاہتا ہوں! تنہائی سے میرا ایک حسین راز وابستہ ہے۔ تنہائی میں میری روح کو سکون ملتا ہے۔ تنہائی میں میری اپنی ایک دنیا ہوتی ہے، جس میں، میں کھو جاتا ہوں۔

لیکن میں نارسی سس نہیں ہوں۔ میں اپنے ہی عکس، اپنے ہی وجود میں کھو نہیں گیا ہوں۔ اگر نارسی سس خود پسندی اور انانیت کا اسم ہے تو میں ہرگز ہرگز نارسی سس نہیں ہوں۔

لیکن نارسی سس خود پسندی کا اسم نہیں ہے۔ اگر نارسائسس اپنے عکس میں آپ کھو گیا تھا تو یہ اس کی خود پسندی نہیں تھی۔ اس کے بارے میں تو ایک سبل نے یہ پیش گوئی کی

تھی کہ وہ جب تک اپنے آپ کو نہیں جانے گا، اچھی طرح جیے گا۔ لیکن جب وہ اپنے آپ کو جان لے گا، یا اپنے آپ کو پانے کی کوشش کرے گا، تو فنا ہو جائے گا۔ نارسی سس کی Myth کے یہی حقیقی گہرے معنی ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو پانے کی کوشش کی تھی، ان گہرائیوں میں زندگی کے معانی ڈھونڈے تھے۔ وہ ان گہرائیوں میں دیکھتا رہا، دیکھتا رہا، لیکن اسے وہاں زندگی کی، وجود کی، ایک غیر مرئی، ناقابل گرفت شبیہ نظر آئی۔

The tormenting, mild image, the image of the Ungraspable phantom of life*

اور جب اس نے اسے پانے کی، اسے گرفت میں لینے کی کوشش کی تو انھی گہرائیوں میں ڈوب کر فنا ہو گیا!

تم بھی ان گہرائیوں میں ڈوب کر فنا کیوں نہیں ہو جاتے، نارسی سس، نارسی سس، نارسی سس؟)

ایکو کی سسکیاں اب بھی سنائی دے رہی ہیں۔ لیکن ایکو تو محض ایک صدائے بازگشت تھی نارسی سس اس میں کیا پا سکتا تھا؟ نارسی سس اس پر توجہ کیسے دے سکتا تھا؟

یہ لڑکی بھی میری بنت عم ہے۔ یتیم لڑکی ہے، امی نے اسے پال رکھا ہے۔ وہ چاہتی ہیں میں اس سے شادی کر لوں۔ یہ لڑکی بھی مجھے چاہتی ہے، میرا ہر طرح خیال رکھتی ہے۔ میں بھی اس کا خیال ضرور رکھتا ہوں، لیکن میں اسے بہن سمجھتا ہوں۔ شادی؟ نہیں، کبھی نہیں۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے، کوئی اور عورت اس پہلو میں نہیں ہوگی۔ کسی اور کے لیے میرے دل میں بالکل جگہ نہیں رہی۔ میری بقیہ ساری زندگی صرف اسی کے لیے وقف ہے۔ اس کی پاکیزہ روح کے لیے!

میں اس لڑکی کو اپنے کمرے میں آنے نہیں دیتا، کیوں کہ مجھے اس کا شدید احساس ہوتا ہے کہ اگر یہ آئے گی تو پھر اس کی پاکیزہ روح میرے پاس نہیں آئے گی!

* Herman Milville "Moby dick"

میں چاہتا ہوں، یہاں دوسرا کوئی نہ ہو، دوسرا کوئی نہ ہو....

اس کی موت کے بعد بھی، میں اس کے وجود کو اتنی ہی شدت سے محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی روح میرے پاس ہوتی ہے۔

اور یہی میری اپنی ایک الگ ذہنی دنیا ہے۔ میرے دوست، جو میرے لیے حقیقی مادی دنیا سے کہیں زیادہ حقیقی ہے۔

اور یہی میری تنہائی کا حسین راز ہے۔

یہ گہری رات، یہ قانون، یہ موسیقی، میری محبت کا المیہ اور اس کی روح کا ساتھ!

یہ عام دنیوی زندگی میرے لیے بہت کٹھن معلوم ہوتی ہے۔ ایک بے انتہا حساس فطرت کے لیے، جو انسانوں سے الگ دیکھنے، سوچنے اور محسوس کرنے کی عادی ہو، یہ عام، معمولی، ٹھوس، مادی زندگی بڑی کٹھن معلوم ہوتی ہے!

یہ قانون اس کا اسم ہے۔ یہ میرے درد کی تنہا درماں ہے، یہ اب میرا رفیق حیات ہے۔ اسے میں ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہوں۔ یہ قانون اس کی تصویر کے قدموں میں رہتا ہے۔ میں اس کے نیچے عود اور لوبان اور خوشبوئیں جلاتا ہوں۔ اور اس عنبر و لوبان کی مہک میں بسے ہوئے ستار کو پہلو میں رکھے، جانے کب تک، دیوانگی کے عالم میں چھیڑتا رہتا ہوں۔ رات گہری ہوتی جاتی ہے، میں سو جاتا ہوں، لیکن سوتے میں بھی میری انگلیاں ان تاروں کو چھیڑتی رہتی ہیں۔ اور اس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، وہ میرے پاس ہے۔ میں اپنے شانے پر اس کے ننھے سے سر کا بوجھ محسوس کرتا ہوں، اس کی ملائم ریشمی زلفیں میرے شانے پر بکھری معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی مہک سے مجھ پر مدہوشی سی چھانے لگتی ہے....

کون کہتا ہے وہ مر چکی ہے۔ وہ امر ہے۔ موسیقی نے اسے لافانی بنا دیا ہے۔ اس قانون میں اس کی روح ہے۔ اور جب بھی میں اس قانون کو اس طرح چھیڑتا ہوں کہ میری روح ان تاروں میں تحلیل ہو جاتی ہے تو اس کی روح میرے پاس چلی آتی ہے۔

The all of thine that cannot die

Through dark and dread Eternity
Returns again, to me*!

میری موسیقی امر ہوگئی، میری بھینٹ قبول کرلی گئی۔ اور اس کے صلے میں آج دیوی خود میرے پاس چلی آئی ہے۔ سنگیت کی، کلا کی، روپ کی دیوی!

یہ وہی روپ ہے، یہ وہی روپ ہے۔
اور یہ وہی ہیں، یہ نیل کمل، یہ نیل کمل،
یہ نیل کمل۔

کون کہتا ہے وہ مرچکی ہے۔ وہ امر ہے، لافانی ہے۔

اس ستار میں اس کی روح ہے! یہ ستار اس کی اسم ہے۔ اور جب کبھی میں اس ستار کو اس طرح چھیڑتا ہوں کہ میری روح ان تاروں میں تحلیل ہو جاتی ہے تو اس کی روح میرے پاس چلی آتی ہے۔ اور ہماری روحیں موسیقی کی لہروں پر مل کر ایک ہو جاتی ہیں!

آرفیوس اور یوریڈیس کی روحیں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے یلیزین وادی میں آزاد گھوما کرتی ہیں۔ آزاد اور مسرور!

پہاڑیوں سے اب بھی آرفیوس کی آواز کی بازگشت آتی ہے۔

یوریڈیس، یوریڈیس، یوریڈیس!

اور جس ندی میں آرفیوس کا سر بہایا گیا، اس ندی سے اب بھی وہی لے نکلتی ہے، آرفیوس کی بربط کی لَے!

مگدھ اور بدیسہ کی بڑی سڑک کے اس پار ایک چھوٹی سی کٹیا کے سامنے بانس کے درختوں کے جھنڈ میں، پورنیما کی چاندنی میں، ایک پتھر کا مجسمہ نظر آتا ہے۔ اور جب پون چلتی ہے، تو اس مجسمے کے گرد کے بانسوں سے ایسی آواز نکلتی ہے، جیسے بانسری پر کوئی میگھ ملہار بجا رہا ہے!

---

* Byron بائرن

نامکمل افسانے

اردو افسانے کے تسلسل میں ممتاز شیریں کو عہد ساز افسانہ نگار (جس طرح منٹو اور بیدی ایک دور کے خالق بھی تھے اور خاتم بھی) یا سد شکن افسانہ نگار (جن معنوں میں قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین رجحان ساز افسانہ نگار ہیں) قرار دینا تو مشکل ہوگا، مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ضروری ہے کہ ان کی افسانوی تدبیر کاری اتنی ہنر دار ہے اور ایسے تخلیقی و فکری رویوں میں گندھی ہوئی ہے کہ اس کا مطالعہ اور اس کی بازیافت آج ہمارے لئے سودمند ہوگی۔

— آصف فرخی

ایک زلیخائے خود آگاہ کا دامن بھی جلا

دو نفیس بلوریں گلاس جن سے دو مختلف رنگوں کے مشروب چھلک رہے ہیں، بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہیں۔ ایک میں گہرا زرد یا نارنجی سیال ہے دوسرے میں فرانسیسی شراب کلیرے کا سا سرخی مائل براؤن، ایک اورنج جوس ہوگا، دوسرا شربت فانسہ یا اسی سے ملتا جلتا کوئی شربت۔

دو گلاس پاس پاس بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہیں ان کی شفاف بلوریں سطح سے سرخی مائل سنہرا اور براؤن اور نارنجی رنگ چھلک رہا ہے۔ دونوں گلاسوں کے سیال مادہ میں بلبلے اٹھ رہے ہیں۔ ان میں سفید سفوف کے ذرے تحلیل ہو رہے ہیں۔ سفید سفوف یا ہلکا زرد سفوف یا ایک گلاس میں سفید سفوف اور ایک میں ہلکا زرد، مشروب کے گہرے رنگوں کی وجہ سے سفوف کا رنگ واضح دکھائی نہیں دیتا۔ اب ذرے گھل کر مشروب کے ساتھ یکجان ہو چکے ہیں۔ حباب نہیں اٹھ رہے ہیں اور مشروب کی سطح پرسکون ہے۔

ایک آراستہ شبستان نرم قالین دبیز پردے فوم کا ڈبل بیڈ اور ریشمیں لحاف ریشمیں نرم، گرم، لحاف میں سے ایک نازک مخروطی انگلیوں والا حسین ہاتھ نکلتا ہے پھر عریاں بازو اور کندھے اور سینہ حد نظر تک عریاں ایک مضبوط مردانہ ہاتھ گلاس کی جانب بڑھتا ہے، بڑھتے بڑھتے رک جاتا ہے۔

"نہیں نہیں، ابھی نہیں، ابھی رات بہت باقی ہے۔ رات گہری ہونے دو، آج کی

رات ہماری آخری رات ہے۔ آج کی رات محبت کی آخری رات ہے۔ آج کی رات محبت اور لذت کو اپنے منتہی تک پہنچنے دو۔ اس منتہی تک کہ اس سے پرے موت کے سوا کچھ نہیں۔ اس آغوش لذت سے ہم موت کی آغوش میں پہنچ جائیں۔ گھبراؤ نہیں جانم، یہ موت اذیت ناک نہیں ہوگی، ایک گہری طویل نیند ہوگی اور بس....

کاش میں ایک فن کار ہوتا۔ ایک باکمال مقصود یا سنگ تراش کہ تمھاری آخری شبیہ پیش کر سکتا جو میرا آخری شاہکار اور بلند ترین فنی کارنامہ قرار پاتا۔ تمھارے بے مثال حسن کے سحر کو میں نے لفظوں میں تو سمویا ہے، تم میری شاعری کی جان ہو، وجدان ہو، میرے اشعار کا سوز و گداز، حدت و تپش، بجلی کی سی تڑپ سب کچھ تم سے ہے، رعنائی خیال تم سے وابستہ ہے... تھی جو اک شخص کے تصور سے۔ نہیں میں محض تصور کا قائل نہیں، محض لذت نظر کا قائل نہیں، اس جرأت گناہ کا قائل ہوں جو قرب اور جسم کے لمس اور آسودگی تک پہنچا سکے۔ اس جرأت گناہ میں تم نے میرا مکمل ساتھ دیا ہے جذباتی روحانی، جسمانی ہر لحاظ سے ہم نے ایک دوسرے کے... اور تم میرے لیے صرف تصور نہیں رہی ہو۔ نازنین! وجود کی تکمیل کی ہے۔

میں مصور نہیں ہوں لیکن ایک تصویر کار تو ہوں کہ کیمرے سے غضب کی تصویریں اتار سکتا ہوں۔ مہ رخوں کے لیے ہم نے مصوری نہیں سیکھی، مصوری کے فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے خاصی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ فوٹوگرافی آسان ہوئی ہے اور جدید زمانے کی الٹراماڈرن مہ رخوں کے لیے بہر ملاقات، یہ تقریب ہی کافی ہے اور تمھیں ماننا پڑے گا کہ کم از کم عکس نگاری فوٹوگرافی کے فن میں، میں خاصی مہارت رکھتا ہوں۔ تمھاری بے شمار تصویریں اس کی شاہد ہیں۔ مانا کہ تم بے حد حسین و جمیل ہونے کے علاوہ غضب کی فوٹوجینک بھی ہو، پھر بھی کیا مجھ سے فن کار کے دلی لگاؤ اور فنی مہارت کو اس میں کوئی دخل نہیں کہ میں نے تمھارے حسن کو لازوال کر دیا؟

تمھاری وہ پہلی تصویر تمھیں یاد ہے جو میں نے وفور شوق کے عالم میں بنائی تھی۔ اس وقت جب تم میرے لیے صرف ایک تصور ایک تمنا تھیں، تمھاری پہلی معصومیت کی

تصویر اس میں تم ایک الوہی وجود ایک دیوی کی طرح مقدس، پاکیزہ اور معصوم نظر آ رہی ہو، لہراتے ہوئے بال کھولے تم سمندر کی موجوں سے اس طرح ابھر رہی ہو جیسے بوتی چلی کی وینس! تمھاری وہ پہلی تصویر میرا پہلا شاہکار تھا۔ کاش کہ میں تمھاری آخری تصویر بنا سکتا جس میں تمھارے چہرے پر اور حسین جسم پر بیک وقت انتہائی لذت اور انتہائی اذیت کی کیفیات طاری ہوں۔ یہ تصویر واقعی ایک شاہکار ہوتی لیکن اس وقت میرے ہاتھوں میں سکت ہی کہاں ہوگی۔ میرے حواس ہی کہاں قائم ہوں گے کیوں کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ موت میں شریک ہوں گے۔

نازنیں تمھاری اس پہلی معصومیت سے اس زندگی میں لے آنے کا جس کی آج تم ماہر ہو چکی ہو شاید میں ہی ذمہ دار ہوں۔ میں نے تمھیں اس زندگی کی لذت سے آگہی بخشی، تم آج ایک کامیاب سوسائٹی گرل ہو۔ اس شہر نگاراں کی ہر محفل کی شمع، ہر پارٹی کی جان، ہر کلب اور جم خانہ کی رونق تم سے۔ دوستی کا شرف اور نیاز حاصل کرنے کے لیے بڑے سے بڑے آدمی بے تاب، حتیٰ کہ ایک بین الاقوامی گروہ میں تمھاری مانگ بڑھتی گئی۔ جو تمھارے حسن اور ذہانت کو اپنے مقام کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ تم نے اس زندگی کی خیرہ کن چمک دمک دیکھی اور اس دلدل میں ایک دفعہ پھنسنے کے بعد اپنے آپ کو باہر نہ نکال سکیں۔ یہ پھندے اتنے مضبوط ہیں نازنیں کہ تم نکلنا بھی چاہو تو نکل نہ سکو گی۔ میں تمھیں بچانا بھی چاہوں تو بچا نہیں سکوں گا۔

ڈائری کے اوراق الٹتے گئے۔ ڈائری نویس کا موڈ بدلتا جا رہا تھا۔ محبت کا لہجہ نفرت وانتقام میں بدلتے ہوئے ایک قاتل کا سا لہجہ بنتا جا رہا تھا۔

''الٹا مجھی کو الزام دیتی ہو کہ میں نے تمھیں زندگی کی ان راہوں پر لا ڈالا کہ تم ایک مرد کی پابند نہ رہ سکیں۔ اس مرد کی جو تم پر دل و جان سے فریفتہ تھا اور تمھارا ہر رویہ ہر لغزش برداشت کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن میں وہ نہیں ہوں جسے تم اب تک دھوکا دیتی رہی ہو، میری خمیر ایک اور ہی مادہ سے اٹھی ہے، میں سراسر نار ہوں، تمھاری ذرا سی بے وفائی......

مجرم کون؟

کیا وہ ایک مجرم تھی؟

ایک مجرم، ایک قاتل؟

وہ جس کے حسن میں میڈونا کی سی تقدیس اور پاکیزگی تھی؟

وہ جو ایک ماں تھی، جس کے سینے میں ماں کا دل دھڑکتا تھا، جو جدائی میں اپنے ننھے سے بچوں کے لیے تڑپ رہی تھی؟

عورت ایک نا قابل فہم معمہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے معصوم ظاہر میں کتنی پیچ در پیچ، تہہ دار شخصیت چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔

یقیناً وہ ایک قاتل ہونے کے ساتھ ایک ماں بھی ہو سکتی تھی۔

لیکن کیا حقیقتاً وہ ایک قاتل تھی؟

بے شمار نظریں اس پر لگی تھیں۔ کورٹ روم (کمرۂ عدالت) کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کیوں کہ آج اس مشہور مقدمہ کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ باہر بھی ایک مجموعہ کثیر تھا۔ لوگ اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔

وہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑی تھی، اسی شاہانہ تمکنت کے ساتھ، سر اونچا کیے۔ بلور کے سے شفاف چہرے پر جذبات کا عکس چھلک چھلک آتا، لیکن وہ جذبات پر قابو پائے ہوئے تھی۔ چہرے پر خوف یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔

استغاثہ کی جانب سے لاتعداد گواہ پیش کیے گئے تھے، وکیل استغاثہ نے کیس بھی بہت اچھی طرح پیش کیا تھا۔ لیکن وکیل صفائی (Criminal Lawyer) کی حیثیت سے ملک گیر شہرت کا مالک تھا۔ اس نے گواہوں پر اتنی کامیاب جرح کی تھی اور دفاع کا کیس (Sum up) سمیٹتے ہوئے اتنی قابل قبول، مدلل بحث کی تھی کہ یقین ہو چلا تھا، یا تو وہ بری کردی جائے گی یا پھر سزا ہوگی تو چند سال کی سزائے قید۔

اس نے حاضرین عدالت پر ایک نظر ڈالی۔ ساری نظریں اس پر جمی تھیں۔ ان نگاہوں میں کیا تھا؟ (Accusation?) اور اچانک جیسے یک زباں ہو کر کہا:

تم مجرم ہو!

یہ کسی جیوری کی آواز نہیں تھی، سارے شہر کی آواز تھی،

تم مجرم ہو، تم مجرم ہو،

مجرم، مجرم، مجرم

یہ آواز اس کا تعاقب کر رہی تھی۔

اور اچانک اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ اس کی نظروں نے دیکھا جج کے سر پر کالی ٹوپی رکھی گئی تھی۔

اس کے کانوں نے سنا، فیصلہ سنایا جا رہا تھا فیصلہ...

سزائے موت!

پھانسی! سانس رکنے تک، حرکت قلب بند ہو جانے تک،

پھانسی! اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی گردن کی طرف بڑھا۔ وہ مرمریں صراحی دار گردن جو ہیرے کے ہار، یاقوت اور موتیوں کے گلوبند یا وینس کے جگمگاتے کرسٹل کی لڑیوں سے مزین رہتی تھی، ایک موٹی رسی کے پھندے میں کسی جائے گی حتیٰ کہ سانس... اُف کتنی عبرت ناک موت ہوگی۔

ہر محفل کی شمع تھی وہ جو شہر نگاراں کی اعلیٰ سوسائٹی کی رونق تھی، شمع محفل تھی، کلبوں،

کاک ٹیل، ڈنر پارٹیوں، رقص و سرود کی محفلوں کی جان تھی، اس کی زندگی کا انجام اتنا شرمناک، اتنا عبرت ناک ہوگا.....

●●●

مترجم افسانے

خوش قسمتی سے ممتاز شیریں حصول شہرت کے سلسلے میں بے حد باشعور واقع ہوئی تھیں۔ وہ شہرت کی اہل ہونے کے ساتھ ساتھ حصول شہرت کے فن سے بھی اچھی طرح واقف تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اور ان کے نقاد شوہر صمد شاہین نے ابتدا سے ہی اس سلسلے میں مہم چلائی اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شہرت حاصل کی۔

— شہزاد منظر

ایک پرانی کہانی

تصنیف: ماستی وِنکٹیش آئینگار (کنڑ)

شام ہو چلی تھی۔ شام، جو گہری ہو کر پونم کی رات بننے والی تھی۔

سورج کسی شریر لڑکے کی طرح دن بھر بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے تھک کر اب سونے جا رہا تھا۔ اور بدلیاں سارے آکاش پر یوں بکھر گئی تھیں جیسے کسی پیچھا کرنے والے سے سہم کر اِدھر اُدھر بھاگ رہی ہوں اور چھپنے کی کوشش میں ناکام ہو کر گھبرائی گھبرائی اِدھر اُدھر بکھر گئی ہوں۔ اور ہوا بھی خاموش تھی۔ اس گڈریے لڑکے کی طرح جس کی بھیڑ بکریاں بھاگ نکلی ہوں اور وہ ان کا پیچھا کرتے کرتے تھک کر خاموش ہو گیا ہو۔ ہوا اب ندی کے کنارے بڑے بڑے درختوں کے درمیان آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔

سورج کو گویا یاد آ گیا کہ اب دن ختم ہو رہا ہے اور آج کے دن ساری دنیا میں جو کچھ ہوا تھا وہ اس کا عینی شاہد ہے اور اس حیثیت میں اس کا اپنا ایک فرض ہے۔ ڈوبنے سے پہلے اس نے اپنی شعاعیں ساری دھرتی پر پھیلا دیں۔ آکاش پر شفق کی لالی چھا گئی، ساری کائنات حسین ہو گئی۔

ندی کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں سکڑوں کی موسیقی کی طرح مدھم سر نکل رہے تھے۔ ندی کا پانی جو اپنے بچپن میں (یعنی ندی کے منبع سے) شوخی سے چھوٹے بڑے پتھروں سے کھیلتا آیا تھا، اب سنجیدگی اور گمبھیرتا لیے ہوئے تھا۔ اب اس کے سر میں منزل کی

دھن سمائی ہوئی تھی۔ وہ اپنی منزل یعنی سمندر تک پہنچنا اور اس میں اپنے آپ کو کھو دینا چاہتا تھا۔ لیکن ایک جوان عورت کی طرح سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ساتھ اس میں شوخی ابھی باقی تھی۔ چلتے چلتے وہ کبھی چکر میں گھوم جاتا، کبھی ناچ اٹھتا اور میٹھی آواز میں گنگناتا جاتا جیسے کوئی عورت اپنے گھر کا کام کاج کرتے ہوئے میٹھے سروں میں گنگناتی جائے۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں ندی کے پانی سے کھیل رہی تھیں، درختوں کے جھنڈ پر پڑ رہی تھیں، پاس کے گاؤں پر پڑ رہی تھیں، گایوں بھینسوں کے گلوں پر اور ننھے ننھے بچھڑوں پر جو اپنی ماؤں کو پکار رہے تھے اور چراگاہوں سے اب گاؤں واپس آ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا سورج کی کرنوں کو دھرتی کی ان ساری چیزوں سے پیار ہو گیا ہے۔ اور وہ اس حسن کو تحسین بھری نظروں سے دیکھ رہی ہیں جوان کے چھونے سے دھرتی کی ان چیزوں پر نکھر آیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کرنیں یہاں سے لوٹنا نہیں چاہتی ہیں اور اس کشمکش میں تھرتھرا رہی ہیں۔

ساری کائنات پر امن وسکون چھایا ہوا تھا۔

ندی کے کنارے، اپنے مٹھ کے سامنے، گھاس کی چوکی پر، ایک سنیاسی بیٹھا شام کے اس حسن کے نظارے میں تھا۔ اور شام کے اس سکون کو اپنی روح میں جذب کر رہا تھا۔ اس کا سن کچھ زیادہ نہیں تھا۔ چالیس کے لگ بھگ ہوگا۔ اس کے نورانی چہرے پر راکھ ملی ہوئی تھی اور اس کے راکھ ملے ہوئے چہرے کا نور سامنے رکھی ہوئی انگیٹھی میں پڑے ہوئے ان انگاروں سے مشابہ تھا جس پر راکھ کی ہلکی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اپنے تن پر وہ ایک سنیاسیوں کے عام دستور کے مطابق گیروے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔

ادھیڑ عمر کے اس سنیاسی کی شخصیت میں ایک عجیب آن بان اور عظمت تھی۔ وہ ایک قدیم، وضع دار اور علم وفضل سے بہرہ ور خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ اور ابھی لڑکا ہی تھا کہ اس مٹھ کا سوامی اسے یہاں لے آیا۔ اور اس وقت سے اس کی پرورش اور تربیت اس ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے گرو کا سب سے محبوب چیلا تھا۔ گرو نے اسے اپنی جانشینی کے لیے منتخب کیا تھا۔ اور اس لیے اسے خاص تربیت دی تھی۔ ضبط نفس اور روحانی ارتقا کے وہ

سارے قواعد جو اس ادارے سے نسلاً بعد نسل وابستہ چلے آئے تھے، اسے سکھائے گئے تھے۔ اپنے استاد کی موت کے بعد اب وہ اس مٹھ کا سربراہ بن گیا تھا۔ اس کا استاد اور گرو بہت پہنچا ہوا گرو تھا۔ اور وہ اپنے استاد کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ اس کی صرف ایک تمنا تھی، وہ اپنے استاد کی جانشینی کا صحیح معنوں میں حقدار ثابت ہو۔ اور اس کے تحت اس ادارے کی شہرت اور نیک نامی پر خراش بھی نہ آنے پائے۔ لگاتار کوشش سے اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس نے روحانی ارتقا کے کئی مدارج طے کر لیے تھے۔ اور اب ایک بے داغ اور باقاعدہ زندگی بسر کرنے کا پھل پا رہا تھا۔ اس کی روح کو ایک سکون حاصل تھا، اور اس کی روح کا یہ امن وسکون شام کے امن وسکون کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ یہ ہم آہنگی اس کے دل کو ایسی بے پایاں مسرت بخش رہی تھی کہ کوئی اور دل، جو اتنا پاکیزہ نہ ہو، یہ مسرت اور اطمینانِ قلب پا ہی نہیں سکتا تھا۔

اس کا ایک چیلہ مٹھ سے باہر آیا اور کہنے لگا، "گرو جی، حسب ارشاد میں نے ساری نقلوں میں ترمیم کر دی ہے۔"

سنیاسی نے کہا: "بہت اچھا، شکریہ"

اور سنیاسی کو، جو اب تک اپنے کو فطرت سے یک جان محسوس کر رہا تھا، اور قدرت کے نظاروں میں محو تھا، ایک خیال پھر ستانے لگا۔ آج صبح بھی اس خیال نے اسے پریشان کیا تھا۔ سنیاسی کا یہ معمول نہ تھا کہ اپنی روز کی کارکردگی کا جائزہ لے۔ ہر روز جو کچھ بھی وہ کرتا تھا، یہ پہلے ہی سے طے شدہ تھا۔ وہ اپنی طرف سے گویا کچھ بھی نہ کرتا تھا۔ اس مٹھ میں صدیوں سے جو دستور چلا آیا تھا، اس کے روز وشب اسی دستور کے مطابق گزر رہے تھے۔

لیکن آج ایک غیر معمولی بات ہوئی تھی۔

آج بھی حسب معمول اس نے سب سے پہلے مٹھ کی بڑی دیوی کی پوجا کی، پھر حسب معمول وہی ہلکی غذا کھائی، پھر اپنے شاگردوں کو پڑھایا۔ اس کے بعد اپنے ایک خاص شاگرد کو جو دوسروں سے بہت آگے تھا، سبق دینے لگا۔ اس لڑکے کا نام شیشا تھا۔ شیشا

اس کا سب سے محبوب چیلا تھا۔ جس طرح وہ خود اپنے گرو کا سب سے محبوب چیلا تھا۔ شیشا کو اس نے بڑی احتیاط سے منتخب کیا تھا۔ اور اپنی جانشینی کے لیے بڑی کاوش سے اسے تربیت دے رہا تھا۔ شیشا ایک کتاب لے کر پڑھنے لگا۔ وہ کتاب کے چند جملے پڑھتا پھر اس کی تفسیر کرتا۔ درمیان میں کوئی دقیق مسئلہ نکل آتا تو اپنے استاد سے پوچھ لیتا۔ یا کبھی اس کی ضرورت محسوس ہوتی تو استاد خود ہی مزید تشریح و تفسیر کر دیتا۔ جب شیشا پڑھتے پڑھتے اس جملے پر پہنچا ''مرد خواہ کتنا ہی سن رسیدہ، کتنا ہی دانشور، کیسا ہی پرہیز گار کیوں نہ ہو، حسیاتی لذتوں کی طرف کھنچ ہی جاتا ہے۔'' یہاں مراد خاص طور پر ان حسیاتی لذتوں سے تھی جو عورت کی ترغیب اور کشش سے وابستہ ہیں۔

یہ جملے سن کر سنیاسی نے کہا ''مجھے بارہا خیال آیا ہے کہ یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ ایک سچے پرہیز گار سنیاسی کو عورت کی ترغیب سے خوف محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بیان ویاس کا ہے۔ اور ویاس نے یہ بیان دیتے ہوئے غالباً خود اپنا خیال کیا ہوگا۔ اس بیان میں یوں ترمیم کر دو کہ ''کتنا ہی سن رسیدہ، کیسا ہی عقلمند کیوں نہ ہو، مرد حسیاتی لذتوں کی طرف کھنچ ہی جاتا ہے۔ لیکن ایک سچے سنیاسی کو یہ لذتیں اپنی طرف کھینچ نہیں سکتیں۔'' چیلے نے عرض کیا ''حضور یہ ویاس کا بیان ہے۔ اسے یوں ہی رہنے دیا جائے۔''

سنیاسی نے کہا ''ویاس کی عظمت مسلم ہے۔ لیکن تارک الدنیا سنیاسیوں کے بارے میں اس کا بیان حرفِ آخر نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ وہ خود سنیاسی نہیں تھا۔ اگر کسی سنیاسی نے، مثلاً شکھا نے یہ بات کہی ہوتی تو پھر اسے بدلنے میں ہمیں جھجک ہونی چاہیے تھی۔ میں نے جیسے بتایا ہے، ویسے تصحیح کر دو۔''

شیشا نے اپنے استاد کے حکم کی تعمیل کی۔

پھر سنیاسی نے اس سے کہا کہ مٹھ کے کتب خانہ سے اس کی دوسری سب نقلیں نکال کر ان میں یہی ترمیم کر دے۔

یہی بات تھی جس کا سنیاسی سے شیشا اب ذکر کر رہا تھا، کہ اس نے ساری نقلوں

میں ترمیم کردی ہے۔

شیشا کو پڑھا چکنے کے بعد سنیاسی مٹھ سے باہر نکل آیا۔ اور اس مسئلہ پر کافی غور و خوض کرتا رہا، آیا وہ اس بیان کی ترمیم میں حق بجانب تھا یا نہیں؟ آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس نے ٹھیک قدم اٹھایا تھا۔ اب شیشا کے یاد دلانے پر دوبارہ اس نے اس مسئلہ پر خوب سوچ بچار کی۔ اور پھر اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اس نے جو کچھ کیا، ٹھیک ہی تھا۔

اس کے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اسے پورا اعتماد تھا۔ اس کے علاوہ اپنے استاد کی بے داغ زندگی کی مثال بھی اس کے سامنے تھی۔ اسے یاد آیا کہ جب اپنے استاد کے سامنے وہ یہی سبق پڑھ رہا تھا تو یہ جملے پڑھتے ہوئے اسے شرم محسوس ہوئی تھی۔ اور اس نے اپنی آواز نیچی کر لی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ استاد اس کی ضرور تشریح کرے گا۔ اور وہ پڑھتے پڑھتے رُک گیا تھا۔ لیکن اس کے استاد نے کوئی تشریح نہ کی۔ اور اس سے آگے پڑھنے کے لیے کہا۔ وہ آگے پڑھنے لگا۔ اور جب سبق ختم ہو گیا تو اس نے خود ہی اپنے استاد سے پوچھا کہ ویاس نے یہ بات کیوں کہی تھی۔ استاد نے جواب دیا ”اس بیان میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ ہم عموماً عورت کو مرد سے کمتر خیال کرتے ہیں لیکن دراصل عورت کی روح مرد کی بہ نسبت 'تکمیل' اور 'ارتقا' سے قریب تر ہے۔ جو کچھ کمتر ہے وہ برتر کی طرف کھنچتا ہے۔ یہی چیز ہے جسے کشش کا نام دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ لوہا کتنا صاف کیوں نہ ہو، مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ مرد بھی اسی طرح عورت کی کشش سے کھنچتا ہے۔ کشش محسوس کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ گناہ کی طرف مائل ہے۔ وہ اپنے جذبات اور احساسات کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ یہ جملے ازراہ احتیاط لکھے گئے ہیں۔“ استاد کی اس تشریح سے اس کی ذہنی تسکین تو ہو گئی تھی لیکن دل کو اطمینان نہ ہوا تھا۔ اسے اپنے استاد پر بے حد ناز تھا۔ اس تشریح سے صاف ظاہر تھا کہ استاد نے خود عورت کے حسن میں کوئی خطرہ محسوس نہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی خود استاد کی زندگی اس کی شاہد تھی۔ وہ زندگی جو پاک اور بے داغ تھی، صاف نیلے آسمان کی طرح نکھری ہوئی چاندنی کی طرح، ندی کے شفاف پانی کی طرح۔

استاد کی روح کو جسد خاکی کو چھوڑے ہوئے کئی سال ہو گئے۔ اس کے بعد اس نے یہ جگہ سنبھال لی تھی۔ اس وقت سے اب تک ویاس کے اس بیان کو اس نے بار ہا پڑھا تھا اور ہر بار اسے اس کی مکمل صداقت میں گمان ہوا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں آج تک کبھی ایسے تجربہ سے نہیں گزرا تھا۔ اس کی زندگی میں آج تک ایک بھی ایسا موقع نہیں آیا تھا جس میں عورت کے حسن نے اسے اپنی طرف کھینچا ہو۔ لڑکپن سے اب تک اس نے بیسیوں عورتوں کو دیکھا تھا، سب سے پہلی عورت تو اس کی ماں تھی۔ اس کی ماں کا چہرہ، کیا حسن تھا۔ اس حسن میں کیا متانت تھی، کیسا سکون تھا! یہی کامل حسن اور کامل سکون اس نے دیوی کی مورتی میں بھی دیکھا تھا۔ جس کی وہ ہر روز پرستش کرتا تھا۔ اس کی ماں حسین عورت تھی۔ اس کی بہنیں بھی بڑی حسین و جمیل لڑکیاں تھیں۔ یہ لڑکیاں بڑی ہو کر خوب صورت عورتیں بنیں، بیویاں اور مائیں بنیں۔ انھوں نے اپنے گھر بسائے، زندگی بتائی اور ایشور کو پیاری ہوئیں۔ اس نے اپنی بہنوں کا حسن بھی دیکھا تھا جب وہ ابھی نوجوان تھا۔ اور ایک بڑا شہر دیکھنے گیا ہوا تھا تو وہاں اس کے بعض عقیدتمندوں نے اس کا جلوس نکالا تھا۔ انھوں نے اس موقع پر طوائفوں کو بھی بلوایا تھا جو اس کے آگے آگے رقص کرتی جا رہی تھیں۔ ان ناچنے والی لڑکیوں نے اسے بھی انھیں نظروں سے دیکھا تھا جیسے وہ اور مردوں کو دیکھنے کی عادی تھیں۔ اور انھوں نے اس کے سامنے بھی اپنی ساری کا فر اداؤں، رعنائیوں، غمزوں، عشوؤں کا مظاہرہ کیا تھا۔ لیکن وہ ان کے حسن اور رعنائی کے سحر سے اسی طرح بیگانہ اور بے پروا رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے منع کر دیا تھا کہ اس کے جلوس میں ناچنے والی عورتیں شامل نہ ہوں۔

بار ہا ایسا ہوا تھا کہ جب وہ ندی کے کنارے چہل قدمی کر رہا ہوتا، گاؤں کی عورتیں وہاں نہا رہی ہوتیں۔ یہ عورتیں بھی ایسی ہی خوبصورت تھیں جیسے اس کی ماں بہنیں خوب صورت تھیں۔ نہاتے نہاتے جب ان کی نظر سنیاسی پر پڑ جاتی تو وہ گھبرا کر اپنا بدن ڈھانپ لیتیں اور گہرے پانی میں چلی جاتیں۔ اور اس کے سامنے شرم و حیا سے سر جھکا لیتیں۔ انھیں دیکھ کر سنیاسی دوسری طرف منہ پھیر لیتا۔ نوجوان، نیم عریاں عورتوں کا حسن بھی اس

میں للچاہٹ پیدا نہ کر پاتا۔ اور اس کا دل ویسے ہی صاف اور پاکیزہ رہتا، بلکہ کبھی کبھی وہ یہاں تک سوچتا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر ایسے میں گوپی کرشنا، ان عورتوں کی ساڑیاں اٹھا لے جائے، یہ تو خواہ مخواہ اس کے سامنے جھینپتی ہیں۔

یہاں ہمیں ایک بات سمجھنا چاہیے۔ یہ بات نہ تھی کہ سنیاسی حسن کے احساس سے بالکل ہی عاری تھا۔ لیکن حسن کو دیکھ کر اس کے من میں اپنا لینے کی للچاہٹ کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ حسن کا اسے احساس تھا، طلب نہ تھی۔ عورت کے خوبصورت پیکر کو دیکھنے سے اسے مسرت ہوتی تھی۔ گو یہ مسرت ایسی ہی تھی جیسے حسن کو کسی بھی شکل میں دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ حسن کو دیکھ کر سنیاسی اپنے آپ سے کہتا "حسن خدا کی تخلیق ہے۔ زندگی کی تجدید کے لیے خدا نے حسن کو پیدا کیا ہے۔ وہ کسی جوان، اچھی پلی ہوئی خوبصورت گائے کو دیکھتا— بھرا بھرا جسم، بڑی بڑی آنکھیں، چھوٹے چھوٹے حساس لرزتے ہوئے کان، سر پر اُگے ہوئے خوبصورت سینگ— تو اس گائے کو دیکھنے میں بھی اسے اسی نوع کی خوشی محسوس ہوتی جیسے کسی جوان خوبصورت عورت کو دیکھنے سے۔

اپنے بعض خوشحال عقیدتمندوں کے گھروں میں اس نے خوبصورت عورتوں کے جھرمٹ کے جھرمٹ دیکھے تھے۔ یہ عورتیں اس سے آشیرواد لینے کے لیے جمع ہوئی تھیں۔ عموماً تہوار کے موقع ہوتے اور یہ عورتیں خوب بنی ٹھنی ہوتیں، زرق برق کپڑے پہنے، زیورات سے لدی پھندی۔ بہت بڑے مجموعہ میں گھری ہوئی، اور اس احساس سے کہ مرد انھیں گھور رہے ہیں، شرمائی، لجائی، سمٹی، سمٹائی، وہ آشیرواد لینے کے لیے اس کے قریب آتیں۔ حسن کے احساس کے ساتھ، یہ شرم وحیا ان کے حسن میں چار چاند لگا دیتی۔ ان کی آنکھوں کی چمک کے آگے ان کے کندنی زیوروں کی چمک بھی ماند تھی۔ یہ خوبصورت عورتیں اس کے پاؤں پر جھکی جاتی تھیں۔ اس کے یہ پاؤں خوبصورت نہ تھے۔ یہ پاؤں گندمی رنگ کے عام پاؤں تھے جو ریاضت سے سوکھ کر پتلے ہو گئے تھے۔ جب سنیاسی ان خوبصورت چہروں کو اپنے پاؤں پر جھکے ہوئے دیکھتا تو اسے اپنے مٹھ کے پاس والے

تالاب کا خیال آتا جس میں سوکھی ٹہنیوں کے پاس خوبصورت کنول تیرتے ہیں۔

حسن کا یہ تنوع، یہ رنگا رنگی، یہ رعنائی، یہ کشش — اس کی نظر نے سب کچھ دیکھا تھا۔ لیکن اس کا ذہن کبھی نہیں بھٹکا تھا۔

ہر روز وہ اپنی دیوی کی مورتی کے سامنے بیٹھے یہ سوچتا، اس شبیہ کو ڈھالنے والا، ان خدو خال کو تناسب دینے والا واقعی کوئی ایسا فن کار ہی ہوسکتا ہے جس نے تخلیق کے حسن کا صحیح تصور کیا ہو۔ جسمانی اور حسیاتی طور پر اس حسن کو محسوس کیا ہو۔ اور پھر وہ دیوی کے حسن کے تصور میں کھو جاتا، جیسے آج شام وہ فطرت کے حسن کے تصور میں کھو گیا تھا۔ جس کی روح ایسی پاک ہو، جو دیوی کے حسن کے تصور میں اس طرح محو ہوسکتا ہو، اس دنیا کی کسی عام عورت کا حسن اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا؟ اور اسی لیے ویاس کا یہ بیان پڑھ کر اسے بڑی تکلیف ہوئی تھی۔ اگر وہ اس بیان میں تھوڑی سی مناسب ترمیم کر دے تو ہرج کیا تھا؟ جب کہ اس نے اپنے ذاتی تجربہ میں، کبھی ایسی کمزوری محسوس نہیں کی تھی۔ تو یہ ترمیم کرنے میں وہ بالکل حق بجانب تھا۔ ممکن ہے اس میں تھوڑی سی خود پسندی بھی شامل ہو۔ لیکن اگر آدمی اتنا نیک ہو تو پھر اتنی خود پسندی تو اس کے لیے جائز ہے؟

ویاس نے متاہلانہ زندگی کی لذت چکھی تھی۔ اس لیے اس کا عورت سے وابستہ جسمانی لذتوں کی طرف کھنچنے کا امکان تھا۔ آخر وہ ان کے بارے میں قطعی حکم کیسے لگا سکتا تھا جنھوں نے دنیا تیاگ دی تھی، اور عورت کو کبھی نہ جانا تھا۔

یہ سب سوچ کر سنیاسی میں اتنی خود اعتمادی پیدا ہو گئی کہ اس نے سورج کی تیز کرنوں سے جو اس کے وجود کے آر پار ہو کر اس کی سچائی کا امتحان لینا چاہتی تھیں، مسکرا کر نظریں ملائیں۔ گویا انھیں آزمانے کی دعوت دے رہا ہو۔

اپنا امتحان لیتے ہوئے سنیاسی نے چند اہم امور کو نظر انداز کر دیا تھا۔ جب ہمیں کسی چیز سے خوشی حاصل ہوتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس میں کشش محسوس کرتے ہیں۔ خارجی طور پر وہی کشش ہے۔ جب وہ ندی کے کنارے نہاتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھے

بغیر گزرتا تھا تو کیا اس کی پاکیزگی میں یہ تمنا شامل نہ تھی کہ یہ عورتیں اسے اچھا سمجھیں؟ جب وہ اپنے شاگردوں کے کمروں میں خوبصورت عورتوں کے مجمع میں کھڑا ہوتا تھا تو کیا واقعی یہ بات تھی کہ اس کے دل میں انھیں ایک سے دوبارہ دیکھنے کی آرزو نہیں پیدا ہوتی تھی یا وہ محض اپنے ضبط نفس کا اس لیے مظاہرہ کرتا تھا کہ لوگ اسے اچھا سمجھیں؟ اور اس کے زہد و تقویٰ سے متاثر ہوں۔

سنیاسی نے ان سب باتوں کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ وہ اس سے آگاہ تھا کہ اسے حسن سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اگر پاکباز سمجھے جانے کی تمنا درمیان میں حائل نہ ہوتی تو وہ کسی طلب سے اپنے ارادہ کو آلودہ کیے بغیر حسن کو دیکھ سکتا تھا اور وہ اس حسن پر اسی طرح غور کر سکتا تھا جیسے وہ دیوی کے حسن کے تصور میں محو ہوتا تھا۔

شام گہری ہوگئی۔ ساری چڑیاں ندی کے کنارے جھنڈ پر جمع ہوگئیں اور اپنے اپنے راگ گانے لگیں، گویا سب نے مل کر ایک حسین سمفونی چھیڑ دی۔ پھر وہ اڑ کر اپنے اپنے گھونسلوں میں چلی گئیں۔ تاریکی نے سارے گاؤں کو اس طرح ڈھانپ لیا جیسے رات، دھرتی کی ماں، اپنے بچے کو تھپک تھپک کر سلاتے ہوئے اپنی ساری کے آنچل سے اسے ڈھانپ دے۔

دور گاؤں میں ایک ایک کر کے چراغ جل اٹھے۔ اور یہ ننھے ننھے دیے دور سے درختوں کے درمیان ٹمٹما رہے تھے۔ ایک گائے جو دور سے گاؤں واپس آئی تھی اپنے بچھڑے کو پکار رہی تھی۔ جب شام گہری ہوگئی اور ہر سو خاموشی چھاگئی ندی کے بہتے ہوئے پانی کا مدھم سا شور مٹھ میں سنائی دینے لگا۔ سنیاسی وہیں باہر بیٹھا رہا اور شام کے اس سکون سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

پھر ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔

اچانک کہیں قریب سے سنیاسی کے کانوں میں پائل کی جھنکار سنائی دی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی عورت مٹھ کی جانب تیزی سے چلی آرہی ہے۔ سنیاسی نے ادھر مڑ کر دیکھا جدھر

سے آواز آئی تھی۔ بھلا اس وقت کون آئے گا؟ مٹھ کو آنے والے دن میں آتے تھے۔ مٹھ کا راستہ ایک گھنے جنگل میں سے ہو کر نکلتا تھا اور قریب ایک پہاڑی تھی جہاں چیتے رہتے تھے۔ اندھیرا ہونے کے بعد لوگ ادھر سے گزرتے ڈرتے تھے۔ اگر کوئی شام سے پہلے مٹھ واپس نہ آسکتا تو وہ گاؤں واپس چلا جاتا۔ آج کیا بات ہے کہ کوئی اس وقت مٹھ کی طرف آ رہا ہے؟ اور پھر ایک عورت؟ ممکن ہے کوئی عورت گاؤں جاتے ہوئے راستہ بھول گئی ہو۔

پائل کی جھنکار نزدیک آتی گئی۔ اور پھر ایک جوان عورت مٹھ کے دروازے پر کھڑی پوچھ رہی تھی:

"ماں، اس گھر میں کوئی ہے؟"

اب رات گہری ہو گئی تھی۔ سنیاسی بات کرنے والی کی شکل اچھی طرح دیکھ نہیں سکتا تھا۔ انگیٹھی سے جو تھوڑی سی روشنی نکل رہی تھی، اس عورت پر پڑ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا عورت کافی دیر سے بارش میں بھیگتی چلی آ رہی ہے۔ اس کے کپڑے گیلے ہو رہے تھے، اور بدن سے چمٹ گئے تھے۔

سنیاسی نے پوچھا: "آپ کون ہیں؟"

"یہ کس کا گھر ہے؟ آپ کا ہے؟" عورت نے سوال کیا۔

"یہ ایشور کا گھر ہے، ماں جی، مٹھ ہے۔"

"کیا مٹھ میں عورتیں بھی ہیں؟"

"نہیں ماں جی! کیوں؟ تم یہاں کیسے آئی ہو؟"

عورت سنیاسی کے قریب آ گئی اور اس کے گیروے کپڑے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"کیا آپ اس مٹھ کے سوامی ہیں؟"

"ہاں، ماں جی۔"

بابا، میں بہت خوفزدہ ہوں۔ جب آپ نے کہا مٹھ میں تو عورتیں نہیں ہیں تو میں بہت گھبرا گئی۔ پھر آپ کو دیکھنے سے مجھے تسلی ہوئی۔ آپ میرے باپ کے برابر ہیں۔ کیوں

کہ آپ سنیاسی ہیں۔ اگر میں یہاں ٹھہروں تو کوئی بھی میرے چال چلن پر شبہ نہیں کر سکتا۔ لیکن بابا مجھے نہیں معلوم میرے پتی کا کیا ہوا ہے۔ میں اب کیا کروں، کہاں جاؤں؟ اور عورت رونے لگی۔

سنیاسی کا ذہن مضطرب ہو گیا۔ اسے عورت پر رحم آنے لگا۔

''آپ کے پتی کے کچھ ہو جانے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ کیا آپ اپنے پتی کے ساتھ آئی تھیں؟ آپ کہاں سے آ رہی ہیں؟'' سنیاسی نے عورت سے دریافت کیا۔

جہاں سنیاسی کا دل عورت کی مصیبت سے مضطرب ہو گیا تھا، وہاں اسے ایک طرح کی خوشی بھی تھی کہ یہ ثابت کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا ہے کہ وہ عورت کے جسم میں کوئی کشش نہیں محسوس کرتا۔

بھیگی ہوئی ساری عورت کے سڈول بدن سے چمٹی ہوئی تھی۔ سنیاسی نے عورت کے جسم کو اس طرح غور سے دیکھا جیسے اس نے پہلے کبھی کسی زندہ عورت کے جسم کو نہ دیکھا تھا۔ اس طرح عورت کے جسم کو دیکھنے میں سنیاسی نے غلطی کی۔ لیکن اس وقت اسے اس بات کا شعور نہ تھا۔

عورت بولی ''سوامی، میرا باپ رگھناتھ پور کا رہنے والا ہے۔ میں اپنے پتی کے ساتھ اپنے باپ کے گاؤں سے نکلی تھی۔ ہم مولیور جا رہے تھے۔ راستہ میں میرے پتی رک گئے اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں آگے بڑھی چلوں۔ پہلے وہ میرا مذاق اڑا رہے تھے کہ میں بہت دھیرے دھیرے چلتی ہوں، اور اس دھیمی چال کے لیے انھوں نے مجھ پر طرح طرح کی مردانہ پھبتیاں کسیں کہ عورتیں اس لیے آہستہ چلتی ہیں... جب وہ رک گئے تو میں انھیں بتانے کے لیے کہ میں کتنا جلد جلد چل سکتی ہوں، پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر تیزی سے چلتی دور نکل آئی۔

پھر کچھ دور چلنے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھا تو ان کا پتہ نہ تھا۔ پھر میں ان کے انتظار میں وہیں سڑک پر بیٹھ گئی۔ جب بہت دیر تک انتظار کرنے پر بھی وہ نہ آئے تو میں پھر واپس

مڑی اور انھیں ہر جگہ ڈھونڈا، لیکن ان کا کہیں پتہ نہ ملا۔ میں انھیں پکارتی رہی، کوئی جواب نہ ملا۔ میں اکیلی تھی اور اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ اس راستے پر ایک گاؤں ملے گا۔ اس لیے میں ادھر چلی آئی۔ لیکن یہاں آئی تو دیکھا کہ یہاں کوئی گاؤں نہیں ہے۔ میرے بابا مجھے آشیرواد دیجیے۔ میرے سہاگ کے لیے دعا کیجیے۔ میرے پتی کو ڈھونڈ نکالیے کسی کو اس کی تلاش میں بھیجئے۔ جلدی کیجیے۔ میرے اندر میری زندگی کانپ رہی ہے۔ وہ بے قابو ہوئی جا رہی تھی اور ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

مرد کا دل عورت کے آنسو سے پگھل جاتا ہے۔ سنیاسی کے دل میں ہمدردی کا جذبہ امڈ آیا۔

ماں جی، مٹھ میں زیادہ آدمی نہیں ہیں۔ اتنی رات گئے ہم کیسے آپ کے پتی کی تلاش میں بھیج سکتے ہیں؟ میرا خیال ہے آپ کے پتی پر کوئی بپتا نہ پڑی ہوگی۔ ہوا یہ ہے کہ اس موڑ پر جہاں سڑک دو الگ الگ راستوں میں بٹ گئی ہے، آپ غلط سمت مڑ گئی ہیں اور آپ کے پتی نے دوسرا راستہ پکڑا ہے۔ میرے خیال میں ہوا یہی ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ آج رات آپ یہیں ٹھہر جائیے۔ صبح کسی کو بھیج کر گاؤں میں پوچھ گچھ کریں گے۔

عورت بولی ''بابا، میں آپ کو اپنے سگے باپ کی طرح سمجھتی ہوں۔ لیکن مٹھ میں تو عورتیں نہیں ہیں۔ میں ساری رات یہاں کس طرح ٹھہر سکتی ہوں؟''

آپ میری بیٹی کی طرح ہیں۔ اندر ایک الگ کمرہ ہے۔ آپ وہاں سو سکتی ہیں۔ میں خود آپ کے دروازے کے باہر سوؤں گا اور آپ کی حفاظت کروں گا۔ اگر رات میں آپ کو خوف محسوس ہو تو آپ مجھے آواز دے سکتی ہیں۔ گھبرائیے نہیں۔''

''آپ خود.... ہاں، آپ تو سنیاسی ہیں۔ اچھا سوامی، اب اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں نظر آتی۔ جیسا آپ کہیں میں مانوں گی۔ صبح میں کسی کو ضرور گاؤں بھیجئے۔ میرے پتی کو ڈھونڈ نکالیے۔ میرے سہاگ کو بچائیے۔''

عورت عقیدت سے سنیاسی کے قدموں پر جھک گئی، اور اپنی نرم نرم ٹھنڈی انگلیوں

سے اس کے پاؤں کو چھوا۔

سنیاسی جب کائنات کے حسن کو دیکھتا تھا تو اس سے بھی اعلیٰ تر حسن کا تصور کرتا تھا جو خدا کا حسن تھا۔ کیا اب بھی وہ اسی طرح عورت کے جسم کا تھوڑا حصہ دیکھ کر عورت کے حسن کا تصور کر رہا تھا۔ یا اس کا دھیان ویاس کے اس بیان کی طرف تھا، جس میں اس نے آج ہی ترمیم کروائی تھی، اور جس میں عورت کی جسمانی کشش کا تحقیر سے ذکر کیا گیا تھا؟ بہر حال... جب عورت کی ٹھنڈی، نرم انگلیاں اس کے پاؤں سے مس ہوئیں تو اس کے جسم میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ نسوانی انگلیوں نے اس کے پاؤں کو بارہا چھوا تھا، لیکن کبھی اس طرح نہیں چھوا تھا۔

جب عورت اس کے پاؤں چھو کر اٹھ کھڑی ہوئی تو اس نے اپنے ایک شاگرد کو پکار کر کہا کہ چراغ لے آئے۔ اسے بڑی حیرت تھی کہ اس کے جسم نے عورت کے نسوانی لمس کا جواب دیا تھا۔ جب شاگرد چراغ لے آیا، عورت کو چراغ کی روشنی میں دیکھتے ہوئے سنیاسی چند ایسے احساسات سے دوچار ہوا جن سے وہ اب تک بالکل ناآشنا تھا۔

خلا کے اندھیرے میں وہ عورت ایک بجلی معلوم ہوئی تھی۔ جیسے کوئی تنہا مسافر کالی گھٹاؤں کو دیکھتا چلا جائے اور اچانک ان کالی گھٹاؤں میں برق کی ایک تڑپتی ہوئی لکیر اس کی آنکھوں کو چندھیا دے۔ بالکل اسی طرح سنیاسی کی آنکھیں عورت کے حسن کو دیکھ کر خیرہ ہو گئیں۔ سیدھی مانگ کے دونوں طرف اس کے بال کمانوں کی صورت میں پیشانی پر جمے ہوئے تھے۔ اور گویا ان کمانوں کے جواب میں ابروؤں کی کمانیں اوپر تنی ہوئی تھیں۔ تیز، نوکیلی پلکیں خوبصورت خم کھا کر اوپر تک چلی گئی تھیں۔ چمکیلی نیلی ساڑی، جس پر سنہری دھاریاں پڑی ہوئی تھیں، حسین تھیں بناتی اس کے سڈول بدن کے ساتھ اس طرح لپٹی ہوئی تھی کہ اس کے نسوانی جسم کے نشیب و فراز اور قوسیں پوری طرح نمایاں ہو رہی تھیں۔ وہ مسکرا نہیں رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو...

"میں اپنے شوہر کے سوا کسی کے سامنے نہیں مسکراتی۔ پھر بھی دیکھیے، یہ مسکراہٹ روکنے

کے باوجود کیسے پھوٹی پڑ رہی ہے۔'' اس کے گالوں میں دو ننھے ننھے گڑھے تھے۔ اور یہ گڑھے اتنے پیارے، اتنے دلفریب تھے، معلوم ہوتا تھا اس کے رخساروں کے قیامت خیز حسن کو گرفت میں رکھنے کے لیے دو کیلیں اس کے گالوں میں ٹھونک دی گئی ہیں۔ اس کے جسم کا تناسب، اس کے چہرے کے حسن کا ساتھ دے رہا تھا۔ اور کندنی زیورات اس کے حسن میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ اس کے بازوؤں پر جڑاؤ، بازو بند، کلائیوں میں طلائی چوڑیاں، ناک میں ہیروں کی نازک سی کیل، اور کالے بالوں میں سفید چمبیلی کے پھول، اس کا ثبوت دے رہے تھے کہ سفید اور سیاہ کا امتزاج کیا حسن پیدا کر سکتا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر سنیاسی حیران رہ گیا۔ یہ خوبصورتی غیر معمولی خوبصورتی تھی، جو کسی بھی مرد کے دل و دماغ کو گرفت میں لانے کے لیے کافی تھی۔ ایسی خوبصورتی اس کے سامنے آج ہی کیوں آئی تھی؟

کہ یہ خوبصورتی آج ہی اس کے سامنے آئے؟ یہ بڑی حیران کن بات تھی۔ اور اپنی حیرت میں سنیاسی کچھ دیر ٹکٹکی باندھے عورت کی طرف دیکھا کیا۔

عورت ہلکے سے مسکرائی اور اپنا سر جھکا لیا۔ روشنی کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کسی کو میرے ساتھ بھیج دیں تو میں گاؤں چلی جاؤں گی۔''

سنیاسی کھسیانا ہو گیا۔ ''میں نے چراغ اس لیے منگوایا کہ آپ کو اندر لے چلوں۔ چلیے اندر چلیں۔''

''نہیں سوامی، آپ کسی کو میرے ساتھ کر دیجیے۔ یہ بہتر ہے کہ میں اس وقت گاؤں چلی جاؤں۔''

''ماں جی، گاؤں یہاں کہاں ہے؟ اور اتنی رات گئے، آپ کیسے جا سکتی ہیں۔ آپ کی حفاظت کے لیے میں خود یہاں موجود ہوں۔ آپ کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ یہاں دیوی کی مقدس بارگاہ میں آپ کو کسی بات کا خوف نہیں۔ آیئے اندر چلی آیئے۔''

عورت اندر لائی گئی۔ اسے پہننے کے لیے ایک پرانی ساری دی گئی، جو دیوی کی

مورتی کو پہنائی جاتی تھی۔ دیوی کی پوجا ہونے تک عورت وہیں کھڑی رہی۔ پھر سب نے کھانا کھایا۔ پھر ایک نوکر نے صحن سے ملے ہوئے کمرے میں ایک چٹائی بچھائی، اس پر دو ایک پرانے کپڑے ڈالے۔ اور عورت سے کہا کہ وہاں چل کر سو رہے۔ سنیاسی نے پھر اسے تسلی دی کہ وہ اس کے دروازے کے باہر سوئے گا۔ خوف کی کوئی بات نہیں۔ عورت مسکرائی اور بولی "خدا میرا محافظ ہے۔ مجھے کوئی خوف نہیں۔"

سنیاسی کمرے کے باہر بیٹھا تھا، تھوڑی دیر بعد عورت باہر آئی، سنیاسی کے پاؤں چھوئے، اور پھر اندر جا کر سو رہی۔ کچھ دیر بعد پھر دروازے کے پاس آئی، باہر جھانک کر دیکھا، اور سنیاسی پر ایک مشکوک نگاہ ڈال کر دروازہ بند کر لیا۔ اور چٹخنی چڑھا دی۔"

اس عورت میں کمسنی کی معصومیت بھی نہ تھی۔ اور پختہ سن کا تجربہ بھی نہ تھا۔ یونہی جوانی کی شوخی تھی اور وہ اپنے حسن سے آگاہ تھی۔

سنیاسی نے پہلے کبھی نسائیت کے سحر کو اس شدت سے محسوس نہ کیا تھا۔ ممکن ہے نسائی دلکشی پہلے بھی اس کے سامنے آئی ہو۔ لیکن اس نے کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا۔ آج اس نے یہ دکھانا چاہا کہ نسائی رعنائی اور دلکشی کیسی ہوتی ہے۔ اور اس کا ذہن اس میں الجھ گیا۔ عورت کی حرکات، شک اور بدگمانی لیے ہوئے، اس کی عجیب نظریں — سنیاسی اپنی سنجیدگی بھول رہا تھا، اور اس کا ذہن شوخی، شرارت اور چھیڑ چھاڑ کی جانب مائل ہو رہا تھا۔ عورت اس سے ایک ممکنہ ساتھی، کا سلوک کر رہی تھی۔ جب کہ دوسری عورتیں اسے اپنا بزرگ سمجھتی تھیں۔ اور انتہائی عقیدت سے پیش آتی تھیں۔ عورت اسے گویا اپنے جوڑ کا آدمی سمجھ رہی تھی۔ کتنی عجیب سی بات ہے۔ سنیاسی نے اپنے آپ سے کہا۔ اسے ذرا سا کیوں نہ ڈرایا جائے، لطف رہے گا۔ ایک طرف سے چھیڑ چھاڑ اور شوخی دوسری طرف بھی وہی جذبات پیدا کرتی ہے۔ سنیاسی جس کا ذہن کبھی دنیوی باتوں میں الجھا نہ تھا، جس نے عورت کو کبھی دلچسپی کی نظر سے دیکھا نہ تھا، عورت کی جان بوجھ کر اکسانے والی شوخی اور ایک طرح کی بدگمانی اسے بھی شوخی کی طرف مائل کر رہی تھی۔ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے، سنیاسی نے سوچا۔ پھر

وہ سنبھل کر اپنے عارفانہ مراقبہ میں کھو گیا۔

ہر روز جب وہ اس طرح اپنے مراقبہ میں محو ہوتا تھا، وہ اپنی دیوی کا تصور کیا کرتا تھا۔ اب دیوی کی صورت کے ساتھ ساتھ ایک اور صورت اس کے ذہن میں متحرک تھی۔ یہ کس کا چہرہ تھا۔ یہ اس نو وارد عورت کا چہرہ تھا۔ سنیاسی نے اپنے آپ سے پوچھا، یہ چہرہ میرے ذہن میں کیوں گھوم رہا ہے؟ سنیاسی نے اس سے انکار کرنا چاہا کہ وہ عورت کی طرف کھنچ گیا ہے اس کے کیا معنی ہیں آخر؟ یہ فرض کیا جائے کہ عورت سے سنیاسی کی شادی ہو سکتی تھی، کیا وہ واقعی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا؟ نہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شادی کے بغیر وہ اس کی داشتہ بن سکتی تھی؟ کیا وہ یہ بات پسند کرتا تھا؟... نہیں؟ اس کے پاکیزہ دل میں اس قسم کی طلب اور تمنا کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ پھر وہ کیا چاہتا تھا؟... وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ اس چہرے کو دیکھے، صرف ایک مرتبہ دیکھے۔ فرض کیجیے جب آپ کسی سڑک پر جا رہے ہیں اور کسی کے باغیچہ میں آپ کو ایک خوبصورت گلاب اپنی ٹہنی پر جھومتا نظر آتا ہے۔ گلاب کے پھول میں، سفید اور گلابی رنگوں کا حسین امتزاج، قرینے سے تہہ بہ تہہ جمی ہوئی پتیاں آپ کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ آپ مجبور ہو کر اسے دیکھنے لگتے ہیں۔ لیکن آپ صحن میں گھس کر گلاب توڑنا نہیں چاہتے۔ نہ آپ کا ارادہ گلاب کو اپنے پاس رکھنے لینے کا ہوتا ہے۔ آپ صرف اسے ایک نظر اچھی طرح دیکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک بالکل پاکیزہ سی خواہش تھی جو اب سنیاسی کے دل میں پیدا ہو رہی تھی۔ وہ صرف عورت کے چہرے کو ایک دفعہ اور اچھی طرح دیکھ لینا چاہتا تھا تاکہ اسے پھر اس کا خیال نہ آنے پائے۔ اور وہ بغیر کسی مزید خلل کے دیوی کے تصور میں محو ہو سکے۔ ایک طرف عورت کو دیکھنے کی تمنا تھی، دوسری طرف وہ ضبط نفس تھا جو سالہا سال کی ریاضت سے حاصل ہوا تھا۔ اور یہ احساس کہ ایسی خواہش جائز نہیں ہے۔ دونوں کے درمیان کشمکش جاری رہی۔ اور سنیاسی نے اس خواہش کو پرے ہٹا دیا۔ اس خیال سے کہ اس سے کوئی غیر مناسب حرکت سرزد نہ ہونے پائے، احتیاطاً اس نے اپنے ایک شاگرد کو اپنے پاس بلا لینا چاہا اور شیشا کو آواز دی۔

لیکن شیشا کو بلانے اور شیشا کے آنے کے درمیانی لمحوں میں اس کا نظریہ پھر بدل گیا۔ سنیاسی کو خوف محسوس ہوا تھا کہ کہیں عورت کو دیکھنے کی خواہش اس کے ضبط نفس پر حاوی نہ ہو جائے اور ایسے میں شیشا اس کے پاس ہو تو اچھا ہے لیکن پھر اسے خیال آیا.. کیا میں اتنا کمزور ہوں؟ میں جواب تک اتنا پاک باز رہا ہوں، آج ہار جاؤں گا؟ اگر میں اپنے آپ کے لیے راہ راست پر نہیں رہ سکتا تو شیشا کی وجہ سے کیسے رہ سکتا ہوں؟ اس لیے سنیاسی نے یہ فیصلہ کیا کہ شیشا کو اپنے پاس رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے تحت الشعور میں دراصل کیا تھا، کون کہہ سکتا ہے؟ اگر شیشا میرے پاس آ کر سوئے تو چاہے خواہش کتنی ہی شدت اختیار کر جائے، اسے پوری کرنے کا امکان ہی نہیں رہے گا۔ آخر اتنی سی خواہش میں کوئی برائی تو نہیں ہے۔ آخر عورت کو میری طرف سے کوئی خطرہ تو نہیں۔ اور نہ میری اپنی پاکدامنی کو کوئی خطرہ ہے۔ میں تو صرف ایک بار اس کے خوبصورت چہرے کو اس کی رعنائی کو دیکھنا چاہتا ہوں، دن کی روشنی میں اسے دیکھنا مناسب نہیں، جب دوسرے لوگ موجود ہوں گے۔ اور جب وہ خود جاگ رہی ہوگی۔ کیا سنیاسی کے تحت الشعور میں یہ مبہم احساسات تھے؟ بہر حال اس کا شاگرد اس کی آواز سن کر آ گیا تھا، اور سنیاسی نے اس سے کہہ دیا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہ واپس چلا جائے۔

جب سنیاسی نے اپنے آپ سے یہ پوچھا تھا کہ راہ راست پر چلنے کے لیے وہ صرف اپنی اچھائی پر اعتبار کرے یا اپنے چال چلن کی راستی پر بجا ناز کی بھی اسے ضرورت پڑے گی۔ اور پھر اس نے اس مدد کو ٹھکرا دیا تھا اور ٹھکرانے میں اس نے ایک غیر دانشمندانہ قدم اٹھایا تھا۔ اس ایک پاؤں کے لنگڑے آدمی کی طرح جو اپنی بیساکھیاں پھینک کر بالکل بے بس ہو جائے کیوں کہ آخر یہ بیساکھیاں ہی اسے چلنے میں مدد دیتی تھیں۔ جیسے جیسے لمحات گزرتے گئے، اس کی خواہش گہری ہوتی گئی۔ جب آپ ایک شفاف چشمے کے پاس بیٹھے ہوں اور پاس کے درخت کی ایک شاخ کا سایہ اس میں پڑ رہا ہو۔ اور آپ اس سایہ کو دیکھتے رہتے ہوں، اور اچانک ایک سیاہ سانپ اندر سے نکل آئے اور اس سایہ کی جگہ لے

لے تو آپ خوف کھائیں گے۔ وہ ہلکا سا اضطراب جو عورت کو دیکھ کر سنیاسی نے شام میں محسوس کیا تھا، رات گہری ہونے پر ایک شدید اور ملوث طلب کی صورت اختیار کر گیا۔ سنیاسی کو بار بار اس جوان عورت کے چہرے کا خیال آنے لگا۔ آغاز شب کے سارے واقعات ایک ایک کر کے اس کے ذہن کے سامنے آتے رہے۔ جب رات کی تاریکی نے دھرتی کو اس طرح ڈھانپ لیا تھا جیسے کوئی ماں اپنی گود میں سوتے ہوئے بچے پر اپنی ساڑی کا آنچل اڑھا دے، دور گاؤں میں ان گنت ٹمٹماتے ہوئے چراغ جیسے روشنی کے دیوتا نے اپنی ہستی کو ننھی ننھی روشنیوں میں تقسیم کر لیا ہے، تا کہ گھر گھر روشنی ہو جائے، جوان عورت کے پائل کی جھنکار جس نے ہلکی ہلکی لہروں کی طرح شام کے امن و سکون کے سمندر کو چھیڑ دیا تھا۔ چراغ کی روشنی میں وہ حسن، یہ جاننے پر کہ اسے اجنبی مردوں کے درمیان تنہا رات گزارنی ہوگی، عورت کی آواز میں وہ ہلکی سی جھجک اور گھبراہٹ، اس کی وہ نظر جس میں کچھ خوف سا تھا، کچھ شرم سی تھی۔ اور شاید جسمانی طلب کا اظہار بھی، اس کی اداؤں میں، اس کے اشاروں میں، اس کی چھوٹی سے چھوٹی حرکتوں میں وہ بلا کی رعنائی، ایک ساتھ ان سب باتوں نے مل کر سنیاسی کو وارفتہ بنا دیا۔ سنیاسی اس احساس سے گھبرا گیا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے دیوی کے تصور میں اپنا دھیان لگانا چاہا لیکن اس کوشش میں ناکام رہا۔ عورت کو ایک بار، صرف ایک بار اور دیکھنے کی تمنا، بھوک اور پیاس کی طرح ایک جسمانی طلب بن گئی۔

آپ پوچھیں گے آخر اس عورت میں ایسا کون غیر معمولی حسن تھا؟ عورت کا حسن دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک حسن شفیق، متین، باوقار اور پرسکون ہوتا ہے۔ یہ دل کو فتح کر لیتا ہے ساتھ ہی دل کو سکون پہنچاتا ہے، اطمینان بخشتا ہے، یہ حسن ماں کا حسن ہے۔ دوسرا حسن ذہن میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے، حواس باختہ کر دیتا ہے، یہ حسن محبوبہ کا حسن ہے۔ ہر مرد ہر عورت میں دونوں طرح کا حسن دیکھ سکتا ہے۔ بہت سے مرد جو عورت کو احترام اور عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں، کسی عورت کے حسن میں محبوبہ کے حسن کی بجائے ماں کے حسن کا جزو

دیکھتے ہیں۔ روایات اور اخلاقی قدروں نے اسے ان میں ایک ثانوی جبلت بنا دیا ہے، کہ وہ ہر عورت کو اس نظر سے دیکھیں، لیکن جب کوئی عورت کسی مرد کے سامنے یوں آ جائے جیسے ترغیب خود مجسم ہو کر آ گئی ہو، تو پھر کوئی کیا کر سکتا ہے؟ مرد کی ہمت جواب دے جائے گی۔ وہ ہار جائے گا۔ آج سنیاسی کا دماغ بھی اسی طرح ہار گیا تھا۔

سنیاسی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا... وہ عورت کو جگا کر صرف ایک بار اسے دیکھے گا۔ دروازے کے پاس جا کر اس نے کواڑ دھکیلا۔ لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دروازے پر کان لگا کر سنا۔ گہری نیند میں عورت کی لمبی گہری سانسیں اسے سنائی دیں۔ گہری نیند کے سکون میں وہ چہرہ کتنا حسین لگ رہا ہوگا! سنیاسی کے ذہن نے سوچا، اس نے پھر دروازہ دھکیلا۔ کمرے میں کسی کے حرکت کرنے کی آواز آئی، پھر اندر سے یہ سوال پوچھا گیا۔ کون ہے؟

"میں ہوں۔"

"مٹھ کے سوامی جی؟"

"ہاں۔"

"بابا، کیا میرے پتی آ گئے ہیں؟"

"نہیں، ماں... میں صرف یہ دیکھنے آیا ہوں کہ آپ آرام سے سو رہی ہیں یا نہیں؟"

"آپ کا شکریہ۔"

"نیند تو خوب آئی ہوگی؟"

"ہاں، میرے لیے تو آپ کے اس جگانے سے نیند ہی بھلی تھی۔ کیوں کہ نیند میں، میں خواب دیکھ رہی تھی کہ میں اپنے پتی کے ساتھ سفر کر رہی ہوں۔"

"یہ اچھا شگون ہے۔ اب آپ کو کوئی خوف تو نہیں رہا؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔"

"کیا آپ نے اندر سے چٹخنی لگائی ہے؟"

''ہاں بابا، میں اکیلی عورت ہوں۔ میں نے اپنی حفاظت کے لیے اندر سے چٹخنی لگائی ہے۔''

''یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ کو ہم پر کسی طرح کا گمان ہو۔ پھر بھی آپ نے دروازہ نہیں کھولا، حالانکہ میں اتنی دیر سے آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔''

''سوامی، آپ سنیاسی ہیں۔ آپ ان باتوں کو سمجھ نہیں سکتے۔ میں اکیلی عورت ہوں۔ آدھی رات کو میں اپنے پتی کے سوا کسی کے لیے بھی دروازہ نہیں کھول سکتی۔''

''ایک سنیاسی سے تو کوئی خطرہ نہیں۔''

''میں باور کرتی ہوں کہ آپ کچھ نہیں کریں گے۔ پھر بھی یہ مناسب نہیں ہے۔ میں سوتی سوتی ابھی اٹھی ہوں۔ میرے کپڑے بے ترتیب ہیں۔''

''میں آپ کو اس کا ثبوت دینا چاہتا ہوں کہ دروازہ کھولنے پر میں کچھ نہیں کروں گا۔ آپ دروازہ کھولیں تو سہی۔''

''مجھے آپ کی پاکبازی پر بھروسہ ہے۔ یہ باور کرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے، آپ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''آپ میری مہمان ہیں۔ کیا یہ میرا فرض نہیں کہ میں آپ کی خیر خیریت دریافت کروں؟''

آپ کی عنایت سے میں بالکل اچھی ہوں۔ میرے بارے میں کوئی فکر نہ کیجیے۔ اتنی رات گئے میں کسی اور غیر مرد سے ہرگز بات نہ کرتی۔ میں صرف آپ سے بات کر رہی ہوں۔ اب آپ جایئے، آرام کیجیے۔''

''تو آپ دروازہ نہیں کھولیں گی؟''

''نہیں۔ اپنے پتی اور صرف اپنے پتی کے لیے دروازہ کھولوں گی۔ کسی اور کے لیے ہرگز نہیں، خواہ کتنا ہی دانشور، کتنا ہی سن رسیدہ، کتنا ہی پرہیز گار کیوں نہ ہو۔''

ان الفاظ نے سنیاسی کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے اپنے حواس جمع کرتے ہوئے

پوچھا "آپ یہ عبارت جانتی ہیں؟"

"یہ میرے اپنے الفاظ ہیں۔"

"آپ مذاق کر رہی ہیں۔ آپ بھی بڑی عجیب خاتون ہیں۔ ابھی شوخی، ابھی جفا، میں ابھی آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ جس نے یہ الفاظ لکھے ہیں وہ حقیقت سے بے خبر تھا۔ آپ دروازہ کھولیے، میں آپ کو بتادوں گا کہ ایک سچا سنیاسی کسی بھی ایسی کمزوری کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔"

"آپ جو کچھ بھی کہیے، میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

"اگر میں زبردستی کھول دوں تو؟"

"اچھا کھولیے، اور سبق حاصل کیجیے۔"

سنیاسی ایک لحہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر "بہت اچھا" کہہ کر اس نے کواڑ دھکیلے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اندر سے چٹخنی نہیں لگائی گئی تھی۔ بس ذرا سا دباؤ ڈالنے پر دروازہ کھل گیا۔ سنیاسی نے اندر قدم رکھا۔

اس نے اپنے سامنے عورت کو نہیں، بلکہ ایک مرد بزرگ کو کھڑا ہوا پایا۔ ان بزرگ کی لمبی لمبی جٹائیں تھیں۔ اور ہونٹوں پر ایک عجیب مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ سنیاسی چونک پڑا پھر شرم سے اس نے سر جھکالیا۔

بزرگ نے کہا "اگر ذہن اس طرف کھنچا نہ تھا تو آخر اسے دیکھنے کی اتنی تمنا کیوں تھی؟"

سنیاسی بزرگ کے پاؤں پر گر پڑا۔ "میں نے بے وقوفی کی۔ معاف فرمائیے۔"

"تمھارا خیال تھا میں حقیقت کو نہیں جانتا۔ خیر یہ کوئی بات نہ تھی کیوں کہ تم مجھے جانتے نہ تھے۔ لیکن خود اپنے استاد اور گرو کی بات بھی تم نے قبول نہ کی۔"

"مجھ سے بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی۔"

"تو اس کے سامنے سر جھکاؤ۔"

سنیاسی نے سر اٹھایا، اور دیا س کے پہلو میں اپنے گرو کو کھڑے دیکھا۔ گرو کی آنکھوں میں اپنے چیلے کے لیے شفقت تھی، اور وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اپنے چیلے کی اس لغزش نے اسے محظوظ کیا ہو۔ سنیاسی نے اپنے گرو کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا کہ وہ ان دونوں بزرگوں سے بات کرے۔ لیکن انھیں غائب پایا۔ جس جگہ پر وہ دونوں کھڑے تھے، شام والی عورت فرش پر سو رہی تھی۔ اسے دیکھنے کی یا اس کے خوب صورت خدوخال کا تصور کرنے کی سنیاسی کے دل میں اب کوئی خواہش نہ تھی۔ سنیاسی پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ وہ آج رات کے تجربوں سے اس لیے گزارا گیا تھا تاکہ وہ خود اپنے آپ کو پہچان سکے۔

سنیاسی دروازہ بند کر کے باہر آیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ کر وہ پھر دیوی کے تصور میں محو ہو گیا۔ اور اب اس کا ذہن بغیر کسی خلل کے دیوی کی طرف رہا۔ وہ رات بھر یونہی بیٹھا رہا۔

جب دوسرا دن طلوع ہوا اور دنیا کے طور دیکھنے کے لیے سورج پھر ابھر آیا، مٹھ کے نوکر چاکر اور شاگرد سب جاگ پڑے اور اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ تو شام میں آئی ہوئی عورت کا شوہر اسے ڈھونڈتے ہوئے مٹھ آ پہنچا تھا۔ اور وہ دونوں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

جانے سے پہلے وہ دونوں سنیاسی کے پاس آئے۔ دونوں نے جھک کر عقیدت سے اس کے پاؤں چھوئے۔ عورت نے کہا "بابا جب میں مصیبت زدہ تھی، بے بس تھی، آپ نے مجھے پناہ دی۔ میری عزت آبرو کی حفاظت کی۔"

سنیاسی نے کہا "ماں، خدا نے آپ کی حفاظت کی۔ آپ کی بھی اور میری بھی۔" قدرے توقف کے بعد سنیاسی نے پھر کہا "میں رات آپ کے کمرے میں آیا تھا، آپ اطمینان سے سو رہی تھیں۔"

مجھے اس کی بالکل خبر نہیں۔ آپ کی نگرانی میں میں اپنے آپ کو بالکل محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ جیسے ہی بچھونے پر پڑی، ایسے سوئی کہ کسی بات کی خبر ہی نہ رہی۔ صبح ہونے پر

میری آنکھ کھلی، مجھے بالکل پتہ نہ چلا کہ رات آپ میرے کمرے میں آئے تھے۔ جب میں جاگی تو دیکھا کہ دروازہ کی چٹخنی نہیں لگی ہے۔ میں نے سوچا رات شاید میں نے بھولے سے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔"

"نہیں، ماں، آپ نے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے دھکیل کر اسے کھولا تھا۔"

سنیاسی نے میاں بیوی سے کہا کہ وہ صبح کا ناشتہ یہیں کرلیں۔ اور ان دونوں نے اسے منظور کرلیا۔ پوجا پاٹ میں وہ بھی شریک ہوئے۔ اور جب پرشاد بانٹا گیا تو انھیں بھی ملا۔ سنیاسی نے آج صبح اس عورت میں وہ شوخی، وہ دلربائی بالکل نہیں پائی جس نے کل شام اس کے دماغ کو گرفت میں لے لیا۔

دوپہر میں جب مہمان چلے گئے اور سنیاسی حسب معمول شیشا کو پڑھانے بیٹھا تو اس نے شیشا سے کہا کہ وہ ویاس کے بیان کو پھر اپنی اصل کے مطابق لکھ دے۔

اس کے شاگرد نے پھر سے تصحیح کردی اور پوچھا "بزرگ و برتر استاد، کیا شاردمنا نے آپ کو اس کا حکم دیا؟"

"یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"جب شاردمنا کل رات یہاں آئی تھیں تو میں پہچان گیا کہ یہ وہی ہیں۔ یہ بات آپ نے مجھے نہیں بتائی تو میں نے سوچا شاید آپ کا منشا یہ ہے کہ ہم سب لوگ انھیں کوئی عام عورت سمجھ لیں۔ جب آدھی رات میں آپ نے مجھے پکارا تو میں نے خیال کیا آپ دیوی شاردمنا کے حضور میں جارہے ہیں۔ اور از راہ عنایت آپ نے مجھے بھی بلوایا ہے کہ میں بھی دیوی کے درشن کرلوں۔ لیکن جب میں آپ کے پاس آیا تو آپ نے مجھے پھر واپس بھیج دیا۔ غالباً آپ نے خیال کیا کہ میں ابھی اس قابل نہیں ہوں، روحانی ارتقا کی اس آخری منزل پر نہیں پہنچا ہوں کہ میں دیوی کا جلوہ کرسکوں۔ میں واپس آگیا۔ لیکن سامنے دالان میں بیٹھا رہا کہ شاید پھر آپ مجھے بلائیں۔ جب آپ کمرے کے باہر کھڑے دیوی سے باتیں کررہے تھے تو مجھ پر ایک طرح کی غنودگی سی طاری ہوگئی۔ اس

کے باوجود مجھے محسوس ہوا کہ آپ کمرے کے اندر گئے ہیں اور اندر کسی سے باتیں کر رہے ہیں۔ صبح اٹھا تو میں نے جان لیا کہ آپ مجھے دیوی کے حضور میں اس لیے نہیں لے گئے کہ میں اس تجربہ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اب آپ نے ویاس کے بیان کو اپنی اصلی شکل دینے کے لیے کہا تو مجھے خیال ہوا۔ شاید کل رات دیوی نے آپ کو ساری حقیقت سمجھائی ہے کہ ویاس کا بیان سچا ہے۔''

''تو تمھارا خیال ہے کہ وہ عورت جو ابھی یہاں سے گئی، دیوی شاردمتا تھی؟''

''نہیں حضور، وہ جو کل شام آئی تھیں، دیوی شاردمتا تھیں۔ یہ عورت جو اب یہاں سے گئی، یہ کوئی اور ہے۔''

''تو پھر اس عورت کا کیا ہوا جو کل رات آئی تھی۔ اس بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟''

''یہ سب میں کیا جانوں حضور۔ آپ اپنی روحانیت کے بل پر سینکڑوں کراماتیں دکھا سکتے ہیں۔ میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکوں گا۔ آپ نے ازراہ عنایت مجھے اتنی آگاہی دی کہ دیوی شاردمتا کو پہچان سکوں اور میں نے پہچان لیا۔ اب آپ مجھے اس سے زیادہ بتانا نہیں چاہتے تو میں آپ کے بتائے بغیر کیسے جان سکتا ہوں؟ اس سے مجھے ٹھیس بھی نہیں پہنچی، کیوں کہ میں جانتا ہوں، خواہ آپ مجھے کچھ بتائیں یا مجھ سے کچھ چھپائیں، ہر حال میں آپ میری بھلائی ہی چاہتے ہیں۔''

سنیاسی اپنے چیلے کی اس گہری محبت اور اعتقاد سے بہت متاثر ہوا۔ اسے اس معصومیت پر رشک آیا جس نے الوہی حسن کا جلوہ دیکھا جب کہ خود اسے محض فانی حسن نظر آیا۔

اس نے کہا ''شیشا، میرے بچے، تم جس حال میں ہو وہ مجھ سے بہتر ہے۔ خدا تم پر ہمیشہ فضل کرے۔ تم نے دیوی کا روپ دیکھ لیا، جہاں میں نے صرف عورت دیکھی۔'' اور پھر اس نے اپنے شاگرد کو شام سے اب تک کے واقعات تفصیل سے بتائے اور کوئی بات پوشیدہ نہ رکھی۔

اپنی ساری بپتا سنا کر سنیاسی نے اپنے چیلے سے کہا "یہ باتیں تم اچھی طرح یاد رکھ لو۔ اور انھیں دوسروں کو بھی سنا دو جو روحانی ہدایت حاصل کرنے یہاں چلے آئے ہیں۔ تم اس کا بالکل لحاظ نہ کرنا کہ میری کہانی بیان کرنے سے میری نیک نامی پر کوئی دھبہ آئے گا، جو کچھ مجھ پر گزرا اسے میں شرم کا باعث نہیں سمجھتا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ خدا نے مجھے اس گڑھے میں گرنے سے بچالیا، جس کے کنارے میں کل شام اپنے فخر کے سہارے چلتا پہنچ گیا تھا۔ یہ خدا ہی ہے جو انسان کو سیدھے راستے پر چلاتا ہے۔ انسان خود اپنے سہارے اس پر چل نہیں سکتا۔ نیکی اور فخر ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ انسان کو بے جا فخر نہیں کرنا چاہیے۔

میرے دوست، بنیادی، اصلی اور ازلی حسن، خدا کا حسن ہے۔ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق یہ حسن ہم سب کو مسحور کرتا ہے۔ کوئی اس کے مجازی مظہر ہی کو دیکھ پاتا ہے، کوئی حقیقت کی تلاش میں روحانی ارتقا حاصل کر لیتا ہے۔ بہر حال یہاں بھی اور وہاں بھی یہ خدا ہی کا جلوہ ہے جو ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ کشش خدا کی کشش ہے۔ حسن کو دیکھ کر ہمیں خدا کے حسن کا تصور کرنا چاہیے۔ سارا حسن اور ساری نیکی خدا کی طرف سے ہے۔ کائنات کے ہر ذرّے میں خدا کا جلوہ ہے۔

●●●

گھر تک

(کنڑ زبان)

''لنگا!''

''سوامی''

''ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے، ہمارا گاؤں یہاں قریب ہی ہے۔''

''اُدھر دیکھیے، سوامی۔ سفید لکیر دکھائی دے رہی ہے نا، وہی ہوگی سڑک۔''

''نہیں وہ تو پانی بہہ رہا ہے، ایک چھوٹا سا نالا۔''

''اِدھر آ، اس ٹیلے پر چڑھ کر دیکھیں۔ شاید کچھ پتہ چلے۔''

ہم چڑھنے لگے۔ لنگا بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔ پاؤں کیچڑ میں دھنس دھنس جاتے۔ میں اس کے پیچھے گھوڑے پر ہولیا۔

اندھیرا ہو چلا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ گرمی کی چھٹیوں میں اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ بنگلور سے بس میں چلا، تحصیل پہنچ کر وہاں شیخ دار صاحب سے جن سے میری جان پہچان تھی، گھوڑا لیا اور ان کے نوکر لنگا کو ساتھ لیے گاؤں چلا تھا۔ لنگا راستے سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ لیکن میں ادھر سے کئی دفعہ گزرا ہوں۔ جانے کیسے ہم اس شام بھٹک گئے۔

''لنگا!''

''جی، سوامی۔''

''سوٹ کیس کا بوجھ زیادہ تو نہیں معلوم ہو رہا؟''

''جی نہیں بہت ہلکا ہے یہ۔ دیکھنے میں بڑا معلوم ہوتا ہے بس۔ کیا رکھا ہے سوامی اس میں؟''

''بس چند کتابیں، دو جوڑے کپڑے۔ بھائی کے لیے زری کی ٹوپی اور جوتے، بہن کے لیے دو گڑیاں... بس یہی۔''

''بنگلور میں آپ کتی دن رہے سوامی؟''

''پچھلی گرمیوں کے بعد گیا اب لوٹ رہا ہوں۔ دیکھا ایک سال میں یہ جگہ اتنی بدل گئی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف جھاڑیاں اور پودے بھی بدل گئے ہیں۔ اسی لیے تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہم کس سمت جا رہے ہیں۔''

ہم تینوں، لنگا، میں اور گھوڑا تھک کر چور ہو رہے تھے۔ کچھ دیر خاموشی سے یونہی چلتے رہے۔ مجھے گھر جلدی پہنچنے کی بے تابی تھی۔ میں ماں سے ملنا چاہتا تھا۔ ننھے بھائی کو دیکھنا چاہتا تھا، جو ٹوپی کا انتظار کر رہا ہوگا۔ پتا جی کو سنانا چاہتا تھا کہ میں نے امتحان میں پرچے کتنے اچھے کیے ہیں۔ اور بھی کتنی ساری باتیں تھیں جو گھر والوں کو سنانی تھیں....

ہم چڑھائی پر چڑھ کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ لیکن بے سود۔ راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ صحیح راستہ معلوم کرنے کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی میں نے سگریٹ جلانے کی کوشش کی۔ ہوا اتنی تیز تھی دیا سلائی بجھ بجھ جاتی۔ آخر بڑی مشکل سے سگریٹ جلایا۔

سناٹا، ویرانی اور ہوا کی سائیں سائیں۔

''ہمیں ساری رات یہیں پڑا رہنا ہوگا۔ اس بیابان میں۔''

گھوڑا جیسے میری بات سمجھ گیا، اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

لنگا بولا ''ذرا سنیے سرکار۔''

ہماری داہنی جانب کتے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے کہا "چل اسی طرف چلیں، شاید کوئی گاؤں مل جائے۔ پیڑ پودوں کو دیکھتے چلیں، کچھ نہ کچھ نشان مل جائے گا۔"

ہم ذرا داہنے کو مڑ کر اترنے لگے لیکن کتے کا بھونکنا پھر سنائی نہ پڑا۔ لنگا یکایک رُک گیا۔

"وہ... وہ دیکھیے اُدھر۔"

میں نے اُدھر دیکھا جدھر اس نے اشارہ کیا تھا۔ "اوہ! وہ تو ایک پیڑ ہے۔ ڈرپوک کہیں کا، اِدھر آ جا۔ گھوڑے کے ساتھ چل، گھبرا نہیں میں تجھے ایک کہانی سناؤں گا۔ تجھے پڑھنا لکھنا آتا ہے کیا؟"

"کچھ کچھ آتا ہے سوامی، اچھا سنائیے کہانی۔"

وہیں ایک مینڈھ پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میں لنگا کو کہانی سنانے لگا۔

انگریزی فوج کاویری ندی پار کر کے کیسے آئی... کھڑی دوپہر میں انگریز قلعے پر چڑھ آئے اور اس پر اپنا جھنڈا چڑھا دیا... اس وقت سلطان ٹیپو کھانے پر بیٹھے تھے۔ دو نوالے ہی لے پائے تھے کہ انگریزوں کی چڑھائی کی خبر سنی۔ کھانا چھوڑا، اٹھ کھڑے ہوئے۔ گھوڑے پر سوار ہو کر قلعے کے پاس آئے... شام تک ڈٹ کر لڑتے رہے۔ "سات گولیاں کھائیں۔ پھر بھی جان باقی تھی۔ وہ لاشوں میں چلے پڑے تھے۔ ایک گورے نے ٹیپو کا کمر بند نکالنا چاہا۔ ٹیپو نے تلوار کا وار کیا۔ سپاہی نے گولی چلائی۔ اس گولی سے وہ ختم ہو گئے... پھر کہانی کا بقیہ حصہ انگریزوں کا سلطان کے بیٹوں کو قید کرنا، لالٹین لے کر ٹیپو کی تلاش کرنا... رات کی تاریکی میں سرینگپٹن میں لوٹ مار... ہراساں عورتوں اور بچوں کا رات سڑکوں پر گزارنا، دوسری صبح ٹیپو کے جنازے کا جلوس، تجہیز و تکفین... اور پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا....

"بڑی دُکھ بھری کہانی ہے، سوامی، سچ کتنی دکھ بھری ہے۔"

ہم پھر چل پڑے۔ پیڑ کی طرف دیکھتے ہوئے لنگا نے زیرِ لب کہا "سوامی، پیڑ

کہیں ایسا ہوتا ہے؟'' اور گھوڑے کے نزدیک آ گیا۔

بات بھی یہ تھی کہ وہ پیڑ تاریکی میں کچھ بھیانک سا معلوم ہو رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ لڑکا ڈر جائے گا، میں گھوڑے سے نیچے اتر پڑا۔

''اس پیڑ کو میں اچھی طرح جانتا ہوں رے، ہمارا گاؤں یہاں سے بالکل قریب ہے۔ اسی پیڑ کو دیکھ کر میرا بھائی شامنا ڈر گیا تھا۔''

''وہ اس طرف کیوں آ نکلے تھے، سرکار؟''

''پچھلی گرمیوں میں جب میں یہاں آیا تھا، شامنا اور میں شام میں یونہی گھومنے نکلے۔ اس وقت اس کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔ وہ مجھے ایک کہانی سنا رہا تھا۔ وہی کہانی جو ابھی میں نے سنائی۔ وہ اتنے جوش وخروش میں ہوتا کہ کہانی سناتے اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ شامنا بڑا ہوشیار ہے۔ بڑی اچھی کہانیاں سناتا ہے۔ سریرنگپٹن کی کہانی اسے بہت پسند ہے۔ وہ مجھے تنگ کیا کرتا ہے مجھے سریرنگپٹن لے چلو۔ اس دن بھی کہانی سنتے سنتے رات ہو گئی اور ہم راستہ بھول گئے اور بھٹک کر اسی پیڑ کے پاس پہنچے۔ شامنا اس پیڑ کو دیکھ کر ڈر گیا۔ گھر پہنچتے ہی اس کو بخار چڑھ آیا اور تین دن تک نہ اترا۔''

''تب تو یہاں سے گاؤں جانے کا راستہ آپ کو معلوم ہوگا... یہاں سے گاؤں اور کتنی دور ہے؟''

''یہاں سے گاؤں تک کوئی سیدھی سڑک نہیں۔ ہمیں اندھیرے میں کھوج لگاتے جانا ہوگا۔ یہاں سے گاؤں کوئی آدھ میل ہوگا۔ یہ ہمارے گاؤں کا شمشان ہے۔''

''کیا کہا سوامی؟''

ارے توبہ، میں نے بھول کر شمشان کا ذکر اس کے سامنے کر دیا۔ یہ چودہ سال کا لڑکا پھر ڈر جائے تو۔

''بس اب گاؤں آ ہی گیا۔ یہاں سے ذرا داہنی طرف جانا ہے۔ یہ پیڑ ہمارے گاؤں کے پچھم میں ہے۔''

بارش تھم گئی تھی۔ لیکن تاریکی بڑھ گئی تھی۔ لنگا پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ میں جان گیا وہ ڈر گیا ہے۔ اس سے بات کرتے رہنا چاہیے، میں نے سوچا۔

''لنگا!''

''ادھر دیکھیے۔'' اس نے انگلی سے پیچھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بھوتوں سے ڈرتا ہے بزدل، ڈرپوک کہیں کا!''

''لیکن وہاں سوامی دیکھیے ادھر....'' وہ اصرار کر رہا تھا۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مینڈھ کے پاس جہاں بیٹھ کر میں نے لنگا کو کہانی سنائی تھی۔ روشنی نظر آئی۔ اور دو شکلیں آمنے سامنے بیٹھی زمین کی طرف تک رہی تھیں۔ جھوٹ کیوں کہوں؟ مجھے بھی ذرا ڈر لگا۔

''لنگا، تجھے کیا دکھائی پڑتا ہے وہاں؟''

''دیکھیے۔ ایک مشعل ہے اور اس کے پاس....''

''ڈر مت، چل پاس جا کر دیکھیں۔''

''دیکھیے اس طرف، دیکھیے۔'' وہ بے حد سہما ہوا تھا۔

روشنی اب حرکت کرتی نظر آئی۔ میں نے لنگا کا ہاتھ تھام لیا اور دوسرے میں گھوڑے کی لگام پکڑے، میں دھیرے دھیرے مینڈھ کی طرف بڑھا۔ جو کچھ نظر آیا تھا وہ ہمارا وہم نہیں تھا۔ دو صورتیں واقعی تھیں اور وہ بات کر رہی تھیں۔ انسانی آواز سن کر ہم میں ہمت آئی اور ہم پیڑ کے پیچھے کھڑے ہو کر سننے لگے۔

''ہائے، میرے بچے، میرے لال، تو پیاس سے تڑپتا رہا۔ تیرے لیے دودھ لائی ہوں، لے، پی لے... کیسا تھا میرا لال، اور اب تو سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا... ہم سب کو چھوڑ کر کہاں چلا گیا تو... آخر وقت تو کیا کہنا چاہتا تھا، میرے بچے، تیرے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ تیری آنکھیں، تیری آنکھوں میں کتنا کرب تھا! تیری آنکھیں کہتی تھیں تو ہمیں چھوڑنا نہیں چاہتا، ہائے، میرے بچے، اس جنگل بیابان میں اکیلا تن تنہا، ہائے بھگوان کیا یہ سب

سچ ہے؟" ...ایک عورت کٹورے سے مینڈھ پر دودھ انڈیل کر زاروقطار رو رہی تھی، بین کر رہی تھی۔ ہم اس دھیمی روشنی میں پہچان سکتے تھے کہ وہاں دو عورتیں ہیں، ان میں سے ایک چھوٹی لڑکی ہے۔ لڑکی رو رو کر کہہ رہی تھی۔

"ہم بھیا کو دیکھ بھی نہ سکے۔ دو دن کے اندر ہی یہ کیا ہو گیا۔ ہائے۔"

میں نے چند قدم آگے بڑھائے۔ اتنے میں ہمارے سامنے کی روشنی مینڈھ میں پہنچ گئی....

پھر تیسری آواز آئی۔ بھرائی ہوئی، لیکن قدرے کرخت۔

"یہ کیا پاگل پن ہے کہ ایسی خوفناک رات میں تم یہاں آئی ہو۔ کیا تمھارے رونے چلانے سے وہ واپس آ جائے گا؟"

میں نے آواز پہچان لی۔ یہ میرے پتاجی کی آواز تھی۔

میرے بچے، تو اندھیرے سے ڈرتا تھا، اب اندھیرے میں اکیلا پڑا ہے۔ تو ایک بار اسی جگہ ڈر گیا تھا، تجھے بخار چڑھ آیا تھا۔ اور اب تو اکیلا اسی جگہ پڑا ہے، اب تجھے ڈر نہیں لگتا؟ میں تجھے اکیلا چھوڑ کر گھر کیسے جاؤں؟" میری ماں پھر پھوٹ پڑی۔

"بھیا ٹوپی اور جوتے لائیں گے۔ اب انھیں سر ریگنلپٹن کا قصہ کون سنائے گا۔ بھیا کس کو سر ریگنلپٹن دکھائیں گے۔ شیامیو، میرے شیامیو، ہائے بھگوان۔" یہ میری بہن تھی۔

اس وقت مجھ پر کیا گزر رہی تھی میں بیان نہیں کر سکتا۔ ایسا لگتا تھا کائنات کی اس بے کراں وسعت میں، میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ لنگا میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا تھا، مجھے وہاں جانے سے روک رہا تھا۔ لیکن میں ہاتھ چھڑا کر مینڈھ کی طرف بھاگا۔

"پتاجی نے لالٹین اوپر اٹھائی اور پوچھا کون ہے؟"

مجھے دیکھتے ہی سب پھر پھوٹ پڑے۔ نئے سرے سے کرب ان کے سینوں میں امڈ آیا۔ میں بہت دیر تک شامنا کی قبر پر آنسو بہاتا رہا۔ میں نے سوٹ کیس سے ٹوپی اور جوتے نکالے اور انھیں شامنا کی قبر پر رکھ دیا۔ شامنا نے ایک بار پوچھا تھا "بھیا یہ پیڑ

پودے جنگل میں اکیلے کیسے رہتے ہیں۔" میرا جی چاہا ساری رات یہیں گزار دوں، شامنا کو اکیلا نہ چھوڑوں۔

ہم بہت دیر تک وہاں رہے۔ شامنا کی باتیں کرتے رہے۔ اس کی بیماری، اس کی موت... وہ ہمارے گھر کا ہیرا تھا۔ سب گاؤں والوں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ سب کا چہیتا، ذہین، عقلمند، اب اس کے بغیر گھر میں زندگی بے کیف تھی۔

پتا جی نے آہ بھر کر کہا "ایک نہ ایک دن ہم سب کو یہیں آنا ہوگا۔"

ہوا کا ایک جھونکا جیسے اپنے ساتھ اس کا جواب لایا "ہاں"۔

میرا بھائی اسی جگہ جہاں وہ ڈر گیا تھا، آج اکیلا، ابدی نیند سو رہا تھا۔ اسے چھوڑ کر ہم گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ جی ہاں گھر کی طرف؟ لیکن ہمارا گھر ہے کون سا؟

(ستمبر 1949)

●●●

زندگی کا رس

کنوٹ ہامزوں (ناروینجین زبان)

نیچے جاتے ہوئے کوپن ہیگن کی بندرگاہ کے قریب ایک گلی ملتی ہے جس کا نام ہے وسٹرو ولڈ۔ ایک نئی سنسان سی گلی۔ یہاں بہت کم گھر ہیں۔ کہیں کہیں گیس لیمپ، اور آدمی تو بالکل نظر ہی نہیں آتے۔ ان دنوں گرمیوں میں بھی شاذ ہی یہاں کوئی سیر کرتا نظر آتا ہے۔

تو کل رات مجھے اس گلی میں ایک عجیب سا واقعہ پیش آیا۔

میں یہاں چہل قدمی کررہا تھا۔ مقابل کی طرف سے ایک عورت آتی دکھائی دی۔ آس پاس ایک بھی آدمی نہ تھا۔ گیس لیمپ روشن کردیے گئے تھے پھر بھی اندھیرا تھا۔ اور میں اس عورت کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ وہی راتوں کو نکلنے والی عورتوں میں سے ہوگی، میں نے سوچا اور اس کے پاس سے یونہی گزر گیا۔

گلی کی نکڑ تک جاکر میں پھر مڑ گیا۔ عورت بھی مڑ کر واپس آرہی تھی۔ ہم دونوں پھر ملے۔ کسی کا انتظار کررہی ہوگی۔ میں نے خیال کیا۔ کس کا انتظار کررہی ہوگی؟ مجھے جاننے کا اشتیاق ہوا، لیکن پھر میں اس کے پاس سے یونہی گزر گیا۔

جب ہم تیسری دفعہ ملے تو میں نے ٹوپی اتار لی اور کہا ”شام بخیر۔ کسی کے انتظار میں ہیں آپ؟“

وہ چونک پڑی۔ ”نہیں۔ یعنی ہاں... انتظار کررہی ہوں۔“

اس آدمی کے آنے تک میں آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں؟ آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟''

''نہیں مجھے بالکل اعتراض نہ ہوگا۔ شکریہ۔'' اس نے کہا۔ ''ویسے میں خصوصیت سے کسی کا انتظار بھی نہیں کر رہی ہوں۔ یونہی ہوا کھانے چلی آئی۔ یہ پرسکون جگہ ہے۔''

ہم ساتھ ساتھ ٹہلنے لگے۔ ادھر ادھر کی بہت سی باتیں کرتے رہے۔ میں نے اپنا بازو پیش کیا۔

''نہیں شکریہ۔'' اس نے سر ہلا کر کہا۔

یونہی ٹہلنے میں کوئی مزا نہیں آرہا تھا۔ میں اندھیرے میں اسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے دیا سلائی جلائی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اب کیا بجا ہے۔ پھر جلی ہوئی دیا سلائی کو اونچا کر کے اس کو بھی دیکھا۔

وہ کپکپا رہی تھی۔ جیسے سردی سے ٹھٹھر رہی ہو۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا'' آپ ٹھٹھر رہی ہیں۔ چلیے ہوٹل میں چل کر کچھ پئیں۔ نوالی میں؟ نیشنل میں؟''

''لیکن اس وقت تو میں کہیں نہیں جا سکتی۔ آپ نے شاید غور نہیں کیا۔''

اب میں نے پہلی دفعہ دیکھا۔ وہ ایک سیاہ جالی کا نقاب ڈالے ہوئے تھی۔ میں نے معافی چاہی کہ اندھیرے میں دیکھ نہ سکا تھا۔ اس نے جس طرح میرے عذر کو قبول کر لیا، یہ دیکھ کر میں فوراً تاڑ گیا کہ وہ رات کو نکلنے والیوں میں سے نہیں ہے۔

''میرے بازو کا سہارا نہیں لیں گی آپ؟'' میں نے پھر جرأت کی۔

''شاید اس سے کچھ گرمی پہنچے۔''

اس نے میرے بازو کا سہارا لے لیا۔ ہم کچھ دیر اِدھر سے اُدھر ٹہلتے رہے۔ اس نے پھر وقت پوچھا۔ ''دس۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ کہاں رہتی ہیں۔''

''گاملے کانگیوی میں۔''

''میں آپ کو مکان تک پہنچا سکتا ہوں؟''

''نہیں، یہ اچھا نہ ہوگا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ بروڈ گیڈ پر رہتے ہیں نا؟''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''اوہ، میں جانتی ہوں آپ کون ہیں۔''

ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہم روشن گلیوں میں چلتے رہے۔ وہ جلدی جلدی چل رہی تھی۔ اس کا سیاہ نقاب پیچھے سے اڑا آ رہا تھا۔

''ہمیں جلدی کرنا چاہیے۔'' وہ بولی۔

گاملے کانگیوی میں اپنے دروازے پر رک کر وہ میری طرف مڑی۔ شاید شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ میں نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ آہستہ سے اندر گئی... میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ اندر جا کر اس نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔

تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر ہم تیسری منزل پر آئے۔ اس نے قفل کھولا۔ پھر اندر جا کر ایک اور دروازہ کھولا۔ ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گئی۔ یہ ڈرائنگ روم معلوم ہوتی تھی۔ بڑی گھڑی دیوار پر ٹنگی ٹک ٹک کر رہی تھی۔ اندر آ کر ایک لمحہ کے لیے وہ یونہی کھڑی رہی۔ پھر میرے گرد باہیں ڈال کر، مجھے جکڑ کر، کپکپاتے ہوئے جلتے ہوئے ہونٹوں سے میرے ہونٹوں کا بوسہ لیا۔ ہونٹوں کا!

''بیٹھیے یہاں صوفہ ہے۔ میں ابھی لیمپ جلاتی ہوں۔''

وہ لیمپ جلا لائی۔

میں نے حیرت سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ میں ایک کشادہ اور سجی ہوئی ڈرائنگ روم میں تھا۔ اس روم میں کئی دروازے تھے، جو اندر دوسرے کمروں میں کھلتے تھے۔ میں بالکل اندازہ نہ لگا سکا۔ آخر میں کس قسم کی عورت کے ساتھ آ گیا ہوں۔

''کتنا خوبصورت کمرہ ہے۔ آپ یہاں رہتی ہیں؟''

''ہاں یہ میرا گھر ہے۔''

''آپ کا گھر؟ تو آپ اپنے والدین کے ساتھ یہاں رہتی ہیں؟''

''اونہیں۔ وہ ہنس پڑی۔ میں بوڑھی عورت ہوں۔ آپ ابھی دیکھ لیں گے۔'' پھر اس نے نقاب الٹ دیا۔ ''دیکھیے میں نے کہا تھا نا۔''

پھر اچانک میرے گرد اپنے بازو حمائل کر اس نے مجھے جکڑ لیا۔ کسی شدید خواہش سے مغلوب ہو کر۔

میں نے سوچا تھا کہ وہ بیس بائیس برس کی ہوگی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی تھی۔ اس لیے ممکن ہے وہ شادی شدہ بھی ہو۔ خوبصورت نہیں اس کے منہ پر مہاسے تھے۔ بھوؤں کے بال تقریباً ناپید تھے۔ لیکن اس کے لب بہت خوبصورت تھے۔ اور اس کے انگ انگ سے زندگی پھوٹی پڑتی تھی۔

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا، وہ کون ہے؟ اس کا شوہر (اگر اس کا شوہر ہے) کہاں ہے؟ اور میں کس کے گھر میں ہوں؟ لیکن جب بھی میں کچھ پوچھنے کے لیے منہ کھولتا تو وہ مجھے بھینچ لیتی اور زیادہ پوچھ گچھ سے منع کرتی۔

''میرا نام یلن ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''کچھ پیو گے؟ میں گھنٹی بجاؤں تو کسی کی نیند میں خلل نہ پڑے گا اطمینان رکھیے۔ شاید آپ یہاں بیٹھنا پسند کریں بیڈ روم میں۔ آپ یہاں آجایئے۔''

میں خواب گاہ میں چلا گیا۔ ڈرائنگ روم سے یہاں کچھ روشنی آرہی تھی۔ دو بستر لگے تھے۔ یلن نے گھنٹی بجائی اور شراب منگائی۔ وہ دروازے کے پاس کچھ دیر رکی۔ میں اس سے ملنے کے لیے چند قدم آگے بڑھا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ پھر وہ خود ہی میرے پاس آگئی۔

یہ کل شب کا واقعہ تھا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی، سورج کی روشنی پردے سے چھن کر آرہی تھی۔ یلن بھی بیدار ہو گئی تھی۔ اور میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی باہیں سفید اور مخملیں تھیں۔ اور سینہ بھرپور۔ میں نے اس کے کان میں کچھ کہا اس نے اپنے ہونٹوں سے میرے ہونٹ بند

کر دیے۔ بڑی نرمی اور محبت سے۔

دن چڑھتا گیا۔

دو گھنٹے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ یلن بھی اٹھ کر کپڑے پہننے لگی۔ اس نے شوز بھی پہن لیے۔

اس کے بعد میں نے ایسی چیز دیکھی کہ اب بھی ایسا لگتا ہے کہ میں نے خواب دیکھا تھا۔ یلن کو دوسرے کمرے میں کوئی کام تھا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

کمرے کے بالکل درمیان میں میز پر ایک نعش رکھی ہوئی تھی۔ سفید کفن میں لپٹی ہوئی ایک بوڑھے مرد کی نعش۔ سفید داڑھی، گھٹنے بھنچی ہوئی مٹھیوں کی طرح چادر کے اندر سے نکلے ہوئے تھے۔ چہرہ ہیبت ناک تھا۔

میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس لیے میں نے منہ پھیر لیا۔

جب یلن واپس آئی میں لباس پہن چکا تھا۔ اور باہر جانے کے لیے تیار تھا۔ اب میں اس کے پیار کا جواب دینے سے ہر حال میں قاصر تھا۔

اس نے چند اور کپڑے اوپر سے ڈال لیے۔ وہ مجھے نیچے تک چھوڑ آنا چاہتی تھی۔ دروازے کے پاس وہ دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی تا کہ باہر کے لوگ اسے دیکھ نہ سکیں۔

''خدا حافظ۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کل تک؟'' میں نے یونہی اس کا امتحان لینے کے لیے پوچھا۔

''نہیں، کل نہیں۔''

''کیوں؟''

''اتنے سوال نہ پوچھو۔ میرا ایک رشتہ دار مر گیا ہے۔ کل اس کی تجہیز و تکفین ہے۔ اب سمجھ گئے نا؟''

''لیکن پرسوں؟''

''ہاں پرسوں، میں یہاں ملوں گی۔ اسی دروازے کے پاس۔ خدا حافظ۔''

میں چلا آیا۔

وہ کون تھی؟ اور نعش؟ مٹھیاں بھنچی ہوئی۔ ہونٹوں کے کنارے پچکے ہوئے۔ پرسوں وہ میرے آنے کی متوقع رہے گی۔ کیا مجھے جانا چاہیے؟

میں سیدھے بربینا کیفے گیا اور ڈائرکٹری مانگ کر دیکھی۔ گیا ملے کانگیوی پر وہ نمبر نکلا... وہاں اس کا نام تھا۔ میں نے وہیں بیٹھ کر کچھ دیر صبح کے اخباروں کا انتظار کیا۔ اخبار کے ملتے ہی موتوں کی فہرست پر نظر ڈالی۔ فہرست میں سب سے اوپر اسی کا اعلان تھا۔ جلی حروف میں لکھا تھا:

''میرے شوہر ایک طویل عرصہ تک بیمار رہنے کے بعد آج انتقال کر گئے۔ ان کی عمر ترپن سال کی تھی۔'' اعلان پر پرسوں کی تاریخ تھی۔

میں بہت دیر تک وہاں بیٹھا سوچتا رہا۔ ایک مرد شادی کرتا ہے۔ لیکن اس کی بیوی اس سے تیس سال چھوٹی ہے۔

اور ایک دن وہ مر جاتا ہے۔

اس کی بیوہ آخرکار اطمینان کا سانس لیتی ہے۔

●●●

نیا جہنم

پورے گرکویست (سویڈش زبان)

جانسن نے لفٹ کا دروازہ کھولا اور محبت سے اس عورت کو سہارا دیا جو سمور میں لپٹی لپٹائی، غازے اور عطر سے مہک رہی تھی۔ وہ دونوں بالکل پاس پاس، ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھ گئے اور لفٹ نیچے اترنے لگی۔

عورت نے اپنے شراب سے بھیگے ہوئے، ادھ کھلے ہونٹ بند کر لیے اور ان دونوں کے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

انھوں نے تاروں کی چھاؤں میں رات کا کھانا کھایا تھا اور اب ایک دوسرے کے ساتھ لطف اٹھانے کے لیے کہیں جا رہے تھے۔

''ڈارلنگ کیا نادر لمحے تھے۔ کتنا رومانی لگ رہا تھا۔ تمھارے ساتھ وہاں اوپر بیٹھے ہوئے۔ معلوم ہوتا تھا ہم ستاروں کی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔ اس وقت اس کا صحیح اندازہ ہوتا تھا کہ محبت کیا چیز ہے! تم مجھ سے محبت کرتے ہو نا!... سچ سچ؟''

جواب میں اس نے اس کا منھ چوم لیا۔

اور لفٹ نیچے اترتی رہی۔

''کیا ہی اچھا ہوا کہ تم آ گئیں [آ گئی]۔ میں تو دیوانہ ہو جاتا اگر تم نہ آتیں [آتی]۔''

''ہاں، لیکن تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس سے کیسے نبٹنا پڑا۔ میں جب تیار ہونے لگی

تو مجھ سے پوچھنے لگا کہاں جا رہی ہو۔ سو میں نے کہہ دیا میں جہاں جانا چاہوں، جاؤں گی، میں اس کی قیدی تھوڑے ہی ہوں؟ وہ یوں ہی خاموش بیٹھا مجھے گھورا کیا۔ جب تک میں نے کپڑے بدل لیے وہ مجھے ایک ٹک گھورتا رہا... میں نے آج یہ نیا لباس پہنا ہے۔ بتاؤ میں اس میں اچھی لگ رہی ہوں؟ میں کون سے رنگ میں تمھیں سب سے اچھی لگتی ہوں، گلابی؟

''ہر رنگ، ہر چیز تمھیں بھاتی ہے، پیاری۔ اور آج رات تم اتنی پاری، اتنی حسین لگ رہی ہو کہ آج سے پہلے کبھی اتنی حسین نظر نہ آئی تھیں۔''

وہ مطمئن اور خوش ہو کر مسکرائی۔ اور ان کے ہونٹ بڑی دیر تک ایک طویل بوسے میں پیوست ہو گئے۔

اور لفٹ نیچے اترتی رہی۔

''جب میں تیار ہو کر باہر جانے لگی تو اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس زور سے دبایا کہ ابھی تک درد کر رہا ہے۔ تم نہیں جانتے وہ کتنا وحشی ہے'' اچھا تو خدا حافظ! میں نے کہا۔ اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اوہ! وہ اتنا نامعقول ہے، اتنا ناقابل برداشت... میں اس کا ساتھ برداشت نہیں کر سکتی۔''

''بے چاری لڑکی، ننھی لڑکی۔''

''جیسے میں کچھ دیر باہر جا کر دل بہلا نہیں سکتی۔ وہ اتنا سنجیدہ ہے، کہ ایک معمولی فطری بات کو یوں نہیں سمجھتا، اس کے لیے گویا یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔''

''بے چاری لڑکی، پیاری لڑکی، تم پر کیا گزری ہے...؟''

''یہ تو کوئی بھی نہیں جان سکتا مجھ پر کیا گزری ہے... تم سے ملنے سے پہلے میں جانتی بھی نہ تھی کہ محبت کیا ہے!''

''میری محبوب۔'' جانسن نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

اور لفٹ نیچے، اور نیچے اترتی رہی۔

''ذرا سوچو تو۔'' اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ بوس و کنار سے اس کی سانس رک

رک گئی تھی۔ ''وہاں اوپر، تمھارے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کتنے اچھوتے تھے، میں ستاروں اور سپنوں کی دنیا میں پہنچ گئی تھی۔ میں یہ لمحات کبھی نہیں بھول سکتی، کبھی نہیں۔ اور تم جانو، آرتھر ان باتوں میں بالکل اناڑی ہے۔ وہ بالکل ہی سنجیدہ، اور خشک آدمی ہے، وہ سمجھ ہی نہیں سکتا میں کیا چاہتی ہوں۔ اس کی سرشت میں شاعری نام کو نہیں۔''

''واقعی، پیاری، تمھارے لیے یہ ناقابل برداشت تھا۔''

''کیوں، ہے نا؟'' اس نے مسکرا کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ''لیکن اب جانے بھی دو، ہم کیوں یہ باتیں لے بیٹھے۔ اب تو ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ... تم مجھ سے محبت کرتے ہو نا، سچ، سچ؟''

''پوچھتی ہو، میں تم سے محبت کرتا ہوں؟'' اس نے بے قرار ہو کر اسے لپٹا لیا اور اس زور سے بھینچا کہ سانس رک گئی۔

اور لفٹ نیچے اترتی رہی۔

وہ اس پر جھک کر سہلانے لگا۔ وہ شرما گئی ''اور آج رات ہم اس طرح... جیسے کہ پہلے کبھی نہیں... تم...؟'' اس نے چپکے سے سرگوشی میں کہا۔ عورت نے اسے کھینچ کر اپنے قریب کر لیا اور آنکھیں بند کیے، اس کی آغوش میں سمٹ آئی۔

آخر کار جانسن سیدھے اٹھ بیٹھا۔ اس کا چہرہ سرخ اور گرم ہو گیا تھا۔ ''لیکن لفٹ کو یہ کیا ہو گیا ہے؟'' وہ بے صبر ہو کر پھوٹ پڑا ''یہ رکتی کیوں نہیں؟ ہم کتنی دیر سے یہاں بیٹھے ہیں۔''

ہاں، واقعی، وقت کتنی جلد گزر گیا۔ پتہ بھی نہ چلا۔''

''ہمیں یہاں بیٹھے بیٹھے تو مدت ہو گئی۔ اس کے کیا معنی ہیں آخر؟''

اس نے جالی میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ سیاہ تاریکی۔ اور لفٹ، دھیرے دھیرے، برابر نیچے اتر رہی تھی۔

''خدایا، اس کے کیا معنی ہیں، آخر؟ ہم تو ایک ایسے گڑھے میں اتر رہے ہیں، جس

کی کوئی تہ ہی نہیں۔ ایسے لگ رہا ہے، ہم ابد تک یونہی نیچے اترتے رہیں گے۔"

انھوں نے نیچے دیکھنے کی کوشش کی۔ نیچے گھپ اندھیرا تھا۔ اور وہ اس سیاہ تاریکی میں نیچے اور نیچے گرے جارہے تھے۔

جانسن نے کہا "ہم جہنم میں جارہے ہیں۔"

"اوہ!" عورت کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اور اس نے اس کا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے، بٹن دبادو۔"

جانسن نے اپنی ساری قوت صرف کر کے بٹن دبایا۔ لیکن بے سود۔ لفٹ اپنے راستے پر بدستور رواں تھی، نیچے، نیچے اور نیچے۔

"غضب ہوگیا" وہ چلائی۔ "اب کیا کیا جائے؟"

وہ خوفزدہ ہوکر رونے لگی۔

"نہیں پیاری، روؤ نہیں، ہمیں ہمت سے کام لینا چاہیے۔ اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹھ جاؤ۔ ہاں یوں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ آخر یہ کہیں تو رکے گی۔"

وہ چپ بیٹھے انتظار کرنے لگے۔

"ذرا سوچو تو، آج ہی یوں ہونا تھا، جب ہم ایک دوسرے کے ساتھ لطف اٹھانے جارہے تھے۔"

"ہاں کیا بے وقوفی ہے یہ بھی۔"

"تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو؟ کرتے ہو نا؟"

"میری پیاری" جانسن نے اسے قریب کھینچ لیا۔

لفٹ اچانک ٹھہر گئی۔ اور اچانک وہ ایک تیز، آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی میں گھر گئے۔

وہ جہنم میں آگئے تھے۔

شیطان نے بڑے اخلاق سے دروازہ کھولا۔ اور تعظیماً جھک کر انھیں سلام کیا۔

''شام بخیر'' اس نے بڑی نفاست سے لباس پہنا تھا۔ فراک کوٹ اس کی بالوں دار گردن سے یوں لٹکا ہوا تھا جیسے کسی زنگ آلود کیل سے۔

جانسن اور وہ عورت کھوئے کھوئے باہر نکلے۔ ''خدایا، ہم کہاں آ گئے ہیں۔'' وہ اس ہیبت ناک پیکر کو سامنے دیکھ کر چلا اٹھے۔

شیطان نے انھیں بتایا کہ وہ اس وقت کہاں آ گئے ہیں۔ وہ جلدی جلدی انھیں اطمینان دلانے لگا۔ ''لیکن اب یہاں حالات اتنے برے نہیں ہیں۔ مجھے امید ہے آپ کا وقت یہاں اچھا گزرے گا۔ صرف ایک رات کے لیے غالباً؟''

''جی ہاں، جی ہاں، صرف ایک رات کے لیے۔'' جانسن نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔ ''اس سے زیادہ ٹھہرنے کا ہمارا ارادہ نہیں۔''

عورت اس کے بازو سے لگی کانپ رہی تھی۔

آگ کی سبز اور زرد روشنی اتنی تیز، آنکھوں کو خیرہ کرنے والی تھی کہ وہ مشکل سے اپنے اردگرد دیکھ سکتے تھے۔ کسی چیز کے جلنے کی بو آ رہی تھی۔ جب وہ اس تیز روشنی کے عادی ہو گئے تو انھوں نے دیکھا کہ وہ ایک مارکیٹ کی سی جگہ میں کھڑے ہیں۔ اطراف میں گھر بھی ہیں، جن کی کھڑکیوں میں سے یہ تیز آگ کی روشنی پھوٹ رہی ہے۔

''وہ آپ ہی لوگ ہیں نا جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔'' شیطان نے پوچھا۔

''جی ہاں، ہم ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے ہیں۔'' عورت نے جانسن کو محبت بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو آپ ادھر آیئے۔ میرے ساتھ ساتھ آیئے گا۔ وہ مارکیٹ کی ایک اندھیاری گلی میں گئے۔ ایک گندے چکنے دروازے سے پرانی ٹوٹی پھوٹی لالٹین لٹک رہی تھی۔

''آپ یہاں چلے جائیں۔'' شیطان نے بڑے اخلاق سے ان کے لیے دروازہ کھولا۔ اور

پیچھے ہٹ گیا۔

وہ دونوں اندر گئے۔ ایک موٹی بہ بڑی چھاتیوں والی شیطان عورت نے ان کا استقبال کیا۔ اس کے داڑھی مونچھوں دار چہرے پر کاسنی رنگ کے پاؤڈر کی تہیں جم رہی تھیں۔ بھاری سانس لیتے ہوئے وہ مسکرائی۔ اور اپنی منکوں کی سی آنکھوں سے بڑی مہربان نظروں سے انھیں دیکھنے لگی۔ جیسے وہ ان کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ اس کی پیشانی پر سینگ اُگے ہوئے تھے۔ اس نے بال ان سینگوں پر لپیٹ رکھے تھے۔ اور انھیں پتلی پتلی نیلی ربنوں میں باندھ دیا تھا۔

"مسٹر جانسن اور ان کی محبوبہ؟...آپ از راہ کرم اس کمرے میں چلے جایئے نمبر 8 میں۔" اس نے انھیں ایک بڑی سی چابی نکال دی۔ اور وہ اندھیری چکنی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ چکناہٹ سے ان کے پاؤں پھسل پھسل جاتے۔ آخر وہ اوپر پہنچ گئے۔

درمیانے سائز کا کمرہ تھا۔ کمروں کے بیچوں بیچ ایک میز تھی جس پر دھول سے اٹا ہوا کپڑا بچھا تھا۔ دیوار سے لگا ہوا بستر تھا جس پر اجلی چادریں صفائی سے بچھی تھیں۔ انھیں یہ کمرہ اچھا لگا۔ انھوں نے اپنے کوٹ نکالے، اور ایک دوسرے کو پیار کیا۔

ایک آدمی خاموشی سے اندر آیا۔ وہ ویٹر کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کا لباس بہت صاف ستھرا تھا۔ اور اس کے لباس کا اگلا حصہ چمک رہا تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے اندر چلا آیا۔ وہ بغیر کسی آواز کے چلتا تھا جیسے خواب میں چل رہا ہو۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی تھی، اور کنپٹی پر گولی کا زخم تھا۔ اس نے کمرہ صاف کیا، اور برتن چن دیے۔

انھوں نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ لیکن جب وہ باہر جانے لگا تو جانسن نے اس سے کہا "ہمیں تھوڑی سی شراب چاہیے۔ آدھی بوتل مدیرا لے آؤ۔" وہ آدمی تعظیماً جھکا، پھر باہر چلا گیا۔

جانسن نے اپنا اوور کوٹ اور ویسٹ کوٹ اتارا۔ عورت نے کہا "کپڑے اتارو نہیں۔ وہ پھر آئے گا۔"

''او، ایسی جگہ ان باتوں کی کیا پروا۔ تم بھی اپنے اتار ڈالو، پیاری۔''

عورت نے اپنا فراک اتارا۔ اور بڑے نخروں اور عشووں کے ساتھ زیریں جامہ بھی اتار ڈالا۔ اور اس کی گود میں آ بیٹھی۔ کتنا مزا آ رہا تھا؟

''سوچو تو۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''ہم دونوں ساتھ ساتھ یہاں بیٹھے ہوئے، خلوت میں، بالکل اکیلے، ایسی عجیب، پراسرار اور رومانی سی جگہ۔ یہ سب اتنا شاعرانہ معلوم ہو رہا ہے۔ میں کبھی بھولوں گی نہیں۔''

''تم کتنی پیاری ہو، کتنی میٹھی ہو۔'' جانسن بڑی دیر تک اس کے ہونٹوں کو چومتا رہا۔

وہ آدمی پھر خاموشی سے نمودار ہوا۔ میکانکی طور پر اس نے گلاس میز پر جمائے اور ان میں شراب انڈیلنے لگا۔ اس آدمی میں کوئی بات غیر معمولی نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ موت کی طرح زرد تھا، اور اس کی کنپٹی میں گولی کا زخم تھا۔

عورت اچانک اچھل پڑی اور چلا اٹھی۔

''اوہ، یہ تم ہو آرتھر؟ تم ہو؟ خدایا وہ مر چکا ہے۔ اس نے خودکشی کر لی ہے۔''

وہ آدمی بالکل خاموش کھڑا رہا۔ بغیر کسی حس و حرکت کے۔ اور یونہی سامنے کی طرف خالی خالی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر اذیت اور دکھ کا کوئی اظہار نہ تھا۔ اس کا چہرہ سخت اور سنجیدہ تھا۔

لیکن، آرتھر یہ تم نے کیا کیا؟ یہ تم نے اپنے آپ کو ہلاک کیسے کر لیا؟ اگر مجھے اس کا ذرا بھی گمان ہوتا تو میں گھر سے باہر نہ نکلتی۔ لیکن تم نے تو مجھ سے کچھ بھی نہ کہا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تم... او خدا، یہ کیا ہو گیا؟''

وہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگی۔ اس آدمی نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ بالکل اجنبی ہو۔ اس کی برفیلی، بھوری آنکھیں اس کے آر پار ہو رہی تھیں۔ اس کا زرد اور سفید چہرہ لیمپ کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ زخم سے خون نہیں نکل رہا تھا، وہاں صرف ایک سوراخ تھا۔

''میں اب یہاں رہ نہیں سکتی۔'' وہ چلائی۔ چلو یہاں سے نکل چلیں۔ میں یہ اذیت برداشت نہیں کر سکتی۔''

اس نے جلدی سے کپڑے سمیٹ لیے۔ ہیٹ اور کوٹ بھی اٹھالیا۔ اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ جانسن بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ وہ دونوں سیڑھیوں پر سے پھسلے اور عورت سگریٹ کی راکھ اور تھوک سے لتھڑی ہوئی جگہ پر آن گری۔ زینے سے نیچے، وہ بوڑھی شیطان عورت شفقت سے مسکرا رہی تھی، اور اپنے سینگوں سمیت سر کو ہلا رہی تھی۔

باہر گلی میں آکر انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ عورت نے کپڑے پہن لیے۔ اور ناک پر پوڈر لگانے لگی۔ جانسن نے اس کے شانوں کے گرد اپنا بازو ڈال کر اسے سہارا دیا۔ اور اس کے آنسوؤں کو چوم لیا۔ وہ اتنا رحم دل تھا۔ وہ اب پھر مارکیٹ میں آگئے تھے۔ بڑا شیطان وہیں پھر رہا تھا۔ وہ دوبارہ اس سے ملے۔

''اوہ، آپ اتنی جلد واپس آگئے؟'' اس نے پوچھا ''خوب لطف اٹھایا ہوگا۔''

''نہیں، اُفوہ اتنا بھیانک....'' عورت کہنے لگی۔

''ارے یوں نہ کہیے یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اگر آپ پہلے کبھی یہاں آتے تو دیکھتے کہ یہاں کی حالت کیا تھی۔ اب تو دوزخ میں ایسی کوئی چیز نہیں جس کے بارے میں کسی کو کوئی شکایت ہو۔ یہاں اب ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ ہر بات فطری معلوم ہو۔ بلکہ اب تو لوگ یہاں مزے میں رہتے ہیں۔

''ہاں، یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ یہاں اب حالات اچھے ہیں۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' جانسن نے کہا۔

''بالکل۔'' شیطان بولا ''ہم نے یہاں ہر چیز بدل دی ہے۔ یہاں اب سب کچھ جدید اصولوں کے مطابق ہے۔ زمانہ ترقی کر رہا ہے، ہر طرف جدت کا دور دورہ۔ ہم نے بھی اسی سمت میں قدم بڑھائے ہیں۔ اب ہمارے ہاں صرف 'روح کا عذاب' ہے۔''

''خدا کا شکر ہے۔'' عورت نے کہا۔

شیطان بڑے اخلاق سے انھیں لفٹ تک پہنچا آیا۔ ''شب بخیر۔'' اس نے جھک کر کہا۔ ''پھر آیئے گا۔'' اس نے لفٹ کا دروازہ ان پر بند کیا۔

لفٹ اوپر جانے لگی۔

''اچھا ہوا، کہ یہ سب کچھ ختم ہو گیا۔'' دونوں نے کہا۔ اور اب اطمینان سے ایک دوسرے کے قریب لگ کر بیٹھ گئے۔

''تمھارے بغیر، اس آزمائش سے میں گزر ہی نہیں سکتی تھی۔'' اس نے آہستہ سے سرگوشی میں کہا۔ جانسن نے اسے اپنے قریب کھینچ کر پیار کیا۔

''ذرا سوچو تو سہی۔ آخر اس نے یہ کیوں کیا۔ اس کے بھی بڑے عجیب خیالات تھے۔ وہ کسی بات کو فطری صورت میں قبول ہی نہ کر سکتا تھا۔ یہ اس کے لیے زندگی اور موت کا سوال تھا۔''

''یہ صریحاً بے وقوفی ہے۔'' جانسن نے کہا۔

''اس نے مجھ سے کچھ تو کہا ہوتا۔ میں گھر ہی ٹھہر جاتی۔ اور ہم کوئی اور شام ساتھ گزارتے۔''

''ہاں، ٹھیک ہے۔'' جانسن بولا۔

''لیکن ڈارلنگ، اب ان سب باتوں کا خیال کرنے سے فائدہ؟ اس نے چپکے سے سرگوشی میں کہا اور اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔'' اب تو سارا معاملہ ختم ہے۔''

''ہاں، میری محبوب۔'' جانسن نے عورت کو اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔

اور لفٹ اوپر چلی گئی۔

●●●

میاں بیوی
(فرانسیسی زبان)

آنگن سے گزرتے ہی اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں اور وہ وہیں نچلے زینے پر بیٹھی صبح سے رو رہی تھی۔ پینتیس چالیس برس کی یہ عورت لانبا قد، دبلا پتلا جسم، کمزور سی، کچھ بیمار سی، وہ زور زور سے سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی اور کچھ مبہم سے الفاظ بڑبڑاتی جاتی تھی۔ گویا وہ ہر پاس سے گزرنے والے کو دھمکیاں دے رہی ہو۔ پڑوسنیں کئی بار اسے منا چکی تھیں ''تمھیں چاہیے کہ اندر چلی جاؤ۔ اتنی چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنانا ٹھیک نہیں۔ یونہی روتی رہوگی تو درد سر الگ مول لوگی۔ آخر یوں روتے رہنے سے فائدہ ہی کیا ہے؟''

مگر یہ سب گویا اس نے سنا ہی نہیں، آخر انھیں اس کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے یہ بوڑھی قطامائیں، کیا اسے آزادی نہ تھی کہ جو جی میں آئے کرے؟

''اوہ! میں کتنی تنگ آگئی ہوں ان باتوں سے؟ اس نے سوچا۔''

کبھی وہ سونے کی ناکام کوشش میں اپنا سر زینے کی پٹی پر رکھ دیتی کسی تھکے ماندے مسافر کی طرح کبھی اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا لیتی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ اس کے آنسو کسی نہ سوکھنے والے چشمے سے امڈے چلے آرہے تھے ایک دبی ہوئی آہ اس کے ہونٹوں سے نکل جاتی، کبھی وہ بالکل خاموش ہو جاتی اور اپنے سامنے بے معنی نگاہوں سے تکنے لگتی۔ پھر کہنی زانوں پر ٹیکے ہتھیلی پر رکھے بہت دیر تک بے حس وحرکت بیٹھی

رہی، وہ اسی انداز سے بیٹھی رہ کر اس کو حیران کر دینا چاہتی تھی۔ یہ اس کے انتقام کا صرف ایک پہلو تھا اسی لمحے جب ان کے جھگڑے نے یہ رنگ اختیار کیا تھا۔ اسے یہ تجویز سجھائی دی تھی۔

یہ پہلا موقع نہ تھا جب اس نے ان زینوں کو سہارا بنایا تھا یہ رویہ اس کے شوہر کو دیوانہ بنا دیتا تھا اور یہی وہ چاہتی بھی تھی۔ کیوں؟ شاید وہ خود بھی اچھی طرح نہ جانتی تھی۔

ہاں وہ ضرور اسے دھمکی دے گا کہ اس سے قطع تعلق کر لے گا۔ وہ اسے مارنے کی بھی دھمکی دے گا۔ مگر اسے یقین تھا کہ وہ ان دھمکیوں کو روبۂ عمل نہیں لائے گا۔ وہ کچھ بھی کرے، مگر اسے کبھی نہیں چھوڑے گا اور نہ ہی اس پر ہاتھ اٹھائے گا۔ یونہی ساتھ ساتھ ان کے دن بسر ہوں گے۔ ان میں سے کسی ایک کے مرنے تک، شاید یہی حقیقت تھی جو اس کو پاگل بنا دیتی تھی۔

لوگ سیڑھیاں چڑھتے یا اترتے ہوئے اس کے پاس رک جاتے۔ ان میں سے اکثر کی آنکھوں میں رحم کی جھلک ہوتی۔ کچھ حیرت سے تکتے اور بعض کندھوں کو جھٹکاتے ہوئے اس کے پاس سے گزر جاتے۔ مگر وہ یونہی بیٹھی رہی حرکت کیے بغیر گویا اس نے کسی کو دیکھا ہی نہیں۔ اگر کوئی اس کے پاس سے گزرتا ہوا اسے دھکا دے جاتا، اس کا ہاتھ کچل دیتا، تب بھی شاید وہ یونہی ساکت بیٹھی رہتی بلکہ وہ خود چاہتی تھی کہ کوئی ایسا کرے۔

پھر کسی نے کہا دوپہر ہو رہی ہے، اب اسے اندر چلی ہی جانا چاہیے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخر وہ کیوں جواب دیتی؟ کیا وہ اس لیے وہاں بیٹھی تھی کہ لوگ اسے دیکھیں اور اچھی طرح جان لیں کہ اس نے اس کی زندگی کو کس قدر تلخ بنا رکھا ہے اور اس کے شوہر کو معلوم ہو جائے کہ لوگوں نے اسے بھی دیکھ لیا ہے اور وہ سب کچھ جان چکے ہیں۔ ہاں وہ یہی چاہتی تھی اگر لوگ اسے نصیحت کرتے یا تسلی دیتے تو اس کے جواب میں وہ صرف رونے لگتی۔

جھگڑا سویرے ہی شروع ہوا تھا اور وہ صبح، آٹھ بجے سے وہیں سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی

تھی کوئی طاقت اسے وہاں سے ہٹا نہ سکتی تھی۔ گھڑی نے بارہ بجائے۔ کوئی دم میں وہ آ جائے گا۔ آخر وہ کہے گا کیا؟ شاید جیسے اس نے پچھلی مرتبہ کیا تھا۔ اس پر نظر ڈالے بغیر ہی گزر جائے گا۔ مگر وہ زیادہ دیر تک فلیٹ میں تنہا تو نہیں رہ سکتا تھا۔ پچھلی بار جب ایسی ہی لڑائی ہوئی تھی تو پندرہ منٹ سے زیادہ نہ رہ سکا تھا اور اسے ڈھونڈتا ہوا آ پہنچا تھا۔ آج بھی بے شک یونہی ہوگا۔

وہ انتہائی غصے کی حالت میں گھر سے نکلا تھا۔ دھماکے سے کواڑ بند کرتے ہوئے قسم کھائی تھی ''یہ آخری بار ہے، تم نے سنا، آخری بار، کہ میں اس قسم کے پاگل پن کو برداشت کر رہا ہوں۔'' مگر... اسے دفتر میں بہت سا وقت ملے گا وہ صبح کے واقعات پر پھر غور کرے گا اور اس کا غصہ یقیناً ٹھنڈا پڑ جائے گا۔

صحن کا دروازہ کھلا۔ عورت نے اس کے قدموں کی آہٹ پہچان لی۔ اس کی ایک نس بھی نہ کانپی، گو وہ ہمہ تن گوش بن گئی تھی اور ان مانوس قدموں کی آواز سننے کے لیے اس کے جسم کا ہر عضو دفعتاً ساکت ہو گیا تھا۔ لیکن بظاہر وہ یوں بے حس دکھائی دیتی تھی جیسے اس کے گرد جو کچھ ہو رہا ہے اس کا اسے احساس ہی نہیں۔ قدموں کی چاپ نزدیک آتی گئی۔ وہ کچھ ہی دیر میں اسے دیکھ لے گی تاہم وہ یونہی بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اس کا سر پٹی پر رکھا تھا اور آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ مجسم انتظار بنی ہوئی تھی۔

وہ اس سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا اور گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایسے واقعات کا اس نے پہلے بھی سامنا کیا تھا۔ لیکن ہر دفعہ کوئی نت نئی چیخ لگی رہتی تھی۔

وہ کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے کھڑا رہا۔

وہ ایک معمولی کلرک تھا۔ عمر کوئی پچاس سال کی ہوگی۔ اس کی گھنی گھنی مونچھیں تھیں اور وہ موٹا سا بے ڈول آدمی تھا۔

''تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔ اس کی آواز میں نرمی تھی غصہ نہ تھا۔ عورت نے کوئی جواب نہ دیا وہ کسی خوف سے سہم گیا۔ اسے محسوس ہوا اس کا خون

خشک ہو رہا ہے اور اس کے ہاتھ جو چھتری کو تھامے ہوئے تھے وہ کانپنے لگے۔ اس کے دل میں اپنے آپ پر حقارت کا جذبہ اُمڈ آیا اور ندامت کی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی، مگر اس کے احساسات میں رحم کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ وہ بہت دیر تک وہیں خاموش کھڑا رہا۔ روشنی باہر سے داخل ہو رہی تھی اس لیے اس کے چہرے کے نقوش اچھی طرح دکھائی نہ دیتے تھے۔ صرف ایک پرچھائیں تھی، گوشت پوست کا ایک تودا۔

اس نے پھر نرمی سے پوچھا "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

عورت نے اپنی جذبات سے عاری آنکھیں اٹھائیں اور اس کے آر پار گھورنے لگی۔ ان نگاہوں میں اتنی گرمی تھی کہ اس کے شوہر نے تاب نہ لا کر آنکھیں پھیر لیں اور چھتری اس کے ہاتھوں سے گر پڑی۔

اس نے پھر پوچھا "تم کب سے یہاں بیٹھی ہو؟"

جواب ندارد تف ہے ایسی زندگی پر، اس نے سوچا اور بیزاری سے کندھے جھٹکائے تو۔ تو یہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ سارا دن وہ آفس میں اس گھریلو لڑائی کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ پر ملامت کی تھی۔ مگر اسے پھر بھی امید تھی کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔

"کیا تم نے یہیں بیٹھنے کی ٹھان لی ہے؟"

اس سوال کا بھی کوئی جواب نہ ملا۔ اس کے لہجے سے پتہ چلتا تھا کہ غصہ اس پر قابو پا رہا ہے۔ اس نے احتیاط کرنے کی کوشش کی کیونکہ غصہ اسے بے حد تھکا دیتا تھا۔

"چلی آؤ۔ اوپر چلیں۔ یہ سراسر بے وقوفی ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

لفظ بے وقوفی پر ایک ایسی خشمگیں نگاہ اس پر پڑی کہ وہ کانپ گیا۔ اس نے ایک سرد آہ بھری۔ کیا زندگی تھی یہ بھی! اور یہ سب کچھ کس لیے۔ پھر وہ عورت کی طرف دیکھنے لگا "آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟" یہ سوال یا دوسرا کوئی سوال دونوں برابر تھے کیوں کہ جواب ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔

''بھاڑ میں جائے مجھے کیا؟'' وہ چلایا۔

ابھی دو ایک سیڑھیاں ہی چڑھا تھا کہ وہ گھوم کر پلٹا۔

وہ چونک پڑی!

''اور بچی کہاں ہے؟''

وہ آگے کو جھک گیا۔ اس کی گرم سانس عورت کے بالوں کو چھونے لگی۔ اس نے بچی کی ذرا بھر پروا نہیں کی تھی بچی کو کچھ دیر کے لیے بھول جانا بھی بے شک اس کے انتقام کا ایک حصہ تھا مگر اسے یہ خیال نہ آیا تھا کہ اس بات کا اسے خود اتنا رنج پہنچے گا۔

''کہاں چھوڑ آئی ہو بچی کو؟ سنا تم نے۔'' وہ گرجا

عورت ڈری کہ اب مار پڑے گی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اس نے واقعی اپنی بچی کا خیال نہ رکھا تھا اور اسے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی۔

''جواب نہیں دو گی؟'' اب وہ غصے میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ تیزی سے سیڑھیاں اترتا وہ اس کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا۔ عورت کا سر نیچے جھک گیا۔ اس نے چھتری کو دیوار سے لگا کر رکھا اور ہاتھ بڑھا کر اندھوں کی طرح عورت کے چھپے ہوئے چہرے کو ٹٹولا۔

''کب تک آخر کب تک یونہی اذیت دیتی رہو گی؟'' اس نے دبی آواز میں کہا

''کب تک، اوہ میرے خدا!''

اس کی روح کو ناقابل برداشت تکلیف پہنچ رہی تھی۔ یکایک اسے وہ رات یاد آئی جب وہ گھر سے بھاگ نکلی تھی اور اس نے گھنٹوں اس کی تلاش کی تھی اس خوف سے کہ کہیں وہ دریا میں کود نہ پڑے۔

''بولو، بولو بھی۔'' اس نے عورت کی ٹھوڑی پکڑ کر آہستہ آہستہ اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

اب اسے اس پر ترس آنے لگا۔

''تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟'' عورت کے ہونٹ کانپے۔ وہ اور زیادہ جھک

گیا۔ نہیں معلوم اس کے کانوں نے کیا سنا۔ اس نے پوچھا ''کیا کہا تم نے؟''

''کچھ نہیں۔'' عورت نے جواب دیا اور پھر سب کچھ بدل گیا۔

''کچھ نہیں؟'' وہ چلایا ''واقعی؟ تو پھر، آخر کیوں؟ آخر کیوں؟؟ خدارا مجھے بتلاؤ آخر تم نے یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے، بچی کو کہاں چھوڑ آئی ہو؟''

وہ چیختا ہوا اسے زور زور سے ہلانے لگا۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ خلاف توقع غصہ اس پر بخار کی طرح چڑھ رہا تھا۔

یہ غصہ، یہ طوفان، پھر ندامت، پریشانی، یہ جذبات کا تغیر، یہ تبدیلیاں، رحم و شفقت پھر وحشت، غیض و غضب، یہ سب کچھ کتنا ڈرامائی تھا!

اس کے زور سے ہلانے پر عورت کو چوٹ آئی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی، چلاتی ہوئی... ''تم درندے کہیں کے!''

کہیں اوپر والی منزل سے ایک آواز آئی ''بچی ہمارے پاس ہے گھبرایئے نہیں، ہم اسے دوپہر کا کھانا کھلا دیں گے۔''

اس نے جواب نہ دیا۔ گو یہ سن کر اس کے سر سے ایک بوجھ اتر چکا تھا۔

تو... ہمسائیاں بھی سب کچھ سن چکیں، کتنی شرم کی بات تھی۔

''نہیں سنا آپ نے؟'' اوپر سے پھر آواز آئی۔

اس نے چلا کر کہا ''ہاں بھئی سن لیا۔ شکریہ آپ کی مہربانی۔'' اور غیر ارادی طور پر چھتری اٹھالی۔

''آہ میں تنگ آ گیا ہوں، تنگ آ گیا ہوں۔'' وہ بڑبڑایا۔

اس کی بیوی نے مڑ کر دیکھا۔ اندرونی جذبات اس کے چہرے سے عیاں تھے گو اس کی آنکھیں خشک تھیں اسے بھی یہ سن کر کہ بچی محفوظ ہے، اطمینان ہو گیا تھا۔

''تنگ آ گئے ہو؟ کس بات سے تنگ آ گئے ہو۔'' اس نے میٹھی آواز میں پوچھا۔

اس کا سر مارے درد کے پھٹا جا رہا تھا۔ شاید اب کی دفعہ اس کے شوہر نے بھی خاموش رہنے

کی ٹھان لی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

''ہاں، میں جواب کا انتظار کر رہی ہوں۔''

''بھئی میں ان روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ گیا ہوں۔''

''ہاں، تو ان لڑائیوں کی ذمہ دار میں ہوں؟''

''نہیں تم نہیں، وہ قصائی کا لڑکا۔''

قریب تھا کہ وہ ہنس پڑے، کیوں کہ جواب ہی اس قدر مضحکہ خیز تھا مگر وہ ہنسی نہیں۔

''جس طرح میرے دن بیت رہے ہیں، اس کی تمھیں کیا پروا؟'' عورت نے گلہ کیا۔ وہ بے پروا نہ تھا اس کے برخلاف اس کے لیے یہ بہت اہم بات تھی لیکن پھر بھی۔

عورت نے ایک آہ بھری۔ پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ بھول چکا تھا کہ وہ ابھی تک زینوں ہی پر ہے اور یہ بھی بھول چکا تھا کہ وہ بھوکا ہے۔ قرائن سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی چیز پکائی نہیں گئی ہے۔ اسے جھگڑا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن وہ پھر بھی اس مخمصے میں پھنس گیا۔

اس نے کہنا شروع کیا کہ اسے خود کتنی تکلیف پہنچی ہے۔ دراصل وہ اس سے کتنی محبت کرتا ہے، اس بات کا یقین دلانے کے لیے وہ بے تاب تھا۔

''تم نہیں دیکھتیں کہ یہ سب کیسی بے وقوفی ہے۔ اتنا وقت بے کار ضائع گیا۔ ان جھگڑوں کے بغیر بھی زندگی کی پیچیدگیاں کیا کم ہیں؟ تو پھر کیوں؟ یہ سب آخر کس لیے... بولو....'' اس نے اپنے ہاتھ عورت کے کندھے پر رکھے اور اس کو اپنے قریب کھینچ لیا۔ ''تو، اب یہ کھیل ختم ہو چکا سمجھیں؟''

عورت نے اپنا گال اس کے گال پر رکھ دیا اور رونے لگی۔

''دیکھو نا، اب ختم کرو یہ رونا دھونا۔ اب تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔'' اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ یہ نرم محبت آمیز جملہ گویا عورت کی تمام کوششوں کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ اپنے شوہر کی زبان سے یہ الفاظ سنے۔ اب وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔

"ہنری!" اس نے اپنے شوہر پر محبت بھری نگاہ ڈالی۔ ہنری نے اس کے گال پر ہلکی سی تھپکی دی "آؤ اوپر چلیں۔"

وہ اس کے ساتھ ہولی۔ "بہتر ہوگا اگر ہم بچی کو بھی لے لیں۔"

"نہیں وہ جہاں ہے وہیں اچھی ہے۔"

فلیٹ میں ہر چیز بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھی۔ بچھونا تک برابر نہیں کیا گیا تھا۔ کھڑکیاں بھی بند تھیں، کمرہ میں تاریکی تھی اور ان میں رات کی بو بسی ہوئی تھی۔ ہنری نے اپنی ہیٹ اتاری۔ کچھ دیر یونہی ہاتھوں میں پکڑے سوچتا رہا کہ اسے کہاں رکھا جائے۔ آخر اس نے ہیٹ کو چھتری کے پاس کرسی پر رکھ دیا۔

"ہاں"۔ اس نے عورت کی طرف دیکھ کر کہا جو کمرے کے بیچ میں کھڑی تھی۔

"ہاں کیا؟" اس نے بچے کی طرح منھ بنایا گویا پھر رونا شروع کر دے گی اور پیشانی پونچھنے لگی۔

"یقیناً یہ پھر شروع نہیں ہوگا، تمھارے سر میں درد تو نہیں ہے؟"

"ہاں شدید!" اسے تعجب نہ ہوا۔ اسی نے تو یہ بیماری مول لی تھی۔

"تو اب ہو چکا ختم؟"

"ہاں ختم ہو چکا۔" عورت نے جواب دیا۔ اس کی آواز دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی۔ ہنری نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا، اور آہستہ سے بھینچا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک لفظ بھی زبان سے نکالے۔ کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ اس وقت خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ پھر بھی اس نے باتیں کرنا شروع کیں۔

"تم ایسا کیوں کرتی ہو؟" اس نے نرمی سے پوچھا... "کیوں؟"

"اور تم ہم دو ہیں، ایک نہیں۔ صرف ایک کا تصور ہوتا ہے۔"

مگر اس نے بات کاٹ کر کہا "ہم میں سے کوئی بھی قصوروار نہیں۔"

"یہی تو۔" عورت بولی... "یہی بات ہے کچھ بھی ہو ہمارے دل میں کھوٹ

نہیں ہے۔''

''بالکل نہیں۔'' عورت نے جلدی سے جواب دیا ''تمھیں یاد ہے یہ سب کچھ کس لیے ہوا؟''

''مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔ صرف چند الفاظ تھے اور الفاظ تو کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ میں انھیں قطعی بھول چکا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ جھگڑا کیوں اٹھ کھڑا ہوا؟''

''اب بھول بھی جاؤ۔'' عورت بولی۔

بازوؤں کی گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ ہنری دور ہٹ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک کرسی پر گرا دیا۔ غصہ اس پر پھر چڑھ رہا تھا۔ ''تم عجیب ہو'' وہ چلایا۔ ''کیا تم نے صبح کا اخبار پڑھا ہے؟''

کیا عجیب سوال تھا، جیسے اخبار کا خیال بھی آیا ہو۔

''ہاں سچ ہی تو کہہ رہا ہوں۔''

''میں جانتی ہوں۔''

وہ پھر برس پڑا۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو۔ تو تمھارا ان سیڑھیوں پر بیٹھے رہنے سے کیا مطلب ہے؟ اس طرح روتی بسورتی خدا جانے کس بات پر؟؟؟''

''اوہ خاموش ہو جاؤ خدا کے لیے!''

وہ آپ ہی آپ چپ ہوگیا۔ اس نے صبح کے واقعات سوچتے ہوئے اپنی بیوی کی طرف دیکھا تو اسے محسوس ہوا اسے اپنی بیوی سے نفرت ہے۔ ہاں سچ مچ۔ واقعی اس سے نفرت ہے اور وہ اس قسم کے تریا چلتروں سے سخت بے زار تھا۔

''کچھ پکا بھی ہے، آخر ہم کھائیں گے کیا؟'' اس نے گھڑی جیب سے نکالتے ہوئے پوچھا... ''ساڑھے بارہ ہو چکے ہیں۔''

''انڈے تل لوں گی اور ساگ ترکاری کافی ہے ہاں؟'' وہ باورچی خانے میں

چلی گئی۔

ہنری بستر پر دراز ہو گیا۔ یہ سب کچھ صبح اس نے آخر کیا کہا تھا جو اس کی بیوی کو اتنا برا لگا۔ اس نے دماغ پر بہتیرا زور دیا۔ لیکن بے سود۔ وہ اندر بیٹھی انڈے پھینٹ رہی تھی کہ یکا یک ہنری نے آواز دی۔

"مارسیل!"

"جی!" اس نے ہاتھ روکتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے صبح تم سے کیا کہا تھا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر بولی "کچھ نہیں۔"

"ہاں ہاں، کہونا!"

"اس سے کیا فائدہ؟"

"میں یونہی جاننا چاہتا تھا۔"

"وہ پھر دہرانے کے قابل نہیں۔" وہ ہنوز جواب کا انتظار کرتا رہا۔ وہ کیوں بتانا نہیں چاہتی تھی؟ وہ جاننے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ یہ کس قدر تعجب خیز بات تھی کہ اسے خود یاد نہیں آ رہا تھا۔

"تمھیں یاد نہیں مارسیل، تم مجھے تو بتلاؤ نا۔"

"کیوں بتاؤں؟" ہم پھر سے اس جھگڑے کو شروع تو نہیں کریں گے۔ یہ صریحاً بے وقوفی ہے اسے یقین ہو گیا وہ نہیں بتائے گی۔

"اچھا یونہی سہی۔" وہ گنگنایا... "آخر جاننے سے کیا فائدہ؟... نہ جاننا ہی بہتر ہے۔"

●●●
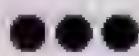
خطوط

مجھ میں فنکار کی انا سہی، لیکن اتنا انکسار تو ضرور ہے کہ یہ محسوس کر سکوں کہ ان کے سامنے ہم کتنے چھوٹے ہیں اور فنکار کے ارتقاء اور تکمیل تک پہنچنے میں ہمیں ابھی کتنے اور مرحلے طے کرنے ہیں۔ میں اپنے بارے میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ پہلے درجے سے گزر کر میں نے دوسرے میں قدم رکھا ہے، اور اپنی ذات میں نارسیسی انہماک پر بڑی حد تک قابو پالیا ہے۔

— ممتاز شیریں

محمد سلیم الرحمٰن کے نام

ایف گپتا میانشن
نزد پلازا، کراچی-3

20 فروری 1963

مکرمی سلام مسنون!

آپ کا خط مل گیا تھا۔ 'میگھ ملہار' کا پیپر بیک ایڈیشن ابھی آیا ہے۔ خاص ایڈیشن ختم ہو گیا۔ جیسے ہی پبلشرز سے مجھے پیپر بیکز کی کاپیاں ملیں، میں نے آپ کو دو کاپیاں بھجوا دی ہیں۔ امید کہ اب تک مل گئی ہوں گی۔ یہ میں نے آپ کے مکتبہ جدید کے پتے پر بھجوائی ہیں۔ اگر یہ کاپیاں 'پاکستان ٹائمز' کو دینی ہیں تو از راہ کرم دے دیجیے گا۔ یا ایک جلد آپ رکھیں اور ایک 'پاکستان ٹائمز' کے دفتر میں پیش کر دیں۔ عنایت ہوگی۔ میں نے آپ کو براہ راست کتاب اس لیے بھیجی ہے کہ شاید پاکستان ٹائمز کے توسط سے پہنچنے میں دیر ہو جائے۔ آپ کے تبصرے کی منتظر رہوں گی۔

میں نے 'دن اور داستان' پر آپ کا تبصرہ پاکستان ٹائمز میں پڑھا تھا۔ پسند آیا تھا۔ خصوصیت سے 'دن' کے بارے میں آپ نے جو باتیں کہی ہیں، وہی مجھے بھی سوجھی تھیں۔ Appreciation بالکل صحیح ہے۔ البتہ 'جل گرجے' کے بارے میں مجھے آپ سے اختلاف ہے۔ داستان کی طرف واپسی کے سلسلے میں انتظار حسین صاحب نے جتنی بھی کوششیں کی ہیں، میں سمجھتی ہوں کہ 'جل گرجے' ان میں سب سے کامیاب کوشش ہے۔ پہلی دفعہ 'جل گرجے' پڑھ کر مجھ پر عجیب اثر ہوا تھا۔ یہ 1957ء کی بات تھی۔ اس زمانے میں غدر (جنگ آزادی) کے بارے میں پڑھنے کا جنوں سا ہو چلا تھا اور میں نے اس موضوع پر بہت کچھ پڑھا تھا، تاریخی اور نیم تاریخی کتابیں، لیکن اس سلسلے میں 'جل گرجے' کی خالص فنی اور تخلیقی کاوش کا تاثر کچھ اور ہی تھا۔ اس افسانے میں تو انتظار حسین نے واقعی جادو جگایا

ہے، پرانی داستان کو اپنے دور سے ملایا ہے اور نئے معنی پیدا کیے ہیں۔

میں نے 'نصرت' کے لیے بھی 'میگھ ملہار' کی ایک جلد بھیجی ہے اس سے پہلے بھی حنیف رامے صاحب کے نام ایک جلد بھیجی تھی اور تبصرے کے لیے انھوں نے غالباً یہ جلد مظفر علی سید صاحب کو بھجوائی ہے۔ مگر کسی وجہ سے مظفر صاحب تبصرہ نہ کر سکیں یا انھیں وقت نہ ملے تو ازراہِ کرم 'نصرت' میں بھی 'میگھ ملہار' پر تبصرہ آپ ہی کر دیجیے گا۔

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

3، گل فشاں

بیلی روڈ، ڈاکہ-2

27 مارچ 1963

مکرمی سلیم الرحمٰن صاحب! آداب

بہت دن ہوئے آپ کا خط آیا تھا کہ میں آپ کے نام 'میگھ ملہار' کی دو جلدیں بھیجوں، آپ اس پر پاکستان ٹائمز میں ریویو کریں گے۔ آپ نے یہ بھی لکھا تھا کہ تبصرہ مارچ کے پہلے ہفتے میں آئے گا۔ اگر 'میگھ ملہار' آپ کو جلد مل جائے... سو میں نے اس وقت 'میگھ ملہار' کی دو جلدیں آپ کے نام مکتبہ جدید کی معرفت بھجوا دی تھیں۔ خط بھی لکھا تھا۔ آپ کی جانب سے رسید کی اطلاع نہیں ملی۔ لیکن کتابیں آپ کو یقیناً مل گئی ہوں گی، چوں کہ رجسٹری سے بھجوائی تھیں۔

ادھر میں ڈھاکہ چلی آئی۔ شاہین کی یہاں عارضی تبدیلی ہوئی تھی۔ سارا مارچ یہیں گزرا، اور اس دوران میں میں 'پاکستان ٹائمز' کے پرچے دیکھتی رہی لیکن تبصرہ نظر سے نہیں گزرا۔ ہوسکتا ہے وہ خاص پرچہ جس میں آپ نے ریویو کیا ہو مجھے نہ ملا ہو۔ اگر تبصرہ

'پاکستان ٹائمز' میں شائع ہوا ہے تو از راہِ کرم اس کا تراشہ بھجوا دیں، ممنون ہوں گی۔ یا تبصرہ ابھی چھپا نہ ہو اور آئندہ کسی پرچے میں آ رہا ہو تو مطلع کریں کہ کس ہفتے شائع ہونے والا ہے۔ یا جب بھی چھپے آپ ہی اس کا تراشہ بھیج سکیں تو بڑی عنایت ہوگی۔

امید آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

8، ایف گپتا میانشن

نزد پلازا، کراچی-3

9 مئی 1963

مکرمی سلیم الرحمٰن صاحب! سلام مسنون

ابھی چند دن ہوئے ہم کراچی واپس آ گئے ہیں۔ یہاں آن کر میں نے دریافت کیا کہ آپ کے نام عید سے پہلے (یعنی عید الفطر) بھیجی گئی کتابیں کیوں نہیں ملیں؟ میں ڈھاکہ جانے سے پہلے اپنے ہاتھ سے inscribe کر کے آپ کے نام دو جلدیں، ایک ذاتی آپ کے لیے اور ایک پاکستان ٹائمز کے لیے، پیک کروا کر اور اڈریس بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر ٹائمز اینڈ ٹائمز (ہماری کتابوں کی دوکان) میں چھوڑ گئی تھی کہ رجسٹری کروا دیں۔ ساتھ ہی حنیف رامے صاحب کے نام بھی ایک جلد الگ تھی۔ یہ تینوں پیکٹ مکتبہ جدید کے پتے پر تھے۔ اس کے علاوہ میری کتاب کے دو تین اور پیکٹ تھے جو میسور اور بنگلور بھیجنے کے لیے ان کے سپرد کیے تھے۔ اور آپ سے اور دوسروں سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی کو کتابیں بھیجی نہیں گئیں ہیں۔

اب آ کر میں نے رسیدیں دیکھیں تو معلوم ہوا کہ یہ سارے پیکٹ جو فروری میں سپرد کیے گئے تھے انھوں نے 16 اپریل کو بھجوائے ہیں۔ کتابیں کہیں رکھ کے بھول گئے تھے

اور جب میں نے ڈھاکے سے انھیں دوردار خط لکھا کہ آخر کیا بات ہے کسی کو کتابیں نہیں ملیں تو اس وقت ڈھونڈ ڈھانڈ کر پیکٹ رجسٹر کروائے گئے۔

بہر حال اتنی تاخیر سے ہی سہی آپ کو جلدیں اپریل کے وسط تک مل گئی ہوں گی۔ (اور غالباً حنیف رامے کو بھی ان کے نام بھیجی گئی کتاب مل گئی ہوگی۔ آپ از راہِ کرم انھیں بھی بتا دیں کہ کتاب کیسے دیر سے پہنچی) ان میں سے ایک جلد آپ پاکستان ٹائمز کو دے دیں اور ایک آپ رکھیں۔ آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔ ہم نے پاکستان ٹائمز کے پچھلے شماروں میں آپ کے وہ تبصرے دیکھے جن کے بارے میں آپ نے لکھا تھا کہ عرصے سے روک لیے گئے تھے۔

جس پور چکیز ناول (غالباً پور چکیز ہی تھا، میں بھول رہی ہوں اور آپ کا خط کہیں کھو گیا ہے) کا آپ نے ذکر کیا تھا، وہ میری نظر سے نہیں گزری۔ یہاں بک اسٹالوں پر بھی نہیں دیکھا۔

امید آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

8، ایف گپتا میشن

نزد پلازا، کراچی 3

6 جون 1963

مکرمی سلیم الرحمٰن صاحب! آداب

آپ کا خط اور ریویو کا تراشہ مل گیا تھا۔ بہت ممنون ہوں۔ جواب میں تاخیر ہوئی کہ ہم پنڈی جانے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ ہماری تبدیلی پنڈی ہو گئی ہے۔ شاہین چلے بھی گئے۔ میں کچھ دیر اور یہاں ہوں۔

آپ کا تبصرہ مجھے پسند آیا۔ خصوصیت سے 'کفارہ' کی آپ نے بڑی اچھی تحویل کی ہے۔ البتہ وہ Poetic Passages جن کا آپ نے ذکر کیا ہے، میرے اپنے نہیں ہیں بلکہ 'اینگ کور' کے اصل Inscriptions ہیں۔ ترجمہ در ترجمہ در ترجمہ ہوتے ہوتے ان کا یہ حال ہو گیا۔ یعنی اصل کھموج زبان سے ان کا ترجمہ فرانسیسی میں ہوا، پھر اس سے انگریزی میں اور 'کفارہ' میں انگریزی سے اردو میں۔ ویسے یہ اور اینگ کور کی دوسری کنندہ تحریریں بڑی پر معنی اور حسین ہیں۔ اگر آپ یہ اصل افسانہ، جو میں نے انگریزی میں لکھا تھا، پڑھتے تو آپ کو اندازہ ہو جاتا کہ یہ passages اینگ کور کے اصل Inscriptions ہیں، اور 'کفارہ' میں دو ایک جگہ T. S. Eliot کے اصل اشعار بھی نقل کیے گے ہیں۔ اصل انگریزی افسانے میں یہ افسانے کے جسم میں یوں گھل گئے ہیں کہ الگ نہیں معلوم ہوتے۔ ویسے اس سارے افسانے ہی کو اہل ذوق نے Sheer Poetic Creation اور Prosepoem کہا ہے۔

'کفارہ' چوں کہ اردو ترجمہ ہے اس میں غالباً وہ بات نہیں آنے پائی۔ اصل افسانہ 'The Attonement' اب حال ہی میں 'Scintilla' کے سالنامے میں شائع ہوا ہے۔ یہ پرچہ میں حنیف رامے صاحب کو بھیجنے والی ہوں چوں کہ اس کا تعلق لٹریچر سے زیادہ مصوری سے ہے۔ آپ ضرور ان سے یہ پرچہ لے کر 'The Attonement' پڑھیے گا۔

آپ نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ 'میگھ ملہار' میں میرے فن کی سب سے نمائندہ، بہترین اور اصلی تخلیق 'کفارہ' ہی ہے۔ 'کفارہ'، 'میگھ ملہار' کی طرح صرف ادبی تجربہ نہیں ہے، بلکہ ایک سچا تجربہ ہے۔ ایک روح کا تجربہ۔ ویسے 'میگھ ملہار' بھی میں نے Calculatingly اور Cold Bloodedly نہیں لکھا۔ میں نے اسے بھی ایک کیف اور سرشاری میں ڈوب کر لکھا تھا۔ البتہ اس افسانے میں آگے چل کر، جیسا کہ آپ نے لکھا ہے، Learning اور Creativity میں توازن قائم کرنا مشکل ہو گیا۔ 'دیپک راگ' بھی میں نے اس احساس کے ساتھ نہیں لکھا کہ مجھے 'شر' پر لکھنا چاہیے۔ یہ افسانہ تقسیم

سے چند مہینے پہلے لکھا گیا تھا، جب میں اکیس بائیس سال کی تھی، اس وقت شر کا کوئی واضح تصور میرے ذہن میں نہیں تھا۔ یہ احساس تو بہت بعد میں ہوا تھا کہ شر کے گہرے تصور کے بغیر کوئی گہرا ادب پیدا نہیں ہوسکتا، جب منٹو پر کام کرنے لگی تھی اور اس سلسلے میں بہت سی کتابیں اور تنقیدی مضامین پڑھے تھے۔ اور وہ بات کہ میں شر کو چھوتے ہوئے ڈرتی تھی۔ ہمارے فرانسیسی دوست نے بنکاک میں 1960 میں کہی تھی! لہٰذا ان سب باتوں کا اثر تو اس وقت تھا ہی نہیں جب میں نے 'دیپک راگ' لکھا تھا۔ یہ سب باتیں مجھے اس وقت سوجھتی ہیں جب میں اپنے افسانوں کا جائزہ لینے بیٹھتی ہوں۔ افسانہ لکھتے وقت شعوری طور پر میں سب کچھ پلان کر کے نہیں لکھتی۔

نادم ہونے کی بھی آپ نے ایک ہی کہی۔ جب آپ نے یہ سب کچھ سچائی سے محسوس کر کے لکھا ہے تو اس میں نادم ہونے کی کیا بات ہے؟ ویسے میں ان زود حس قسم کے ادیبوں میں سے نہیں ہوں جو ذرا سی بھی تنقید کا برا مان جاتے ہیں۔ جب میں خود ہی نقاد ہوں تو اپنی تحریروں پر دوسروں کی تنقید کو بھی برداشت کرسکتی ہوں۔

'اجنبی' کا یا کسی اور کتاب کا ترجمہ میں نہیں کر رہی۔ جن دنوں میں 'اجنبی' کا ترجمہ کر رہی تھی مجھے یہ معلوم ہوا کہ ایک اور مکتبے والے کسی اور صاحب سے اس کا ترجمہ پہلے ہی کرا چکے ہیں۔

امید آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

مکرر: آپ سے ایک درخواست کرنی تھی۔ 'فنون' کے لیے احمد ندیم قاسمی صاحب کو میں نے پیاسترناک پر ایک مضمون بھیجا ہے۔ یہ مضمون جو پیاسترناک پر کتابچے کا ایک حصہ ہے انگریزی میں ہے۔ ندیم صاحب نے لکھا ہے کہ وہاں کون اچھا ترجمہ کرسکیں گے۔ میں نے آپ کا نام تجویز کیا کہ آپ کا انگریزی Expression

بھی بہت اچھا ہے اور آپ ترجمہ بھی بہت اچھا کرتے ہیں۔ ویسے یہ زیادتی ہے کہ میں آپ کو اپنے مضمون کے ترجمے کے لیے کہوں۔ لیکن اگر فرصت ہو تو ازراہ کرم ادھر توجہ فرمایئے گا۔ ویسے اب میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ انگریزی میں نہیں لکھوں گی۔

8، الف گپتا میانشن
نزد پلازا، کراچی-3

6 اگست 1963

مکرمی سلیم الرحمٰن صاحب! آداب

کل ہی مجھے 'فنون' ملا۔ اس میں آپ کا ترجمہ پڑھا۔ ترجمہ واقعی بہت اچھا ہوا ہے۔ بالکل ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔ پاسترناک والے مضمون میں کافی مشکل الفاظ اور Expression تھے، جنھیں آپ نے بڑی سلاست سے اردو میں منتقل کر دیا ہے۔

اس ترجمے کے لیے میں ذاتی طور پر آپ کی ممنون ہوں۔ جب میں نے آپ سے گزارش کی تھی، تو مجھے پوری امید نہ تھی کہ آپ ترجمہ کرنا قبول کریں گے۔

میں نے محمد سلیم الرحمٰن اور سلیم الرحمٰن دو نام دیکھے ہیں، اور دونوں شاعر ہیں۔ اس سے بڑا Confusion ہوتا ہے۔ میں پہلے یہ سمجھتی رہی تھی کہ یہ آپ ہی ہیں اور کبھی کبھی اپنے نام کے آگے سے محمد نکال دیتے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ اسی نام کے دو آدمی ہیں۔

آپ کی عنایت کے لیے مکرر شکریہ۔

اور آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز کیش
ممتاز شیریں

8، ایف گپتا مینشن
نزد پلازا، کراچی-3

7 ستمبر 1963

مکرمی سلیم الرحمٰن صاحب! آداب

آپ کا خط مل گیا تھا، شکریہ۔

کاش مجھے پہلے ہی علم ہوتا کہ آپ ترجمہ کریں گے۔ ترجمے کے سلسلے میں میرا پیاسٹرناک والا آدھا کتابچہ گم ہو گیا۔ میں پیاسٹرناک کے مطالعے کے مختلف حصے 'سویرا' یا 'نصرت' کو بھیجنا چاہتی تھی، لیکن ان دنوں مجھے علم نہ تھا کہ اس کا ترجمہ کون کرے گا۔ میں نے بنکاک سے حنیف رامے صاحب کو اس سلسلے میں خط بھی لکھا تھا۔ چوں کہ ان سے کوئی جواب نہیں ملا، میں نے سوچا شاید ترجمے کے سلسلے میں دقت ہو۔ پاکستان واپس آئی تو ایک مدیر صاحب مجھ سے یہ کہہ کر مضامین لے گئے کہ وہ ان کا ترجمہ کرا کے Series میں اپنے رسالے میں شائع کریں گے۔ یہ مضامین ٹائپ نہیں ہوئے تھے اور میری تحریر میں تھے، اس پر مستزاد انھیں میں نے فیر تک نہیں کیا تھا، یونہی فسٹ ڈرافٹ کر کے دے دیے تھے۔ یہ میں نے سخت غلطی کی۔ اب انھوں نے مضامین مختلف لوگوں کو ترجمے کے لیے دیے۔ لیکن نہ وہ مضامین ہی چھپے نہ مجھے واپس کیے گئے۔ عرصے بعد پتہ چلا کہ مضامین کھو گئے ہیں۔

اس طرح پیاسٹرناک پر سارا کتابچہ ہی بیکار گیا۔ اور اب دوبارہ لکھنے کی ہمت نہیں! بس یہ ایک حصہ میرے پاس رہ گیا تھا جسے ٹائپ کروا لیا تھا۔ خصوصیت سے ایک Chapter کھو جانے کا مجھے بہت ہی افسوس ہے، جو ڈاکٹر ژواگو کی ہیروئن لاریسا سے متعلق تھا۔ بیس صفحات کا مضمون تھا۔

'Larissa as mary magdalene or the feminine principle'۔ فسٹ ڈرافٹ کسی کے حوالے کرنے کی غلطی جو کی تھی اس کا یہ خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اب اس کا اور بھی زیادہ افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے chapter ٹائپ کروا لیے

ہوتے تو ایک ایک کر کے ان کا ترجمہ کرنے پر شاید آپ رضامند ہو جاتے۔

Scintilla کا سالنامہ جس میں میرا افسانہ 'The Atonement' شامل ہے، عرصہ ہوا، حنیف رامے صاحب کو بھجوا چکی ہوں۔ آپ ان سے لے کر پڑھ لیں۔ Pasternak والا یہ مضمون بھی اسی رسالے کے تازہ پرچے میں شائع ہوا ہے لیکن اس میں سے انھوں نے نوبل پرائز Controversy والا حصہ کاٹ دیا ہے۔

میں پندرہ کو پنڈی جا رہی ہوں۔ شاہین کی وہاں تبدیلی ہوگئی ہے اور وہ کوئی چار ماہ سے وہیں ہیں لہٰذا اس خط کا جواب جلد دیجیے گا، تا کہ مجھے پنڈی جانے سے پہلے یہیں مل جائے۔

امید آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

چند حواشی

☆ ٹھیک یاد نہیں کہ کس پرتگالی ناول کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اغلب یہی ہے کہ برازیل کے یوکلی دیس واکن کے ناول 'Os Sertoes' کا پتہ کیا ہوگا۔

☆ 'اجنبی' کا ترجمہ اگر ممتاز شیریں کرتیں تو خوب ہوتا۔ جیسا کہ خط سے ظاہر ہے یہ معلوم ہونے پر کہ کوئی اور صاحب (غالباً جناب بشیر چشتی) ناول کا پہلے ہی ترجمہ کر چکے ہیں۔ انھوں نے اپنا کام ادھورا چھوڑ دیا۔ نامکمل ترجمے کا مسودہ شاید ان کے کاغذات میں موجود ہو۔

پتہ نہیں کون ستم ظریف مدیر تھے جنھوں نے پاسترناک پر کتابچے کے ساتھ یہ ظالمانہ سلوک کیا۔

(م۔س)

محمود ایاز کے نام

8 ایف گپتا میانشن
نزد پلازا اسنیما، کراچی-3

5 جنوری 1963

بھائی ایاز! آداب

نیا سال اور نئی زندگی مبارک۔

خدا کرے آپ کی ازدواجی زندگی طویل، خوشگوار اور کامیاب ہو۔

میں آپ کو اس سے پہلے خط نہ لکھ سکی۔ پچھلا مہینہ خاصا Hectic رہا۔ بچوں کے ہائیر سینئر کیمبرج کے امتحانات ختم ہی ہوئے تھے کہ شاہین کی ڈھاکہ تبدیلی ہو گئی۔ ان کے جانے کی تیاریاں شروع ہوئیں، پھر ان کے جانے کے بعد بچوں کے لاہور بھیجنے کی باری آئی۔ اب تین چار دن ہوئے پرویز، گلریز ایف سی اور گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لینے کے لیے لاہور جا چکے ہیں، اور شاہین کو ڈھاکہ گئے کوئی تین ہفتے ہو گئے۔ میں یہاں اکیلی رہ گئی ہوں۔ تبدیلی عارضی ہے لہٰذا ہم نے گھر shift کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں یہیں رہوں گی۔ البتہ دو تین ہفتہ وہاں جا کر مشرقی پاکستان کی سیر کر آؤں گی۔

صادق بھائی نے بھی لکھا ہے کہ وہ بھی آپ کی شادی میں شریک نہ ہو سکے جس کا انھیں افسوس ہے۔ ہاں ایک بات... میں صادق بھائی کو اپنی کتاب 'میگھ ملہار' نہیں بھیج سکی، حالاں کہ کتاب ان کے نام معنون کی ہے۔ بات یہ ہوئی کہ پبلشرز نے مجھے چند ہی کاپیاں دی تھیں، جو چند رسالوں کو ریویو کے لیے بھجوا دیں۔ اب ناشر کہتے ہیں کہ مزید کاپیاں وہ پیپر بیک میں دیں گے، اور پیپر بیک ایڈیشن شائع ہونے میں ابھی دیر ہے۔ لہٰذا بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ اپنی جلد صادق بھائی کو عاریتاً دے سکیں یا کم از کم انھیں کتاب ہی بتا دیں۔ میں نے انھیں لکھا تھا کہ کتاب ان کے نام معنون ہے۔

لیکن اس پر تبصرہ لکھنے کے بعد آپ انھیں 'میگھ ملہار' عاریتاً عنایت کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کتاب ان کے پاس چلی جائے اور ان کے پاس سے کہیں اور Circulate ہوتی رہے اور آپ کو واپس دیر سے ملے یوں بھی تبصرہ اسی نمبر میں ہو جانا چاہیے۔ ایک تو آپ کا یہ نمبر بہت اچھا ہے۔ (بیدی کی تین کہانیاں!) دوسرے زیر ترتیب نمبر کے آنے تک تو بہت دیر ہو جائے گی، اور یہ خاص نمبر تو اب تیار ہی ہے۔ اس میں تبصرہ کی گنجائش نکل سکتی ہے، اگر آپ تبصرہ لکھ کر غلام حسین کے ہاتھ بھجوا دیں۔ میں جانتی ہوں یہ زیادتی ہے۔ آپ ہنی مون منا رہے ہیں اور ایسے میں میں آپ کو تبصرہ لکھنے کا 'خشک' اور غیر دلچسپ کام سپرد کر رہی ہوں۔

خط کے جواب کا انتظار رہے گا۔ جواب فوراً دیجیے گا۔ کیوں کہ میں ہفتہ عشرہ میں غالباً ڈھاکہ چلی جاؤں گی۔

غلام احمد اور غلام حسین کب واپس آ رہے ہیں؟ والد صاحب کی خدمت میں آداب۔ فقط

مخلص

ممتاز شیریں

3، گل فشاں

بیلی روڈ، ڈھاکہ-2

بھائی ایاز صاحب! آداب

عرصہ ہوا آپ سے کوئی خط نہیں آیا، اور نہ 'سوغات' کی کوئی خبر ملی۔ یہاں تو لوگ یہی کہنے لگے ہیں کہ 'سوغات' بند ہو گیا۔ خدا نہ کرے کہ بند ہو۔

ادھر ہم یہاں مشرقی پاکستان آ گئے۔ شاہین کی یہاں عارضی تبدیلی ہوئی تھی ڈھاکہ میں کوئی چار ماہ سے ہیں، اب ہفتہ عشرہ میں ہم انشاء اللہ کراچی جائیں گے یا شاید

پنڈی۔ لہٰذا اس خط کا جواب کراچی کے پتے پر دیں۔ لیکن جواب ضرور بضرور دیں۔

'سوغات' کا خاص نمبر کب تک نکل آئے گا؟ کیا اس میں کامو کے دو ناولٹوں کے ترجمے شریک ہیں؟ 'The Fall' اور 'Out Sider' کے ترجمے، محمد عمر میمن صاحب کہہ رہے تھے کہ انھوں نے 'سوغات' کے لیے بھیجے ہیں۔ ان میں صرف 'The Fall' کا ترجمہ 'سوغات' میں شامل ہوگا یا دونوں؟ میرے لیے یہ جاننا ضروری ہے۔ ازراہِ کرم ضرور مطلع کیجیے گا۔

آپ نے ازراہِ عنایت وعدہ فرمایا تھا کہ 'سوغات' کے اس خاص نمبر میں 'میگھ ملہار' پر تفصیلی مضمون لکھیں گے۔ آج کل یہ کتاب خوب Controversial ہو رہی ہے۔ مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ مظفر علی سید کے اس مضمون کے علاوہ ڈاکٹر احسن فاروقی نے 'سات رنگ' کے سالنامے کے لیے بہت تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ 'نیا دور' میں سلیم احمد ایک طویل مضمون لکھ رہے ہیں۔ آدم جی پرائز کے لیے یہ کتاب Runner Up رہی۔ اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ بہترین افسانے کا انعام 'کفارہ' کو ملا۔ اس اعزاز میں آپ بھی شریک ہیں، کیوں کہ 'کفارہ' کی پیش کش کے ذمے دار آپ ہیں۔ اس افسانے کو آپ نے جس طرح سمجھا ہے اور جن موزوں الفاظ میں اس کی شرح وبسط کی ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ یوں تو اہلِ ذوق میں سے جس کسی نے بھی اس افسانے کو پڑھا Ecstasy کا اظہار کیا۔

'نصرت' میں مظفر علی سید صاحب کے مضمون کا تراشہ بھیج رہی ہوں۔ یوں مضمون زوردار لکھا ہے لیکن 'کفارہ' کو وہ سمجھ نہیں پائے ہیں۔ اب 'کفارہ' کا Vindication آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ 'سوغات' کے اسی پرچے میں مضمون لکھیے (ورنہ بہت دیر ہو جائے گی) اور اس طرح کا مضمون کہ 'حرفِ آخر' ثابت ہو۔

آپ کے پریس کا کیا حال ہے؟

والد صاحب کیسے ہیں؟ ان کی خدمت میں میرا آداب اور مریم زمانی صاحبہ کو سلام

پہنچادیں۔ شاہین سلام کہتے ہیں۔ امید آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

---

8 الیف، گپتا میانشن

نزد پلازا، کراچی-3

9 مئی 1963

بھائی ایاز! آداب

چند دن ہوئے ہم کراچی واپس آ گئے ہیں۔ آپ کا عنایت نامہ ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ کی شکایت بجا ہے کہ میں نے 'سوغات' کے خاص نمبر کے لیے کچھ نہیں بھیجا تھا۔ لیکن یہ شکایت مجھ سے سب رسالوں کے مدیروں کو ہے۔ بہت سوں نے مجھ سے یہ گلہ کیا تھا کہ میں نے 'سوغات' کو بیک وقت دو اہم چیزیں دے دی تھیں اور ان کی جانب التفات نہیں کیا تھا۔

یقین جانیے میں نے 'سوغات' کے اس پرچہ کے لیے بورژس کا ایک اور افسانہ جو مجھے 'زخم کا ہلال' سے زیادہ پسند تھا، ترجمہ کرنا چاہا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ 'Encounter' کا وہ پرچہ ہم ایک دوست سے مانگ لائے تھے۔ انھیں ضرورت ہوئی تو پرچہ انھوں نے واپس مانگ لیا۔ دوسرا یہ کہ مجھے غلام حسین کی باتوں سے اور ثناء اللہ (نیا دور) کے کہنے سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ 'سوغات' کے خاص نمبر کی کتابت عرصہ ہوا، مکمل ہو چکی ہے اور اب اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ آپ کا اشتہار بھی 'نقوش' میں پہلے دیکھا تھا کہ پرچہ تیار ہے۔ اور پھر ہم ڈھاکہ چلے گئے۔

اگر اب بھی گنجائش ہو، تو ایک چیز بھیج رہی ہوں۔ ایک مختصر سا انگریزی مضمون جو مجھ سے پطرس بخاری نے لکھوایا تھا، وہ ایک کتاب مرتب کر رہے تھے جس کے لیے انھوں

نے دنیا بھر کے فلسفیوں، سائنس دانوں اور ادیبوں وغیرہ سے اس قسم کے تاثرات طلب کیے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجھے بھی لکھا تھا۔ پھر نہیں معلوم اس کتاب کا کیا ہوا شاید کتاب مرتب ہونے سے پہلے ہی پطرس بخاری صاحب وفات پا گئے۔

میں جانتی ہوں کہ آپ بے حد مصروف ہیں، لیکن مضمون چھوٹا سا ہے۔ اگر مریم زمانی ایاز ترجمے کے لیے تھوڑا سا وقت نکال سکتی ہوں، تو پھر ان کے سپرد کر دیجیے۔ اونا مونو کی کہانی کا ترجمہ انھوں نے بہت اچھا کیا تھا۔

ہم بے ٹھکانہ ہو کر رہ گئے ہیں ابھی ڈھاکہ سے واپس آئے اور اب پنڈی پوسٹنگ ہوگئی ہے۔ بہر حال کراچی ہی میں رہوں گی۔ آپ جواب اسی پتے پر دیں۔

'میگھ ملہار' پر آنے والے تبصرے کے لیے، بہت ممنون ہوں۔ میرے افسانوں کے بارے میں آپ کی رائے سے مجھے پورا اتفاق ہے کہ یا تو پہلے تین افسانے (انگڑائی، آئینہ، گھنیری بدلیوں میں) دل کو لگتے ہیں یا پھر 'کفارہ'۔ یہ اس لیے کہ یہی افسانے دل سے نکلے بھی ہیں۔

والد صاحب کی خدمت میں تسلیمات، مریم ایاز کو سلام شوق۔ شاہین آپ کو سلام کہتے ہیں۔ امید آپ بخیر ہوں گے۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

---

8 ایف، گپتا میانشن

نزد پلازا، کراچی-3

28 اگست 1963

ایاز بھائی! آداب

کل باشو بھائی یہاں پہنچے۔ ان سے آپ لوگوں کی خیریت معلوم ہوئی، اور یہ سن کر

خاص طور پر اطمینان ہوا کہ آپ کے والد صاحب بہت خوش ہیں۔

آپ کا خط بہت دن ہوئے ملا تھا۔ یہ اطلاع پہلے ہی مل گئی تھی کہ آپ نے 'سوغات' کے خاص نمبر کے لیے 'میگھ ملہار' پر تفصیلی ریویو کیا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔

میں ان دنوں کافی پریشانی اور مصروفیتوں میں گھری رہی۔ باشو بھائی میسور ہو آئے ہیں۔ ان سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ ہمارے والد محترم کا انتقال ہو گیا۔ ادھر شاہین کی پنڈی تبدیلی ہو گئی۔ اور وہ مئی میں چلے گئے۔ ابھی ایک مہینہ ہوا پرویز اور گلریز چھٹیوں میں یہاں آئے ہیں۔ پندرہ دن بعد وہ بھی چلے جائیں گے۔ اس کے بعد شاید میں بھی پنڈی چلی جاؤں۔

گلریز کو باہر بھیجنے کے سلسلے میں بھاگ دوڑ لگ رہی۔ اب وہ 11 ستمبر کو لندن جا رہے ہیں۔ یوں جب میں اکیلی تھی اس دوران میں کافی چیزیں لکھنے کا موقع ملا، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں کہ 'سوغات' کے لیے بھیج سکوں۔ دیباچے ہی دیباچے ہیں۔ ایک 'اپنی نگریا' کے نئے ایڈیشن کا دیباچہ، دوسرے میرے انگریزی collection کا دیباچہ اور تیسرے ایک collection کا دیباچہ جو میں نے ابھی مرتب کی ہے۔ یہ انتخاب فسادات اور ہجرت سے متعلق تحریروں کا ہے۔ اس کے علاوہ بس 'ادب لطیف' کے جوبلی نمبر کے لیے ایک سوالنامے کے جوابات لکھے۔

اب میں منٹو پر لگی ہوئی ہوں۔

سنا ہے بیدی بنگلور آئے تھے؟

والد صاحب کی خدمت میں آداب، مریم زمانی کو سلام مسنون۔

مخلص

ممتاز شیریں

نومبر 1961

نوٹ: فرمے کا آخری صفحہ یعنی سوالوں کا صفحہ کاتب کے پاس رہ گیا ہے۔ لہٰذا مسودے کے آخری ڈیڑھ صفحہ کی تصحیح نہ ہو سکی۔ کتابت کی تصحیح کے بعد ازراہِ کرم یہ مکمل افسانہ [1] آپ مجھے پھر بھجوائیں تا کہ اس کے 'رگِ ساز' میں شامل ہونے سے پہلے میں ایک نظر اور غور سے دیکھ لوں۔

ترجمہ واقعی بہت اچھا ہوا ہے۔۔ بہت بہت شکریہ۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

1. 'کفارہ' مرحومہ کی خواہش پر اس کا انگریزی سے ترجمہ میں نے [محمود ایاز] کیا تھا اور یہ افسانہ پہلی بار 'سوغات' میں (دسمبر 1961ء) شائع ہوا، اور 'میگھ ملہار' میں شامل ہے، کتابت کے بعد کاپیاں تصحیح کے لیے ممتاز شیریں کو بھجوائی گئی تھیں۔ یہ نوٹ تصحیح شدہ کاپیوں کے ساتھ آیا تھا۔

اختر انصاری دہلوی کے نام

29 اکتوبر 1946

مکرمی! تسلیم

بہت دنوں سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ چند دنوں پہلے شاہین کے والد محترم کا انتقال ہو گیا۔ اناللہ، وہ ابھی تک سنبھل نہیں سکے ہیں اور بہت دنوں تک 'نیا دور' کا کام بھی نہ دیکھ سکے۔ اسی لیے نمبر 9 کے نکلنے میں تاخیر ہو گئی۔ اس کے علاوہ یہاں بھی فسادات شروع ہو گئے تھے اور خصوصاً چھاؤنی میں جہاں نیا دور کی کتابت طباعت ہوتی ہے، آگ بڑے زور سے بھڑکی تھی۔ اس لیے کچھ دنوں تک 'نیا دور' کا کام

بالکل رک گیا۔ گو صرف آخری فارم باقی تھا۔

آپ کے افسانے یا مضمون کے لیے 'نیا دور' کی آنکھیں فرش راہ بنی رہیں۔ نہ جانے کیوں آپ آج کل بالکل نہیں لکھ رہے ہیں... اب ہماری ایک تجویز ہے۔ ہم نمبر 10، ایک خاص نمبر کے طور پر نکال رہے ہیں۔ یہ بنگالی افسانہ نمبر ہوگا۔ اس میں دور جدید کے نمائندہ بنگالی افسانہ نگاروں کے بہت اچھے افسانوں کا انتخاب شائع ہوگا۔ انتخاب ہم نے کیا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ ان کے ترجمے بھی مشہور اہل قلم سے کرائیں (یہ انگریزی میں ترجمہ شدہ افسانے ہیں)۔ اب آپ سے بھی درخواست ہے کہ ان میں سے ایک کا ترجمہ عنایت کریں... افسانہ نہیں۔ مضمون نہیں، ترجمہ ہی سہی۔ آخر آپ کی کوئی چیز تو 'نیا دور' میں شائع ہو۔

ترجمہ کرنا آپ کو منظور ہو تو افسانہ آپ کی خدمت میں جلد ہی بھیج دیا جائے گا۔ بہت سے ادیبوں نے ہمارے اس اقدام کو پسند کیا ہے۔ بنگالی ادیبوں نے بھی مبارک باد دی ہے اور اپنے اجازت نامے اور فوٹو بھجوائے ہیں۔

بنگالی نمبر کے مسودے قریب قریب تیار ہیں۔ دس بارہ ترجمے موصول ہو چکے ہیں۔ اب صرف آپ ہی کی اعانت کا انتظار ہے۔ آپ کا ترجمہ آجائے تو کام شروع ہو جائے گا۔ یا آپ صرف یہ لکھ دیں کہ آپ کو منظور ہے تو ہم اس افسانے کو جسے ہم آپ کو بھیجنا چاہتے ہیں، ترتیب میں شامل کر کے پہلے افسانے کتابت کے لیے دے دیں گے۔ پھر آپ ترجمہ 20-15 دن میں بھی بھیج سکیں تو مضائقہ نہیں۔

ہمیں امید ہے آپ ضرور اس درخواست کو قبول کریں گے۔ ہمیں اب تک آپ سے یہ پوچھنے میں جھجک اس لیے تھی کہ آپ نے پہلے کبھی ترجمہ نہیں کیا ہے۔ نہ جانے آپ یہ کام پسند کریں بھی یا نہیں! لیکن اب ہمیں یقین ہو گیا کہ آپ ضرور ہمارے اس venture میں مدد دیں گے۔

سید احتشام حسین، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی، شبلی بی کام، سید محمد اختر وغیرہ

نے ترجمے کے کام میں ہماری اعانت کی ہے۔

شاہین بہت بہت سلام کہتے اور یاد کرتے ہیں۔ جب سے ان کے والد کا انتقال ہوا ہے وہ پریشان ہیں۔ میں ہی 'نیا دور' کی خط و کتابت وغیرہ کا سارا کام دیکھ رہی ہوں۔ اور وہ بہت مصروف بھی ہیں۔ کیوں کہ امسال وہ ایم اے کا امتحان دے رہے ہیں۔

آپ کے خط کا بہت انتظار رہے گا۔

نیاز مند

ممتاز شیریں

ضمیر الدین احمد کے نام

29 جولائی 1953

مکرمی ضمیر احمد صاحب! آداب

میرے نام آپ کا خط، شاہین کے نام خط، افسانہ اور طنز سب کچھ مل گئے تھے اور رسید کی اطلاع میں تاخیر کے لیے معافی چاہتی ہوں۔ شاہین نے کہا تھا کہ اب کے وہ آپ کو لکھیں گے۔ لیکن وہ آپ کے بھائی کا انتظار کرتے رہے کہ ملنے پر آپ کو لکھیں، لیکن اب تک ان کی آپ کے بھائی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کہہ رہے تھے کہ یہ اطلاع آپ کو دے دوں۔

کچھ دن ہوئے ہم نے سنا کہ آپ خود یہاں آ رہے ہیں۔ غالباً اگست کے پہلے ہفتے میں۔ خط نہ لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب تو ساری باتیں زبانی ہی ہوں گی۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ آپ کو کم از کم افسانوں کی رسید کی اطلاع تو دینی چاہیے تھی۔

ساقی کا ضخیم افسانہ نمبر جس میں آپ کا افسانہ حکیم مجتبیٰ حسین شائع ہوا ہے بک پوسٹ سے ارسال تھا۔ مل گیا ہوگا۔

آپ کا افسانہ 'رگِ سنگ' بہت پسند آیا۔ تکنیک کے لحاظ سے اور ایک خاص کیفیت طاری کرنے میں، یہ افسانہ اتنا ہی کامیاب ہے جتنا 'بادوباراں' بلکہ میرے خیال میں تو یہ 'بادوباراں' سے زیادہ گہرا افسانہ ہے اور اس میں تہہ داری کے کئی پہلو نکلتے ہیں۔ جب میں نے اس پر غور کیا کہ اس میں وہ کون خاص بات ہے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے کہ آپ نے اس افسانے میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، تو یکے بعد دیگرے کئی باتیں نکل آئیں۔

اختر میں عورت کے روپ کا ایک اور Variation ہے جو نفیس اور قیصر سے مختلف ہے۔ اور اختر اور ظہیر کے تعلق کا بھی ایک اور Variation ہے جو نفیس اور قیصر اور نظیر کے تعلق سے مختلف ہے۔ یہاں وہ صرف دوست ہیں، سچے دوست۔ اختر سے وہ سب کچھ کہہ سکتی ہے اور اختر کی دوستی نازک سے نازک موقعوں پر سہارا دے سکتی ہے۔ لیکن شمی کی موت کا ذکر وہ اختر سے بھی نہیں کر سکتا۔ شمی کی موت کا اسے اتنا زبردست صدمہ پہنچا ہے کہ وہ یہ بات زبان تک لا بھی نہیں سکتا۔ شمی کی موت کی حقیقت ایسی ہے کہ خود اس کا ذہن اسے قبول نہیں کرتا، قبول نہیں کرنا چاہتا۔ جب وہ خود موت کا سامنا کرتا ہے اور موت سے گھبرا کر واپس لوٹ آتا ہے تو اس پر یہ حقیقت پوری طرح کھلتی ہے کہ شمی نے موت کا سامنا کیا اور وہ واقعی مر بھی گئی۔ شمی کی موت کی حقیقت اس وقت ایک Tangible شکل اختیار کر لیتی ہے۔

وہ لمحہ سب سے اہم لمحہ ہے جب وہ خودکشی کرنا چاہتا ہے۔ اس دوران میں اچانک اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ موت کا سامنا کرنے کی اپنے آپ میں ہمت نہیں پاتا۔ اس لمحہ وہ ایک معمولی آدمی بن جاتا ہے۔ A Pitiful Ordinary Human Being نیچے لوگوں کے ٹھٹھے مذاق اس کے اس انکشاف کو اور بھی واضح کر دیتے ہیں۔ اور اب اس کے ضبط کا بند آپ ہی آپ ٹوٹتا ہے۔ اور وہ اپنی بلندیوں پر سے اتر کر ایک عام آدمی کی طرح رو سکتا ہے، اختر کا سہارا لے کر، اختر جو پہلے بھی اسے اچھی طرح سمجھتی تھی، اب اسی Understanding کے ساتھ اس نئے ظہیر کو بھی قبول کر لیتی ہے۔

'بادوباراں' کا پہلا تاثر قائم رہتا ہے لیکن یہ افسانہ ایسا ہے کہ پڑھنے کے بعد جوں

جوں وقت گزرتا جائے آپ پر Grow ہونے لگتا ہے۔

آپ یہاں کب آرہے ہیں؟ پرکاش پنڈت صاحب سے مجھے اپنا مضمون ابھی تک واپس نہیں ملا ہے۔ اگر انھوں نے بھجوایا نہ ہو تو ازراہ کرم آپ ان سے لیتے آئیں۔ ممنون ہوں گی۔

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

18 اکتوبر 1955

مکرمی ضمیر احمد! آداب

آپ کا خط مل گیا تھا۔ جواب دینے والی تھی کہ وہ خط ہی کہیں کھو گیا۔ اور ساتھ ہی آپ کا نیا پتہ بھی۔ یہ خط 'فنکار' کی معرفت لکھ رہی ہوں۔ امید کہ آپ کو مل جائے گا۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ فنکار کے تازہ شمارے میں آپ کا کوئی افسانہ آرہا ہے۔ 'فنکار' میرے پاس آتا ہی نہیں، آپ پرکاش پنڈت صاحب سے کہیں کہ وہ مجھے پرچہ نکلنے پر بھیج دیں۔

میں نے 'سیارہ' والوں سے دریافت کیا کہ آپ نے جو افسانہ انھیں بھیجا تھا اس کا کیا ہوا۔ وہ تو صاف منکر ہیں کہ آپ کا کوئی افسانہ ان کے پاس آیا تھا۔

'سیارہ' کا کتابی سائز پر ایک خاص نمبر جلدی نکلنے والا ہے۔ اس میں میرا تازہ افسانہ 'میگھ ملہار' شائع ہو رہا ہے۔ یہ دراصل پورا افسانہ نہیں ہے۔ یہ افسانہ مکمل 'سویرا' کے آنے والے شمارے میں آئے گا۔ آپ یہ پورا افسانہ ضرور پڑھیے گا اور اس کے بارے میں اپنی رائے لکھ بھیجئے گا۔ یہ اردو میں اپنے انداز کی ایک اور کافی Significant تخلیق ہے۔ آپ کو معلوم ہے میں نے عرصے سے کوئی افسانہ نہیں لکھا تھا اور اب یہ افسانہ بڑی شدید تخلیقی Urge کے تحت ہوا ہے۔ اردو میں ایک Unusual اور Rare قسم کی چیز

تخلیق کرنے کا اچانک جنون سا سوار تھا اور دوران تحریر یہ جنون چھایا رہا۔

اب یہ آپ لوگ ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ واقعی میں نے کوئی چیز تخلیق کی بھی ہے کہ نہیں۔ یہ افسانہ فل اسکیپ سائز کے کوئی 90 صفحات کا ہے اور جانے کن کن چیزوں کو اس میں ملایا ہے۔ ہندو دیو مالا، Greek Mythology، ہومر، ورجل اور ملٹن کے ٹچس کے ساتھ، انجیلی عیسائی Symbolism اسلام میں Ritual کا کم یاب عنصر، یعنی کئی ایک کلچر اور مذہبوں کے مشترکہ عناصر۔ یہ سب یونہی پس منظر کے طور پر ہے ورنہ افسانے کی مرکزی تھیم تو موسیقی کا سحر ہے اور فنکار کا امر ہونا Immortality of Art ہے۔

میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ جس میں دیپک راگ اور 'میگھ ملہار' دونوں شامل ہیں شاید جلد ہی شائع ہو جائے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کے متعلق کوئی ایسے فنکار لکھیں جو واقعی فن کی سمجھ رکھتے ہیں اور ایسے تو معدودے چند ہی ہیں۔ آپ کے ذوق پر مجھے بھروسہ ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ ان افسانوں کی Significance کو سمجھ پائیں گے۔ جب کتاب نکل آئے تو میں آپ کو بھیجوں گی، کیا آپ وہاں کے پرچوں میں یا 'سویرا' یا 'نقوش' کے لیے اس پر تبصرہ کر دیں گے۔

میری منٹو پر کتاب اور تنقیدی مضامین کے مجموعے کے سلسلے میں بھی بات چیت ہو رہی ہے۔

شاہین ہالینڈ سے ابھی نہیں لوٹے۔ ایک ڈیڑھ ماہ میں آئیں گے۔ ان کی ڈاکٹریٹ Promotion کے لیے جن پروفیسروں کی موجودگی ضروری تھی، وہ پروفیسر چھٹیوں میں ہالینڈ سے باہر جا چکے تھے اس لیے شاہین کو دو مہینے اور دیر ہو گئی ورنہ وہ اب تک واپس لوٹ آتے۔ آپ کی بیگم صاحبہ کو میرا اسلام پہنچا دیجیے۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

مکرمی ضمیر احمد صاحب! آداب

آپ کے دونوں خط مل گئے تھے۔ 'گلبیا' اور سارے افسانے بھی۔ میں آپ کو جواب دیا ہی چاہتی تھی کہ آپ کا یہ خط ملا۔

دراصل میں نے 'نقوش' اور 'سویرا' والوں کو 'گلبیا' کے بارے میں لکھا تھا اور ان کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ غالباً آپ کو 'نقوش' والوں کا خط میرا خط انھیں ملنے کے بعد ہی ملا ہے۔ بہر حال اب کے آپ نے دوسرے افسانے بھی بھیج دیے ہیں۔ 'نقوش' والوں کو ان کی مرضی کے مطابق کوئی 'شریفانہ' چیز ہی بھیجی جا سکتی ہے۔

'گلبیا' اگر 'سویرا' کے اس شمارے میں آجائے جس میں میرا طویل افسانہ 'میگھ ملہار' آرہا ہے تو بہت اچھا ہو۔ میں نے انھیں لکھ دیا ہے۔ افسانے کی تعریف بھی کر دی ہے۔ دیکھیں وہاں سے کیا جواب آتا ہے۔ غالباً وہ یہ پرچہ صرف طویل نگارشات کے لیے وقف کر رہے ہیں۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو شاید آپ کا افسانہ وہاں شائع ہو سکے۔

'نقوش' کے لیے بغیر عنوان والی نمبر 2 بھجوا دیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کہتے ہیں یہ پرانی وضع کی ہے۔ مجھے تو یہ کہانی واقعی پسند آئی۔ بغیر عنوان والی نمبر (1) اس میں Subtle Undertones ہیں۔ ہموار سطح کے نیچے ایک دبی دبی زیریں ہلچل جو دبی دبی رہنے کی وجہ ہی سے خاصی شدت اختیار کر گئی ہے۔ بغیر عنوان (1) تکنیکی لحاظ سے اور جذبات و محسوسات کے مد و جزر کے اعتبار سے میرے افسانے 'گھنیری بدلیوں سے' بہت کچھ ملتا ہے۔ لیکن وہ ہلچل تو ایک محبت کرنے والی بیوی کے ذہن میں ایک معمولی سی بات پر ضرورت سے زیادہ Anxiety سے پیدا ہوئی ہے اور یہاں آپ کے افسانے میں مجرم ضمیر کی کشمکش ہے۔ یوں بات تو شروع ہی میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ افسانے کا اختتام صرف اس کا اضافہ کرتا ہے کہ وہ آیا تھی۔

'اچھی بٹیا' کی نفسیاتی Significance کو نہیں معلوم، لوگ سمجھ بھی سکیں گے۔

'شو بھارانی' پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ بچوں کا جاگا ہوا جنسی شعور کیا رنگ لے آتا ہے۔

'گلبیا' تو خیر کچھ اور ہی چیز ہے۔ منٹو کا افسانہ معلوم ہوتا ہے اور کردار بھی منٹو کا ہے۔ منٹو کی پھڑکتی ہوئی عورت کرداروں کے علاوہ 'گلبیا' میں میں نے ایک اور کردار سے بھی مشابہت پائی۔ یہ ایملی زولا کے ایک کردار L.A. Cognet سے مشابہ ہے جو Earth کی ایک کردار ہے۔ ایملی زولا کا انگریزی میں ترجمہ ابھی ابھی چھپا ہے۔ اب تک یہ کتاب انگریزی میں شائع ہی نہیں ہوئی تھی کیوں کہ انگریزی اس کی غضب کی عریاں حقیقت نگاری کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اب جانے کیسے اس کا ترجمہ ہو گیا اور ترجمہ کیا ہوا کہ تہلکہ مچ گیا۔ اگر آپ نے ابھی تک یہ کتاب نہ پڑھی ہو تو ضرور پڑھیے گا۔ بلا کی شدت، غضب کے Passions اور پھڑکتی ہوئی زرخیز دھرتی کی کوکھ سے پھوٹتی ہوئی زندگی۔ 'زر' اور 'زمین' اور 'زن' کے لیے انسان کی حرص وطمع اور Possessive Instinct کی دیوانگی جو اسے حیوان سے بھی بدتر بنا دیتی ہے۔ البتہ کتاب کے بعض حصے اتنے Grotesquely Obscene اور Filthy ہیں کہ Finer Sensitivities والوں کی طبیعت پر نہایت گراں گزرتے ہیں۔ لیکن کتاب پڑھنے کی ہے بڑی Irresistible اور اس میں 'گلبیا' کا سا ایک کردار ہے L.A. Cognet۔

ہاں 'گلبیا' کے بارے میں ایک چھوٹا سا Suggestion ہے اور وہ یہ کہ اس کا دوسرا جملہ سب سے پہلا ابتدائی جملہ ہونا چاہیے۔ اس سے فوراً آغاز ہی میں گرفت پیدا ہو جاتی ہے۔ چھوٹتے ہی چھوٹتے کیوں نہ گلبیا کا یوں تعارف ہو جائے۔

"جرا بچ کر رہنا بھیا۔ بڑی حرامجادی ہے سالی۔"

اور اس کے بعد رام دین کے بارے میں جملہ آ سکتا ہے۔ کہیے۔ آپ کو یہ مشورہ پسند آئے تو میں خود یہ تبدیلی کرلوں۔ اور افسانے کے آخر میں دو ایک جملے جن سے عریانی پیدا ہو گئی ہے، کاٹے جا سکتے ہیں۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ یہ رسالے والے چھاپنے سے جو ڈرتے ہیں! یوں بھی بات اشاروں ہی اشاروں میں واضح ہو جاتی ہے۔ ایک آدھ کھلے جملوں کو نکالا جا سکتا ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ مجھے نئے افسانہ نگاروں کے بارے میں مضمون لکھنا چاہیے۔ بہت سے لکھنے والوں کو اس کا احساس ہے کہ جب سے میں نے افسانوں کا جائزہ لینا چھوڑ دیا ہے انھیں کوئی ٹھیک طور سے سمجھنے والا نہیں ہے اور سب نقاد رسمی سی باتیں کر دیتے ہیں۔ انشاء اللہ کبھی کچھ اس موضوع پر لکھوں گی۔ بلکہ مجھے تو افسانے پر ایک کتاب ہی لکھنی چاہیے۔ یوں میں تکنیک کے تنوع میں جو اضافے کر رہی ہوں اس میں آپ کا بھی ذکر ہوگا۔ تقسیم کے بعد میری رائے میں دو ہی افسانہ نگار ایسے ابھرے ہیں جن کی کوئی ادبی Significance ہے۔ ایک انتظار حسین، ایک آپ۔ ایک حد تک اشفاق احمد نے بھی اچھی چیزیں لکھی ہیں۔ اس موضوع پر میں فی الحال تو کچھ نہیں لکھ سکتی کیوں کہ یونیورسٹی کے بکھیڑے ہیں اور میرا وقت اپنا نہیں ہے۔ کوئی چھ مہینے تک میں کچھ نہ کچھ لکھ سکوں گی۔

آپ کو اس کی شکایت ہے کہ وقار عظیم صاحب نے 'ساقی' میں اپنے مضمون میں آپ کا یونہی ذکر کر دیا ہے۔ اب اسے کیا کہیے گا عبادت بریلوی نے ساقی میں پچیس سالہ تنقید پر مضمون میں میرا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ حالانکہ بعض اونچے ادبی حلقوں میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں دو ہی وقیع نقاد ہیں۔ ایک عسکری صاحب ایک میں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جان بوجھ کر مجھے نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی وجہ کا بھی اندازہ ہے کہ کیوں۔ میں اس لحاظ سے داد نہیں چاہتی کہ عورتوں میں میں ایک ہی نقاد ہوں۔ ادب میں عورت مرد کی تفریق کو کیوں لایا جائے۔ دونوں کی ادبی حیثیت ساتھ ساتھ متعین کی جاسکتی ہے۔ لیکن ایک ایسے مضمون میں جس میں ان کا تک ذکر ہو جنھوں نے صرف ایک ایک دو دو تنقیدی مضمون لکھے ہیں، میرا نام تک نہ لیا جائے، یہ تعجب خیز ہے۔

یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ نے 'ہندی مسلمان' کے بارے میں رپورتاژ لکھا ہے۔ ساقی نکلنے پر ضرور پڑھوں گی۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ یہ ادبی بحران، یا 'ادبی بخار' ہم دونوں کو ایک ساتھ ہوا

ہے۔ میں نے بھی ان دنوں کافی چیزیں اور طویل چیزیں لکھ ڈالیں۔ امریکی افسانوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس میں سارے امریکی افسانے کا ایک طویل جائزہ بھی لیا ہے۔ 'میگھ ملہار' کوئی اسی صفحات کا لکھ ڈالا۔ 'نقوش' کے اصرار پر 'مغربی افسانے کا اثر اردو افسانے پر' لکھا (یہ ان کے ابھی شائع کیے گئے افسانوں کے ضخیم انتخاب میں شامل ہے۔ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔) منٹو نمبر میں دو ایک مضامین لکھے۔ منٹو پر اپنی کتاب 'نوری نہ ناری' تقریباً ختم کر لی۔ اور انگریزی میں ہیمنگوے پر، منٹو پر مضامین لکھے۔ انگریزی ہی میں ناصر شمسی کے ڈراموں کا دیباچہ لکھا۔ غالباً اس کی وجہ بھی آپ کی سی ہو۔ بیوی کی شدید بیماری کی وجہ آپ کو تخلیق کی شدید تحریک ہوئی ہو تو شاید میری تخلیق کی اس شدید Urge کا باعث شاہین کی غیر حاضری کا احساس ہو۔

شاہین فروری میں آئیں گے۔ ان کی ڈاکٹریٹ کی تاریخ پھر ملتوی ہو گئی۔ یہ بھی عجیب مصیبت ہے۔ جانے ڈچ یونیورسٹیوں کے خداؤں کو کیا سوجھی کہ ان کو ڈاکٹریٹ عطا کرنے کی تاریخ ملتوی کر کے 21 جنوری کر دی۔ کرسمس کی چھٹیوں کے بعد۔ حالانکہ ان کی تھیسس چھپ چکی ہے اور Approve بھی ہو چکی ہے۔ بہر حال جب اتنا انتظار کر لیا ہے تو دو ماہ اور سہی۔

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیز کیش

ممتاز شیریں

اوپندر ناتھ اشک کے نام

19 جولائی 1947

محترمی! تسلیم

یہ سن کر بہت رنج ہوا کہ آپ ایک مہینے سے سخت بیمار ہیں۔ خدا کرے اب آپ

پورے طور سے صحت یاب ہو چکے ہوں۔ اور ہم انتہائی شکر گزار ہیں کہ آپ نے ایسے میں بھی نیا دور کا خیال کر کے یہ باب بھیجا۔ یہ باب رجسٹر سے ہمیں بحفاظت مل گیا۔

'گرتی دیواریں' کے جتنے باب بھی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں سب مجھے بہت پسند ہیں اور یہ باب بھی بہت پسند آیا۔ شاید یہ شروع کے بابوں میں سے ہوگا۔ بالکل مکمل ٹکڑا ہے۔ یہ ناول پڑھنے کا بہت اشتیاق ہے۔ کب شائع ہوگا؟

سب ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ ہمارے بہت اچھے مراسم ہیں۔ اور وہ ہمارے ساتھ ہمارا تعاون کر رہے ہیں۔ 'نیا دور' کی مخالفت کے بارے میں ہم نے جو کچھ بھی سنا ہے وہ صرف 'نظام' کے ذریعہ سنا ہے۔ ورنہ ہمیں کچھ پتہ نہ تھا۔ 'نظام' میں ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ کی جو روداد یں شائع ہو رہی ہیں انھیں دیکھ کر پتہ لگا۔ ان میٹنگوں کے شرکت کرنے والوں میں آپ بھی تھے۔ جب 'جہاد' پڑھا گیا تھا شاید وہی آخری میٹنگ تھی جس میں آپ نے شرکت کی تھی۔ اور جناب قدوس صہبائی کی وہ عجیب و غریب تحریک کہ رجعت پسند رسالوں کا بائیکاٹ کرنا ترقی پسند ادیبوں کا فرض ہے۔ اس کے بعد کی میٹنگ میں پیش ہوئی تھی اور اس تحریک میں 'نیا دور' کا نام 'رجعت پسند' رسالوں کے سرفہرست دیکھ کر ہمیں بالکل تعجب نہ ہوا کیوں کہ یہ تو ہمیں معلوم تھا قدوس صہبائی ہم پر اور 'نیا دور' پر کس قدر بگڑے ہوئے ہیں۔ بات یہ ہوئی کہ انھوں نے 'نیا دور' کے لیے ایک افسانہ بھیجا تھا 'وکٹری ڈے' پر یہ افسانہ اچھا نہ تھا اور کسی طرح 'نیا دور' کے معیاری نہ تھا۔ گو 'ردعمل' سے ('نیا ادب' کے تازہ نمبر میں شائع شدہ افسانے) یہ بہتر تھا۔ ہم نے نہایت نرمی سے معذرت چاہی۔ یہ بھی لکھا کہ اسی موضوع پر احمد عباس اور ابن سعید وغیرہ کے افسانے شائع ہو چکے ہیں پھر 'وکٹری ڈے' کو بہت دن بھی گزر چکے... وہ بہت برا مان گئے۔ ہمیں کئی دفعہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے ادیبوں کی چیزیں واپس کرنی پڑی ہیں۔ لیکن انھوں نے کبھی برا نہ مانا۔ اب دیکھیے آپ نے بھی ناول 'پکا گانا' واپس کرنے پر برا نہ مانا۔ آپ نے دوسری چیز بھیج دی اور ہماری دوستی اسی طرح قائم ہے۔ لیکن قدوس صاحب اس قدر بگڑے اس قدر بگڑے کہ

اس کے بعد ان کے خطوط کا لہجہ بدل ہی گیا۔ حالاں کہ ہم سب ایسے خطوں کا جواب بھی نرمی سے دیا کرتے تھے۔ ایک اور دفعہ بھی ہم نے انھیں ناراض کر دیا تھا۔ حیدر آباد کانفرنس کے موقع پر ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے میرے ایک مضمون کی بہت تعریف کی۔ پھر کہا شاید میں نے ان کے افسانے نہیں پڑھے۔ پھر بمبئی جا کر انھوں نے اپنے چھ سات مجموعے بھیجے کہ پڑھ کر ان پر رائے لکھوں۔ جو کچھ ہم نے محسوس کیا لکھا اور وہ برامان گئے او راس وقت سے ہم پر بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے اگر 'نظام' کے ہر ایڈیٹوریل میں ان کی بائیکاٹ والی تحریک میں 'نیا دور' رجعت پسند رسالوں کے سرفہرست پیش کیا گیا تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوا۔ البتہ جناب سجاد ظہیر کو 'نیا دور' میں کون سی چیز کھٹکی ہے نہیں معلوم۔

ویسے تو سب ادیب ہم سے تعاون کر رہے ہیں اور اکثروں کے خط آ گئے ہیں کہ 'نیا دور' کو 'رجعت پسند' کہنا سراسر ظلم ہے اور جانے کیوں بعض لوگ ادب کو اس قدر محدود کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک ہمارے نظریوں کا سوال ہے۔ ہم ضرور ترقی پسند ادب کے حامی ہیں لیکن اس کے وسیع مفہوم ہیں۔ پھر اس کے ساتھ ہی اگر کوئی اچھے ادیب ادب کے متعلق کچھ مختلف نظریے رکھتے ہوں اور ان نظریوں کی حمایت میں اچھے دلائل پیش کریں اور ان کے مضمون ٹھوس، سنجیدہ اور معیاری ہوں تو 'نیا دور' انھیں چھاپنے سے گریز نہیں کرتا۔ یہ کم نظری ہوگی۔

لیکن آخر کون چیزیں ترقی پسند ہیں اور کون سی غیر ترقی پسند؟ اور یہ لیبل کن کن پر لگائے جائیں؟ ادیبوں پر، مضامین پر، اور افسانوں پر کیوں نہیں۔ کسی رسالے میں کسی مضمون کے ایک یا دو پیراگراف دیکھ کر اسے رجعت پسند قرار دے دیا جائے تو افسانوں کے بارے میں یہ احتساب کیوں نہیں ہوتا؟ افسانوں کے موضوع یا اختتام یا مصنف کا رویہ، انداز نظر یا کرداروں کے حرکات غیر ترقی پسند ہو سکتے ہیں اور ایسے افسانے ان رسالوں اور ہفتہ واروں میں بھی چھپتے ہیں جو اپنے آپ کو ملک کا واحد ترقی پسند ہفتہ وار یا

رسالہ کہتے ہیں اور پھر طریقہ اظہار... شاید لوگ خارجی حقیقت نگاری ہی کو ترقی پسند سمجھتے ہیں۔ لیکن آج کل جو نئے رجحان آرہے ہیں ان کا کیا ہوگا؟ سیمبالزم، ایکسپریشنزم، تخیل کے گھروندے کہہ کر شاید انھیں غیر ترقی پسند بتایا جائے گا۔ خواہ ان میں حقیقت اور زیادہ گہری اور Profound حقیقت کیوں نہ ظاہر ہو۔ پھر ہمارے جدید ادب میں یہ بڑھتی ہوئی یاسیت اور قنوطیت کسی طرح ترقی پسند تھیں۔ بہت غور سے دیکھا جائے تو ان لفظوں کے مضمون میں نہایت مہین اور ہلکے ہلکے Shade نکل جاتے ہیں، درمیان میں ایک چھوٹی سی لکیر کھینچ کر یہ موٹے موٹے لیبل لگائے نہیں جاسکتے کہ ادھر کا حصہ ترقی پسند ہے اور یہ رجعت پسند۔

کوئی افسانہ لیجیے،... کسی نے کہا خاتی کے 'دہی والی' ('نیا دور'-1) کا اختتام غیر ترقی پسند ہے۔ بہو بیٹے کو الگ گھر بنانے کا پورا حق تھا، بہو کو آزاد رہنے کا حق تھا۔ وہ کیوں اپنی ساس کا کاٹ سہتی! لیکن 'دہی والی' میں یہ ساس ان کے گھر آجاتی ہے۔ ٹھیک۔ لیکن ساس کے زاویے سے وہ بوڑھی غریب جس کا اپنے بیٹے بہو کے سوا دنیا میں کوئی نہیں تھا، کیسے الگ رہ کر اپنا دکھیارا جیون بتاتی۔ آخر میں وہ سب پھر مل جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی چھوٹی چھوٹی خطاؤں کو درگزر کر کے ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ یہ ہمدردی، یہ انسانیت، یہ ایک دوسرے کے غم میں شریک ہونے، ساتھ رہنے کا جذبہ، جذبۂ آزادی سے کہیں زیادہ بلندتر ہے اور حاشی نے بہت ٹھیک طرح سے افسانے کا اختتام کیا ہے... یا احمد عباس کے چڑھاؤ اتار کو لیجیے۔ ترقی پسند نقطہ نظر میں محبت کی آزادی ہے۔ نرمل کو پورا حق تھا کہ اپنی اس بے جوڑ، دہقانی بیوی کو جس کے ساتھ زندگی گزارنے میں کوئی راحت نہ تھی، چھوڑ دیتا اور شیریں اور نرمل ساتھ رہتے۔ یہ زیادہ ترقی پسند اختتام ہوتا لیکن نرمل اپنی اسی گنوار بیوی کی محبت دل میں لیے اسی کے پاس واپس لوٹتا ہے۔ اور میرے خیال میں یہ بہتر اختتام ہے اور اس مسئلہ کا بہتر حل بھی۔ اس سے بھی زیادہ واضح مثال ہمیں چینی اور روسی ہم نام افسانے 'نفرت' میں ملتی ہے۔ فنی لحاظ سے چینی نفرت کہیں زیادہ بلند پایہ تخلیق ہے۔ اس کا یہاں ذکر

نہیں۔ انداز نظر کا مقابلہ ہے۔ بظاہر ان دونوں افسانوں کے نظریے ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں اور کٹر ترقی پسند یقیناً شالوخوف کی 'نفرت' کو ترقی پسند شاہکار کہیں گے۔ سب سے پہلے اس لیے کہ یہ روسی افسانہ ہے، پھر اس میں فاشسٹوں سے شدید نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن چینگ تین یہ کے افسانے میں انسانیت کا ایک خوبصورت وسیع تر جذبہ اس نفرت کو تحلیل کر کے اسے محبت اور ہمدردی میں بدل دیتا ہے۔ اب بتائیے آپ ان میں سے کسے ترقی پسند کہیں گے؟ دونوں بظاہر بالکل متضاد پھر بھی دونوں ترقی پسند ہیں اور انسانیت کی ترقی اور بہبود کے لیے اس خوبصورت جذبہ کی کہیں زیادہ ضرورت ہے۔

تو 'نیا دور' نے ادب کو اور ترقی پسندی کو وسیع تر معنوں میں لیا لیکن ساتھ ہی فن کو بھی مقدم رکھا اور ترقی پسند ادب کی خدمت کی۔

ترقی پسندی کی حمایت میں کسی بھی معمولی آدمی کے ہلکے اور سطحی مضامین اور اسی نقطۂ نظر سے معمولی تبصرے جو تنقیدی صلاحیت سے قطعی مبرا ہوں، اور معمولی افسانے جن میں ترقی پسندی واضح طور پر نظر آتی ہو جن میں نچلے طبقے کا تذکرہ ہو یا کوئی سیاسی مسئلہ ہو (جیسا کہ اکثر صدیقہ بیگم کے افسانوں میں ہوتا ہے۔ سیاست ضرور اہم ہے لیکن اس موضوعوں کو پیش کرنے کا سلیقہ بھی تو ہو) یا ان میں سرخ رنگ، ہنسیا اور ہتھوڑا اور نیا زمانہ کا ذکر ہو، ایسے مضامین اور افسانے چھاپ کر نہیں بلکہ ٹھوس طور پر ساتھ ہی اپنا معیار قائم رکھ سکے۔ ہم نے ترقی پسند ادب کی وضاحت میں کتنے مضامین شائع کیے۔ غیر مطبوعہ ہی نہیں کتابوں اور رسالوں سے چن چن کر۔ ایک شمارے میں دو دو مضمون، ٹھوس سنجیدہ، معیاری، قابل غور مضامین، فیض، احتشام حسین، اختر انصاری، سجاد ظہیر، کرشن چندر، قاضی عبدالغفار کے مضامین۔ اتنے سارے مضامین صرف ایک موضوع 'ترقی پسند ادب' پر شائع کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا تھا سوائے اس کے۔

اور ادب کا ایک وسیع نظریہ پیش کرنے میں نمبر 6 کو ایک مثالی حیثیت حاصل تھی (اور اس حیثیت سے ادبی حلقوں میں اس نمبر کی بہت قدر ہوئی تھی) جس میں ہم نے کرشن

چندر اور احمد علی کے مضمون ساتھ ساتھ دیے تھے ساتھ ہی ای. ایم فارسٹر کا پھر شاہین نے صرف آغاز میں اتنی طویل بحث کی تھی جس میں ایک معتدل اور میانہ روا ختیار کی گئی تھی۔ اور افسانے جہاں تک مجھے یاد ہے سب کے سب ترقی پسند تھے۔ اتنا سب کرنے پر بھی نیا دور کو نہ صرف 'رجعت پسند' رسالوں میں شمار کیا جائے بلکہ اسے ان کے سرفہرست بھی پیش کیا جائے تو....

صرف یہ کہنا ہے کہ ہمارا نظریۂ ادب وسیع تر ہے اور جہاں تک ادیبوں کا سوال ہے، 'نیا دور' ان میں کسی طرح کی گروپ بندی کا شکار نہیں، کسی پارٹی کا آرگن نہیں، اس کا حلقہ وسیع تر ہے اور رہے گا۔

اور آخر میں میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے 'نیا دور' سے تعاون کیا اسے 'رجعت پسند' سمجھ کر 'بائیکاٹ' نہیں کر دیا۔

شاہین سلام کہتے ہیں۔

امید ہے آپ اب پورے طور پر صحت یاب ہو چکے ہوں گے۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

---

30 اگست 1947

مکرمی و محترمی! تسلیم

میں کہہ نہیں سکتی، کس قدر شرمندہ ہوں کہ آپ کے خط کا جواب اتنی دیر سے دے رہی ہوں شاہین کافی عرصہ کے لیے شمالی ہند جانے والے تھے۔ وہ تیاریوں میں مصروف تھے اور میں پریشان... (اور اب وہ چلے گئے)۔

آپ کا خیال تو ہمیں ہمیشہ رہتا تھا کہ جانے آپ کی صحت کیسی ہوگی۔ آپ کا خط آنے سے پہلے بھی، جب سے کسی نے یہ بتایا تھا کہ آپ علیل ہیں اور ہسپتال میں ہیں۔ خدا

کرے اب آپ پورے طور سے صحت یاب ہو چکے ہوں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ ہم کئی غیر اہم اور میکانکی خط تو لکھ دیتے ہیں، لیکن جو ہمیں سب سے زیادہ یاد آ رہے ہوتے ہیں انھیں کو نہیں لکھتے۔ لیکن ان دنوں تو میں نے کسی کو خط نہیں لکھا پھر بھی ہر روز سوچتی رہتی ہوں کہ اگر کسی کو نہ لکھا تو صرف آپ کو ضرور جواب دوں گی۔ کم از کم ایک کارڈ لکھ کر آپ کی صحت کے بارے میں دریافت کروں گی۔ لیکن پھر خیال آتا تفصیلی خط ہی لکھ دوں اور آپ نے جواب بھی تفصیلی طلب کیے تھے۔ اس لیے سوچا اطمینان سے اور تفصیل سے اور پھر ایک دفعہ آپ کی بتائی ہوئی کہانی پڑھ کر اس کے متعلق تاثرات ہی نہیں بلکہ بہت کچھ اور بھی لکھوں لیکن آپ نے یہ کیا کہا کہ آپ طالب علم کی حیثیت سے یہ چھوڑ رہے ہیں؟

آپ نے جو بات کہی ہے وہ عرصے سے میں بھی بری طرح محسوس کر رہی ہوں۔ یعنی یہ کہ ترقی پسندی کے نام سے بہت سی غیر ترقی پسند چیزیں لکھی جا رہی ہیں۔ سارے پہلوؤں کو لایا جائے تو یہ بڑا ہی پیچیدہ مسئلہ ہے لیکن یہاں تو صرف جنس پر بحث ہے لیکن یہ بھی کافی پیچیدہ ہے۔ نئے ادب پر عریانی کے الزام کا جواب اس قدر آسان نہیں ہے کہ آپ کو یہ اس لیے کھٹکتی ہے کہ خود آپ کا 'لحاف' گندہ ہے۔ خود آپ کے جسم سے 'بو' آتی ہے۔ دراصل یہ بھی بحث فکر طلب ہے کہ 'بو' اور 'لحاف' بھی ترقی پسند ہیں یا نہیں۔ 'بو' تو کسی لحاظ سے ترقی پسند نہیں اور 'لحاف' گو اس کا موضوع ترقی پسند ہے یعنی یہ کہ اگر ایک صحت مند عورت کی اس طرح کے مرد سے شادی کر دی جائے تو کیا ہوتا ہے... لیکن اسی موضوع بلکہ اس مواد کو بھی کئی طریقے سے پیش کیا جا سکتا تھا۔ 'لحاف' میں جس طرح یہ موضوع پیش کیا گیا ہے، ترقی پسند عنصر لذتیت میں ڈوب کر رہ گیا ہے....

یہی تو مشکل ہے کہ کئی باتوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ صرف موضوع کافی نہیں۔ موضوع، مواد یہ کسی طریقے سے پیش کیا جائے تا کہ قارئین پر ایک خاص اثر ہو، خود مصنف کا اخلاقی نظریہ پروپیگنڈا اور پند و نصائح کا سہارا لیے بغیر کیسے ظاہر ہوا اور اگر افسانہ نگار

افسانے سے الگ رہ کر پوری معروضیت بھی برتنا چاہے تو وہ محض افسانے کی تفصیلوں، اور کردار کی تعمیر وغیرہ میں ہی اپنے مقصد کو کس طرح لے آسکتا ہے۔

ایک ہی بات دو افسانوں میں کس قدر مختلف اثر پیدا کر سکتی ہے! منٹو کے دو تازہ افسانوں، پانچ دن اور سوراج کے لیے میں تقریباً وہی محور ہے۔ 'سوراج کے لیے' میں غلام علی کا وہ Self Control واقعی مضحکہ خیز نظر آتا ہے۔ فطری جذبے کو گھونٹ کر اسے جائز طریقے سے بھی پورا نہ ہونے دے کر اپنے آپ پر اس قدر جبر کرنا، ایسی مصنوعی زندگی بسر کرنا... جب غلام علی اپنا عہد توڑ دیتا ہے تو ہمیں خوشی ہوتی ہے... لیکن جب پانچ دن میں پروفیسر اپنا زہر توڑتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے انسانیت قعرِ مذلت میں گر گئی۔ پروفیسر بھی اسی طرح اپنے آپ پر جبر کر کے پاکیزہ زندگی بسر کرتا ہے گناہ سے بچ کر، لیکن مرتے وقت اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی یہ زندگی ریاکار زندگی تھی اور مرنے سے پانچ دن پہلے ریاکاری کا یہ پردہ نکال پھینکنا چاہتا ہے اور ان پانچ دنوں میں ناکردہ گناہ کی ساری حسرتیں پوری کر لیتا ہے۔ ایک تو یہ انتہائی غیر فطری بات ہے کہ ایک مرنے والا آدمی جس سے موت اس قدر قریب ہو ایسا کرے گا۔ گنہگار آدمی بھی مرتے وقت خدا کو یاد کرتا ہے، توبہ کرتا ہے، یہ موہوم امید کرتا ہے کہ شاید اس کے گناہ معاف ہو جائیں لیکن یہاں تو عمر بھر کی بے گناہی کے بعد آخری لمحوں میں گناہ کی لذت چکھنا... یہ انتہائی غیر ترقی پسند افسانہ بھی شاید ترقی پسند سمجھ کر لکھا گیا ہے کیوں کہ اس میں ریاکاری کی مذمت ہے... یہ ایک اور عجیب بات ہے... یعنی یہاں میں افسانوں کو چھوڑ کر زندگی کی بات کر رہی ہوں۔ کچھ لوگ نہ برائی سراہ سکتے ہیں نہ اچھائی۔ آدمی برا ہے تو اس کی مذمت کرتے ہیں، اگر اچھا ہے تو اس پر ریاکاری کا گمان کرتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگوں کو بتانے کے لیے اچھا ہے۔ اندر وہ بھی گندہ ہے اور یہ اندرونی گندگی یہ ریاکاری گناہ سے بھی بدتر ہے۔ لیکن کیا ایسے آدمی نہیں جو لوگوں کے ڈر سے نہیں، خدا اور مذہب کے ڈر سے نہیں اپنے لیے پاک ہیں؟ گو ایسے آدمی تو مٹھی بھر ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ اچھا ہونے کے لیے ریاکار ہی ہونا لازمی نہیں۔

آخر Sublimation بھی کوئی چیز ہے۔ زندگی میں اعلیٰ قدریں بھی تو ہیں۔ انسان کو ہمیشہ کشمکش سے گزرنے، اپنے جذبات کو گھونٹتے رہنے کی ضرورت ہمیشہ نہیں پڑتی۔ جب وہ ہر ادنیٰ جذبات پر قابو پانا سیکھ جاتا ہے تو یہ قابو اور اس کے Sublimated Instincts اس کی فطرت ثانی بن جاتے ہیں۔

لیکن منٹو کے افسانے کا پروفیسر ریاکار ہے۔ وہ صرف لوگوں میں اچھا نام لینے کے لیے ایک پاکیزہ ظاہر اوڑھے ہوئے ہے لیکن اس کے اندر جذبات ہیں جنھیں وہ مشکل سے دبائے رکھتا ہے... اور اس لیے یہاں بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ ریاکاری گناہ سے بھی بدتر ہے... لیکن گناہ صرف اس لیے خراب نہیں ہے کہ اس سے ایک فرد کا نا کام ہوتا ہے گناہ اس لیے اور بھی مذموم ہے کہ دوسروں کو بھی اس سے نقصان پہنچتا ہے۔ دوسروں کی زندگی بھی اس سے تباہ ہو سکتی ہے۔ اب یہیں اسی پروفیسر کی مثال لیجیے اس کی پاکیزگی میں ریاکاری تھی۔ لیکن پھر بھی کیا یہ اچھی بات نہیں ہوئی کہ اس سے کم از کم وہ کالج کی لڑکیاں تو بچ گئیں؟ اور مرتے وقت اس ریاکاری کا پردہ اتار پھینک کر گناہ سے محظوظ ہو کر، اور اس لڑکی کو جسے اس نے موت کے منھ سے بچا کر اتنی مدد کی تھی، اس کو اپنی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بنا کر اس نوجوان تندرست لڑکی کو دق لگا کر اس کی زندگی تباہ کر کے اس نے کون سا میدان مار لیا؟ تعجب ہے کہ منٹو کے سے ترقی پسند افسانہ نگار نے ایسا غیر ترقی پسند افسانہ بھی اسے ترقی پسند سمجھ کر کیسے لکھا؟ یہ کتنی افسوسناک بات ہے۔

خصوصیت سے عوام ترقی پسندی کو عریانی کے مترادف سمجھنے لگے ہیں۔ ہمارے پاس جو افسانے آتے ہیں ان سے یہ اندازہ لگا کر بے حد افسوس ہوتا ہے کہ لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ افسانے میں جتنی عریانی ہو، ایک ترقی پسند رسالہ اسے اتنی ہی آسانی سے قبول کرلے گا!

بلونت سنگھ کے افسانے 'گھٹن'، 'ڈگریا' کا میں نے زیادہ خیال نہیں کیا تھا۔ پہلی بار یہ افسانہ پڑھنے کے بعد کوئی خاص خیال نہیں آیا تھا سوائے اس کے کہ بس ایک رخ دکھایا گیا ہے، اور مصنف نے یہ واقعہ پیش کرتے ہوئے پوری معروضیت برتی ہے۔ اس کا کوئی

اخلاقی نظریہ ظاہر نہیں ہوتا اور مجھے ایسی چیزوں سے شکایت نہیں جن میں افسانہ نگار نے اپنا مقصد ظاہر نہ کیا ہو اور جو بعض محض زندگی کی ایک سچی تصویر ہیں اور بس لیکن جب ان میں ترغیب کا عنصر آ جائے تو یہ واقعی غیر ترقی پسند ہیں... بلونت سنگھ کے افسانے کو جب میں نے پہلی دفعہ پڑھا تو اس غیر ترقی پسند عنصر کا مجھے احساس نہ ہوا بلکہ افسانے کے اختتام کو ایک ہلکی سی نفرت کا احساس ہوا کہ بھئی لوگ ان لوگوں کی تو غیرت بھی مر جاتی ہے اسے معلوم ہوتا ہے کہ بج ناتھ بابو اس کے گھر آیا تھا اور اس کی اپنی بیوی اس کے ساتھ... اور پھر بھی غصہ کا ایک ہلکا سا جذبہ بھی پیدا نہیں ہوتا... اور میرا یہ نظریہ ہے کہ اگر مصنف اپنی طرف سے کچھ کہے بغیر بھی برائی سے نفرت کا احساس دلا سکے تو وہ ایک کامیاب اور ترقی پسند افسانہ ہے... لیکن پھر بعد میں آپ کے کہنے کے بعد یہ افسانہ دوبارہ پڑھا تو مجھے اس کا احساس ہوا کہ اس افسانے میں غیر ترقی پسند عنصر ہے کیوں کہ افسانے کے آخر میں بھی یہ احساس دلایا گیا ہے کہ وہ دونوں اس 'تبادلے' کے بعد کس قدر تازہ اور مسرور تھے۔

ایک اور بات جو مجھے بری طرح محسوس ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ ہمارے ادیب انسانی کردار کے تاریک پہلوؤں کی طرف، بہت زیادہ توجہ کر رہے ہیں اور سماج کی پیدا کردہ برائیوں کو بتانے کی دھن میں ہمیشہ ایسے افسانے پیش کر رہے ہیں جن سے انسان پر سے، انسانی فطرت پر سے بھروسہ اٹھ جانے کا ڈر ہے....

میں ان سب باتوں کا افسانوں کے جائزے میں چلتے چلتے ذکر کر دیتی ہوں۔ لیکن پھر بھی بہت دنوں سے میرا خیال رہا ہے کہ اس صحیح ترقی پسندی کے مسئلہ پر خصوصاً ہمارے افسانوں میں جنس پر ایک الگ مضمون لکھوں... حال ہی میں میں نے ایک افسانہ لکھا ہے (جو ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔ 'سویرا' والوں کے اصرار پر لکھا تھا۔ لیکن لاہور میں تو قیامت برپا ہے نہ ڈاک برابر پہنچ رہی ہے نہ کوئی اطلاع ہے۔ اس لیے میں نے ابھی تک انھیں بھیجا بھی نہیں) اس میں میں نے ایک حد تک جنس کے مسئلہ کو ذرا وسعت کے ساتھ گھیرنے کی کوشش کی ہے۔ سات مختلف تصویریں ہیں جنھیں سات افسانچے بھی کہنا چاہیے۔ ان میں

کوئی لگاؤ نہیں۔ سوائے اس کے کہ یہ سب جنس اور محبت اور ازدواجی زندگی سے متعلق ہیں۔ان سب کو میں نے ایک ہی افسانے میں اس لیے پیش کیا ہے کہ تضاد اور تقابل سے ایک خاص اثر پیدا ہو سکے۔

ہمیں چاہیے کہ انسانی فطرت کی بلندی کو بھی ساتھ ساتھ پیش کریں۔آپ کے 'قید حیات' میں انسان کتنا بلند نظر آتا ہے! انسان کی مجبوری اور انسان کی بلندی۔ مجھ پر تو اس ڈرامے نے اس قدر شدید اثر کیا...واقعی آج تو ڈرامہ کے میدان میں آپ کا کوئی ثانی نہیں!

آپ بھی تعجب کریں گے یہ خط لکھا گیا ہے 30 اگست کو اور اب پوسٹ کیا گیا۔ بنگلور میں ان دنوں گڑبڑ شروع ہوگئی ہے۔آپ نے سنا ہوگا اور اگر سخت کرفیو لگا دیا جاتا ہے۔ پھر ساری ریلیں الگ بند ہوگئی ہیں۔ اسٹرائک کی وجہ سے ڈاک انتظام بھی ٹھیک نہیں۔ اس لیے اب پوسٹ کر رہی ہوں اور یہ سب ایک وجہ سے اچھا ہی ہوا کیوں کہ اب مجھے آپ کا دوسرا کارڈ مل گیا ورنہ میں پرانے پتے سے بھیجتی تو شاید آپ کو یہ خط نہ ملتا۔ یہ سن کر بے حد مسرت ہوئی کہ اب آپ سینی ٹوریم چھوڑ رہے ہیں۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

نظیر صدیقی کے نام

8-ایف

کراچی-3

29 جنوری 1963

مکرمی! سلام مسنون

آپ کی کتاب* مجھے مل گئی تھی۔ شکریہ۔ مجھے چاہیے تھا کہ آپ کو اس کی رسید کی

اطلاع اسی وقت دے دیتی۔ پھر میں نے سوچا کہ کتاب پڑھ کر آپ کو لکھوں گی۔ کچھ ایسی مصروفیات نکل آئیں کہ اس دوران میں کتاب پڑھ نہ سکی۔ اِدھر اُدھر سے دیکھی ہے۔ پوری کتاب پڑھنے کے بعد ہی آپ کو رائے بھیج سکوں گی۔

دوسرے مصنفین کی بھیجی ہوئی کتابیں بھی یوں ہی رکھ چھوڑی ہیں۔ انھیں پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ اس وقت میں کامو کی کتاب کا ترجمہ کر رہی ہوں۔ یہ ابھی مکمل نہیں ہوا ہے اور مکتبہ جدید کا تقاضا ہے کہ جلد از جلد مکمل کرلوں۔ ترجمہ کے علاوہ وہ دیباچہ کے طور پر کامو، ان کا فلسفہ اور خود وجودی تحریک وغیرہ پر ایک سیر حاصل مضمون بھی چاہتے ہیں۔ لہٰذا اسی کام میں لگی ہوئی ہوں اور ساتھ ہی منٹو کی کتاب بھی مکمل کرنا چاہتی ہوں۔ اب صرف دو باب باقی رہ گئے ہیں۔

ایملی برونٹے اور پیسٹرناک پر کتابچے شائع نہیں ہوئے ہیں۔ بھلا یہاں کون انگریزی کتابیں شائع کرتا ہے؟ پہلی کتاب پی ای این والوں نے شائع کرنی چاہی تھی۔ اسی دوران میں میں یورپ چلی گئی، اور معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ پی ای این نے پھر کتابوں کی اشاعت ہی بند کردی۔ 'درشہوار' غالباً براہ راست USIS یعنی یو ایس انفارمیشن سروس، کراچی سے مل سکے گی۔

مبارکباد کا شکریہ۔ کم از کم انسانوں کے معاملہ میں تو گلڈ کا انتخاب صحیح رہا ہے۔ پچھلے سال ہاجرہ مسرور کا افسانہ 'تیسری منزل' بھی انعام کا مستحق تھا۔

مشرقی پاکستان دیکھنے کی تمنا ہے۔ انشاء اللہ رمضان کے بعد میں وہاں آرہی ہوں۔ امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیازکیش

ممتاز شیریں

(* 'تاثرات وتعصبات')

---

8 ایف
کراچی-3

7 فروری 1963

مکرمی نظیر صدیقی صاحب! آداب

میں نے آپ کی کتاب* کے کئی مضامین پڑھ لیے ہیں۔ آپ کی تنقیدیں شگفتہ انفرادیت لیے ہوئے ہیں، اور ذوق سلیم اور سوجھ بوجھ کا پتہ دیتی ہیں۔ انداز بیان شستہ اور سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ مدلل بھی ہے۔ میں نے آپ کو بحیثیت مجموعی ایک persuasive نقاد پایا۔ آپ کے پاس کہنے کی باتیں کہنے اور انھیں منوا لینے کا گر ہے اور تاثراتی تنقید میں یہ خوبی اور خصوصیت لازمی ہے۔

میں نے خاص طور پر آپ کا منٹو پر مضمون شوق سے پڑھا۔ چونکہ منٹو میرا خاص موضوع ہے۔ آپ نے تقابلی مطالعے کے ساتھ منٹو کی قلمی مرقع نگاری کی امتیازی خصوصیت کو بڑی خوبی سے ابھارا ہے۔ آپ نے اپنی تنقیدوں میں غیر جانبداری اور معروضیت سے کام لیا ہے۔ آپ کی رائیں جچی تلی اور بے لاگ ہیں۔ رشید احمد صدیقی پر مضمون میں البتہ عقیدت کا رنگ بہت واضح ہے۔

میرا خیال ہے کہ آخری مضمون کو (کچھ اپنی صفائی میں) اس کتاب میں شامل ہونا نہیں چاہیے تھا اور تبصرہ نگاروں کی تنقید کا اتنی سنجیدگی سے نوٹس بھی نہیں لینا چاہیے۔

آپ کے سلسلے میں شاہین** نے بھی مجھے خط لکھا تھا۔ آپ کی کتاب انھیں بھی پسند آئی ہے۔ آسانی سے روز ملتے رہتے ہیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ شاہین کو وہاں بھی ادب دوستوں کی صحبت میسر ہے۔

میرا رمضان گزرنے کے بعد ڈھاکہ آنے کا ارادہ ہے۔ مشرقی پاکستان دیکھنے کا شوق ضرور ہے۔

بہترین افسانے کی حیثیت سے 'کفارہ' کے انتخاب پر آپ نے مبارکباد دی ہے۔

اس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔ The Atonement اس کا ترجمہ نہیں ہے۔ میں نے یہ افسانہ پہلے انگریزی میں ہی لکھا تھا۔ چنانچہ The Atonement اوریجنل افسانہ ہے اور 'کفارہ' اس کا ترجمہ۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

(*'تاثرات و تعصبات')

زینت جہاں کے نام

کراچی

20 فروری 1963

میں نے تم کو اپنی کتاب 'میگھ ملہار' تحفۂ عید کے طور پر بھیجی ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ تمھیں میرا افسانہ 'کفارہ' پڑھنے کی بڑی خواہش تھی۔ حقیقت میں یہ افسانہ میں نے انگریزی زبان میں 'The Atonement' کے عنوان سے تخلیق کیا تھا اور اس کا ترجمہ اردو میں 'کفارہ' کی سرخی کے ساتھ کیا۔ انگریزی افسانہ نسبتاً زیادہ موثر ہے۔ یہ کہانی میرے ان اذیت ناک تجربات کی عکاسی کرتی ہے جو مجھے بنکاک میں پیش آئے اور جن کے دوران مجھے اپنے بچہ سے محروم ہونا پڑا اور میں مرتے مرتے بچی۔ تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ یہ افسانہ پاکستانی افسانوی ادب کا ایک شہ پارہ قرار پایا اور اس کی تخلیق پر مجھے گلڈ ادبی انعام سے نوازا گیا۔ یہ انعامات صدر ایوب خاں تقسیم کرتے ہیں۔ سچ کہو تمھیں یہ افسانہ کیسا لگا؟ بلکہ بہتر ہوگا کہ پوری کتاب کے بارے میں اپنی رائے لکھو۔ ہو سکا تو میں تمھیں انگریزی افسانہ 'Atonement' ضرور بھیجوں گی۔ اسے ایک دیدہ زیب اور اعلیٰ درجہ

کے رسالہ کے سالنامہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔

کراچی

22 مئی 1963

دو روز قبل میں نے تمھیں بذریعہ رجسٹری 'Scintilla' میگزین کے سالنامہ کا ایک نسخہ بھیجا تھا جس میں میرا افسانہ 'کفارہ' کا اصل 'Atonement' کے عنوان سے شامل ہے۔ تم نے اس افسانہ کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میگزین کی رسید سے مطلع کرو اور یہ بھی لکھو کہ تمھیں یہ اصل انگریزی افسانہ کیسا معلوم ہوا۔

مجھے یہ جان کر خوشی محسوس ہوئی کہ تم میری کہانیوں کو بہت زیادہ پسند کرتی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے بعض میری اپنی زندگی کی عکاس ہیں۔ یہی بات (کفارہ) 'Atonement' پر صادق آتی ہے، جس کا تعلق ایک ایسی اذیت ناک صورت حال سے ہے، جو مجھے بنکاک میں قیام کے دوران پیش آئی۔

کراچی

یکم ستمبر 1963

تمھارا خط وصول کر کے خوشی ہوئی۔ یہ امر بھی باعث مسرت ہے کہ تمھیں میری کہانی کفارہ کا اصل 'The Atonement' پسند آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل انگریزی افسانہ بہت زوردار اور موثر ہے۔ تمھاری اور تمھارے حلقہ احباب کی جانب سے اس افسانہ کی تعریف و توصیف میری حوصلہ افزائی، تخلیقی تحریک اور رومانی تاثیر کا باعث ہوئی ہے۔

کراچی

31 اکتوبر 1963

اب راولپنڈی میں میرے قیام اور سیر وتفریح کے بارے میں سنو۔ اگرچہ وہاں بمشکل ایک ماہ رہی لیکن برابر سفر میں رہی۔ ہم لوگ مری، ایبٹ آباد، ٹیکسلا کے علاوہ اسلام آباد کی سیر کو بھی گئے جو پاکستان کا نیا دارالخلافہ ہے اور راولپنڈی سے صرف چند میل کے فاصلہ پر ہے۔ راولپنڈی میں ہم ایک بڑے بنگلے میں مقیم تھے جس کے پائیں باغ میں سرد، کھٹا کرنا، شہتوت کے درختوں کے علاوہ سورج مکھی اور رنگارنگ گلابوں کے جھرمٹ تھے۔ چاندنی میں وہاں کے کھلے سبزہ زاروں میں بیٹھ کر سبز چائے پینے میں کیا لطف آتا تھا؟ اس قسم کی کتنی ہی دلکش راتیں ہم نے شکور بھائی اور ان کی دختر عزیزہ سے غپ شپ میں گزار دیں۔ یہ میرے ساتھ پشاور سے آئے تھے۔ میں پشاور میں تقریباً تین چار روز مشکور بھائی اور ان کے اہل وعیال کے ساتھ رہی اور وہاں تقریباً تمام قابل دید مقامات کی سیر کی۔ یونیورسٹی کا شاندار کیمپس، ورسک ڈیم، لنڈیکوتل، تاریخی درہ خیبر اور افغانستان کی سرحد تورخم، کیا تھا جو نہیں دیکھا۔

انقرہ

31 مئی 1964

جس وقت یہ خط تمھیں موصول ہوگا تم یقینی طور پر اپنی جاگیر سے بنگلور واپس آچکی ہوگی۔ خوش قسمت ہو کہ چھٹیاں اپنی ریاست میں مناتی ہو۔ بعض اوقات ہمیں خصوصاً شاہین کو اپنے کافی کے باغوں کی یاد بری طرح ستاتی ہے۔ بدقسمتی دیکھیے کہ گزشتہ سال ہندوستان میں ہوتے ہوئے ہم اس قسم کی کسی ریاست یا جاگیر میں نہیں جاسکے۔ اگر زندگی ہوئی، انشاءاللہ تو اگلی مرتبہ ہم مختلف جاگیروں کی سیر کی انتہائی کوشش کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ تم بھی ہمارا ساتھ دوگی۔

آج کل انقرہ کے شہر کو دلکش اور رنگین بہاریں سنوار رہی ہیں۔ رات بھر ننگے درختوں کی برف سے ڈھکی ہوئی شاخوں پر پتیاں پھوٹتی رہی ہیں۔ اب ہر طرف گہرے رنگ کا سبزہ ہے اور تفریح گاہیں نہایت دلکش اور دلربا نظر آتی ہیں۔ شاہین کے دفتر سے واپس آنے کے بعد جلد ہی ہم تین تین چار چار میل کی طویل سیر پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی قزلی (ہلال احمر) اسکوائر کی طرف جو اتاترک بلواری پر واقع ہے، جا نکلتے ہیں۔ یہ مقام یہاں کا سب سے زیادہ فیشن ایبل شاپنگ سنٹر ہے۔ بعض اوقات طویل سایہ دار اور کشادہ شاہراہوں پر، کبھی کسی پارک میں بیٹھ کر مونگ پھلی یا نمکین پستہ کھاتے ہیں یا شاہین اپنے مخصوص پائپ سے اور میں اپنے سگریٹوں سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم سرِ راہ واقع کیفوں (چائے خانوں) میں شوخ رنگ شامیانوں یا چھتریوں کے تلے جا بیٹھتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں پڑی ہوئی تلخ و شیریں کافی کی چسکیاں لے لے کر گزرتے ہوئے ہشاش بشاش لوگوں کے ہجوم کو تکتے رہتے ہیں۔ پھیکے پھیکے بھورے اور کالے رنگ کے سردیوں کے کپڑوں کی جگہ رنگ برنگے لباس نکل آئے ہیں۔ وزنی اوورکوٹ، دستانوں، جرابوں اور سوئیٹر کو چھوڑ کر ساڑی میں گھومنا پھرنا کتنا لطف دیتا ہے۔ فرصت کے اوقات کی فراوانی ہے، سورج 9 بجے غروب ہوتا ہے اور ہم ایک یا ڈیڑھ بجے رات تک مطالعہ جاری رکھتے ہیں۔ آج کل میں بے پناہ پڑھ رہی ہوں۔ ترکی کی تاریخ، سیاحت نامے، کمال اتاترک پر مختلف کتابیں۔ انقلاب ترکی اور یشر کمال جیسے اعلیٰ پایہ کے ترک افسانہ نویس کی کتابیں۔ یہی نام میں رفیق کے چھوٹے بچہ کا رکھ چکی ہوں۔

انقرہ

12 اکتوبر 1964

اتنی مدت تک تمہارے خط کا جواب نہ دینے پر اپنے آپ کو مجرم سا محسوس کر رہی ہوں۔ اس تمام عرصہ سوچتی رہی کہ تمہیں خط لکھوں پھر ہر بار یہ خیال آیا کہ کیوں نہ لمبا چوڑا

خط لکھوں اور اس طرح التوا ہوتا رہا۔ میں بہت زیادہ مصروف رہی ہوں۔ اپنے گھر اور دوستوں کے گھروں پر کتنی ہی پارٹیاں ہوئی ہیں۔ سرکاری پارٹیاں الگ رہیں۔ باہر کی سفارتی زندگی ہمیشہ ہیجان خیز ثابت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بے تکلف اور دلی دوستوں کے خطوط کو بھی سرکاری خطوط سے جلد از جلد نمٹنے کی خاطر معرض التواء میں ڈال دیا جاتا ہے۔ تبسم * نے اپنی منتخب نظمیں مجھے بھیج کر عین نوازش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خلاف توقع سب نظمیں اچھی ہیں۔ لڑکی اپنی عمر کے مقابلے میں زیادہ ذہین معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ہر نظم میں کوئی نہ کوئی گہری بات مضمر ہے۔ خاص طور پر نظموں کے آخری اشعار کسی ایسے دلی پیغام کے حامل نظر آتے ہیں جس میں گمبھیر پن اور عمق محسوس ہوتا ہے۔ میں نے اس کی یہ نظمیں اپنے چند دوستوں کو دکھائیں تو انھیں یہ معلوم ہو کر تعجب ہوا کہ ان کی خالق ایک دس سالہ بچی ہے۔ خاص طور پر پرویز نے ان نظموں کی بہت تعریف کی چونکہ وہ خود بھی شعر اور آرٹ کا کچھ نہ کچھ ذوق رکھتا ہے۔

(* مکتوب الیہ کی بیٹی)

انقرہ

16 فروری 1965

تم نے اپنے خط میں شمالی ہندوستان کے تفریحی سفر کا حال لکھا ہے۔ ہم نے بھی گزشتہ سال اکتوبر، نومبر میں ترکی کے ایک علاقہ کی سیر کی تھی اور اس خط میں اسی سیر کے بارے میں تمھیں تھوڑا بہت لکھ رہی ہوں۔

پاکستان کو واپس جاتے وقت ہم نے ہندوستان کی بھی سیر کی تھی لیکن دو شہروں کو جہاں پہنچ کر شاید مجھے خوشی حاصل ہوتی، جانا نصیب نہیں ہوا۔ وہ شہر ہیں لکھنؤ اور جے پور۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم دہلی، آگرہ، علی گڑھ، چنڈی گڑھ اور امرتسر کے علاوہ اپنے راستے میں پڑنے والے دیگر بہت سے شہروں اور خصوصاً خوبصورت وادی کانگڑہ کی سیر کر سکے۔

ہم نے اپنے قیام کے دوران وہاں بہت کچھ دیکھا اور خاص طور پر تاج محل کے صاف شفاف اور لطیف حسن نے میرے ذہن پر ابدی تاثر چھوڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاج محل کے نظارہ سے روح کو جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ تاج محل کے حسن و لطافت کا جواب نہیں، اسے ایک سہانے خواب سے تعبیر کیا جاسکتا ہے یا اسے جذبہ اور روح کا ایک البیلا تجربہ کہا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تاج محل ابدی محبت کی ایک یادگار ہے۔ ہمالیہ کے شاندار جاہ و جلال نے بھی مجھے بڑا متاثر کیا جس کی تحیر انگیز عظمت و رفعت خدائے بزرگ و برتر کی شانِ کبریائی کی شہادت دیتی ہے اور ہم وہاں سے بہت قریب محسوس کرتے ہیں۔

یہاں ترکی میں بھی ہم نے رفیع الشان پہاڑ دیکھے اگرچہ وہ ہمالیہ کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں لیکن پھر بھی یہ اپنے تاریخی پس منظر اور دیو مالا کے لیے مشہور ہیں۔

برسا کے مقام پر ہم مشہور و معروف دیو مالائی پہاڑ Olympus (اولمپس) کے اوپر تک گئے۔ برسا اس پہاڑ کے دامن میں نہایت سرسبز و شاداب مقام ہے اور اس کی اسی خصوصیت کی بنا پر یہاں کے لوگ اسے 'Green Bursa' (گرین برسا) کہتے ہیں۔ اولمپس یونانی دیوتاؤں کا استھان ہے۔ ازمیر کے مقام پر ہم Pagasns پہاڑ کی سیر کو گئے۔ یہ پہاڑ یونانی دیو مالا میں شاعری کی علامت ہے۔ ازمیر میں ہومر (Homer) رہتا تھا اور یہیں اس پہاڑ پر اس نے اپنی عظیم رزمیہ 'Illiad and Odessy' تخلیق کی تھی۔ سکندر نے یہاں جو قلعہ تعمیر کیا تھا وہ ابھی تک اچھی حالت میں موجود ہے۔ تمھیں معلوم ہوگا کہ جسے اب مغربی ترکی کہتے ہیں وہ عہد سلف کی 'Hellenic World' ہے۔ ٹرائے آف ہیلن ازمیر کے بالکل قریب ہے اور یہاں پہنچ کر یونانی تاریخ، یونانی دیو مالا اور یونانی ادب ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ یوفیسس (Euphesus) ازمیر سے چند میل دور ہے۔ یہاں ہم نے یونانی اور بازنطینی تہذیب کے عظیم الشان کھنڈرات دیکھے۔ یوفیسس اور پرگمیم (Pergamum) میں Diana کے معبد اور اپالو کے مجسمہ

کے خرابے موجود ہیں۔ میرے اس خط کے لفافہ پر آپالو ہی کے مجسمہ کی تصویر ہے۔ یہیں پر قربانی کی بھینٹ چڑھی 'Ipheginia' کو دوبارہ زندہ کر کے اسے پجارن اور پروہت بنایا گیا۔ ازمیر کے متصل ہی 'Agamemnon Baths' واقع ہیں جہاں ماضی کی تمام روایتیں جیتی جاگتی صورت میں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ یہاں خالص سنگ مرمر کا ایک پورا شہر ہے جس کے گلی کوچے تک مرمر سے بنے ہیں۔ ایک سقفی بازار 'Igora' کے علاوہ بہت سے معبد، محل اور قحبہ خانے بھی ہیں اور قحبہ خانوں کے راستے مردانہ اور زنانہ اعضائے مخصوصہ سے سجے ہوئے ہیں۔ یہاں قرآن شریف اور انجیل مقدس کے قصص و روایات کی تجسیمات بھی دیکھیں۔ 'Ephesus' کو شہر افسوس کہا جاتا ہے۔ یہی وہ شہر گناہ ہے جہاں اصحاف کہف نے بھاگ کر ایک غار میں پناہ لی تھی۔ شہر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر وہ غار ہے جہاں اصحابِ کہف (قرآن شریف کے مطابق) تین سو نو سال تک سوتے رہے۔ اس سے آگے 'کوہِ عنادل' (Mount of Nightingales) ہے۔ ترکی میں اب اسے 'بلبل ڈاگ' کہا جاتا ہے۔ اس کی چوٹی پر دوشیزہ مریم نے اپنی زندگی کے آخری سال بسر کیے تھے۔ حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کے بعد سینٹ جان نامی مبلغ انجیل مریم کو ایشیائے کوچک لے آئے تھے اور مریم کا قیام وہیں رہا۔ ہم نے دوشیزہ مریم کی مقدس قیام گاہ کی بھی زیارت کی اور اس مکان کے زیریں چشموں کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی بھی پیا۔ اس پانی کی شفا پذیری مشہور ہے۔ ہم نے یہاں کچھ دیر قیام کیا اور یہاں کے متین اور مقدس ماحول سے روحانی تسکین حاصل کی۔

برسا اور ازمیر دونوں خوبصورت شہر ہیں۔ ازمیر Aegian Sea کے آس پاس پھیلا ہوا ہے اور ازمیر کو کوہِ پگاسس نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ ایک طرف سمندر اور دوسری جانب پہاڑی سلسلے نے ازمیر کے مناظر میں غیر معمولی دلربائی پیدا کر دی ہے۔ ازمیر قدیم سمرنا کا نام ہے جو تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح کا شہر ہے۔ برسا بھی قدیم شہر ہے جو ابتدائی عثمانی ترک سلطانوں کا دارالحکومت تھا۔ ہر سرما میں سرمائی کھیلوں کا انعقاد کوہ

اولمپس پر ہوتا ہے۔ ہم نے یہاں بس سے سفر کیا اور راستے میں بہت سے دوسرے شہر بھی دیکھے۔ انقرہ سے ازمیر تک کے تقریباً تمام راستے میں پہاڑی سلسلوں کے علاوہ اناطولیہ کے خشک اور بنجر میدان مرتفع سے بھی گزرنا پڑا لیکن ازمیر کے قریب پہاڑ حیرت انگیز طور پر سرسبز و شاداب تھے جو گھنے درختوں اور مختلف قسم کے چیڑ چنار اور دیگر سہی قامت پیڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ازمیر جیسے تین ہزار سال قبل مسیح کے شہر سے ہم پھر انقرہ جیسے جدید ترین اور ماڈرن شہر کو واپس ہوئے۔

جب ہم رات کے وقت انقرہ میں داخل ہوئے تو اس وقت اس کا روپ سہاگ رات میں سجی ہوئی دلہن کی مانند دکھائی دے رہا تھا اور اس شہر کی ہیروں کی طرح چمکتی ہوئی لاتعداد روشنیاں ہمارے استقبال کو موجود تھیں۔

انقرہ

7 مارچ 1965

تم نے میرے نانا 'جان' کی وفات حسرت آیات پر جس خلوص اور ہمدردی سے تعزیت کا اظہار کیا ہے اس پر تمھارا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ وہ بوڑھے اور کمزور ہی سہی لیکن ہمارے گھرانے کا ایک ستون تھے۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے گھر کا ایک ستون گر گیا ہو اور ستون بھی کون سا؟ مرکزی ستون جس سے پورے خاندان کو استحکام حاصل تھا۔ مجھے اب بھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ زندہ ہیں۔ میرا ذہن اس تصور سے مصالحت پر تیار نہیں ہوتا کہ اب جب کہ دوبارہ میسور جاؤں گی تو مجھے وہاں اپنے 'جان' نہیں ملیں گے۔ وہ حقیقت میں ہم سب کی جان تھے۔ میں ان سے ماں اور باپ سے زیادہ پیار کرتی تھی اور وہ ہم سب کے لیے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ ان کا ہم پر بڑا حق ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے پیارے تھے اور انھوں نے ایک مثالی، پاکیزہ زندگی بسر کی۔ انھوں نے دوسروں کے لیے اتنا کچھ کیا کہ اپنی ساری زندگی ہی ہمارے لیے وقف کر

دی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی روح کو بہشت کا دائمی سکون نصیب ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر کتنی حیران ہوتی ہوں کہ اپنے عزیز ترین پیاروں کو کھو کر بھی ہماری زندگی کے معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑتا؟

شاہین آج شام ایک ہفتہ کے لیے استنبول چلے گئے۔ میں گھر پر بالکل تنہا ہوں۔ اتنے بڑے کمرے میں سچ مچ اکیلی اور اسی لیے تم سے باتیں کرنے میں دل بستگی اور تشفی سی محسوس ہو رہی ہے۔ خط در حقیقت بہت بڑی نعمت ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ سامنے بیٹھا ہے۔ اگر چہ میں تنہائی سے تھوڑی سی خوفزدہ ہوں پھر بھی دوسری رہائش گاہوں کا شور اور روشنیاں اس بات کی علامت ہیں کہ میں زندہ انسانوں سے متصل ہی ہوں۔ ہماری رہائش گاہ شہر کے بالکل وسط میں ہے۔ اسی لیے ہر چیز آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہے۔ یہاں گوشت، سبزی، پھلوں اور ڈرائی کلینگ کے علاوہ دوسری دکانیں بھی موجود ہیں جہاں سے ہر چیز مل جاتی ہے۔ ہر روز، میں اشیائے خورد و نوش خود ہی خریدتی ہوں۔ اب تک میں کھانے، پکانے، صفائی، کپڑے اور برتن دھونے کا کام خود ہی کرتی تھی لیکن اب میں نے ایک ترک ملازمہ کا انتظام کر لیا ہے جو صفائی کا کام کرتی ہے اس سے مجھے بڑی مدد ملتی ہے۔ اگر چہ وہ شام 5 بجے چلی جاتی ہے اور تنخواہ کا بھی تو کچھ نہیں صرف 125 سے 150 روپے تک دینا پڑتے ہیں۔ یہاں نوکر بڑی مشکل سے ملتے ہیں اور ہمیں اپنے آپ کو مغرب کے انداز پر ڈھالنا پڑتا ہے جہاں عورتیں گھر کا سارا کام کاج خود کرتی ہیں۔ اگر چہ یہ ہم جیسے لوگوں کے لیے بڑا مشکل ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہم سارا کام نوکروں سے لینے کے عادی ہیں۔ ایک طرح سے یہ اچھا بھی ہے اور اس طور میں اپنے آپ کو بارآور مشقتوں کا کچھ نہ کچھ حامل پا رہی ہوں۔

مجھے کھانا پکاتے وقت ایک نئی لذت محسوس ہوتی ہے۔ ترکی کے کھانے بھی ہمارے کھانوں سے تقریباً ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً سیخ کباب، کوفتہ وغیرہ۔ ان کی بہت سی سویٹ ڈشیں بھی ہمارے شاہی ٹکڑوں، فرنی، چاول کی کھیر اور سیویوں جیسی ہیں۔ یہاں کی دوسری

میٹھی چیزیں بھی بڑی لذت بخش ہیں لیکن گاڑھے شیریں محلول میں ڈوبی ہونے کی وجہ سے نہایت میٹھی ہوتی ہیں۔ عجیب بات ہے کہ مسلمان خواہ کسی ملک سے بھی تعلق رکھتا ہو اس کے کھانے اور پکانے کے طریقے تقریباً ایک جیسے ہیں۔ ترک لوگ بڑے اچھے مسلمان ہیں اور پاکستانیوں سے سچی محبت کرتے ہیں۔ جس کسی سے ہم ملتے ہیں اور جہاں کہیں ہم جاتے ہیں نہایت گرم جوشی سے ہمارا استقبال ہوتا ہے۔ ہوٹل کے ملازمین، دکاندار، یہاں تک کہ گلی کوچوں میں پھرنے والے معمولی لوگ بھی ہمارا خیر مقدم کرتے ہیں اور ہمارے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتے ہیں۔

ہمارے پڑوسی بھی نہایت اچھے اور کار آمد لوگ ہیں۔ خوش قسمتی سے ان میں سے کچھ انگریزی بول لیتے ہیں۔ زبان کی یہاں مشکل ہے کیوں کہ بہت کم ترک انگریزی جانتے ہیں۔ میں تھوڑی بہت ترکی زبان سیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں نے گنتی کے علاوہ سبزیوں، پھلوں، مسالوں اور دوسری ضروریات زندگی کے نام سیکھ لیے ہیں۔ دکانداروں، گوشت فروش اور ملازمہ وغیرہ سے بھی اس زبان میں کام چلا لیتی ہوں۔ لیکن شاہین ابھی اس سے آگے نہیں بڑھے ہیں کہ 'شکریہ'، 'آپ کیسے ہیں؟' یا 'اچھا رخصت' وغیرہ! ان کی فرانسیسی کا بھی یہی حال تھا۔ 'Quest Que Se' سے آگے کبھی نہیں بڑھے۔ البتہ بچوں نے اور میں نے کچھ نہ کچھ فرانسیسی جلد سیکھ لی تھی۔ ہماری رہائش گاہ آرام دہ اور اچھی طرح آراستہ ہے۔ ہم سجاوٹ کی تمام چیزیں پاکستان سے منگا رہے ہیں۔ ان میں وہ اشیاء بھی شامل ہیں جو ہم نے بنکاک میں خریدی تھیں اور پیتل اور سنگ مرمر کی وہ خوبصورت چیزیں بھی جو پاکستان میں خریدی تھیں۔ مجھے امید ہے کہ ان اشیاء سے ہماری رہائش گاہ نہایت عمدہ طور پر سجائی جا سکے گی۔ ہر کمرہ میں نہایت خوبصورت قالین بچھے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ سونے کے کمرے اور برآمدے بھی قالینوں سے آراستہ ہیں۔ علاوہ ازیں خوش نما جھاڑ اور فانوس بھی ہیں۔ غرض کیا کچھ نہیں ہے۔ ان دنوں انقرہ کا موسم بھی خوب ہے۔ زبردست برف باری کے بعد کئی دن سے سورج چمک رہا ہے ویسے

ہماری رہائش گاہ سنٹرل ہیٹنگ کی وجہ سے گرم رہتی ہے۔ ہاں یہاں فرج، کپڑے دھونے کی مشین، صفائی کی مشین، گیس کے چولہے غرض ہر ماڈرن سہولت موجود ہے۔

انقرہ

نہیں معلوم کہ انطالیہ کی تفریح کے بارے میں اب میں تمھیں تفصیل سے لکھ سکوں گی یا نہیں۔ اس تفریح کی یادیں دھندلی پڑ چکی ہیں۔ لیکن پھر بھی میرا ارادہ ہے کہ اپنے ان محسوسات کو کسی وقت مضمون یا انشائیہ کی صورت میں قلم بند کروں۔

انطالیہ کی سیر نے بڑا لطف دیا۔ اس کا قدرتی حسن لاجواب اور سکون بخش ہے۔ بحر روم کے نیلگوں پانی کا نظارہ قابل دید ہے جو کناروں کے پاس فیروزی پھر آگے ہلکا نیلا اور رفتہ رفتہ بیچ سمندر میں گہرا نیلا دکھائی دیتا ہے۔ پس منظر میں 'Tourus' کا پہاڑی سلسلہ ہے جو ایک حسین مرقع سے کم نہیں اور اس کا سایہ دن کے مختلف اوقات میں اس سمندر کے پانی کو عجیب عجیب رنگ بخشتا ہے ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے یہ پہاڑ سراسر سمندر ہی سے اٹھے ہوں۔ ہم نے بہت سے تاریخی مقامات اور کھنڈرات بھی دیکھے مثلاً 'Aspendos'۔ یہیں وہ مقام ہے جہاں سے قلوپطرہ غروب آفتاب کا نظارہ کیا کرتی تھی۔ Manargat کے جگمگاتے آبشار اور بحر روم کے کنارے آباد خوبصورت شہر Alanya بھی دیکھا۔ یہ شہر سمندر سے صف در صف ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہاں ہم نے دو تین خاندانوں میں کچھ دوست بنائے اور ان کی مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوئے۔ جب بھی وہ ہمارے پاس آئے ہم نے بھی ان کی خوب خوب تواضع کی۔ اب بھی Antolya کے ایک خاندان کی تین لڑکیاں چند روز سے ہمارے پاس ٹھہری ہوئی ہیں۔ وہ یہاں یونیورسٹی میں داخلہ کا امتحان دینے آئی ہیں۔ ان کی غپ شپ اور قہقہوں سے آج کل ہمارا گھر گونج رہا ہے۔ یوں میرا دل بہل گیا ہے۔

شاہین ایک سیمینار میں شرکت کی خاطر تقریباً ایک ماہ کے لیے آکسفورڈ گئے ہیں۔

اس سیمینار میں سنٹو اور نیٹو کے اہم اور ذمہ دار افراد شریک ہو رہے ہیں۔

وینس جسے اطالوی زبان میں وینزیا (Venezia) کہا جاتا ہے، نہایت خوبصورت، رنگین اور دلکش شہر ہے۔ ہم یہاں سینٹ مارکو میں ٹھہرے جو سارے وینس میں خوبصورت ترین جگہ ہے۔ Piatza San Maro میں سدا سیکڑوں سیاحوں کی سرگشتی کی وجہ سے گہما گہمی رہتی ہے جو عموماً کبوتروں سے دل بہلاتے نظر آتے ہیں۔ وینس میں سڑکیں نہیں ہیں، صرف نہریں اور پل ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے صرف کشتی یا خوبصورت سی ناؤ استعمال کی جاتی ہے۔ اس ناؤ کو Gondola کہا جاتا ہے۔ یہاں بسیں، کاریں اور ٹیکسیاں بالکل نظر نہیں آتیں۔ یہ سب کچھ نہایت رومان پرور نظارے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وینس چھٹیاں گزارنے کے لیے بہترین مقام ہے۔

انقرہ

29 نومبر 1965

تمھیں یاد ہوگا کہ انطالیہ سے بھیجے ہوئے گزشتہ خط میں تم نے ہمارے مہمانوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس سے قبل بھی میں لکھ چکی ہوں کہ یہ مہمان اکتوبر سے دوبارہ ہمارے ساتھ دو ہفتہ سے زیادہ قیام کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ اس مرتبہ تمام بہنیں نہیں آئیں بلکہ سب سے بڑی بہن اور ان کی والدہ آئی ہیں۔ اس بات پر افسوس ہے کہ اسے انقرہ یونیورسٹی میں داخلہ نہیں مل سکا اور بے نیل و مرام انطالیہ واپس ہونا پڑا۔ اس کی چھوٹی ہمشیرہ کو اساتذہ کے تربیتی کالج میں داخلہ مل گیا ہے اور وہ ہاسٹل میں مقیم ہے۔ میں نے شاید ان کے نام تمھیں نہیں لکھے تھے۔ سب سے بڑی ترکان اس سے چھوٹی مژگان، پھر خندان، مسیحان اور سب سے چھوٹی جانان ہے۔ ان کے دو بھائی آلتان اور گورگان ہیں۔ اور والدہ کا نام خدیجۃ الکبریٰ ہے۔ باپ کا ڈیڑھ سال قبل انتقال ہو چکا ہے اور ان بچیوں میں سے تین جنھوں نے 'میٹرک' تک تعلیم مکمل کر لی ہے، ملازم ہیں اور نہایت خندہ پیشانی

سے اتنے بڑے خاندان کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے والد اور ان کی والدہ نے اپنے شوہر کی وفات کے سانحہ پر جس قوت برداشت کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ یہ لوگ کیساری اور انطالیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور انقرہ اور استنبول کے ترکوں کے درجہ کے سوفسطائی نہیں ہیں لیکن پھر بھی اوسط درجہ کے طرز زندگی کے حامل ہونے کی وجہ سے انھیں بڑی حد تک ماڈرن کہا جا سکتا ہے (حقیقت یہ ہے کہ ترکوں کا طرز رہائش نہایت اعلیٰ ہے۔ ان کی رہائش گاہیں نہایت صاف ستھری اور جدید سہولتوں سے آراستہ ہوتی ہیں۔ خصوصاً فرنیچر، قالینوں کا جواب نہیں۔ پھر ان کی خوراک بھی صحت بخش ہے)۔ ان کا خاندان آٹھ افراد پر مشتمل ہے اور ان کے انطالیہ کے مکان میں صرف تین کمرے ہیں یعنی ایک ڈرائنگ روم اور دو سونے کے کمرے۔ ڈرائنگ روم میں ایک بڑا اور خوبصورت دیوان (تخت) پڑا ہے جس پر کشن اور کور ہٹا کر انھیں سونے کے لیے پلنگ بنا لیا جاتا ہے۔ ماں اور بیٹیوں کی بڑی خواہش ہے کہ ہم لوگ انطالیہ میں دوبارہ ان کے مہمان بنیں اور کم از کم دس دن ٹھہریں۔ وہ وثوق سے کہتی ہیں کہ ہم میں سے تین کو الگ الگ کمرے بھی دے سکتی ہیں۔

لڑکیوں کو ان معنوں میں ماڈرن کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہائی اسکول اور کالجوں میں پڑھتی ہیں۔ مغربی لباس میں 'Jeans' تک پہنتی ہیں۔ بحر روم کے دلفریب ساحل پر تیراکی کرتی ہیں اور جدید ترین موسیقی اور رقص سے واقف ہیں۔ وہ ہماری موسیقی کو جنون کی حد تک چاہتی ہیں اور لتا منگیشکر کی تو پرستش کرتی ہیں۔ ساتھ ہی وہ بڑی حد تک مذہبی قسم کے لوگ ہیں۔ انھوں نے بقرعید پر بھیڑوں کی قربانی دی تھی۔ رمضان کے دوران وہ تمام روزے رکھنے کے علاوہ نماز بھی پڑھتی ہیں۔ البتہ نماز کی سختی سے پابندی نہیں کرتیں۔ دیکھا جائے تو اس سلسلے میں ہم کون سے پابند ہیں۔ نئی نسل عربی رسم الخط سے واقف نہیں اسی لیے نوجوان عربی زبان میں قرآن شریف نہیں پڑھ سکتے لیکن انھیں نماز کی سورتیں یاد ہوتی ہیں۔ انقرہ اور استنبول کے نوجوان نسبتاً زیادہ سوفسطائی ہیں۔ بظاہر وہ غیر مذہبی سے نظر

آتے ہیں لیکن انھیں ٹٹولا جائے تو وہ ہم سے زیادہ بہتر مسلمان ثابت ہوتے ہیں۔ ترک سیدھے سادے ہیں۔ ان میں ریاکاری اور زمانہ سازی نام کو نہیں۔ بڑے بامروت، مخلص اور خوش اخلاق لوگ ہیں۔

لو... میں نے تمھیں ترکوں اور ان کی نئی نسل کے بارے میں بہت کچھ بتادیا۔ تم نے اپنے گزشتہ خط میں ہماری انطالیہ کی مہمان بچیوں کے بارے میں استفسار کیا تھا نا؟

انقرہ

8 اکتوبر 1966

یہ تمھاری نوازش ہے کہ ترکی میں زلزلہ آنے کی وجہ سے تم ہمارے بارے میں اس قدر فکرمند ہو۔ یقین کرو کہ زلزلہ مشرقی ترکی میں آیا تھا اور انقرہ اس سے کسی طور پر بھی متاثر نہیں ہوا۔ یہ زلزلہ ایک اندوہناک سانحہ تھا۔ ہم سب نے اپنے کچھ کپڑے، سوئٹر، چمڑے کے جیکٹ، کوٹ، پتلونیں اور جوتے وغیرہ ایک بڑے سے تھیلے میں بند کر کے متاثرین کے لیے بھیجے ہیں۔ علاوہ ازیں ہم نے کچھ نقد رقم بھی بھیجی ہے۔

اٹلی کے شہر روم اور نیپلز ہم نے بارہ سال قبل بھی دیکھے تھے لیکن اس مرتبہ روم نئے روپ میں تھا۔ اس شاندار اور عظیم تاریخی شہر نے کچھ زیادہ ہی متاثر کیا۔ روم کا ذرہ ذرہ اس کی گزشتہ عظمت کے گن گاتا ہے۔ نیرو کے Collosseum سے اور جولیس سیزر، آگسٹس اور طروجان کے فورم کے کھنڈرات سے اب بھی ماضی کی شان و شوکت جھلکتی ہے اور ان جگہوں کو دیکھتے ہی ذہن ایک دم ماضی کی داستانوں میں کھو جاتا ہے۔ کبھی خیال آتا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں انٹونی نے سیزر کی میت پر اپنی مشہور عالم تقریر کی تھی اور کبھی کچھ کبھی کچھ۔

فلورنس بھی ایک خوبصورت قدیم شہر ہے۔ اس شہر کو احیائے آرٹ کا گہوارہ کہنا چاہیے۔ یہاں اور روم میں ہم نے کلاسیکل آرٹ، پینٹنگز اور مجسموں کے ایسے بے شمار

نمونے دیکھے جنھیں ان کے دور کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ میں نے Micheal Angelo کے مجسمہ David سے زیادہ بے عیب مجسمہ اپنی ساری زندگی میں نہیں دیکھا۔ اسی بت ساز کا Moses کا مجسمہ اور سینٹ پیٹرز کیتھڈرل میں دوشیزہ مریم کی گود میں Christ (حضرت عیسیٰ) والا مجسمہ بھی قابل تعریف ہے۔ Cistin نامی گرجا کی چھت پر مائیکل اینجلو نے جو پینٹنگز کی ہیں وہ بھی شاندار ہیں۔ ان تصویروں میں آدم اور حوا کی تخلیق دکھائی گئی ہے۔ آدم کو دانۂ گندم کھانے کی ترغیب دینا، آدم کا دانۂ گندم کھانا اور جنت سے نکالا جانا، ان نقّاشیوں کے موضوعات ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں Micheal Angelo, Raphael اور Bernini Cellini جیسے مصوروں کے مشہور زمانہ شاہکار دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ ہم نے Raphael کی مشہور پینٹنگز Madonna Boticelli's Venus کے چربے بھی خریدے۔

آرٹ کے اتنے زیادہ حسن پاروں سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم وینس پہنچے۔ یہ شہر خود حسن کا مرقع ہے۔ سارا شہر سمندری نہروں سے مزین ہے۔ انسان نے بھی اس شہر کے حسن کو فروغ بخشنے میں بہت محنت کی ہے۔ روم کی عظیم اور رفیع الشان عمارتوں کے مقابلہ میں وینس کی عمارتیں اپنی نزاکت اور نفاست کی وجہ سے ایسی نظر آتی ہیں جیسے ہاتھی دانت سے تراش کر بنائی گئی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ وینس تعطیلات سے لطف اندوز ہونے کے لیے بہترین مقام ہے۔ اور یہ شہر نہایت رومان پرور، خوبصورت اور دلکش ہے۔ ویانا بھی ایک نفیس اور خوبصورت شہر ہے۔ یہاں کے Hapsburg سلاطین کا محل Schonbrunne لاجواب ہے۔ شاید میں نے اپنی ساری عمر میں تعمیری آرٹ کا ایسا شاندار نمونہ نہیں دیکھا۔

آسٹریا کی شہرت اس کے قدرتی حسن کی وجہ سے ہے۔ یہاں کی سرسبز و شاداب پہاڑیاں، وادیاں، گھاٹیاں خوب خوب دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ یہاں آٹھ سو پارک اور پبلک گارڈن ہیں ان میں سے بعض تو صرف نادر گلابوں کے لیے مخصوص ہیں۔

ہنگری کا شہر بڈاپسٹ رقبہ اور دل آویزی میں ویانا پر فوقیت رکھتا ہے۔ بڈا اونچی پہاڑیوں پر پھیلا ہوا ہے اور اس کے محلات گرجوں اور زرق برق پارلیمنٹ ہاؤس کا عکس دریائے ڈینوب کے نیلے پانی میں پڑتا ہے۔ پسٹ دریا کے دوسرے کنارے پر میدان میں آباد ہے۔ یہاں ہم نے ہنگری کا لذیز ترین طعام نوش کیا اور وجد آور موسیقی سنی۔ تمھیں معلوم ہوگا کہ ویانا بھی موسیقی کے لیے مشہور ہے۔ روم اور فلورنس میں مصوروں کا راج ہے تو ویانا اپنے موسیقاروں سے آباد ہے۔ Franz Listz, Beethoven 'Mozart یہاں کے مشہور موسیقار ہیں اور Stranss بھی جس کو رقص کا بادشاہ کہنا چاہیے کیوں کہ اسی نے رقص کی مشہور دھن Blue Danube ترتیب دی تھی۔

یوگوسلاویہ کا بلغراد اور بلغاریہ کا صوفیہ بھی دلکش شہر ہیں۔ ان شہروں میں بھی وسیع چوراہے اور سایہ دار شاہراہیں ہیں لیکن یورپ کے دوسرے خوبصورت شہر دیکھنے کے بعد ان دوشہروں کا حسن زیادہ متاثر نہیں کرتا۔

البتہ دنیا کے ایک قدیم ترین اور عظیم الشان دارالحکومت استنبول کا جواب نہیں۔ اس شہر کے مختلف نام رہے ہیں۔ بازنطینیہ، نیا روم، قسطنطنیہ، استنبول وغیرہ۔ اسے مہا آنند (روحانی مسرت) کا استھان کہنا چاہیے۔ یہی وہ شہر ہے جہاں دو سمندر اور دو براعظم بحیرۂ اسود اور بحیرۂ مارمورا کے مقام پڑتے ہیں۔ ان دونوں سمندروں کو خوبصورت باسفورس ملاتا ہے۔ یہ شہر دو براعظموں پر پھیلا ہوا ہے۔ ایک طرف ایشیا ہے اور دوسری جانب یورپ۔ سات پہاڑیوں پر آباد یہ شہر اور اس کی ہزاروں مسجدوں کی فضا میں دور تک پھیلے ہوئے شاندار گنبد، بلند اور نفیس مینار اور ایک عجب روح پرور نظارہ پیش کرتے ہیں۔ یہی شہر ہے جو کبھی اسلام کے لیے باعث فخر تھا اور سلطنت عثمانیہ کا دارالخلافہ تھا۔ استنبول نے ہمیں بہت ہی متاثر کیا۔ ہم تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ شاید ہی استنبول جیسا کوئی اور شہر ہو۔ یورپ کے دوسرے شہر اگر وسیع اور شاندار ہیں لیکن وہ صرف شہر ہیں اور استنبول اپنے تنوع کی وجہ سے ایک چھوٹی سی دنیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ استنبول بے مثال شہر ہے۔

استنبول جیسے بارونق اور آباد شہر سے اب ہم صاف ستھرے جدید اور پرسکون شہر انقرہ کو واپس آ چکے ہیں۔ سیر وتفریح کی ہیجان خیزیاں ختم ہو چکی ہیں اور زندگی ایک بار پھر معمول پر آ چکی ہے۔

(ترجمہ: شرر نعمانی)

اسلام آباد

7 اپریل 1967

ہم نے گھر بدل دیا ہے اور پھر نئے گھر میں منتقل ہو رہے ہیں۔ تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔ انقرہ سے کراچی، کراچی سے اسلام آباد اور خود اسلام آباد میں بھی ہوسٹل سے پہاڑیوں کے نزدیک ایچ ٹائپ کے گھر میں اور وہاں سے شہر کے وسط میں ایک دوسرے گھر میں۔ ہم مسلسل حرکت میں رہتے ہیں خواہ ہم ملک سے باہر نہ بھی ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے 'ہمارے پاؤں میں چکر ہے'۔

اسلام آباد کی خاص کشش اس کی تازہ ہوا سبزہ اور دیہی علاقے کا فطری حسن ہے جس کے ساتھ اسے ایک جدید شہر کی تمام سہولتیں بھی مل گئی ہیں۔ فطرت یہاں اچھوتے حسن کے ساتھ موجود ہے۔ ہر طرف سے مری کی خاکستری رنگ کی پہاڑیوں سے گھرا ہوا اسلام آباد نہایت خوش منظر ہے چنانچہ اس کے مختلف حصوں کو بھی رومانی اور اشاریاتی قسم کے نام دیے گئے مثلاً روپ، پھلواری، گلشن، سنبل، کہسار، آب پارہ۔

بازار کا نام آب پارہ ہے اور ایک دوسرا استھی بازار بھی ہے جو کہ ترکی سقفی بازاروں کی طرح ہے۔ اسلام آباد بعض بہت عمدہ اور ٹھوس قسم کے تعمیری کمالات کے ساتھ ترقی کی جانب گامزن ہے۔ مثلاً سکریٹریٹ، گورنمنٹ ہوسٹل وغیرہ اور گورنمنٹ ہوسٹل تو ایک جدید طرز کا لال قلعہ معلوم ہوتا ہے۔ جگہ جگہ مغل طرز کے باغات، ایئر کنڈیشن مسجدیں اور ہر قسم کی آمدنی کے لوگوں کے لیے نہایت آرام دہ اور جدید طرز کے مکانات، ایک طرح سے

اسے معجزانہ تخلیق کہنا چاہیے۔ ایک خالی بیابان میں تین سال کے اندر ایک پورے شہر کا آباد ہو جانا کمال ہی تو ہے۔ لیکن ابھی پوری زندگی یہاں نہیں آئی، ابھی کچھ وقت لگے گا۔

خصوصاً بیرون ملک سے واپسی پر یہاں کی سوشل زندگی میں بوریت محسوس ہوتی ہے۔ باہر کی سفارتی سروسوں میں مراعات اور سوشل لائف کی تو کیا بات ہے میں اب بھی ترکی اور وہاں کے شاندار لوگوں کو یاد کرتی ہوں۔

اسلام آباد

19 مئی 1967

یہاں زندگی بے مزہ اور بے کیف ہے۔ وقت گزرتا ہی نہیں۔ یہاں میرا باغ کی رکھوالی کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔ ہم زیادہ تر اپارٹمنٹوں میں رہے ہیں یا فلیٹوں میں اور اب پہلی بار ہمیں گھر کے ساتھ باغیچہ نصیب ہوا ہے۔ کاش کہ آپ اور حنیف بھائی یہاں ہوتے اور باغبانی میں میری رہنمائی کرتے۔ عمدہ اور نادر قسم کے پودے حاصل کرنے میں تمہارے ذوق اور علم سے فائدہ اٹھاتے لیکن اپنے گھر کے باغ میں پھول اگانے کا اور لطف ہوتا ہے اور کسی عارضی قیام گاہ میں جو اپنی نہ ہو پھول اگانا اور ہوتا ہے بہر حال ایک خاص حد تک اس میں بھی لطف آتا ہے۔ گھر کے سابق مکین کے چھوڑے ہوئے باغ میں پھول تو معمولی سے ہیں لیکن بہت اچھے آگے اور پیچھے بڑے بڑے چمن ہیں۔ کچھ گلاب کی پنیریاں گیندے اور کچھ چھوٹے پھول موجود ہیں جن کے نام مجھے نہیں آتے اور جن کے مختلف رنگ ہیں۔ میں پھولوں کو صبح سویرے پانی دیتی ہوں۔ میں ساڑھے چار بجے اذان کی سریلی اور روح پرور آواز کے ساتھ جاگتی ہوں جو کہ ایک نہایت خوبصورت تاج محل کے نمونے کی بنی ہوئی ایک چھوٹی اور بے مینار مسجد سے آتی ہے اور ہمارے گھر کے بالکل سامنے ہے پانچ بجے صبح کی نماز پڑھتی ہوں اور پھر صبح کی سہانی فضا میں باغ میں نکل جاتی ہوں اور پودوں کو پانی دینا شروع کر دیتی ہوں۔ اس میں مجھے بڑا لطف آتا ہے۔ پہاڑی

کے دامن والے گھر میں میری واحد خوشی پہاڑی کے سلسلے اور پھلوں کے باغات کے ساتھ ساتھ چہل قدمی تھی۔ (اکثر اس سے مجھے اپنی کانی کی زمینیں یاد آتی تھیں) جہاں کی ہوا مہکے ہوئے پھول کی خوشبو سے بھری ہوتی تھی اور آم کے بور کی نشیلی خوشبو اور بے شمار رنگ رنگ کے پرندے درختوں پر زور زور سے چہچہاتے تھے اور کوئل کی کوک اور پپیہے کی پی کہاں سنائی دیتی تھی۔

اسلام آباد

27اپریل1968

...میں اس مضمون کی نقول حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو میرے بارے میں مشہور روزنامہ 'جنگ' میں شائع ہوا تھا اور چاہتی تھی کہ یہ مضمون تمھیں اور اپنی بہنوں کو اور صادق بھائی کو مطالعے کے لیے بھیج دوں، مجھے دو فالتو کاپیاں ملی ہیں جس میں سے ایک میں تمھارے پاس بھیج رہی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ 'پاکستان ٹائمز' کے عید نمبر میں چھپنے والے اپنے مقالے کی زائد کاپی حاصل نہ کر سکی۔ یہ مضمون 'ترکی میں رمضان اور میٹھی عید' پر تھا۔ میں نے صادق بھائی سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی کاپی تمھیں دے دیں۔ یہ ایک ہلکا پھلکا مضمون ہے جو کہ سرسری طور پر لکھا گیا ہے لیکن جن ترکوں نے بھی اسے پڑھا وہ اس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہمارے نہایت اچھے دوست کرنل کان دوریان نے مجھے انقرہ سے لکھا کہ ترکی میں جس نے بھی اس مضمون کو پڑھا اس سے متاثر ہوا اور اس مضمون میں ترکوں سے جن خلوص اور محبت کا اظہار کیا گیا ہے اس سے وہ بھی آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے ان کو خط میں لکھا کہ جو محبت ترکوں کو ہم سے تھی اس کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں۔

آج کل اسلام آباد کا موسم بہت اچھا ہے۔ ابھی تک بہار ہے اور عجیب عجیب پھول کھلے ہوئے ہیں اور ٹھنڈے زمردیں چمن نظر آتے ہیں۔ ہمارے باغ میں پنونیا، کچھ

گلاب، ڈایاتھس اشرنی پال پاکس وغیرہ ہر طرف اُگ رہے ہیں اوران میں رنگارنگ کے پھول ہیں پچھواڑے سبزیوں کے باغ سے ہم نے بہت سی مولیاں اور سلاد لگایا ہے اوراب ٹینڈے اور بھنڈی (یہ ایک نئی سبزی ہے جو کہ بنگلور میں نہیں ملتی)، خربوزے، ٹماٹر، کدو وغیرہ کا وقت ہے۔

اسلام آباد

19اپریل1969

آج کل موسم نہایت اچھا ہے۔ موسم بہار کی بارشیں ہو رہی ہیں اور ہر طرف حقیقی بہار ہے۔ ہمارے شاندار چمن میں بھی کہیں کہیں رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ میرے کمرے کے پاس ایک چنبیلی کی بیل ہے جس سے رات کو ہلکی ہلکی خوشبو آتی ہے۔ کئی رنگوں کے گلاب ہیں، کچھ پنیریاں فلاکس وغیرہ ہیں لیکن ایک اور ماہ گزر جائے تو اسلام آباد گرمی سے ابلنے لگے گا۔ میں دعا کرتی ہوں کہ گرمی ذرا ٹل جائے کیوں کہ میں گھر کا تمام کام کاج خود کر رہی ہوں۔ ہمارا خانساماں جو کہ ہمارا واحد ملازم ہے ڈھائی ماہ کی طویل چھٹی پر گیا ہے اور میں کوئی دوسرا خانساماں رکھنا نہیں چاہتی۔ میں سودا سلف بھی خود لاتی ہوں جو کہ درحقیقت اسلام آباد میں ایک خوشگوار کام ہے۔ ستھی بازار میں جو نہایت ستھرا ہے اور جہاں دکاندار نہایت مہذب اور با ادب ہیں اور خاص گاہکوں پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ میں ہمیشہ خاص اور چہیتے گاہکوں میں شمار ہوتی ہوں۔ انقرہ میں بھی اور یہاں بھی۔ اس چھت سے ڈھکے ہوئے بازار میں گوشت اور سبزی سے لے کر کپڑوں تک اور چاندی کے زیورات تک کوئی بھی چیز مل جاتی ہے۔ یہ مارکیٹ ہمارے گھر سے صرف چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے اور صبح یا شام سیر کے لیے نہایت خوشگوار منظر پیش کرتی ہے۔ خریداری، صفائی...اور کپڑے دھونے اور کھانا پکانے میں صبح وشام بسر ہو جاتے ہیں۔ شاہین تین بجے دفتر سے آتے ہیں اور جب ہم کھانا کھاتے ہیں تو پونے چار بج چکے ہوتے ہیں اور پھر ہم تھوڑی دیر آرام کر کے

ساڑھے پانچ یا چھ بجے شام کی چائے پی لیتے ہیں اور لمبی سیر کو نکل جاتے ہیں۔ دوستوں سے مل لیتے ہیں اور واپس آ کر آدھی رات تک کتابیں پڑھتے ہیں۔ کوئی اچھا پروگرام ہو تو کسی ہمسائے کے گھر میں ٹیلی ویژن دیکھ لیتے ہیں۔

سب سے سریلی آواز اذان کی ہے جو سنبل کے علاقے والی مسجد سے آتی ہے۔ جس کی تصویر میں نے تمھیں بھیجی ہے مسجد کی تصویر سے اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ حقیقتاً کتنی خوبصورت ہے۔ یہ سادہ خوبصورت اور بہت جدید قسم کی مسجد ہے۔ ہاں تم درست کہتی ہو اسلام آباد ایک خوبصورت جدید شہر ہے۔ جس میں دیہاتی اطراف کے حسن اور جدید عمارات اور رہائش گاہوں کا امتزاج ملتا ہے اور زندگی کی تمام جدید سہولتیں میسر ہیں۔ جو چیز اس کو خوش منظر بناتی ہے وہ اردگرد کی پہاڑیاں ہیں۔ کچھ فاصلے پر ایک بند... راول بند اور راول جھیل واقع ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جس سے راولپنڈی کا نام نکلا ہے۔ سفارت خانے اور سفارتی دفاتر راول جھیل کے قریب ہی آئندہ کسی وقت بنائے جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اسلام آباد کی عمارتیں فرداً فرداً بھی بہت خوبصورت اور پراثر ہیں۔ سکریٹریٹ کے بلاک، گورنمنٹ ہوسٹل، ہوٹل شہرزاد وغیرہ ان میں خوبصورتی یہ ہے کہ ان میں جدید طرز تعمیر کو ہمارے اپنے ہاں کے نقشوں اور نمونوں سے ملا دیا گیا ہے۔ مثلاً مختلف رنگوں اور نمونوں میں مغل طرز کی جالیاں زیادہ تر سفید مغل بارہ دریاں، محرابیں ہر جگہ پر اسلامی اور مغل طرز تعمیر کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، ہر طرف مغل باغات ہیں گویا کہ چھوٹے چھوٹے شالامار ہیں۔ رہائشی مکانات نہایت اچھے ہیں اور ہر آمدن کے لوگوں کی ضروریات کے مطابق بنائے گئے ہیں۔ اور ان میں جدید سہولیات مثلاً گیس اور بجلی سے پانی گرم کرنے کے گیزر، چھت کے پنکھے لگائے گئے ہیں۔ چھوٹے بنگلے جن میں جگہ کو بڑے مفید طریقہ سے استعمال کیا گیا ہے اور بڑے بڑے چمن بنائے گئے ہیں۔ پرائیویٹ مکانات جن کو سفارت خانوں، سکریٹریوں اور وزیروں نے کرایہ پر لیا ہوا ہے جن کے کرائے فی ماہ چار ہزار تین ہزار یا اس سے بھی زیادہ ہیں، دیکھنے کے قابل ہیں۔ ہر شاندار بنگلہ کسی نئے طرز کا ہے۔

مجموعی طور پر اسلام آباد نہایت پرشکوہ معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اسے حصہ بہ حصہ دیکھیں تو مجموعی طور پر یہ کسی اچھے منصوبہ بندی سے تیار کیے ہوئے شہر کا نقشہ نہیں پیش کرتا۔ جس یونانی انجینئر نے اس کا نقشہ بنایا ہے اس کا کہنا ہے کہ یہ مستقبل کا شہر ہے اور اس لیے اس کا کوئی 'مرکز' نہیں۔ یہ قطعوں میں تعمیر ہوا ہے اور ہر قطعے میں اپنے خاص ٹائپ کے کوارٹروں کے ساتھ ساتھ اپنی مسجد اور اپنی مارکیٹ بھی ہے۔ مستقبل کے شہر کے بارے میں ماہر تعمیرات کا جو بھی خیال ہو میں تو چاہتی ہوں کہ اسے ویانا کی طرح دائروں میں بنایا جاتا یا قدیم روم کی طرح اس کے زیادہ ہجوم والے بازاروں میں بڑے بڑے چوک بنائے جاتے جن میں بت، فوارے، باغات ہوتے جہاں لوگ گزرتی ہوئی ٹریفک کے خطروں سے بچ کر بیٹھ سکتے اور ٹریفک کا نظارہ کر سکتے یا پھر اسے پیرس یا کسی دوسرے فرانسیسی شہر کی طرح بنایا جاتا۔

بہرحال یہ بہت پیارا شہر ہے شیشے کی طرح صاف وسیع میدانوں، سبزہ زاروں، ہواؤں اور سکون کا گہوارہ۔ کم از کم فی الحال تو ہمارا دل کراچی جانے کو نہیں چاہتا۔ بے پناہ آبادی، گرد و غبار، شور اور غلاظت والا کراچی۔ دیکھئے کب تک ہم اسلام آباد میں ٹھہر سکتے ہیں اور اگر ہمیں یہاں سے جانا ہو تو خدا نے چاہا تو پھر ہم ملک سے باہر جانے کو ترجیح دیں گے۔

اسلام آباد

5 فروری 1970

میں یوم منشور پر 'پاکستان ٹائمز' کا ایک تراشہ اس خط کے ساتھ بھیج رہی ہوں۔ تصویر میں تم مجھے بائیں سے دوسرے نمبر پر دیکھ سکتی ہو۔ میں تمھیں وہ تصویر بھی بھیج رہی ہوں جس کا میں نے عرصے سے وعدہ کیا تھا۔

پیاری زینت اس بات کا امکان ہے کہ ہم اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹرز میں متعین ہو

کر نیویارک چلے جائیں تاہم ابھی تک اس بات کا یقین نہیں ہے لیکن اگر احکامات آ جائیں تو ہوسکتا ہے کہ ہم بہت مختصر نوٹس پر چلے جائیں اس لیے میں تم سب سے خطوط جلدی جلدی حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ تم سے، عالم سے، نجمہ سے اور صادق بھائی سے۔

ہم نے 'اسٹرنیڈ ویکلی' کا عید نمبر بھی دیکھا۔ جب تم نے مجھے قرۃ العین کے مقالے کا لکھا تو شاہین یہ نمبر میرے لیے دفتر سے نکلوا کر لے آئے۔ قرۃ العین جیسا کہ تم جانتی ہو میری ہم عصر اور ذاتی دوست ہے۔ ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے میں اس کی قدر کرتی ہوں اور بلاشبہ وہ جدید اردو ادب میں نہایت بلند مقام رکھتی ہے۔ مجھے اس کی کہانیاں اور سوانحی مضامین جو ویکلی میں چھپا کرتے ہیں پسند ہیں لیکن عید نمبر کے مضمون کے بارے میں میرا خیال جدا ہے اس نے اکثر اپنی مربوط کلچر والی تھیم کو دہرایا ہے خصوصاً یہ کہ ہندو مسلمان مشترکہ تہذیبی وراثت رکھتے ہیں میں یہاں اس سے اختلاف رائے کا ذکر نہیں کر رہی جو کہ ہمارے درمیان ہے۔ میں تو سری کے برِاعظم کا جو تجزیہ نراد چودھری نے کیا ہے اس کو زیادہ ترجیح دوں گی۔ مقالہ بجائے خود ناہموار اور بے تناسب ہے اور اس میں بے حد وسیع بنیاد پر ایک معمولی نکتہ ثابت کرتے ہوئے اپنے علم کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (شاہین یہ الزام مجھ پر بھی لگاتا ہے) جو کہ فرضی ہے۔ سنجیدہ چیزوں کو ہلکے انداز میں پیش کیا گیا ہے جیسے "اسرائیلی کبھی کبھار مندر میں ناچنے والی لڑکیوں سے چھیڑ خانی کرتے تھے اور ان کے خدا نے ان پر قہر نازل کیا" یا "آیئے بے چارے صوفیوں کے پاس چلیں"۔ یہ ایسی صریح غلط بیانیاں ہیں جیسے "فاطمہ محمد کی اکلوتی بیٹی تھیں" وغیرہ۔ اس طرح تاریخی حقائق بھی غلط بیان کیے گئے ہیں۔

شاہین جن کو تاریخ اور اسلامی تاریخ پر کافی عبور ہے اسے ایک کمزور مقالہ سمجھتے ہیں۔ قرۃ العین کے لیے بہتر ہوگا کہ اپنے فن کو ناول نگاری تک محدود رکھے کیوں کہ وہ جب تاریخ میں اپنا راستہ بناتی ہے تو بے شمار خالی جگہیں رہ جاتی ہیں اور تاریخی حقائق تمام تر غلط ہو جاتے ہیں۔

قرۃ العین خود ویکلی کے ایڈیٹروں میں سے ہے اور اس سے اس نمبر کو زیادہ بہتر طور سے ایڈٹ کرنے کی امید تھی۔ اس میں اسلام کے بارے میں صرف ابتدائی قسم کی باتیں کی گئی ہیں اور اگر اس کا مقابلہ آئندہ نمبر یعنی کرسمس نمبر سے کیا جائے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ یہاں عیسائیت کا گہرا ادراک موجود ہے اور اس کی اچھی نمائندگی کی گئی ہے جس کسی نے بھی کرسمس نمبر کو ایڈٹ کیا ہے اس نے ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے اور اچھا کام کیا ہے۔ عید نمبر کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا۔

اسلام آباد

23 اپریل 1970

امید ہے کہ جلد خط نہ لکھنے پر مجھے معاف کرو گی۔ مجھے تمھارا خط وقت پر ملا اور کالج کا رسالہ ینارٹ بھی جس میں تبسم کا پیارا مضمون ہے۔ تبسم کتنے شگفتہ اور برجستہ انداز میں لکھتی ہے۔ انگریزی میں بھی اس کا طرز بیان بہت اچھا ہے فطری، سہل اور زوردار۔ مجھے تو معلوم ہوا کہ اس رسالے میں تمام لکھنے والوں نے اچھی انگریزی لکھی ہے۔ ہمارے زمانے کے مقابلے میں انگریزی کا معیار بلند ہو گیا ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ طلبا انگریزی اسکولوں میں پڑھے ہوئے ہیں؟ تم جانتی ہو کہ ہم اپنے زمانے میں 'استثنا' تھے۔ تم بی اے میں انگریزی میں اول آئی تھیں۔ میں بھی یونیورسٹی میں فسٹ آنے والی تھی لیکن انگریزی کے پرچے میں مجھ سے پورا ایک سوال رہ گیا تھا جس کے 33 نمبر تھے۔ اس کو اگر میں حل کرنے کی کوشش کرتی اور صرف 10 نمبر تک لے لیتی تو فسٹ آجاتی۔ ایک ہندو لڑکی ویدیہی جو کلاس میں ہمیشہ سیکنڈ آیا کرتی تھی انگریزی میں یونیورسٹی بھر میں اول آئی اور میں جو اس لڑکی سے ہمیشہ آگے ہی رہتی تھی یہ فاش غلطی سرزد کر بیٹھی۔ مجموعی طور پر میں نے فسٹ ڈویژن لیا اور سوشیالوجی میں سب سے اول آئی لیکن انگریزی میں اول نہ آنے کی کسر پوری نہ ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ تمھاری اور میری انگریزی اچھی کتابیں پڑھنے سے بہتر

ہوئی تھی۔ اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے میں انگریزی میں سیکنڈ ڈویژن لینا بہت بڑی بات تھی۔ فسٹ ڈویژن تو ہوتے ہی نہیں تھے اور ذہین طلبا بھی انٹر اور بی اے میں سیکنڈ کلاس ہی لیا کرتے تھے۔

اسلام آباد

5 جون 1970

اس سال گرمی بہت جلدی شروع ہو رہی ہے۔ ٹمپریچر ابھی سے 102 درجہ تک پہنچ چکا ہے۔ موسم بہار کا احساس صرف ایک ماہ کے لیے ہوا تھا اور بس۔ یہاں کی گرمی کس قدر گھٹن پیدا کرنے والی ہے۔ اگر میں دھوپ میں نکلوں تو تمام جسم اور چہرے پر گرمی دانے اور پھنسیاں نکل آتی ہیں۔ اس لیے مجبوراً مجھے گھر میں رہنا پڑتا ہے۔ شام کو ہم یا تو دوستوں سے ملاقات کرنے چلے جاتے ہیں یا ہمارے دوست ہم سے ملنے آجاتے ہیں اور ہم اپنے فراخ چمن میں رنگارنگ گلابوں میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں اور رات گئے تک باتیں کرتے رہتے ہیں۔ انار یا فالسے کا خوب ٹھنڈا شربت پیتے ہیں یا پھر کھانے کے بعد سبز چینی چائے پیتے ہیں۔ ہمارا شام کا کھانا بھی ایک ٹرالی میں لان پر لایا جاتا ہے۔ کباب یا تکوں کا سادہ سادہ سا عشائیہ، نہ چاول اور نہ روٹی۔ آدھی رات کے وقت جب ہم اپنے سونے کے کمروں میں جاتے ہیں تو وہ تنور کی طرح تپ رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہمسائے باہر چمن میں ہی سو جاتے ہیں لیکن ہم ایسا نہیں کرتے۔

اب اس وقت دوپہر کے دو بجے ہیں اور میں چھت کے پنکھے کے نیچے ٹیک لگا کر تمھیں خط لکھ رہی ہوں۔ پنکھا گرم ہوا دے رہا ہے۔ میں ٹھنڈا شربت روح افزا پی رہی ہوں۔ یہ وہ مشروب ہے جو اندر سے بھی بدن کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ میں ابھی ابھی آبپارہ مارکیٹ اور ویلفیئر اسٹور سے مہینے بھر کا سودا لے کر آئی ہوں۔ میں تم کو خط لکھ رہی تھی اور پہلا صفحہ لکھا ہی تھا کہ ہمارے ہمسائے مسٹر جاوید جائنٹ سکریٹری کی اہلیہ مسز جاوید کا فون آگیا

اس نے دفتر سے کار منگوالی ڈرائیور بھی حاضر تھا انھوں نے کہا اگر چیزیں لینے کے لیے جانا ہے تو آجائیں میں نے کہہ دیا کہ اچھا۔

اگرچہ ہم کار میں گئے لیکن گرمی نے پھر بھی مجھ پر اثر کیا اور جب میں لکھنے بیٹھی تو جو لکھ رہی تھی اس سے بھٹک گئی جو کچھ میں کہنا چاہتی تھی وہ یہ ہے کہ میں بڑے فکر میں ہوں کہ میرے خطوط آپ تک پہنچتے بھی ہیں یا نہیں۔ میں انھیں باورچی یا چوکیدار کو دے دیتی ہوں کہ ڈاک میں ڈال دے۔ ان میں سے بعض کے جواب مجھے نہیں آئے۔ اگر تمھیں میرے خطوط ملتے ہیں تو براہ کرم جلدی جواب دیں۔ ان میں اتنا پیار اور اتنی کارآمد باتیں ہوتی ہیں کہ نہ پوچھو پھر یہ تمام نہایت عمدہ انگریزی میں لکھے ہوتے ہیں اس کے علاوہ میرے لیے تم یہاں اور بنگلور کے درمیان واحد رابطہ ہو۔

اسلام آباد

10 اگست 1970

میں تمھیں کیا معذرت پیش کرسکتی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ خط لکھنے کے لیے میں زندہ بھی نہ رہتی۔ پچھلے تمام مہینے میں سخت بیمار رہی ہوں۔ حرارت مسلسل 104 سے 107 تک رہتی تھی اور اگر کچھ کم بھی ہوتی تھی تو 102 تک آجاتی تھی۔ لیکن نارمل کبھی بھی نہیں ہوئی۔ پورے دس دن اسی حالت میں گزرے چند دن بعد پھر ویسی حالت ہوگئی۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی اندرونی بیماری ہوگئی ہے اور پہلے ڈاکٹر بھی اس کی تشخیص نہیں کرسکے کہ یہ ملیریا ہے یا ٹائیفائڈ اور حرارت کے اس قدر بڑھ جانے کی کیا وجوہات ہیں۔ پہلے وہ مجھے کونین کی گولیاں دیتا رہا پھر جب بیماری کا پتہ لگ گیا تو اس نے نہایت طاقتور قسم کی جراثیم کش ادویات دیں۔ میں نے 64 کیپسول کھائے ہیں لوگ یقین بھی نہیں کرتے۔ جراثیم کش ادویات تو خون تک خشک کردیتی ہیں۔ میں ابھی تک کمزور ہوں لیکن میں نے سوچا کہ تمھیں ضرور لکھوں کیوں کہ تم بے حد پریشان ہوگی کہ آخر میں نے جواب کیوں

نہیں دیا۔

تمھیں معلوم ہے کہ ہم امید کر رہے تھے کہ نیو یارک سے ہمیں بلاوا آئے گا لیکن مجھے اچھے وقت پر یاد دلایا گیا کہ بلاوا کسی اور طرف سے آسکتا تھا بس موت کے منہ سے بچ نکلی ہوں لیکن بڑی سخت جان ہوں نازک لمحے سے بچ کر نکل گئی۔

اتنی بیمار اور پھر اکیلی اور بے یار و مددگار پڑی رہی۔ کوئی ہاتھ پکڑنے یا ماتھے پر ہاتھ رکھنے کو بھی پاس نہیں تھا اور نہ ہی تسلی دینے کے لیے تھا۔ بیماری کے دو ہفتے بعد رحیمہ پشاور سے آئی۔ وہ میری بڑی اچھی رکھوالی کرتی رہی۔ اب چھوٹی لبنیٰ زرین بھی یہاں ہے۔ گوہر کی بہت ہی پیاری بچی پانچ سالہ لبنیٰ فریاں بھی یہاں ہے۔ اسی بچی کو ہم لے کر پالنا چاہتے ہیں لیکن گوہر کی صرف یہی بچی ہے۔ اگر اس کی ایک بھی اور بیٹی ہوتی تو ہمارا ارادہ تھا کہ اس لڑکی کو بیٹی بنا لیتے۔ میں اس کی فوٹو بھیج رہی ہوں۔ گڑیا کی طرح پیاری ہے حقیقی کشمیری حسن کا نمونہ ہے۔ شہد کی طرح سنہری اور گھونگریالے بال، شہد کی طرح بھوری آنکھیں نہایت صاف رنگ، گلاب کی کلی کی طرح چھوٹا دہانہ اور جسم کے ہر خط نہایت شاندار، بچی کا باپ کشمیری ہے۔ کل (9 اگست کو) ہم نے خیری (ہم اسے خیری کہتے ہیں) کی سالگرہ منائی۔ کل وہ پانچ سال کی ہوگئی۔ میں اس کے لیے انوکھے لباس خریدنا پسند کرتی ہوں اور ہر رنگ اس پر اچھا لگتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ کس لباس کے ساتھ کون سا نیل پالش اور کون سا لپ اسٹک ہونا چاہیے اسے حسن کا بہت احساس ہے لیکن بہت ہوشیار اور با اطوار لڑکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسے کسی اچھے انگریزی اسکول میں داخل کرانا چاہتے ہیں اور اس کی تعلیمی بنیاد اچھی رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اسے ساتھ نیو یارک بھی لے جائیں لیکن یقین نہیں کہ اس کا باپ اس کی اجازت دے گا۔

ایک اچھی خبر سنو۔ پرویز شاعر ہوگیا ہے۔ اس کی نظمیں لندن میں شائع ہونے والے مجموعوں اور رسالوں میں چھپ رہی ہیں۔ اس نے ہمیں ایک چھپی ہوئی نظم بھیج کر

حیران کر دیا اور ساتھ ہی وعدہ کیا ہے کہ کچھ اور بھیجے گا۔ کچھ نو جوان انگریزی شاعروں نے شاعری کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے، جس کا نام 'بیسویں صدی کی شاعری' ہے۔ پرویز کی نظم بھی اسی میں چھپی ہے۔

جو نظم پرویز نے ہمیں بھیجی ہے وہ ایک رسالے 'پوئٹری فورم' میں نمایاں طور پر چو کھٹے میں درمیانی صفحے پر چھپی ہے۔ اس میں باقی تمام شعراء انگریز ہیں۔ اس نظم کا عنوان 'خط' ہے۔ جب میں اس کی نظم کی ان سطروں پر پہنچی

Will this one (I etter) find his

Mother alive or dead?

Or in between the chines?

تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کیوں کہ میری اپنی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ اس کا خط اور اس کی نظم ایسے ہی لمحے میں یہاں پہنچے تھے۔

لیکن یقین کرو کہ میں نے کبھی بھی اپنے بچوں کو اپنی سخت بیماری کے بارے میں نہیں لکھا خواہ مخواہ انھیں کیوں پریشان کروں وہ اتنی دور سے آ تو سکتے نہیں۔ وہ وہیں خوش رہیں جہاں ہیں۔ ہمیں پرویز کے خط سے معلوم ہوا ہے کہ گلریز یورپ میں چھٹی منا رہا ہے اپنے (یونی لیور) نئے کام پر لگنے سے پہلے کچھ سیر و تفریح کرنا چاہتا ہے۔ پرویز نے کنگز کالج میں داخلہ لینے کی غرض سے اپنا کام چھوڑ دیا ہے وہ فلسفے کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔

زینت میں جانتی ہوں کہ یہ خط ایسا اچھا نہیں ہے جیسے کہ میرے پہلے خطوط تھے۔ میں ہیئت ترتیب، یا تقدیم و تاخیر کا لحاظ کیے بغیر لکھتی رہی ہوں۔ میں ابھی تک ویسی کمزور ہوں۔ میں اتنی تھکی ہوں کہ تھوڑی سی محنت بھی مجھے چور چور کر دیتی ہے۔ اس کے باوجود میں نے تم کو خط لکھا۔ آخر میں میں تہہ دل سے ان خوبصورت جذبات کے لیے تمھارا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کا اظہار تم نے میرے حق میں کیا ہے۔ خاتمہ نہایت خوب تھا کہ "بہن

تمھاری طرح کوئی بھی نہیں ہے''۔ جب شاہین نے یہ خط پڑھا تو مجھے بلایا اور کہا کہ ''زینت نے جو کچھ تمھارے بارے میں لکھا ہے، وہ تم نے پڑھا ہے؟ کہتی ہے 'تمھاری طرح کوئی بھی نہیں'۔ میں نے کہا ''زینت نے تو کہا ہے لیکن آپ نے کبھی ایسا نہیں کہا''۔ اور اس نے کہا ''تم جانتی ہو کہ میں زیادہ نمائشی خاوند نہیں ہوں۔'' میں نے کہا ''نہیں لیکن میں نے محسوس ضرور کیا ہے۔'' کیا میں اس پر اعتبار کرلوں؟

اسلام آباد

18 اکتوبر 1970

''اول تو میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ اب میں بالکل اچھی ہوں۔ اگرچہ پورا علاج نہیں ہوا۔ پہلے مہینے کے بعد حرارت نارمل رہی ہے اگرچہ بیماری کا حملہ بار بار ہوتا ہے اور جراثیم کش ادویہ کھانے سے ختم ہو جاتا ہے۔ اب تک میں 106 کیپسول کھا چکی ہوں اور میرا جسمانی نظام اب اس کا عادی ہو چکا ہے۔ میں ایک بہت اچھے ڈاکٹر کے زیرِ علاج ہوں۔ ڈاکٹر سرفراز کے بارے میں اس کے مریض کہتے ہیں کہ وہ بہت شفا رکھتے ہیں۔ حقیقتاً وہ مسیحائی لمس رکھتے ہیں ایک انسان کی حیثیت سے بھی وہ نہایت شاندار کردار کے حامل ہیں۔ نہایت خوش مزاج، رحم دل، مہربان اور بہت ہی پسندیدہ طبیعت کے مالک ہیں۔ بالکل جیسا کہ ایک ڈاکٹر کو ہونا چاہیے۔ وہ شاہین کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ 1949 میں ایس ایم کالج میں جب شاہین ان کے زیرِ علاج تھے تو ان سے کہنے لگے کہ ''شاہین صاحب آپ کو یاد نہیں میں انٹرمیڈیٹ میں آپ کا طالب علم تھا لیکن آپ بیس سال بعد بھی ویسے ہی ہیں۔''

ڈاکٹر سرفراز نے مجھے یقین دلایا ہے کہ بیماری مسلسل علاج سے چلی جائے گی لیکن اس پر کچھ وقت لگے گا۔ بہرحال اب مجھے کوئی فکر نہیں۔

اسلام آباد

31 دسمبر 1970

عید سے دس دن پہلے میں نے کارڈ بھیجنے شروع کر دیے تھے۔ ہندوستان کو، امریکہ کو، لندن کو، ترکی کو، صرف پاکستان میں بھیجے جانے والے کارڈ عید سے دو دن پہلے تک کے لیے روک لیے اور دس دن پہلے میں نے عید کارڈ اور ایک خط اپنی پیاری بہن عالم کو بی آر پی کالونی کے پتے پر بھیجا تھا۔ میں کیسے جان سکتی تھی کہ اس پر کیا آفت پڑ گئی ہے۔ اب اپنے آپ کو میں اس قدر مجرم سمجھتی ہوں کہ میں نے عید منائی دوستوں سے عید پر ملاقاتیں کیں اور میرے مہمان آئے میں نے ان کو گاجر کا حلوہ، خشک میوہ، دال موٹھ حسب معمول کھلایا۔ بریانی کھائی اور اس المیہ سے مکمل طور پر بے خبر رہی جو میری بہن کو پیش آیا۔ یہ المناک خبر مجھے عید کے دوسرے دن نجمہ کے خط سے معلوم ہوئی۔ میں نے نجمہ کا خط کھولا اور خیال کیا کہ اس میں عید کارڈ ہے اور یہ خط جس کا مجھے عرصہ سے انتظار تھا ایک ناقابل یقین المناک خبر لیے ہوئے تھا۔

اس کا غم اتنا ہوا ہے کہ کوئی بھی ہمدردی یا تعزیت اس کے لیے ناکافی ہے۔ پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ میری دلی ہمدردی اور تعزیت عالم آرا تک پہنچادو۔ اگر وہ ابھی تک بنگلور میں ہے۔ علی بھائی جان تو ایک ولی تھے وہ جنت کو سدھار گئے ہیں اور ہمیں ان کے لیے غم نہیں کرنا چاہیے۔ غم تو زندوں کے لیے ہے اس بیوی کے لیے جو ابھی چالیس سے کم ہے اور اس بیٹے کے لیے جو ابھی بچہ ہے۔ اتنی کم عمر میں بیوہ اور یتیم ہو جانا حقیقی المیہ ہے۔ علی بھائی جان نہایت سمجھدار، عقلمند اور ہمدرد انسان تھے۔

پیاری زینت تم کہتی ہو کہ تم آپا اور میرے بھائی علی جان کے آخری دیدار کے وقت ملی ہو۔ اب آپا کیسی ہیں؟ کیا اب بھی وہ جوان نظر آتی ہیں۔ چند سال پہلے تو تھیں لیکن جب سے ابا فوت ہوئے ہیں اور میرے پیارے نانا جان بھی فوت ہو گئے ہیں۔ اس وقت سے ہمارے خاندان کے حالات بہت نازک ہو گئے ہیں۔ ان تمام کا اس کی صحت پر اثر

ضرور پڑا ہوگا اور اب ان کی بیٹی بھی بیوہ ہوگئی؟ بچاری عالم آرا! میرا دل اس کے لیے روتا ہے کیوں کہ عورت کے لیے خاوند کی موت سے بڑا دنیا میں کوئی بھی نقصان نہیں ہے۔ عورت کی زندگی شوہر کے دم قدم سے قائم ہے۔ اس کے بعد اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اب اسے اپنے بیٹے کے لیے زندہ رہنا ہوگا۔ رضو ہوشیار اور اطاعت شعار لڑکا ہے اور کاش اس کی تربیت باپ کے راستے پر کی جائے۔ اے خدا اسے استقامت دے۔

اسلام آباد

23 اگست 1971

تمھیں یاد ہے آج کون سا دن ہے؟ مجھے یقین ہے کہ تمھیں یاد ہے۔ آج ہماری شادی کی سالگرہ کا دن ہے۔ سالہا سال پہلے آج کے دن ہماری شادی ہوئی تھی اور پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل ہی کی بات ہو!

کچھ عرصہ پہلے مجھے ایسا لگتا تھا جیسے لکھنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ زندگی بالکل ہی رک گئی ہے۔ کوئی چونکا دینے والی یا خاص خبر باقی نہیں رہی تھی، مستقبل کے لیے کوئی خاص منصوبے نہیں تھے۔ شاہین جون میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو گئے ہیں اور اب قبل از پنشن چھٹی پر ہیں۔ چنانچہ فی الحال ہم صرف انتظار کر رہے ہیں ویسے اس کے لیے ... ہی بہتر لفظ ہوگا کیوں کہ شاہین کے پنشن کے کاغذات ابھی درست ہونے میں کافی وقت لگے گا۔ ہم یہاں کم از کم دو تین ماہ اور بھی ٹھہریں گے اور پھر واپس کراچی چلے جائیں گے۔ پھر اسی مصروف شور و غل والی گرد و غبار والی گندی کراچی میں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ کراچی نے بہت ترقی کر لی ہے اور گزشتہ چند سالوں میں جب کہ ہم باہر رہے ہیں بہت بہتر ہوگئی ہے۔ جیسی بھی ہے کراچی وہ جگہ ہے جہاں ہمیں بالآخر مستقل سکونت اختیار کرنی ہوگی۔ ہم اسلام آباد چھوڑنے کے بعد کہیں باہر جانا چاہتے تھے اس لیے کہ اسلام آباد سے ہمیں بہت لگاؤ ہو گیا تھا۔ اسی لیے ہم ملک سے باہر جانے کو ترجیح

دے رہے تھے۔ لیکن اب تک یو این (UN) سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ شاہین کا نام یو این کی لسٹ میں ڈال دیا گیا ہے اس کی اسناد کو پسند کیا گیا ہے۔ لیکن فی الحال وہاں کوئی خالی جگہ نہیں ہے۔ لہٰذا آئندہ کبھی جو مبہم سی بات ہے۔

شاہین کے دوسرے منصوبے بھی ہیں۔ وہ یو ایس اے اور کینیڈا میں مختلف یونیورسٹیوں کو تحقیقی فیلوشپ کے لیے لکھ رہا ہے۔ وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں پڑھانا پسند کرتا ہے جو کہ امریکہ میں اول نمبر کی شہرت رکھنے والی یونیورسٹی ہے۔ وہ ایک دو کتابیں بھی لکھنا چاہتا ہے جن کے لیے وہ منصوبے بنا رہا ہے۔ ریسرچ فیلوشپ سے وہ اس قابل ہو جائے گا کہ یونیورسٹی میں پڑھائے بھی، ریسرچ بھی کرے اور کتابیں بھی لکھے۔ لیکن جب تک ان امیدوں میں سے کوئی عملی شکل اختیار نہ کرے وہ واپس کراچی جا کر اس گرائمر سکول میں پڑھانے کا ارادہ رکھتا ہے جس میں پرویز اور گلریز پڑھا کرتے تھے جہاں منتخب طلبا ہی پڑھنے آتے ہیں۔ یہ نہ ہو تو وہ اپنے پرانے ایس ایم کالج میں پڑھانا پسند کرے گا۔ اگرچہ بہت دیر ہو گئی ہے پھر بھی میں کچھ کام کرنا پسند کروں گی تا کہ اپنی طرف سے تھوڑے سے حصہ کا اضافہ کرسکوں۔

پرویز بحیرۂ روم کے ایک جہاز میں سفر کر رہا ہے جو یونانی تہذیب کے علاقوں کے پاس ٹھہرے گا۔ اب تک وہ یونان کے ساحل اور جزیرۂ روڈز سے ہوتے ہوئے ترکی جائیں گے۔ (تمھیں معلوم ہے دریا میں لاشیں تیس سے چالیس میل تک بہہ گئیں۔ بہت کم لوگ زندہ بچے اور سو سے زائد مر گئے۔ مرنے والوں میں بیس نوجوان سائنس کے طلباء بھی تھے جو ملتان کالج سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک پیارا نوجوان جوڑا بھی تھا جن کی صرف دو ہفتے قبل شادی ہوئی تھی۔ یہ اس خوبصورت وادی میں ہنی مون منانے آئے تھے۔ دلہن غزالہ کسی طرح بچالی گئی۔ وہ غضبناک دریا سے کھینچ کر نکالی گئی اور ایک محفوظ ٹیلے پر پہنچادی گئی۔ جب وہ ہوش میں آئی اور اسے معلوم ہوا کہ اس کا خاوند دریا کی موجوں کی نذر ہو گیا ہے تو اس نے پھر دریا میں کود پڑنے کی کوشش کی، "مجھے وہیں جانے دو جہاں میرے سرتاج گئے

ہیں"۔ ایک دلیر نوجوان طالب علم سرفراز جس نے اسے بچایا تھا اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بے شمار زندگیوں کو بچانے کی کوشش کی تھی اسے اپنی گرفت میں رکھا اور اسے دوبارہ دریا میں گرنے سے بچالیا۔ لیکن اس کی تشفی نہیں ہوئی تھی اور چٹانوں اور پہاڑوں میں اس کی "تم کہاں ہو، تم کہاں ہو" کی چیخوں کی بازگشت سنائی دیتی تھی تو حسین وادیٔ سوات کی یادیں میرے ذہن میں ہمیشہ اس خوفناک المیے سے وابستہ رہیں گی۔

(ترجمہ سید الابرار)

●●●

اعلان نامہ

بحمد اللہ ممتاز شیریں کی آپ بیتی، افسانے، مترجم افسانے اور خطوط کا یہ مجموعہ " شیریں کتھا" مکمل ہوا۔ میری یہ کوشش آپ قارئین کے حوالے، اچھا، برا جو فیصلہ صادر کرنا چاہیں کریں لیکن للللہ ایک مرتبہ انہیں پڑھنے کی زحمت ضرور گوارا کریں۔ شیریں کی یہ تحریریں جواب تک بے توجہی کا شکار رہیں اور اردو افسانے کی اس عظیم عمارت کے نیچے دب کر رہ گئیں، جہاں منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت اور قرۃ العین کا دبدبہ قائم تھا۔ ان درخشاں ستاروں کی چکا چوندھ میں بقیہ ستارے ماند پڑ گئے۔ ناقدوں نے بھی اردو افسانے کے اس دور کو انہیں معدود چند افسانہ نگاروں سے خاص کر دیا۔ فی زمانہ جس طرح اردو شاعری میں میر، سودا، درد اور غالب، مومن، ذوق کے عہد کے شعراء کی تلاش و جستجو جاری ہے، اردو افسانہ میں بھی اس زریں دور کے ان افسانہ نگاروں کی تلاش کرنی چاہئے جو کسی بھی وجہ سے ماضی کے دھندلکوں میں کہیں کھو سے گئے ہیں۔ شیریں کتھا ایک ایسی ہی کوشش ہے۔ جو اردو افسانے کی اس عظیم عمارت کے ساتھ ان چھوٹی چھوٹی عمارتوں کو تسلیم کرتی ہے اور ان کے وجود کو قائم کرتی ہے۔

شیریں کتھا کی تکمیلیت کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بات بتاتے ہوئے بھی کافی مسرت ہو رہی ہے کہ بہت جلد آپ قارئین ممتاز شیریں کی تنقیدی تحریروں کا بھی مطالعہ کر سکیں گے۔ راقم الحروف گذشتہ کئی مہینوں سے اس کی یکجائی میں بھی جٹا ہوا ہے۔ ان شاء اللہ جلد از

جلد شیریں کی یہ تحریریں بھی آپ کی خدمت میں ہوں گی۔ پہلے پہل ان دونوں کتابوں کو ایک ساتھ ہی پیش کرنے کا ارادہ تھا لیکن چند دشواریوں کی بنا پر ان تنقیدی تحریروں کو فی الحال شائع کرنے سے قاصر ہوں لیکن امید کرتا ہوں کہ آئندہ چند مہینوں میں یہ زیور طباعت سے آراستہ ہو کر ہدیہ قارئین ہوگی۔ اس کے مشمولات میں شیریں کی دونوں تنقیدی کتابیں معیار اور منٹو نوری نہ ناری کے علاوہ رسالوں میں منتشر متعدد مضامین، مقدمے/ دیباچے اور انٹرویو ہوں گے۔ امید کرتا ہوں آپ قارئین اور ادب کے شیدائی اسے بھی شرف قبولیت بخشیں گے۔

●●●

اپنے اپنے طور پر کر چکے ہیں، اور ان
کے مقالات کا مطالعہ اس دریافت
میں مدد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔
تاہم ان کے ادعا کا یہ محل نہیں۔ ممتاز
شیریں کے کلیات افسانہ کی اشاعت
پر ایک آدھ بات مزید کہنے کی ہے اور
میں فی الوقت اسی پر اکتفا کروں گا۔

ممتاز شیریں کے تمام افسانوں کو
ایک ساتھ دیکھا جائے تو ان میں
بعض عناصر خاصے نمایاں نظر آتے
ہیں۔ داخلی تجربے کی دردمندی، ذہانت
کی کارفرمائی اور sophistication
ان کے افسانوں کے اہم خواص
ہیں۔"

آصف فرخی (ماخوذ)

SHIREEN KATHA

Mumtaz Shireen ki Aapbeeti
Afsane, Mutarjam Afsane, Khutoot

Compiled by

Zeyaullah Anwer

'شیریں کتھا' سے متعلق میری کاوش کا لب لباب اردو ادب کے وہ قارئین ہیں جو میری طرح شیریں کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ دیگر افسانہ نگاروں اور تنقید نگاروں کی طرح ادب میں ان کی چھان پھٹک کرنا چاہتے ہیں۔ ادب کے تئیں ان کے نظریات وخیالات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن تلاش بسیار کے باوجود کوئی امید بر نہیں آتی۔ میری اس کوشش سے شائد ان کی تشنگی دور ہو سکے۔ لیکن میری مطلب برآری اس وقت ہوگی جب شیریں کو ادبی اسٹریم میں پھر سے جگہ دی جائے گی اور ادب کے نئے قارئین کے درمیان ان کے افکار بحث کا حصہ بنیں گے۔ شیریں کی تحریروں سے متعلق جہاں تک میری رسائی ممکن ہو سکی ہے اس سے یہی نتیجہ اخذ کر سکا ہوں کہ — اس خاک کے پتلے کا ہر رنگ نرالا ہے

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-5073-892-4